قصص القرآن

اول

حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی

قصص القرآن

حصۂ اوّل

قصصِ قرآنی اور انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات اور اُن کی
دعوتِ حق کی مستند ترین تاریخ جس میں حضرتِ آدم علیہ السلام سے لے کر
حضرتِ موسیٰ و حضرتِ ہارون علیہما السلام کے واقعات تک نہایت
مفصل اور محققانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں ؂

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

طبع جدید عکسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرستِ مضامین



پیشِ لفظ

طبعِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی ھدانا بالکتاب المبین و انزل علینا القرآن بلسانٍ عربی مبین، وقص فیہ احسن القصص موعظۃ وذکری للمؤمنین، والصلوٰۃ والسلام علی النبی الصادق الامین۔ محمد رسول اللہ وخاتم النبیین۔ وعلٰی آلہ واصحابہ الذین ھم ھداۃٌ للمتقین۔

اما بعد قرآنِ عزیز میں حق تعالیٰ نے دنیائے انسانی کی ہدایت کے لئے جو مختلف معجزانہ اسلوبِ بیان اختیار فرمائے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ گزشتہ قوموں کے واقعات وقصص کے ذریعہ اُن کے نیک وبداعمال اور ان اعمال کے ثمرات ونتائج کو یاد دلائے اور عبرت وبصیرت کا سامان مہیا کرے۔ اسی لئے وہ تاریخی اسلوبِ بیان کے درپے نہیں ہوتا بلکہ ابلاغِ حق اور دعوت الی اللہ کے اہم مقصد کے پیشِ نظر صرف انہی وقائع کو سامنے لاتا ہے جو اس غرض وغایت کو پورا کرتے ہوں اور اسی لئے قرآنِ عزیز میں ان کی تکرار پائی جاتی ہے تاکہ سامعین کے دل میں وہ گھر کرسکیں اور فطری اور طبعی رجحانات کو ان حقائق کی جانب متوجہ کیا جاسکے، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ایک بات کو مختلف

پیرایۂ بیان اور مناسبِ حال اسلوبِ نگارش سے بار بار دُہرایا جائے، اور خوابیدہ قوائے فکریہ کو پے بہ پے بیدار کیا جائے۔

قرآنِ مجید کے قصص وواقعات کا سلسلہ بیشتر گذشتہ اقوام اور ان کی جانب بھیجے ہوئے پیغمبروں سے وابستہ ہے اور جستہ جستہ بعض اور واقعات بھی اس ضمن میں آگئے ہیں، اور یہ تمام ترحق وباطل کے مجادلوں، اور اولیاء اللہ واولیاء الشیطان کے معرکوں کا ایک عبرت آموز اور بصیرت خیز بے مثل ذخیرہ ہے۔

لیکن دوسروں کا کیا ذکر ہم مسلمانوں میں بھی بہت کم ہیں جو خدائے تعالیٰ کے اس مکمل ترین اور آخری قانون (قرآنِ عزیز) سے استفادہ کرتے اور اپنے مُردہ دلوں میں ایمان ویقین کی زندگی پیدا کرتے ہوں اس لئے کہ یہ خدا کا قانون ہے اور ہم اس کے امتثال پر مامور ہیں اور معانی ومطالب پر غور کرتے ہوں یہ سمجھ کر کہ یہ رہتی دنیا تک حیاتِ اَبدی وسرمدی اور دارَین کی فلاح وسعادت کا مکمل دستور ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کی معاندانہ روش سے تنگ آکر یہ شکایت کی تھی۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ	رسول اللہؐ نے کہا: اے میرے پروردگار!
قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ	بے شبہ میری قوم نے قرآن کو مہجور (جھک
مَهْجُوْرًا ۝ (فرقان ع)	جھک) بنالیا ہے۔

لیکن اس چودھویں صدی میں اگر ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں تو دعوائے اسلام اور قرآن کو خدا کا کلام یقین کرنے کے باوجود کتنے ہیں جو اس کلامِ الٰہی کو اپنی زندگی کے لئے بہترین نظامِ عمل بناتے اور اس نظر سے اس کی تلاوت کرتے ہوں۔

اپنی اور اپنی قوم کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے جی چاہا کہ اس سرمایۂ عبرت وبصیرت کو اُردو میں منتقل کیا جائے تاکہ نقل سے محظوظ ہونے کے بعد خود بخود اصل کی جانب رغبت پیدا ہو اور اس طرح سعادتِ دارَین کا سراغ ملے۔

اپنی سادہ طرزِ نگارش کے باوجود اس مجموعے میں چند خصوصیات کا خاص طور پر لحاظ کیا گیا ہے:

(۱) کتاب میں تمام واقعات کی اساس و بنیاد قرآنِ عزیز کو بنایا گیا ہے اور احادیثِ صحیحہ اور واقعاتِ تاریخی سے ان کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

(۲) تاریخ اور کتبِ عہدِ قدیم کے درمیان اور قرآنِ عزیز کے "یقینِ محکم" کے درمیان اگر کہیں تعارض آپڑا ہے تو اس کو روشن دلائل و براہین کے ذریعہ یا تطبیق دی گئی ہے اور یا پھر صداقتِ قرآن کو وضاحت سے ثابت کیا گیا ہے۔

(۳) اسرائیلی خرافات اور معاندین کے اعتراضات کی خرافت کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کیا گیا ہے۔

(۴) خاص خاص مقامات پر تفسیری، حدیثی اور تاریخی اشکالات پر بحث و تمحیص کے بعد سلفِ صالحین کے مسلک کے مطابق ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔

(۵) ہر پیغمبر کے حالات قرآنِ عزیز کی کن کن سورتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کو نقشہ کی شکل میں ایک جگہ دکھایا گیا ہے۔

(۶) ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ "نتائج و عبر" یا "عبر و بصائر" کے عنوان سے اصل مقصد اور حقیقی غرض و غایت یعنی عبرت و بصیرت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

خادمِ ملت

محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

مرقومہ ۲۲ رجب المرجب ۱۳۶۰ھ

دیباچہ طبعِ ثانی

قصص القرآن حصۂ اول و دوم عرصہ ہوا کہ ختم ہو گئے تھے مگر کاغذ کی قلت، کنٹرول کی پابندیوں اور طباعت کی گوناگوں مشکلات نے موقع نہ دیا کہ دوسرا ایڈیشن جلد طبع ہو سکتا، تاہم سعیٔ بلیغ کے بعد طبعِ دوم کی نوبت آہی گئی اور اب اصحاب کے ہاتھوں میں حصۂ اول کا دوسرا ایڈیشن پہنچ رہا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذلك۔

ارادہ تھا کہ اس مرتبہ نظرِ ثانی کر کے کتاب کو نئے اسلوب پر ترتیب دیا جائے، لیکن حصۂ اول کی کتابت اُس وقت ہوئی جبکہ میں مراد آباد اور بریلی کی جیلوں میں اسارت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس لئے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ پھر بھی یہ ترمیم ضروری خیال کی گئی کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کا پورا واقعہ پہلے ہی حصہ میں آجائے اور پہلے ایڈیشن کی طرح نصف دوسرے حصہ کے لئے باقی نہ رہے، چنانچہ اس ایڈیشن میں حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ ہارون (علیہما السلام) کے مکمل حالات و واقعات یکجا ہو گئے ہیں۔

دیباچہ طبعِ ثالث

دلی مرحوم کے "مرحوم" ہونے کے بعد کسے گمان تھا کہ قرول باغ میں برباد شدہ ادارہ "ندوۃ المصنفین" دوبارہ زندگی کے سانس لے سکے گا لیکن مشیتِ ایزدی نے اُس کو روحِ تازہ بخشی اور سابق کی طرح علمی و دینی خدمت کے لئے اُس کو ایک مرتبہ پھر شاہراہِ افادیت پر گامزن کیا۔ تاہم ناسازگار حالات اور نامساعد ساعات نے مسلمانانِ ہند کی جن نت نئی خدمات سے دوچار کیا، اُن کی وجہ سے وہ منصوبہ آج بھی پورا نہ ہو سکا کہ قصص القرآن جلد اوّل کو نئے اسلوب پر ترتیب دیا جائے۔

حق تعالیٰ نے توفیق بخشی تو بعد کے ایڈیشن میں اِس عزم کو پورا کیا جا سکے گا۔

محمد حفظ الرحمٰن

۱۵ شعبان ۱۳۶۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"قصص القرآن" کا شمار "ندوۃ المصنفین" کی مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے، علمی اور تحقیقی اعتبار سے بھی اس کا پایہ نہایت بلند ہے، اسی لئے اس کو اب تک بہتر سے بہتر طریقے پر شائع کرنے کی کوشش کی گئی، پھر بھی یہ خلش باقی تھی کہ سعی بلیغ کے باوجود کتاب اپنی حیثیت اور درجے کے مطابق طبع نہیں ہو سکی، شکر ہے اس دفعہ یہ خلش مٹ گئی، اور اب یہ دل آویز اور دیدہ زیب ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جس کی کتابت بھی نفیس اور دل کش ہے اور طباعت بھی صاف، شستہ اور خوبصورت ہے،

ظاہری خوبیوں سے قطع نظر اس ایڈیشن کی سب سے اہم خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کو مصنفِ مرحوم کی مکمل نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔

مرحوم برسوں سے کتاب کی جلدِ اوّل اور جلدِ ثانی پر وسیع اور عمیق نظرِ ثانی کے خیال میں تھے، مگر ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد کی غیر معمولی مشغولیتوں نے اُن کو اس کا موقع نہیں دیا تھا، یہاں تک کہ سفرِ آخرت سے دو سال قبل اِس خدمت کے لئے کچھ اس طرح مستعد ہوئے کہ سفر و حضر میں جب بھی موقع ملتا کام کرتے، کبھی کبھی تو صبح سے شام تک اِسی کام میں منہمک رہتے تھے، نظرِ ثانی کے وقت اُسلوب اور طرزِ ادا میں ردّ و بدل کے علاوہ بعض نہایت اہم اور مفید اضافے بھی کیئے گئے ہیں، اِن اضافوں کے بعد قدرتی طور پر کتاب کا پایۂ تحقیق اور بھی بلند ہو گیا ہے۔

صد افسوس کہ مرحوم کی زندگی میں یہ ایڈیشن جلوہ افروز نہ ہو سکا، دیکھئے تو کس قدر

مسرور ہوتے لیکن

مَا کُلُّ مَا یَتَمَنَّی المرءُ یُدْرِکُهٗ
تَجْرِی الرِّیَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِی السُّفُنُ

اس وقت کہ یہ سطریں زیرِ قلم ہیں مرحوم کی یاد تیز اور اونچی آواز سے دل پر دستک دے رہی ہے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔

امید ہے قارئین کرام کتاب کے مطالعہ کے وقت مرحوم کے لئے ایصالِ ثواب کا خاص خیال رکھیں گے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی
۲۰ر نومبر ۱۹۶۳ء



حضرت آدم علیہ السلام

① انسانِ اول ② قرآن عزیز میں ذکرِ آدم (علیہ السلام) ③ پیدائشِ آدمؑ
④ مسئلۂ سجودِ ملائکہ ⑤ انکارِ ابلیس ⑥ ربّ العٰلمین سے ابلیس کا مکالمہ
⑦ ملعونیتِ ابلیس اور تاقیامِ قیامت زندگی کی مہلت ⑧ خلافتِ آدمؑ،
⑨ خلافتِ آدمؑ پر فرشتوں کا اظہارِ تعجب ⑩ بارگاہِ ربوبیت سے حضرتِ آدمؑ کو
تعلیم اور فرشتوں کو تنبیہ ⑪ حوّاؑ کی پیدائش اور آدم و حوّاؑ کی جنت میں رہائش،
⑫ آدمؑ و حوّاؑ، وسوسۂ ابلیس اور شجرِ ممنوعہ کا واقعہ ⑬ عتابِ الٰہی اور آدمؑ و حوّاؑ
کا جنت سے زمین کی جانب اخراج ⑭ قصۂ آدمؑ سے متعلق بعض اہم مسائل،

انسانِ اول حضرتِ آدم (علیہ السلام) کے متعلق قرآنِ عزیز نے جو حقائق بیان کیے ہیں ان کے تفصیلی تذکرہ سے پہلے یہ واضح ہو جانا ضروری ہے کہ انسان کے عالمِ وجود میں آنے کا مسئلہ آج علمی نقطۂ نگاہ سے بحث کا ایک نیا دروازہ کھولتا ہے یعنی ارتقاء (EVOLUTION) کا یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ انسان اپنی ابتدائی تخلیق و تکوین ہی سے انسان پیدا نہیں ہوا بلکہ کائناتِ ہست و بود میں اس نے بہت سے مدارج طے کر کے موجودہ انسانی شکل حاصل کی ہے، اس لئے کہ مبدءِ حیات نے جمادات و نباتات کی مختلف شکلیں اختیار کر کے ہزاروں، لاکھوں برس بعد درجہ بدرجہ ترقی کرتے کرتے اول لیونہ (پانی کی جونک)

کا لباس پہنا اور پھر ایسی ہی طویل مدت کے بعد حیوانات کے مختلف چھوٹے بڑے طبقات سے گذر کر موجودہ انسان کی شکل میں وجود پذیر ہوا۔

اور مذہب یہ کہتا ہے کہ خالقِ کائنات نے انسانِ اوّل کو آدم (علیہ السلام) کی شکل میں ہی پیدا کیا اور پھر اُس کی طرح ایک ہم جنس مخلوق حواؑ کو وجود دے کر کائناتِ ارض پر نسلِ انسان کا سلسلہ قائم کیا، اور یہی وہ انسان ہے جس کو خالقِ کائنات نے عام مخلوق پر برتری اور بزرگی عطا فرمائی اور امانتِ الٰہی کا بارِ گراں اُس کے سپرد فرمایا اور کُل کائنات کو اُس کے ہاتھ میں مسخر کر کے خلافت و نیابتِ الٰہی کا شرف اُس ہی کو بخشا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (والتین)	بلاشبہ ہم نے انسانوں کو بہترین اندازہ سے بنایا ہے۔
لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل)	بے شبہ ہم نے نسلِ آدم کو تمام کائنات پر بزرگی اور برتری بخشی۔
اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (بقرہ)	میں زمین پر (آدم کو) اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔
اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (احزاب)	ہم نے بارِ امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انھوں نے (کُل کائنات) امانتِ الٰہی کے بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اُس بارِ گراں کو اٹھا لیا۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ نظریۂ ارتقاء (EVOLUTION) اور مذہب کے درمیان اس خاص مسئلہ میں علمی تضاد ہے یا تطبیق کی گنجائش نکل سکتی ہے خصوصاً جبکہ علم اور تجربہ نے یہ حقیقت واشگاف کر دی ہے کہ دینی اور مذہبی حقائق اور علم کے درمیان کسی بھی موقف پر تضاد نہیں ہے اور اگر ظاہر سطح میں کہیں ایسا نظر بھی آتا ہے تو وہ علم کے بعض حقائق مستور ہونے کی وجہ سے نظر آتا ہے کیونکہ بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ

جب بھی علم کے مستور حقائق سے پردہ اٹھا تو اُسی وقت تضاد بھی جاتا رہا اور وہی حقیقت نکھر کر سامنے آگئی جس کا اظہار وحی الٰہی کے ذریعہ ہو چکا تھا۔

دوسرے الفاظ میں یُوں کہہ دیجئے کہ علم اور مذہب کے درمیان اگر کسی وقت بھی تضاد نظر آیا تو نتیجہ میں علم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑی اور وحی الٰہی کا فیصلہ اپنی جگہ اٹل رہا۔

اس بنا پر اس جگہ بھی قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں حقیقتِ حال کیا ہے اور کس طرح ہے ؟

جواب یہ ہے کہ اس موقف پر بھی علم (ارتقاء) اور مذہب کے درمیان تضاد نہیں ہے البتہ یہ مسئلہ چونکہ دقیق نکتہ سنجیوں کا حامل ہے اس لئے یہ مقام اُس کے تفصیلی مباحث کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اِسی کتاب کے کسی دوسرے مقام پر زیر بحث آسکے گا۔

تاہم اس جگہ یہ حقیقت ضرور پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ انسانِ اوّل (جو کہ موجودہ نسلِ انسان کا باوا آدم ہے) خواہ ارتقائی (EVOLUTION) نظریہ کے مطابق درجہ بہ درجہ انسانی شکل تک پہنچا ہو یا ابتداءِ تخلیق ہی کے وقت سے انسانی صورت میں وجود پذیر ہوا ہو علم اور مذہب دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ موجودہ انسان ہی اس کائنات کی سب سے بہتر مخلوق ہے اور عقل و دانش کا یہ پیکر ہی اپنے اعمال و کردار کے لئے جوابدہ ہے اور دستور و قانون کا مکلف !

یا اِس طرح تعبیر کر لیجئے کہ انسانی کردار اور اس کے علمی و عملی نیز اخلاقی عوامل و محرکات کے پیشِ نظر اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ اس کی تخلیق و تکوین اور عالمِ وجود میں آنے کی تفصیلات کیا ہیں بلکہ اہمیت کا موقف یہ ہے کہ اس عالمِ کون و مکان میں اس کا وجود یونہی بے معنی اور بے مقصد وجود میں آیا ہے یا اُس کی ہستی اپنے اندر عظیم مقصد لے کر وجود پذیر ہوئی ہے ؟ کیا اُس کے اعمال و اقوال اور کردار و گفتار کے اثرات لا یعنی ہیں ؟

کیا اُس کی مادی و روحانی قدریں سب کی سب مہمل اور بے نتیجہ ہیں یا بیش بہا ثمرات کی حامل اور پُر از حکمت ہیں؟ اور کیا اُس کی زندگی اپنے اندر کوئی روشن و تابناک حقیقت رکھتی ہے یا تیرہ و تاریک مستقبل کا پتہ دیتی ہے اور اُس کا ماضی اور حال اپنے مستقبل سے بے بہرہ ہے؟

پس اگر ان حقائق کا جواب نفی میں نہیں بلکہ اثبات میں ہے تو پھر قدرتی طور پر یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ اُس کی کیفیتِ پیدائش پر بحث کی بجائے اُس کے وجود کے مقصد پر پوری نگاہ رکھی جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ اس اشرف المخلوقات ہستی کا وجود بلاشبہ مقصدِ عظیم کا پتہ دیتا ہے اور اس لئے اُس کی اخلاقی قدروں کا ضرور کوئی "مثلِ اعلیٰ" اور اُس کی تخلیق کی کوئی غایت ہے۔

قرآنِ عزیز نے اسی لئے حضرت انسان سے متعلق مثبت اور منفی ہر دو پہلو کو واضح کر کے انسانی ہستی کی عظمت کا اعلان کیا ہے اور بتلایا ہے کہ خالقِ کائنات کی قدرتِ تخلیق و تکوین میں انسان کی تخلیق "احسنِ تقویم" کا درجہ رکھتی ہے اور اسی وجہ سے وہ تمام کائنات کے مقابلہ میں "تکریم و تعظیم" کا مستحق ہے اور اپنے حسنِ تقویم اور لائقِ تکریم ہونے کی بنا پر بلاشبہ وہی امانتِ الٰہی کا علمبردار ہو کر "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر فائز ہونے کا حق رکھتا ہے اور جب یہ سب کچھ اُس میں ودیعت ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اُس کی ہستی کو یونہی بے مقصد اور بے نتیجہ چھوڑ دیا جاتا ہے:-

اَیَحۡسَبُ النَّاسُ	کیا لوگوں (انسانوں) نے یہ گمان
اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی	کرلیا ہے کہ وہ بے مقصد چھوڑ دیئے جائیں گے۔

اور ضروری ہے کہ عقل و شعور کے اس پیکر کو تمام کائنات سے ممتاز بنا کر نیک و بد کی تمیز عطا کی جائے اور بُرائی سے پرہیز اور بھلائی کے اختیار کا مکلف بنایا جائے۔

خَلَقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی	(اللہ تعالیٰ نے) انسان کو پیدا کیا اور پھر (نیک و بد کی) راہ دکھلائی۔
فَھَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ	پھر ہم نے انسان کو دونوں راستے (نیک و بد کے) دکھلائے

غرض قرآنِ عزیز کی تذکیر و دعوت، اوامر و نواہی، اور رشد و ہدایت کا مخاطب اور مبدء و معاد کا محوَر و مرکز صرف یہی ہستی ہے جس کو "انسان" کہتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے انسانِ اوّل کی تخلیقی کوائف و تفصیلات کو نظر انداز کرکے اُس کے "مبدء و معاد" کے مسائل ہی کو اہمیت دی ہے۔

ذکرِ آدمؑ سے متعلق آیاتِ قرآنی | قرآنِ عزیز میں حضرت آدمؑ کا نام پچیس مرتبہ پچیس آیات میں آیا ہے جو ذیل کی جدول سے ظاہر ہوتا ہے:۔

نمبر سورۃ	سورۃ	آیات	شمار
۲	البقرۃ	۲۱-۳۳-۳۴-۳۵-۳۷	۵
۳	آل عمران	۳۳-۵۹	۲
۵	المائدہ	۲۷	۱
۷	الاعراف	۱۱-۱۹-۲۶-۲۷-۳۱-۳۵-۱۷۲	۷
۱۷	الاسراء	۶۱ - ۷۰	۲
۱۸	الکہف	۵۰	۱
۱۹	مریم	۵۸	۱
۲۰	طٰہٰ	۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۲۰-۱۲۱	۵
۳۶	یٰس	۶۰	۱

قرآنِ عزیز میں انبیاء علیہم السلام کے تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ ابو البشر حضرت آدم (علیہ السلام) کا ہے اور حسبِ ذیل سورتوں میں بیان کیا گیا ہے:۔

سورۂ بقرہ، اعراف، اسراء، کہف اور طٰہٰ میں نام اور صفات دونوں کے ساتھ اور سورۂ حجر و ص میں فقط ذکرِ صفات کے ساتھ اور آلِ عمران، مائدہ، مریم اور یٰس میں صرف ضمنی طور پر نام لیا گیا ہے۔

یہ واقعہ اوپر کی تمام سورتوں اور آیتوں میں اگرچہ اسلوبِ بیان طرزِ ادا، اور لطیف تعبیر کے اعتبار سے مختلف نظر آتا ہے لیکن مقصد اور واقعہ کے اعتبار سے ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف تعبیرات میں موعظت وعبرت کے پیشِ نظر حسبِ موقعہ بیان کی گئی ہے۔

قرآنِ عزیز ان تاریخی واقعات کو محض اس لئے نہیں بیان کرتا کہ وہ واقعات ہیں جن کا ایک تاریخ میں درج ہونا ضروری ہے بلکہ اُس کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ وہ ان واقعات سے پیدا شدہ نتائج کو انسانی رشد وہدایت کے لئے موعظت وعبرت بنائے اور انسانی عقل وجذبات سے اپیل کرے کہ وہ نوامیس وقوانینِ فطرت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ان تاریخی نتائج سے سبق حاصل کریں اور ایمان لائیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور اس کا یدِ قدرت ہی اس تمام ہست وبود پر کارفرما ہے، اور اُسی مذہب کے احکام کی پیروی میں فلاح ونجات اور ہر قسم کی ترقی کا راز مضمر ہے جس کا نام مذہبِ فطرت یا اسلام ہے۔

قرآنِ عزیز کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ کو مختلف سورتوں میں اُن سورتوں کے مضامین کے مناسب نئے اور اچھوتے انداز میں بیان کرنے کے باوجود واقعہ کی اصل حقیقت اور اُس کی متانت وسنجیدگی میں ادنیٰ سا فرق بھی نہیں آنے دیتا، کہیں واقعہ کی تفصیل ہے، کہیں اجمال، کسی مقام پر اُس کا ایک پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے تو دوسرے مقام پر اُسی کو سب سے زیادہ نمایاں حقیقت دی گئی ہے، ایک جگہ اُسی واقعہ سے مسرت وانبساط اور لذت وسرور پیدا کرنے والے نتائج نکالے گئے ہیں تو دوسری جگہ واقعہ میں معمولی سا تغیر کئے بغیر خوف ودہشت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، بلکہ بعض مرتبہ ایک ہی مقام پر لذت والم دونوں کا مظاہرہ نظر آتا ہے، مگر موعظت وعبرت کے اس تمام ذخیرہ میں ناممکن ہے کہ نفسِ واقعہ کی حقیقت اور متانت میں معمولی سا بھی تغیر پیدا ہو جائے۔

بلاشبہ یہ کلامِ الٰہی کے ہی شایانِ شان ہے اور اعجازِ قرآن کے عنوان سے معنون

اور متضاد صفات کے حامل "حضرت انسان" کی فصاحت و بلاغت کے مدارج علیا کی دسترس سے باہر!

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ	کیا وہ قرآن کے متعلق غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟
مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ	اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کا کلام ہوتا تو بلا شبہ
اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (نساء)	وہ اس میں (قسم قسم کے) تضاد و اختلاف کو پاتے۔

پیدائشِ آدم، فرشتوں کو سجدہ کا حکم، شیطان کا انکار

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ آدم کو مٹی سے پیدا کیا، اور اُن کا خمیر تیار ہونے سے قبل ہی اُس نے فرشتوں کو یہ اطلاع دی کہ عنقریب وہ مٹی سے ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہے جو بشر کہلائے گی، اور زمین میں ہماری خلافت کا شرف حاصل کرے گی۔

آدم کا خمیر مٹی سے گوندھا گیا اور ایسی مٹی سے گوندھا گیا جو ہر نئی تبدیلی قبول کر لینے والی تھی، جب یہ مٹی پختہ ٹھکری کی طرح آواز دینے اور کھنکھنانے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اِس جسدِ خاکی میں رُوح پھونکی اور وہ یک بیک گوشت پوست، ہڈی، پٹھے کا زندہ انسان بن گیا اور ارادہ، شعور، حس، عقل اور وجدانی جذبات و کیفیات کا حامل نظر آنے لگا۔

تب فرشتوں کو حکم ہوا کہ تم اس کے سامنے سربسجود ہو جاؤ، فوراً تمام فرشتوں نے تعمیلِ ارشاد کی مگر ابلیس (شیطان) نے غرور و تمکنت کے ساتھ صاف انکار کر دیا۔

قرآنِ عزیز کی اِن آیات میں واقعہ کے اِسی حصّہ کو بیان کیا گیا ہے:-

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ	اور پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آدم
فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ	کے آگے سربسجود ہو جاؤ، وہ جھک گئے، مگر ابلیس کی گردن نہیں
وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ وَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ	جھکی، اس نے نہ مانا، اور گھمنڈ کیا، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ کافروں میں تھا
اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ	پھر (ایسا ہوا کہ) ہم نے آدم سے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی دونوں
وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ	جنت میں رہو، جس طرح چاہو، کھاؤ پیو، امن چین کی زندگی بسر کرو،

شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ	مگر دیکھو وہ جو ایک درخت ہے، تو کبھی اُس کے پاس نہ پھٹکنا، اگر تم
الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝	اس کے قریب گئے، تو (نتیجہ یہ نکلے گا کہ) حد سے تجاوز کر بیٹھو گے، اور
(بقرہ آیہ ۳۲-۳۳)	اُن لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں۔
وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ	اور (دیکھو یہ ہماری ہی کارفرمائی ہے کہ) ہم نے تمہیں پیدا کیا
ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا	(یعنی تمہارا وجود پیدا کیا) پھر تمہاری (یعنی نوعِ انسانی کی) شکل و
لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط	صورت بنا دی، پھر (وہ وقت آیا کہ) فرشتوں کو حکم دیا "آدم کے
لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝	آگے جھک جاؤ" اس پر سب جھک گئے، مگر ابلیس کہ جھکنے
(اعراف-آیہ ۱۱)	والوں میں سے نہ تھا۔
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ	اور بلا شبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اُٹھے ہوئے گارے
صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ	سے بنایا، جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے اور ہم "جن" کو اس سے پہلے جلتی
وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ	ہوئی ہوا کی گرمی سے پیدا کر چکے تھے، اور (اے پیغمبر) جب
نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ	ایسا ہوا تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا	"میں خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے،
مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ	ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں (یعنی نوعِ انسانی پیدا کرنے
مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ	والا ہوں) تو جب ایسا ہو کہ میں اُسے درست کر دوں (یعنی
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ	وہ وجود تکمیل کو پہنچ جائے) اور اس میں اپنی رُوح پھونک دوں
فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ فَسَجَدَ	تو چاہیے کہ تم سب اس کے آگے سربسجود ہو جاؤ" چنانچہ
الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ	جتنے فرشتے تھے سب اس کے آگے سربسجود ہو گئے۔
اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ	مگر ایک ابلیس، اُس نے انکار کیا کہ سجدہ کرنے والوں
مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ (حجر)	میں سے ہو۔
وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا	اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا "آدم کے

لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ — آگے جھک جاؤ اور سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ — تھا، وہ جن میں سے تھا۔ پس اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہوگیا

رَبِّهٖؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ — پھر کیا تم مجھے چھوڑ کر (کہ تمہارا پروردگار ہوں) اُسے اور اُس کی نسل

اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ — کو کارساز بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟

بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ (کہف آیۃ) — (دیکھو) ظلم کرنے والوں کے لئے کیا ہی بُری تبدیلی ہوئی!

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ — اور وہ وقت یاد کرو جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے

بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ — کہا۔ میں مٹی سے بشر کو پیدا کرنے والا ہوں۔ پس جب میں

وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ — اس کو بنا سنوار لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں،

سٰجِدِيْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ — تو سب فرشتے اس کے لئے سربسجود ہوجاؤ پس سب ہی نے

كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ — سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ مانا، گھمنڈ کیا اور وہ (علم الٰہی میں

اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ — پہلے ہی) کافروں میں سے تھا۔

سجدہ سے انکار کرنے پر ابلیس کا مناظرہ اللہ تعالیٰ اگرچہ عالم الغیب اور دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے اور ماضی، حال اور استقبال سب اس کے لئے یکساں ہیں مگر اس نے امتحان و آزمائش کے لئے ابلیس (شیطان) سے سوال کیا:۔

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (اعراف) کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟

ابلیس نے جواب دیا:۔

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ — اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے

وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ (اعراف ۱۲) — پیدا کیا اُسے مٹی سے۔

شیطان کا مقصد یہ تھا کہ میں آدمؑ سے افضل ہوں، اس لئے کہ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آگ بلندی و رفعت چاہتی ہے اور آدم مخلوقِ خاکی، بھلا خاک کو آگ سے کیا نسبت؟ اے خدا! پھر یہ تیرا حکم کہ ناری، خاکی کو سجدہ کرے کیا انصاف پر مبنی ہے؟

میں ہر حالت میں آدم سے بہتر ہوں، لہٰذا وہ مجھے سجدہ کرے نہ کہ میں اس کے سامنے سَر بسجود ہوں، مگر بدبخت شیطان اپنے غرور و تکبر میں یہ بھول گیا کہ جب تو اور آدم دونوں خدا کی مخلوق ہو، تو مخلوق کی حقیقت خالق سے بہتر خود وہ مخلوق بھی نہیں جان سکتی، وہ اپنی حکمت اور گھمنڈ میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ مرتبہ کی بلندی و پستی اُس مادہ کی بنا پر نہیں ہے جس سے کسی مخلوق کا خمیر تیار کیا گیا ہے بلکہ اُس کی اُن صفات پر ہے جو خالقِ کائنات نے اُس کے اندر ودیعت کی ہیں۔

بہرحال شیطان کا جواب چونکہ غرور و تکبر کی جہالت پر مبنی تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُس پر واضح کر دیا کہ جہالت سے پیدا شدہ کبر و نخوت نے تجھ کو اس قدر اندھا کر دیا ہے کہ تو اپنے خالق کے حقوق اور احترامِ خالقیت سے بھی منکر ہو گیا، اس لئے مجھ کو ظالم قرار دیا اور یہ نہ سمجھا کہ تیری جہالت نے تجھ کو حقیقت کے سمجھنے سے درماندہ و عاجز بنا دیا ہے پس تو اب اس سرکشی کی وجہ سے ابدی ہلاکت کا مستحق ہے اور یہی تیرے عمل کی قدرتی پاداش ہے

ابلیس کی طلب مہلت ابلیس نے جب دیکھا کہ خالقِ کائنات کے حکم کی خلاف ورزی، تکبر و رعونت اور خدائے تعالیٰ پر ظلم کے الزام نے ہمیشہ کے لئے مجھ کو رب العٰلمین کی آغوش رحمت سے مردود اور جنت سے محروم کر دیا، تو توبہ اور ندامت کی جگہ اللہ تعالیٰ سے یہ استدعا کی کہ تا قیامِ قیامت مجھ کو مہلت عطا کر اور اس طویل مدت کے لئے میری زندگی کی رسی کو دراز کر دے۔

حکمتِ الٰہی کا تقاضا بھی یہی تھا، لہٰذا اس کی درخواست منظور کر لی گئی، یہ سُن کر اب اُس نے پھر ایک مرتبہ اپنی شیطنت کا مظاہرہ کیا' کہنے لگا! جب تو نے مجھ کو راندۂ درگاہ کر ہی دیا تو جس آدم کی بدولت مجھے یہ رسوائی نصیب ہوئی میں بھی آدم کی اولاد کی راہ مارونگا اور اُن کے پس و پیش، اِرد گرد اور چہار جانب سے ہو کر اُن کو گمراہ کروں گا، اور اُنکی اکثریت کو تیرا ناسپاس اور ناشکر گذار بنا چھوڑوں گا، البتہ تیرے مخلص بندے "میرے اغوا

کے تیرے گھائل نہ ہوسکیں گے اور ہر طرح محفوظ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم کو اس کی کیا پرواہ، ہماری فطرت کا قانون "مکافاتِ عمل و پاداشِ عمل" اٹل قانون ہے، پس جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا اور جو بنی آدم مجھ سے رُوگردانی کرکے تیری پیروی کرے گا وہ تیرے ہی ساتھ عذابِ الٰہی (جہنم) کا سزاوار ہوگا جا اپنی ذلت و رسوائی اور شومئی قسمت کے ساتھ یہاں سے دور ہو اور اپنی اور اپنے پیرودں کی ابدی لعنت (جہنم) کا منتظر رہو۔

قرآنِ عزیز کی حسب ذیل آیات ان ہی تفصیلات پر روشنی ڈالتی ہیں:۔

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ط	کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟
قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ	کہا اِس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تُو نے مجھے آگ سے
نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۞ قَالَ	پیدا کیا اُسے مٹی سے" فرمایا "جنت سے نکل جا: تیری یہ ہستی
فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ	نہیں کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے۔ یہاں سے نکل دور ہو یقیناً
تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ	تو ان میں سے ہوا جو ذلیل و خوار ہیں"! ابلیس نے کہا "مجھے
الصّٰغِرِيْنَ ۞ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ	اُس وقت تک کے لئے مہلت دے جب لوگ (مرنے کے بعد
يُبْعَثُوْنَ ۞ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۞	اُٹھائے جائیں گے"۔ "تجھے مہلت ہے" اس پر ابلیس نے کہا
قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ	چونکہ تونے مجھ پر راہ بند کردی، تو اب میں بھی ایسا ضرور کرونگا
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۞ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ	تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لئے بنی آدم کی تاک میں
مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَ	بیٹھوں، پھر سامنے سے پیچھے سے، داہنے سے، بائیں سے
عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ط وَلَا	(غرضکہ ہر طرف سے) اُن پر آؤں اور تو اُن میں سے اکثر کو
تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۞ قَالَ	شکر گذار نہ پائے گا، خدا نے فرمایا "یہاں سے نکل جا،
اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ط	ذلیل اور ٹھکرایا ہوا، بنی آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کریگا
لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ	تو (وہ) تیرا ساتھی ہوگا۔ اور میں البتہ ایسا کروں گا (پاداش

مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (اعراف)

عمل میں تم سب سے جہنم بھردوں !

قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ
مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ لَمْ اَكُنْ
لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ
صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ قَالَ
فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ وَّ
اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝
قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝
قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ اِلٰى
يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝ قَالَ رَبِّ
بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي
الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝
اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝
قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۝
اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ
سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ
الْغٰوِيْنَ ۝ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ۝

(حجر)

اللہ نے فرمایا " اے ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنیوالوں میں شامل نہ ہوا؟" کہا "مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے بنایا ہے جو سُوکھ کر بجنے لگتا ہے" حکم ہوا "اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل جا، کہ تو راندہ ہوا اور جزا کے دن تک تجھ پر لعنت ہوئی" اس نے کہا " خدایا! مجھے اس دن تک مہلت دے جب انسان (دوبارہ) اُٹھائے جائیں گے" فرمایا "اُس مقررہ وقت کے دن تک تجھے مہلت دی گئی" اس نے کہا "خدایا! چونکہ تو نے مجھ پر (نجات و سعادت) کی راہ بند کر دی، تو اب میں ضرور ایسا کروں گا کہ زمین میں ان کے لیے جھوٹی خوشنمائیاں بنا دوں اور (راہِ حق سے) گمراہ کر دوں، ہاں اُن میں جو تیرے مخلص بندے ہوں گے (میں جانتا ہوں) میرے بہکانے میں آنیوالے نہیں" فرمایا "بس یہی سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے، جو میرے (مخلص) بندے ہیں اُن پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا۔ صرف اُنہی پر چلے گا جو (بندگی کی) راہ سے بھٹک گئے اور اُن سب کے لیے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہے (جو کبھی ٹلنے والا نہیں)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰۤئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ
فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا " آدم کے آگے جھک جاؤ" اس پر سب جھک گئے مگر ایک ابلیس نہ جھکا

لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝ قَالَ اَرَءَيْتَكَ	اُس نے کہا "کیا میں ایسی ہستی کے آگے جھکوں جسے تو نے مٹی
هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ لَئِنْ	سے بنایا ہے؟" نیز اُس نے کہا "کیا تیرا یہی فیصلہ ہوا کہ تو نے اس
اَخَّرْتَنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ	(حقیر) ہستی کو مجھ پر بڑائی دی؟" اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت
ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ قَالَ اذْهَبْ	دیدے تو میں ضرور اسکی نسل کی بیخ بنیاد اکھاڑ کے رہوں، تھوڑے
فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ	آدمی اس ہلاکت سے بچیں اور کوئی نہ بچے" اللہ نے فرمایا جا اپنی راہ
جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝ وَاسْتَفْزِزْ	لے، جو کوئی بھی ان میں سے تیرے پیچھے چلے گا، تو اس کیلئے اور
مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ	تیرے لئے جہنم کی سزا ہوگی پوری پوری سزا ان میں سے جس کسی
وَاَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَرَجِلِكَ	کو تو اپنی صدائیں سُنا کر بہکا سکتا ہے بہکانے کی کوشش کر لے اپنے
وَشَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ	لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر، ان کے مال اور اولاد
وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا	میں شریک ہو جا، اُن سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر،
غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ	اور شیطان کے وعدے تو اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ سر تا سر دھوکا،
عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰی بِرَبِّكَ	جو میرے (سچے) بندے ہیں اُن پر تو قابو پانے والا نہیں تیرا
وَكِیْلًا ۝ (اسراء)	پروردگار کارسازی کے لئے بس کرتا ہے۔
قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ	فرمایا اے ابلیس: کس چیز نے روک دیا تجھ کو کہ سجدہ کرے
لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ	اُس کو جس کو میں نے بنایا اپنے (قدرت کے) ہاتھوں سے، یہ
كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ ۝ قَالَ اَنَا خَیْرٌ	تو نے غرور کیا یا تو بڑا تھا درجہ میں، بولا میں بہتر ہوں اس سے
مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ	مجھ کو بنایا آگ سے اور اُس کو بنایا مٹی سے، فرمایا تو تو نکل
مِنْ طِیْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ	یہاں سے کہ تو مردود ہوا۔ اور تجھ پر میری پھٹکار ہے اُس
رَجِیْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَیْكَ لَعْنَتِیْۤ اِلٰی یَوْمِ	جزا کے دن تک، بولا، اے رب! مجھ کو ڈھیل دے جس
الدِّیْنِ ۝ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ	دن تک مُردے جی اُٹھیں۔ فرمایا تو تجھ کو ڈھیل ہے اُسی
یُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۝	وقت کے دن تک جو معلوم ہے۔ بولا تو قسم ہے تیری عزت

إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ○ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ○ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ○ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ○ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ○ (ص)

کہ میں گمراہ کروں گا اُن سب کو، مگر جو بندے ہیں تیرے اُن میں چنے ہوئے، فرمایا، تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں۔ مجھ کو بھرنا ہے دوزخ تجھ سے اور جو اُن میں تیری راہ چلیں اُن سب سے۔

خلافتِ آدم | اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں کو اطلاع دی کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں، جو اختیار و ارادہ کا مالک ہوگا، اور میری زمین پر جس قسم کا تصرف کرنا چاہے گا کر سکے گا، اور اپنی ضروریات کے لئے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکے گا، گویا وہ میری قدرت اور میرے تصرف و اختیار کا "مظہر" ہوگا۔

فرشتوں نے یہ سُنا تو حیرت میں رہ گئے، اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا اگر اس ہستی کی پیدائش کی حکمت یہ ہے کہ وہ دن رات تیری تسبیح و تہلیل میں مصروف رہے اور تیری تقدیس و بزرگی کے گُن گائے، تو اس کے لئے ہم حاضر ہیں، جو ہر لحہ تیری حمد و ثنا کرتے اور بے چون و چرا تیرا حکم بجا لاتے ہیں، ہم کو تو اس خاکی شے سے فتنہ و فساد کی بو آتی ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ تیری زمین میں خرابی اور خونریزی بپا کر دے؟ بارِ الٰہا! تیرا یہ فیصلہ آخر کس حکمت پر مبنی ہے؟

بارگاہِ الٰہی سے اوّل اُن کو یہ ادب سکھایا گیا کہ مخلوق کو خالق کے معاملات میں جلد بازی سے کام نہ لینا چاہئے، اور اس کی جانب سے حقیقتِ حال کے اظہار سے قبل ہی شک و شبہ کو سامنے نہ لانا چاہئے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اُس میں اپنی برتری اور بڑائی کا پہلو نکلتا ہو، خالقِ کائنات اُن حقائق کو جانتا ہے جس سے تم بے بہرہ ہو، اور اُس کے علم میں وہ سب کچھ ہے جو تم نہیں جانتے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ	اور جب ایسا ہوا تھا کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے
جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ	کہا تھا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، فرشتوں
قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ	نے کہا: کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جارہا ہے جو زمین میں خرابی
فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ	پھیلائے گی اور خونریزی کرے گی، حالانکہ ہم تیری حمد و ثنا
نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ	کرتے ہوئے تیری پاکی وقدوسی کا اقرار کرتے ہیں (کہ تیری
قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝	مشیت برائی سے پاک اور تیرا کام نقصان سے منزہ ہے!)
(بقرہ ۴)	اللہ نے کہا، میری نظر جس حقیقت پر ہے، تمہیں اُس کی خبر نہیں،

تعلیم آدمؑ اور فرشتوں کا اقرارِ عجز

یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ اس مقام پر فرشتوں کا سوال اس لئے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مناظرہ یا اس کے فیصلہ کے متعلق موشگافی کریں بلکہ وہ آدم کی تخلیق کا سبب معلوم کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ اس کے خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے ان کی خواہش تھی کہ اس حکمت کا راز اُن پر بھی کھل جائے، اس لئے ان کے طرزِ ادا اور تعبیر مقصد میں کوتاہی پر تنبیہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ اُن کے اس سوال کا جواب جو بظاہر حضرت آدمؑ کی تحقیر پر مبنی ہے عمل و فعل کے ذریعہ اس طرح دیا جائے کہ ان کو خود بخود آدم کی برتری اور حکمتِ الٰہی کی بلندی و وسعت کا نہ صرف اعتراف کرنا پڑے بلکہ اپنی درماندگی اور عجز کا بھی بدیہی طور پر مشاہدہ ہو جائے، لہٰذا حضرت آدمؑ کو اپنی سب سے عظیم المرتبت صفت "علم" سے نوازا اور اُن کو علمِ اشیاء عطا فرمایا۔ اور پھر فرشتوں کے سامنے پیش کرکے ارشاد فرمایا کہ تم ان اشیاء کے متعلق کیا علم رکھتے ہو؟ وہ لاعلم تھے کیا جواب دیتے۔ مگر چونکہ بارگاہِ صمدیت سے قرب رکھتے تھے سمجھ گئے کہ ہمارا امتحان مقصود نہیں ہے کیونکہ اس سے قبل ہم کو ان کا علم ہی کب دیا گیا ہے کہ آزمائش کی جاتی بلکہ یہ تنبیہ مقصود ہے کہ "خلافتِ الٰہیہ" کا مدار کثرتِ تسبیح و تہلیل اور تقدیس و تمجید پر نہیں بلکہ صفتِ "علم" پر ہے، اس لئے کہ ارادہ و اختیار، قدرتِ تصرف اور قدرتِ اختیار یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ حکومتِ ارضی

صفتِ علم کے بغیر ناممکن ہے، پس جبکہ آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ علم کا مظہرِ اتم بنایا ہے تو بلاشبہ وہی خلافتِ ارضی کا مستحق ہے نہ کہ ہم، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ملائکۃ اللہ چونکہ اپنی خدماتِ مفوضہ کے علاوہ ہر قسم کی دُنیوی خواہشوں اور ضرورتوں سے بے نیاز ہیں، اس لئے وہ اُن کے علم سے بھی ناآشنا تھے اور آدمؑ کو چونکہ ان سب سے واسطہ پڑنا تھا اس لئے اُن کا علم اس کے لئے ایک فطری امر تھا جو ربّ العٰلمین کی ربوبیتِ کاملہ کی بخشش و عطا سے عطا ہوا اور اُس کو وہ سب کچھ بتا دیا گیا جو اس کے لئے ضروری تھا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ (بقرہ)

(پھر جب ایسا ہوا کہ مشیتِ الٰہی نے جو کچھ چاہا تھا، ظہور میں آگیا) اور آدمؑ نے (یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیمِ الٰہی سے تمام چیزوں کے تمام علوم کر لئے، تو فرشتوں کے سامنے وہ (تمام حقائق) پیش کر دئیے اور فرمایا، اگر تم (اپنے شبہ میں) درستی پر ہو تو بتلاؤ، ان (حقائق) کے نام کیا ہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا: خدایا ساری پاکیاں اور بڑائیاں تیرے ہی لئے ہیں ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھلا دیا ہے، علم تیرا علم ہے اور حکمت تیری حکمت! جب فرشتوں نے اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کر لیا تو حکمِ الٰہی ہوا اے آدمؑ تم (اب) فرشتوں کو اُن (حقائق) کے نام بتلا دو۔ جب آدمؑ نے بتلا دئیے تو اللہ نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کے تمام غیب مجھ پر روشن ہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی مجھ سے مخفی نہیں!

حضرت آدمؑ کے اِس شرفِ علم کے متعلق مفسرین کی دو رائے ہیں ایک یہ کہ کائنات کی وہ تمام اشیاء جو ماضی سے مستقبل تک وجود میں آنے والی تھیں اُن سب کے نام اور ان کی حقیقت کا علم حضرت آدم علیہ السلام کو دے دیا گیا، دوسری رائے یہ ہے کہ اُس

وقت جس قدر اشیا بھی عالمِ کائنات میں موجود تھیں اور حضرت آدم کے سامنے ان کا مظاہرہ کیا گیا تھا اُن سب کا علم عطا کیا گیا، اور اَلْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (تمام چیزوں کے نام) کا اطلاق جس طرح کائنات کی ماضی و مستقبل کی تمام اشیاء پر ہوتا ہے اسی طرح اُس وقت کی تمام موجودہ اشیاء پر بھی بغیر کسی تاویل کے ہوسکتا ہے، اور یہ کہ " اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ " سے اکثر موجود و محسوس یعنی حاضر ہی کی جانب اشارہ مقصود ہوا کرتا ہے۔ اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اشیاء کی تمام جزئیات و تفصیلات کا علم بخشا گیا تھا بلکہ اشیاء کی بنیاد و نہاد اور اصول و اساس کا علم عطا کیا گیا تب بھی " الاسماء کلھا " کے منافی نہیں ہے۔

بہرحال حضرت آدمؑ کو صفتِ " علم " سے اس طرح نوازا گیا کہ فرشتوں کے لئے بھی اُن کی برتری اور استحقاقِ خلافت کے اقرار کے علاوہ چارۂ کار نہ رہا، اور یہ ماننا پڑا کہ اگر ہم زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ بنائے جاتے تو کائنات کے تمام بھیدوں سے ناآشنا رہتے اور قدرت نے جو خواص اور علوم ودیعت کئے ہیں اُن سے یکسر ناواقف ہوتے اس لئے کہ نہ ہم خورد و نوش کے محتاج ہیں کہ زمین میں ودیعت شدہ رزق اور خزانوں کی جستجو کرتے نہ ہمیں غرق کا اندیشہ کہ کشتیوں اور جہازوں کی ایجاد کرتے، نہ مرض کا خوف کہ قسم قسم کے معالجاتِ اشیاء کے خواص، کیمیائی مرکبات، فوائد طبیعات و فلکیات، طبی ایجادات علوم نفسیات و وجدانیات اور اسی طرح کے بیش بہا اور بیشمار علوم و فنون کے اسرار اور اُن کی حکمتوں سے واقف ہوسکتے، بلاشبہ یہ صرف حضرتِ انسان ہی کے لئے موزوں تھا کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ بنے اور ان تمام حقائق و معارف اور علوم و فنون سے واقف ہو کر نیابتِ الٰہی کا صحیح حق ادا کرے۔

حضرت آدم کا قیامِ جنت اور حوّاء کی زوجیت

حضرت آدمؑ ایک عرصہ تک تنہا زندگی بسر کرتے رہے مگر اپنی زندگی اور راحت و سکون میں ایک وحشت اور خلاء محسوس کرتے تھے اور اُن کی طبیعت اور فطرت کسی مونس و ہمدم کی جویا نظر آتی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ

نے حضرت حوّاء کو پیدا کیا اور حضرت آدم اپنا ہمدم و رفیق پاکر بیحد مسرور ہوئے اور اطمینانِ قلب محسوس کیا۔ حضرت آدم و حوّاء کو اجازت تھی کہ وہ جنّت میں رہیں سہیں اور اُس کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائیں، مگر ایک درخت کو معیّن کر کے بتایا گیا کہ اس کو نہ کھائیں بلکہ اُس کے پاس تک نہ جائیں۔

آدم کا خلد سے نکلنا

اب ابلیس کو ایک موقع ہاتھ آیا اور اُس نے حضرت آدم و حوّا کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ شجر "شجرِ خلد" ہے، اس کا پھل کھانا جنّت میں سرمدی آرام و سکونت اور قربِ الٰہی کا ضامن ہے اور قسمیں کھا کر اُن کو باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، دشمن نہیں ہوں یہ سُن کر حضرت آدمؑ کے انسانی اور بشری خواص میں سب سے پہلے نسیان (بھول چوک) نے ظہور کیا اور وہ یہ فراموش کر بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم، حکمِ امتناعی تھا نہ کہ مربیانہ مشورہ، اور آخر کار جنّت کے دائمی قیام اور قربتِ الٰہی کے عزم میں لغزش پیدا کردی اور انھوں نے اُس درخت کا پھل کھا لیا، اُس کا کھانا تھا کہ بشری لوازم اُبھرنے لگے، دیکھا تو ننگے ہیں اور لباس سے محروم، جلد جلد (آدم و حوّا) دونوں پتّوں سے ستر ڈھانکنے لگے گویا انسانی تمدن کا یہ آغاز تھا، کہ اُس نے تن ڈھانکنے کے لئے سب سے پہلے پتّوں کو استعمال کیا۔

اِدھر یہ ہو رہا تھا کہ خدائے تعالیٰ کا عتاب نازل ہوا اور آدم سے بازپرس ہوئی کہ ممانعت کے باوجود یہ عدول حکمی کیسی؟ آدم آخر آدم تھے، مقبولِ بارگاہِ الٰہی تھے، اسلئے شیطان کی طرح مناظرہ نہیں کیا اور اپنی غلطی کو تاویلات کے پردے میں چھپانے کی سعیِ نامشکور سے باز رہے ندامت و شرمساری کے ساتھ اقرار کیا کہ غلطی ضرور ہوئی لیکن اس کا سبب تمرد و سرکشی نہیں ہے بلکہ بربنائے بشریت بھول چوک اس کا باعث ہے تاہم غلطی ہے، اس لئے توبہ و استغفار کرتے ہوئے عفو و درگذر کا خواستگار ہوں۔

حضرت حق نے اُن کے اس عذر کو قبول فرمالیا اور معاف کردیا، مگر وقت آگیا تھا کہ

حضرت آدمؑ خدا کی زمین پر "حقِ خلافت" ادا کریں، اس لئے بہ تقاضائے حکمت ساتھ ہی یہ فیصلہ سُنایا کہ تم کو اور تمہاری اولاد کو ایک معین وقت تک زمین پر قیام کرنا ہوگا، اور تمہارا دشمن ابلیس بھی اپنے تمام سامانِ عداوت کے ساتھ وہاں موجود رہے گا اور تم کو اس طرح ملکوتی اور طاغوتی دو متضاد طاقتوں کے درمیان زندگی بسر کرنی ہوگی اس کے باوجود اگر تم اور تمہاری اولاد مخلص بندے اور سچے نائب ثابت ہوئے تو تمہارا اصلی وطن "جنّت" ہمیشہ کے لئے تمہاری ملکیت میں دے دیا جائے گا، لہٰذا تم اور حوّا دونوں یہاں سے جاؤ اور میری زمین پر جا کر بسو اور اپنی مقررہ زندگی تک حقِ عبودیت ادا کرتے رہو۔

اور اس طرح انسانوں کے باپ اور خدائے تعالیٰ کے خلیفہ آدمؑ نے اپنی رفیقۂ حیات حوّا کے ساتھ خدا کی زمین پر قدم رکھا۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ
اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ
وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ
شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ
الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا
الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا
مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج
وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ
وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ فَتَلَقّٰٓى
اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ

پھر (ایسا ہوا کہ) ہم نے آدمؑ سے کہا، اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، جس طرح چاہو کھاؤ پیو، امن چین کی زندگی بسر کرو، مگر دیکھو، وہ جو ایک درخت ہے، تو کبھی اُس کے پاس نہ پھٹکنا، اگر تم اس کے پاس گئے تو (نتیجہ یہ نکلے گا کہ) حد سے تجاوز کر بیٹھو گے اور اُن لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں پھر ایسا ہوا کہ) شیطان کی وسوسہ اندازی نے اُن دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جیسی کچھ (راحت و سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے اس سے نکلنا پڑا، خدا کا حکم ہوا کہ یہاں سے نکل جاؤ تم میں سے ہر وجود دوسرے کا دشمن ہے، اب تمہیں (جنت کی جگہ) زمین میں رہنا ہے، اور ایک خاص وقت تک کیلئے (جو علم الٰہی میں مقرر ہو چکا ہے) اس سے فائدہ اٹھانا ہے پھر ایسا ہوا کہ آدم نے اپنے پروردگار کے القاء سے چند کلمات معلوم کر لئے (جن کیلئے اس کے حضور قبولیت تھی) پس اللہ

فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوْا
مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا
يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى
فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ
فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

(بقرہ ۵)

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ
الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا
وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ
لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ
سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا
عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا
مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝
وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝
فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ
بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا
يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ
الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ

نے اس کی توبہ قبول کرلی اور بلاشبہ وہی ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والا ہے۔ اور اس کے درگزر کی کوئی انتہا نہیں (آدم کی توبہ قبول ہوگئی لیکن جس زندگی سے وہ نکل چکا تھا وہ دوبارہ نہیں مل سکتی تھی، پس ہمارا حکم ہوا، اب تم سب یہاں سے نکل جاؤ (اور جس نئی زندگی کا دروازہ تم پر کھولا جارہا ہے اسے اختیار کرلو) لیکن (یاد رکھو) جب کبھی ایسا ہوگا کہ ہماری جانب سے تم پر راہِ (حق) کھولی جائے گی، تو تمہارے لئے دو ہی راہیں ہوں گی، جو کوئی ہدایت کی پیروی کرے گا اس کے لئے (کامیابی و سعادت ہوگی) کسی طرح کا کھٹکا نہیں، کسی طرح کی غمگینی نہیں۔

اے آدم! تو اور تیری بیوی، دونوں جنت میں رہو سہو اور جس جگہ سے جو چیز پسند آئے شوق سے کھاؤ۔ مگر دیکھو (وہ جو ایک درخت ہے) تو اس درخت کے قریب بھی نہ جانا۔ اگر گئے تو یاد رکھو تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہوجاؤ گے لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ اُن کے ستر جو اُن سے چھپے تھے ان پر کھول دے۔ اُس نے کہا تمہارے پروردگار نے اس درخت سے جو تمہیں روکا ہے، تو صرف اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ تم فرشتے بن جاؤ، یا دائمی زندگی تمہیں حاصل ہوجائے۔ اس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ میں تم دونوں کو خیرخواہی سے نیک بات بتانے والا ہوں۔ غرضکہ (شیطان اس طرح کی باتیں سنا سنا کر بالآخر) انہیں فریب میں لے آیا۔ پھر جوں ہی ایسا ہوا کہ انھوں نے درخت کا پھل چکھا۔ اُن کے ستر اُن پر کھل گئے۔ اور جب انہیں اپنی برہنگی دیکھ کر شرم محسوس ہوئی) باغ کے پتے اوپر تلے رکھ کر اپنے

أَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ
وَأَقُلْ لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا
عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا
أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ
تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝
قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ
عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ
وَّمَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ ۝ قَالَ فِيْهَا
تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا
تُخْرَجُوْنَ ۔ (اعراف)

جسم پر چپکانے لگے، اُس وقت اُن کے پروردگار نے پکارا:۔
"کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روک دیا تھا، اور کیا میں
نے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟" انھوں نے
عرض کیا "پروردگار! ہم نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا، اگر
تو نے ہمارا قصور نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا، تو ہمارے لئے
بربادی کے سوا کچھ نہیں! فرمایا "یہاں سے نکل جاؤ، تم ایک
دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے
اور یہ کہ ایک خاص وقت تک وہاں سروسامانِ زندگی سے
فائدہ اٹھاؤ گے۔ اور فرمایا! تم اسی میں جیو گے اسی میں مرو گے
پھر اسی سے (مرنے کے بعد) نکالے جاؤ گے۔"

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلٰى اٰدَمَ مِنْ
قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝
وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا
لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا إِلَّا إِبْلِيْسَ أَبٰى ۝
فَقُلْنَا يٰاٰدَمُ إِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ
لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا
مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ إِنَّ لَكَ أَلَّا
تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَأَنَّكَ
لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝
فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ
قَالَ يٰاٰدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلٰى

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے آدم کو پہلے سے جتا کر عہد لے لیا تھا
پھر وہ بھول گیا، اور ہم نے (نافرمانی کا) قصد اس میں نہیں
پایا تھا اور پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا "آدم کے آگے
جھک جاؤ" سب جھک گئے تھے مگر ابلیس نہیں جھکا، اس نے
انکار کیا اس پر ہم نے کہا اے آدم (دیکھ لے) یہ (ابلیس) تیرا
اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو یہ تمہیں جنت سے نکال کے
رہے اور تم محنت میں پڑ جاؤ۔ تمہارے لئے اب ایسی زندگی ہے
کہ نہ تو اس میں بھوکے رہتے ہو نہ برہنہ، نہ تمہارے لئے پیاس
کی جلن ہے نہ سورج کی تپش (اگر اس سے نکلے تو سرتا سر محنت
میں مبتلا ہو جاؤ گے) لیکن پھر شیطان نے آدم کو وسوسہ میں ڈالا
اس نے کہا "اے آدم! میں تجھے ہمیشگی کے جنت کا نشان

شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ٥	دے دوں؟ اور ایسی بادشاہی جو کبھی زائل نہ ہو؟ چنانچہ دونوں
فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا	نے (یعنی آدم اور اس کی بیوی نے) اس درخت کا پھل کھا لیا،
سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ	اور دونوں کے ستر اُن پر کھل گئے تب اُن کی حالت ایسی ہوگئی کہ
عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ	باغ کے پتے توڑنے لگے اور ان سے اپنا جسم ڈھانکنے لگے غرضکہ
وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ	آدم اپنے پروردگار کے کہنے پر نہ چلا پس وہ (جنت کی زندگی
فَغَوٰى ٥ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ	سے) بے راہ ہوگیا۔ (لیکن) پھر اُس کے پروردگار نے اُسے برگزیدہ
فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى	کیا۔ اس پر (اپنی رحمتوں سے) لوٹ آیا۔ اس پر (زندگی و عمل کی) راہ
قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا	کھول دی، چنانچہ اللہ نے حکم دیا تھا تم دونوں اکٹھے یہاں سے نکل چلو
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ	تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوا (اب تم پر ایک دوسری زندگی
فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ	کی راہ کھلے گی) پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس (یعنی تمہاری نسل کے پاس)
هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ	کوئی پیام ہدایت آیا تو (اس بارے میں میرا قانون یاد رکھو) جو کوئی میری
فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ٥ (طٰہٰ)	ہدایت پر چلے گا، وہ نہ تو راہ سے بے راہ ہوگا نہ دکھ میں پڑے گا۔

واقعہ سے متعلق چند اہم مسائل

واقعہ کی اس تفصیل کے بعد چند ایسے اہم مسائل پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے جو واقعہ کی تفصیلات میں بڑی حد تک معین و مددگار ثابت ہوں،

تخلیقِ آدمؑ

(۱) یہ مسئلہ بھی لائقِ فکر و نظر ہے کہ انسانِ اوّل حضرت آدمؑ کی پیدائش کب ہوئی، کیا کائناتِ ارض و سماوی کے ساتھ ساتھ یا غیر معین مدت کے بعد اس کی ہستی عالمِ وجود میں آئی، ؟

علماءِ یہود و نصاریٰ اور بعض علماءِ اسلام کا قول ہے کہ حق تعالیٰ نے تخلیق و تکوینِ کائنات کے بارہ جو سِتَّةِ اَيَّامٍ (چھ دن) کی تعبیر اختیار فرمائی ہے اُن ہی ایام میں سے ایک دن حضرت آدم (علیہ السلام) نے بھی لباسِ وجود پہنا اور وہ جمعہ کا دن ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار خدا ہی ہے

فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی　　جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا

عَلَی الْعَرْشِ　　(اعراف)　　پھر عرش پر چھا گیا!

لیکن یہ مسلک درست نہیں ہے نہ علمی وتاریخی اعتبار سے اور نہ دینی ومذہبی روایات کے لحاظ سے، یہود ونصاریٰ کے متعلق تو معلوم نہیں کہ انھوں نے کس بنیاد پر یہ کہا، اور اس کے لئے اُن کے پاس کیا دلیل ہے مگر علامہ دمشکی سے ضرور یہ تعجب ہے کہ انھوں نے اس بے دلیل بات کو کس طرح قبول فرمایا اور یہ مسلک کیوں اختیار کیا۔

کافی غور وفکر کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ سبکیؒ کو یہ مغالطہ غالباً صحیح مسلم کی اس حدیث سے ہوا ہے جو فضائلِ جمعہ میں مذکور ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کی پیدائش جمعہ کے دن ہوئی ہے۔

اس روایت میں صرف اسی قدر مذکور ہے مگر سبکیؒ نے اپنی جانب سے یہ اضافہ کر لیا کہ یہ جمعہ "ستۃ ایام" میں شامل جمعہ کا دن ہے اور یہی مغالطہ ہے۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے متعدد جگہ خلقِ کائنات کا ذکر کیا ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی خلقِ آدم (علیہ السلام) کا ذکر نہیں کیا ـــ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ارض وسماوات سے زیادہ حضرت آدم کا ذکر ضروری تھا جو قرآن ہی کی زبان میں اشرف المخلوقات، اور "خلیفۃ اللہ فی الارض" ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر اہم شخصیت کو "ستۃ ایام" ہی میں سے کسی دن (یوم) وجود بخشا جائے اور اُس کا ذکر تک نہ کیا جائے کیونکہ ان آیات میں صرف دو ہی باتیں ذکر کی گئی ہیں ایک ارض وسماوات کی پیدائش کا معاملہ اور دوسرا "استواء علی العرش" کا، مگر حضرت آدم کی ولادت سے متعلق صراحت تو کجا اشارہ تک موجود نہیں ہے، پھر مستزاد یہ کہ قرآن عزیز نے جس جس موقعہ پر حضرت آدم کا ذکر کسی بھی نہج سے کیا ہے ان میں سے کسی ایک مقام پر بھی یوم پیدائش کا ذکر نہیں ہے تب بات واضح ہے کہ اصل حقیقت یہی ہے کہ خلقِ سماوات وارض سے ہزاروں لاکھوں بلکہ غیر معین مدت کے بعد جس کا

سلہ حیوۃ الحیوان

علم صرف عالم الغیب والشہادہ ہی کو ہے) حضرت آدمؑ کو کسی جمعہ میں خلعتِ وجود عطا کیا گیا اور "ستۃ ایام" کے جمعہ کے دن کسی کی بھی تخلیق و تکوین نہیں ہوئی بلکہ "استواء علی العرش"[1] کا مظاہرہ ہوا اور اس لئے جمعہ کا دن جشن یا تعطیل کا دن قرار پایا۔

(۲) آدم و حوا عربی نام ہیں یا عجمی؟ اور یہ نام کسی مناسبت سے رکھے گئے ہیں یا صرف نام ہی کی حیثیت میں ہیں۔؟

پہلے سوال کے متعلق مشہور محدث حافظ ابن حجرؒ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ "سریانی" نام ہے اور بائبل میں الف کے مد اور دال کے طول کے ساتھ پڑھا جاتا ہے یعنی آدام، اور علامہ جوہریؒ اور جوالیقیؒ یہ کہتے ہیں کہ یہ عربی نام ہیں، اور دوسرے سوال کے متعلق ثعلبی کا قول ہے کہ عبرانی زبان میں آدام مٹی کو کہتے ہیں، چونکہ ان کی تخلیق مٹی سے ہوئی، اس لئے آدم یا آدام نام رکھا گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ اُدمۃ سے ماخوذ ہے اس لئے کہ وہ ادیم الارض "یعنی صفحۂ زمین سے پیدا کئے گئے ہیں" اور بعض علماء کہتے ہیں کہ اُدمت بمعنی خلطت سے ماخوذ ہے اور چونکہ اُن کا خمیر پانی اور مٹی کو ملا کر اور خلط ملط کر کے بنایا گیا ہے اس لئے اس مناسبت سے ان کو آدم کہا گیا۔ اسی طرح حوا اسلئے نام پڑا کہ وہ ہر "انسانِ حی" (زندہ انسان) کی ماں ہیں اور مبالغہ کا صیغہ بنا کر انکا نام رکھدیا گیا۔

بہر حال نام اور معنی میں مناسبت کا یہ سوال نکتہ اور لطیفہ کی حیثیت رکھتا ہے، اسلئے بیان کردہ تمام وجوہ بیک وقت بھی صحیح ہو سکتی ہیں اور کسی ایک وجہ کو دوسری پر ترجیح بھی دی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ باب بہت وسیع ہے۔[2]

(۳) اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا جو حکم دیا تھا وہ فرشتوں کو دیا تھا اور ابلیس فرشتوں کی جنس میں داخل نہیں تو پھر اُس پر عتابِ الٰہی کیوں ہوا اور وہ نافرمانی کا مرتکب کس لئے

---

[1] استواء علی العرش اور ستۃ ایام کی تعبیر کے لئے قصص القرآن کی دوسری جلد ملاحظہ فرمائیں۔
[2] فتح الباری ج ۶ کتاب حدیث الانبیاء چونکہ یہ تمام اقوال تخمینی ہیں اس لئے سب کو نقل کر دیا گیا اور کسی ایک قول کو ترجیح دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ابلیس ملائکہ کی جنس سے نہ تھا۔ قرآن عزیز میں تصریح ہے۔

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ — وہ جن سے تھا پس اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی

مگر جب اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا حکم فرمایا تو اُس وقت وہ اس مجلس میں موجود تھا اور غیر معلوم مدت تک فرشتوں کے ساتھ تسبیح و تہلیل میں مشغول رہنے کی وجہ سے وہ بھی اس حکم کا مخاطب تھا اور وہ بھی خود کو مخاطب سمجھتا تھا اسی لئے جب خدائے تعالیٰ نے اس سے دریافت کیا تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا۔ تو اُس نے یہ جواب نہیں دیا کہ میں فرشتہ نہیں ہوں اس لئے اس حکم کا مخاطب ہی نہ تھا کہ سجدہ کرتا بلکہ ازراہِ غرور کہا تو یہ کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں اس لئے سجدہ سے باز رہا۔

یہی جواب صحیح اور درست ہے۔ ورنہ تو ایک ضعیف اور کمزور رائے یہ بھی ہے کہ ملائکۃ اللہ میں سے ایک قسم کو "جن" بھی کہا جاتا ہے اور یہ اُنہیں میں سے ایک تھا۔ مگر اس رائے کی تائید نہ قرآن عزیز سے ملتی ہے اور نہ صحیح احادیث سے!

(۴) ابلیس جب جنت سے مردود ہو کر نکال دیا گیا تو پھر وہ حضرت آدم و حواء (علیہما السلام) کو کس طرح بہکا سکا؟

علماءِ اسلام سے اس کے دو جواب منقول ہیں اور دونوں کسی تاویل کے بغیر چسپاں ہیں:۔ (۱) اگرچہ ابلیس جنت سے نکال دیا گیا لیکن پھر بھی اس کا ایک گنہگار اور نابکار مخلوق کی حیثیت میں جنت کے اندر داخل ہونا اس کے مردود ہونے کے منافی نہیں ہے۔ اس لئے اُس نے اسی حیثیت سے اندر جا کر حضرت آدمؑ و حواؑ سے یہ گفتگو کی اور ان کو لغزش میں ڈال دیا آیت "اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا" اسی کی تائید کرتی ہے کہ عاصی کی حیثیت سے ابھی تک اس کا داخلہ ممنوع نہیں تھا۔

(۵) جس طرح ایک آواز ٹیلیفون اور ریڈیو کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دُور جا سکتی ہے

یا جس طرح لاسلکی (وائرلیس) میں صرف شعاعوں اور آواز کی لہروں کے ذریعہ سے ایک پیغام ہزاروں میل پہنچایا جا سکتا ہے اسی طرح یہ بھی کیوں ممکن نہیں کہ قربت یا بالمشافہہ مخاطبت کے بغیر ہی شیطان کا وسوسہ نفسِ انسانی تک پہنچ جائے اور اس پر اثر انداز ہو تب واقعہ کی صورت یہ ہوئی کہ شیطان نے جنّت سے باہر ہی رہ کر حضرت آدمؑ اور حضرت حوّاؑ کے قلوب میں یہ وسوسہ ڈالا اور اُن کو بہکانے کی کوشش کی، آیت "فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ" سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

(۶) حوّاؑ کی پیدائش کس طرح ہوئی؟ قرآنِ عزیز میں اس کے متعلق صرف اسی قدر مذکور ہے:-

وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا اور اس (نفس) سے اس جوڑے کو پیدا کیا۔

یہ نظمِ قرانی حوّاؑ کی پیدائش کی حقیقت کی تفصیل نہیں بتاتی، اس لئے دونوں احتمال ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حوّاؑ حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہوئی ہوں جیسا کہ مشہور ہے اور بائبل میں بھی اسی طرح مذکور ہے، دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کو اس طرح پیدا کیا کہ مرد کے ساتھ اسی کی جنس سے ایک دوسری مخلوق بھی بنائی جس کو عورت کہا جاتا ہے اور جو مرد کی رفیقۂ حیات بنتی ہے۔

آیت کی تفسیر میں محققین کی رائے اس دوسری تفسیر کی جانب مائل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ عزیز صرف حضرت حوّاؑ کی تخلیق کا ذکر نہیں کر رہا ہے بلکہ عورت کی تخلیق کے متعلق "اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ بھی مرد ہی کی جنس سے ہے اور اسی طرح مخلوق ہوئی ہے، البتہ بخاری ومسلم کی روایتوں میں یہ ضرور آتا ہے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:-

استوصوا بالنساء فان المرأة خلقت من ضلع (الحدیث) عورتوں کے ساتھ نرمی اور خیر خواہی سے پیش آؤ اس لئے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔

اس کا مطلب ابن اسحٰق نے تو یہ بیان کیا ہے کہ حوّاؑ آدمؑ کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں، مگر ابن اسحٰق سے زیادہ محقق اور نقاد علامہ قرطبیؒ نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ دراصل عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ عورت کی خلقت کی ابتدا پسلی سے کی گئی ہے اس کا حال پسلی ہی کی طرح ہے، اگر اس کی کجی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی تو جس طرح پسلی کے ترچھے پن کے باوجود اس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کے خم کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اسی طرح عورتوں کے ساتھ نرمی اور رِفق کا معاملہ کرنا چاہیئے۔ ورنہ سختی کے برتاؤ سے خوشگواری کی جگہ تعلق کی شکست وریخت کی صورت پیدا ہوجائے گی۔[1]

(۶) حضرت آدم (علیہ السلام) جس جنت میں مقیم تھے اور جہاں سے انھیں زمین پر اُترنے کا حکم دیا گیا وہ جنت کون سی جنت ہے "جنت الماویٰ"؟ جو بعد قیامِ قیامت اہلِ ایمان کا مستقر ہے یا "جنتِ ارضی" جو اسی سرزمین میں کسی بلند پُر فضا مقام پر آدمؑ کی حکومت کے لیے بنائی گئی تھی، جمہور علماءِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ یہ "جنت الماوی" ہے جس کا وعدہ آخرت میں مسلمانوں کے لئے کیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ آیات واحادیث کا ظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً

۱- قُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ۔ — ہم نے کہا اے آدمؑ تم اور تمہاری بیوی (حوّاؑ) جنت میں رہو۔

اِس جگہ جنت کو عربی قاعدہ سے "الجنۃ" الف لام کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اُسی مشہور جنت کا ذکر ہے جس کو جگہ جگہ قرآنِ عزیز میں قیامِ قیامت کے بعد مومنوں کا وطن بتایا گیا ہے ورنہ اگر کسی نئے مقام کا تذکرہ ہوتا تو پہلے اس کی حقیقت کا اظہار ہوتا پھر اس کو جانی پہچانی چیز کی طرح اِن الفاظ کے ساتھ ذکر کیا جاتا۔

۲- اِهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا — تم وہاں سے ایک ساتھ اترو۔

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۲۸۳۔

ہبوط: (اُترنا) بلندی سے پستی کی طرف ہوتا ہے، اس لئے یہ جنّتِ ارضی نہیں ہوسکتی بلکہ "جنتہ ماوٰی" ہی ہوسکتی ہے۔

۳۔ مسلم میں ایک طویل حدیث ہے۔ جس میں یہ جملہ موجود ہے۔

یجمع اللہ الناس فیقوم	اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کرے گا، پس اہلِ ایمان
المؤمنون حین تزدلف لھم	کھڑے ہوں گے جب جنت ان کے قریب ہوگی۔
الجنۃ فیأتون آدم فیقولون	پھر وہ آدم کے پاس آئیں گے اور کہیں گے' اے
یاأبانا استفتح لنا الجنۃ	ہمارے باپ ہمارے لئے اس جنت کو کھولئے؛
فیقول: وھل اخرجکم من	اس پر حضرت آدمؑ فرمائیں گے کیا تم کو جنت سے
الجنۃ الاخطیئۃ ابیکم (الحدیث)	تمہارے باپ کی خطا کاری ہی نے نہیں نکالا تھا۔

اس کے برعکس علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ "جنت" دنیا ہی کے مقامات میں سے کسی مقام پر تھی "جنۃ الماوٰی" نہ تھی، اور اپنے قول کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ و حوّاءؑ کو وہاں کھانے پینے کا مکلّف بنایا اور ایک درخت کے نہ کھانے کی تکلیف دی، پھر وہاں آدمؑ خواب راحت میں بھی رہتے تھے اور وہاں ابلیس بھی آتا جاتا رہتا تھا، اور اُس نے حضرت آدمؑ کو بہکا بھی دیا۔ اور پھر آدمؑ و حوّاءؑ اور ابلیس وہاں سے نکالے بھی گئے، تو یہ تمام وہ امور ہیں جو دنیا کے ساتھ مخصوص ہیں اور "جنۃ الماوٰی" میں اُن کا وجود نہیں ہے، نہ وہ عالمِ تکلیف ہے اور نہ اُس میں داخلہ کے بعد اخراج ہے، یہ قول بھی بڑے بڑے علماءِ اسلام کی طرف منسوب ہے، اور ان دو رایوں کے علاوہ اس سلسلہ میں دو رائیں اور بھی ہیں؛ اور اس طرح اس مسئلہ میں چار اقوال ہوجاتے ہیں۔

۱۔ یہ جنۃ الماوٰی ہے۔

۲۔ یہ جنتِ ارضی ہے۔

۳۔ یہ جنت الماوٰی اور جنتِ ارضی کے علاوہ ایک اور جنت ہے جو صرف اسی

غرض سے تیار کی گئی تھی۔

۴۔ اس معاملہ میں توقف اور سکوت کرنا چاہیئے، اور اسے خدا کے حوالہ کر دینا چاہیئے

یہ بحث بہت طویل ہے اور حافظ عماد الدین بن کثیر نے اپنی تاریخ البدایۃ والنہایۃ میں اس کو بڑے شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور تمام اقوال کے مفصل دلائل اور نظائر کو بھی نقل کیا ہے۔[1] تفصیل دیکھنے کے لئے اس کی مراجعت کرنی چاہیئے۔

بہرحال حقیقتِ حال کا عالِم تو خدا ہی ہے لیکن تمام دلائل و براہین کے دیکھنے کے بعد ہماری رائے تو یہی ہے کہ یہ معاملہ بلاشبہ "جنۃ الماویٰ" ہی میں پیش آیا ہے اور کھانے، سونے اور شیطان کے وسوسہ ڈالنے کے لئے تمام معاملات "جنۃ الماویٰ" میں اس وقت پیش آئے ہیں جبکہ انسان ابھی تک عالمِ تکلیف میں نہیں آیا تھا۔ پس یہ جو کچھ ہوا مشیتِ الٰہی کی حکمتِ بالغہ کے زیرِ اثر اس لئے ہوا کہ یہ تمام تکوینی امور انسان کے زمین پر آباد ہونے اور "خلافتِ الٰہیہ" کے حقدار بننے کے لئے ضروری تھے۔ پس اگر یہی راجح قول ہو کہ اس جگہ جنّت سے مراد "جنۃ الماویٰ" ہی ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوّاء (علیہما السلام) زمین کے کس حصّہ پر اتارے گئے؟ تو بعض ضعیف روایتوں میں ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) ہندوستان کی سرزمین پر اور حضرت حواء جدّہ کی سرزمین پر اُتارے گئے اور پھر چل کر دونوں عرفات (حجاز) کے میدان میں ایک دوسرے سے جا ملے اسی لئے اس میدانِ حج کا نام عرفات ہوا کیوں کہ دونوں نے اسی مقام پر ایک دوسرے کو پہچانا۔

لیکن قرآنِ عزیز نے اس حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ اس کا اظہار رشد و ہدایت سے غیر متعلق تھا البتہ قلبی رجحان اور نفسیاتی برہان اس جانب توجہ دلاتے ہیں کہ آدم و حواء ایک ہی جگہ اُتارے گئے ہوں گے تاکہ حق تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے زیرِ اثر جلد ہی نسلِ انسانی کی افزائش اپنا کام کر سکے اور اس عالمِ خاکی کے وارث و مکین خدا کی زمین کو

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد اص ۵۷ تا ۸۰۔

آباد کر کے انسانیت کے سب سے بڑے شرف "خلافتِ ارضی" کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔

ظریفانہ نکتہ | جو علماء اس کے قائل ہیں کہ یہ "جنۃ الماویٰ" ہے ان پر دوسرے علماء کا یہ اعتراض ہے کہ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے (اور یہ ظاہر ہے کہ اسی کا دوسرا نام جنۃ الخلد ہے) تو حضرت آدمؑ سے ابلیس کا یہ کہنا کہ میں تمہیں شجرِ خلد کا پتہ بتاؤں کیا معنی رکھتا ہے؟

لیکن اوّل الذکر علماء ان حضرات سے جو جنتِ ارضی کے قائل ہیں پلٹ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ جنتِ ارضی تھی تو اِس دارِ فانی میں ابلیس حضرت آدمؑ سے ایسی بحث ہی کیسے کر سکتا تھا کہ دنیا اور اُس کی تمام اشیاء تو فانی ہیں مگر اُس میں ایک شجرِ خلد بھی ہے۔ دارِ فانی میں خلود کہاں اس کو تو معمولی عقل کا انسان بھی تسلیم نہیں کر سکتا چہ جائیکہ حضرت آدمؑ۔

جنتِ ارضی علماءِ طبقات الارض کی نظر میں | جو علماء اس جنت کو "جنتِ ارضی" بتاتے ہیں اُن میں سے علماءِ طبقات الارض کا یہ دعویٰ ہے کہ رُبعِ مسکون میں سے جس خطہ پر جنت قائم تھی وہ آج کائناتِ ارضی پر موجود نہیں ہے۔ یہ حصہ "قارۂ مُو" کے نام سے اس دنیا میں آباد تھا مگر مختلف حوادث اور پیہم زلزلوں کے باعث بحرِ ہند میں ہزاروں سال ہوئے کہ غرق ہو گیا، اور یہ کہ جب یہ حادثہ پیش آیا تھا تو اِس خطہ پر بسنے والی انسانی آبادی تقریباً ساٹھ ملین (چھ کروڑ) کی تعداد میں ہلاک ہو گئی۔

اور بائبل کے سِفرِ تکوین اصحاح میں اس کا مقام وقوع وہ بتایا گیا ہے جہاں سے دجلہ اور فرات نکلتے ہیں۔

(۷) کیا حضرت آدمؑ نبی اور رسول ہیں؟

شریعتِ اسلامی میں "نبی" اُس ہستی کو کہتے ہیں جس کو حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے چُن لیا ہو اور وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتی ہو اور "رسول" اس نبی کو کہا جاتا ہے جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے نئی شریعت اور نئی کتاب بھیجی گئی ہو، چونکہ حضرت آدمؑ دنیائے انسانی کے باپ ہیں تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ

جس طرح اپنی نسل کی دنیوی سعادت و فلاح کے لئے رہنما اور ہادی تھے اسی طرح اُخروی سعادت و فلاح کے لئے پیغامبر تھے یا نہیں؟

اس کا جواب ایک ہی ہو سکتا ہے کہ وہ بلاشبہ خدا کے سچے پیغمبر اور نبی برحق تھے اور اس مسئلہ میں اُمت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں اور اسی لئے کبھی یہ مسئلہ موضوعِ بحث نہیں بنا مگر اس مسئلہ میں اس وقت سے اہمیت پیدا ہوئی جبکہ مصر کے قریہ دمنہور کے ایک شخص نے حضرت آدمؑ کی نبوت کا انکار کیا اور اپنے دعوے کی دلیل میں یہ پیش کیا کہ قرآنِ عزیز میں کسی مقام پر بھی حضرت آدمؑ کو دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح "نبی" نہیں کہا گیا۔[1]

اس شخص کا یہ کہنا کہ قرآنِ عزیز نے حضرتِ آدمؑ کو کسی جگہ لفظِ "نبی" سے مخاطب نہیں کیا، لفظی اعتبار سے اگرچہ صحیح ہے لیکن حقیقتِ نبوت کے اعتبار سے بالکل غلط ہے اس لئے کہ نبوت کے جو معنی اسلامی اصطلاح میں بیان کئے گئے ہیں بغیر کسی تاویل کے اس کا اطلاق حضرت آدمؑ پر نظم قرآنی میں بہت سے مقامات میں موجود ہے جگہ جگہ یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی واسطے کے حضرتِ آدمؑ سے ہمکلام ہوتا رہا ہے اور اس تمام مخاطبت اور بات چیت میں امر و نہی اور حلال و حرام کے احکام دیتا رہا ہے اور ان احکام کے لئے آدمؑ کے پاس کسی کو نبی و رسول بنا کر نہیں بھیجا بلکہ براہِ راست انہی سے خطاب فرمایا گیا، پس جبکہ نبوت کی حقیقت بھی یہی ہے تو حضرتِ آدمؑ کی نبوت کا انکار قطعاً باطل اور بے معنی ہے، نیز ان کے رسول ہونے نہ ہونے کی بحث بھی کچھ زیادہ اہم نہیں ہے اس لئے کہ جب وہ پہلے انسان ہیں تو انسانی آبادی کے

---

[1] حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے "میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! مجھے بتایئے کیا آدمؑ نبی تھے۔ حضور صلعم نے فرمایا، ہاں وہ نبی تھے اور رسول بھی، انھیں اللہ رب العالمین سے شرف تخاطب و تکلم حاصل ہوا ہے" روایت کے الفاظ یہ ہیں عن ابی ذرؓ قال قلت یا رسول اللہ ارأیت آدم انبیاً کان قال نعم نبیاً رسولا یکلم اللہ قبیلا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۴ قدیم)

لئے خدا کی وحی کے ذریعہ جو پیغامات بھی انھوں نے سُنائے وہی ان کی شریعت سمجھی جائے گی اور اس لئے وہ رسول بھی ہیں، بہرحال ان کی نبوت پر یقین رکھنے اور قلب میں اطمینان پیدا کرنے کے لئے نظمِ قرآنی کی وہ تمام آیات کافی وشافی دلیل ہیں جو حضرتِ آدم (علیہ السلام) اور اللہ تعالیٰ کے درمیان براہِ راست گفتگو اور مکالمت ومخاطبت کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

(۷) حضرتِ آدم جبکہ نبی ہیں تو اُن سے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کے کیا معنی، نبی تو معصوم ہوتا ہے اور "عصمت" نافرمانی اور گناہ کے متضاد ہے؟

حضرتِ آدم کی عصمت پر بحث کرنے سے قبل مختصر الفاظ میں "عصمت" کے معنی اور اس کا مفہوم معلوم ہوجانا ضروری ہے تاکہ آئندہ بھی ایسے مقامات میں گنجلک اور ریب وشک کی گنجائش باقی نہ رہے۔

عصمتِ نبی کے معنی | خالقِ کائنات نے انسان کی تخلیق متضاد قوتوں کے ساتھ فرمائی ہے، یعنی اس کو نیک وبد دونوں قسم کی قوتیں عطا کی گئی ہیں، وہ گناہ بھی کرسکتا ہے اور نیکی بھی، وہ ارادۂ بد کا بھی حامل ہے اور ارادۂ خیر کا بھی، اور یہی اسکے انسانی شرف کا طغرائے امتیاز ہے۔

اِن متضاد قوتوں کے حامل "انسان" میں سے حضرتِ حق انسانی رشد وہدایت، اور وصول الی اللہ کے لئے کبھی کبھی کسی شخص کو چُن لیتے اور اس کو اپنا رسول، نبی اور پیغمبر بنا لیتے ہیں اور اس سلسلہ کی آخری کڑی ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اور جب یہ ہستی "نبوت" کے لئے چُن لی جاتی ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عمل وارادہ کی زندگی میں ہر قسم کے گناہ سے پاک اور ہمہ قسم کی نافرمانیوں سے منزہ ہو، تاکہ پیغامِ الٰہی کے منصب میں خدا کی صحیح نیابت ادا کرسکے۔ اور:۔

"او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق نہ ثابت ہو، اس طرح وہ ایک

انسان اور بشر بھی ہے کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے اور اہل و عیال کی زندگی سے بھی وابستہ ہے اور وہ ہر قسم کے عملی اور ارادی گناہوں سے پاک بھی ہے کیوں کہ وہ ہر قسم کی نیکی کے لئے ہادی و مرشد اور خدا کا نائب ہے، اور اگرچہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح متضاد قوتوں کا حامل ضرور ہے لیکن عمل اور ارادہ میں اُس سے ہر قسم کی بدی کے ظہور کو ناممکن اور محال کر دیا گیا ہے تاکہ اس کا ہر ایک ارادہ، ہر ایک عمل اور ہر ایک قول غرض ہر ایک حرکت و سکون، کائنات کے لئے اسوہ اور نمونہ بن سکے، البتہ بشریت و انسانیت سے متصف ہونے کی بنا پر سہو، نسیان، اور لغزش کا امکان باقی رہتا اور کبھی کبھی عملی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے مگر فوراً ہی اُس پر متنبہ کر دیا جاتا ہے اور وہ اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔

سہو اور نسیان تو اپنے مفہوم میں ظاہر ہیں مگر زَلّۃ (لغزش) کیا ہے؟ تو اس کا اطلاق ایسی حقیقت پر ہوتا ہے کہ جہاں نہ عمل اور کردار میں تمرد اور سرکشی کا دخل ہو اور نہ قصد و ارادہ کے ساتھ حکم کی خلاف ورزی کا اور ساتھ ہی وہ عمل اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے قبیح، بد اور شر بھی نہ ہو بلکہ ان تمام امور کے پیشِ نظر وہ اپنی ذات میں اگرچہ اباحت اور جواز کا درجہ رکھتا ہو مگر کرنے والے کی ہستی کے شایانِ شان نہ ہو بلکہ اُس کے عظیم رتبہ کے سامنے سبک اور ہلکا نظر آتا ہو، بایں ہمہ اس لئے عمل میں آگیا کہ عمل کرنے والے کی نگاہ میں اس کا اس طرح کرنا خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ تھا لیکن نبی پر چونکہ خدائے تعالیٰ کی مستقل حفاظت و نگرانی رہتی ہے اس لئے فوراً ہی اسکو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ عمل تمہاری جلالتِ قدر اور عظمتِ مرتبہ کے شایانِ شان نہیں ہے اور قطعی غیر مناسب ہے، اِسی فرقِ مراتب کو عربی کی اِس مثل میں ظاہر کیا گیا ہے۔

حسناتُ الابرار سیئاتُ المقربین نکوکار انسانوں کی عام خوبیاں مقربینِ بارگاہِ الٰہی کے حق میں بُرائیاں ہوتی ہیں مگر اس لئے کہ ایک مقرب بارگاہِ الٰہی کو خدا کی مرضی کے سمجھنے میں بھی یہ لغزش کیوں

پیش آئی سنۃ اللہ یہ جاری ہے کہ وہ انبیاء و مرسلین (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی اس قسم کی لغزشوں پر جب ان کو متنبہ کرتا ہے تو اول نہایت سخت اور مجرمانہ عمل کی حیثیت میں اُس لغزش کا ذکر کرتا ہے مگر پھر کسی دوسرے مقام پر اُس معاملہ کی اصل حقیقت کو ظاہر کر کے "نبی و رسول" کے عمل کو لغزش ہی کی حد میں لے آتا، اور اُن کی جانب سے خود ہی معذرت کر دیتا ہے تاکہ کسی ملحد اور زندیق کو کسی بھی نبی و رسول کی جانب گناہ کے الزام لگانے کی بےجا جرأت نہ ہو سکے۔

اِسی مجموعۂ حقیقت کا نام "عصمتِ انبیاءؑ" ہے اور یہی اسلامی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے، یہ مسئلہ اگرچہ بحث و کاوش کے اعتبار سے بہت اہم اور معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، مگر دلائل و براہین اور بحث و نظر کے بعد مسئلہ کی حقیقت اور اس کا خلاصہ یہی ہے جو یہاں سپردِ قلم کیا گیا اور اس مقام پر اسی قدر کافی و شافی ہے۔

حضرت آدمؑ کی عصمت | اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب حضرت آدمؑ کے واقعہ پر غور کیجئے اور نظر ڈالئے کہ قرآنِ عزیز سورۂ بقرہ میں جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو صاف طور پر یہ واضح کر دیا گیا کہ حضرت آدمؑ کی یہ غلطی نہ گناہ تھی اور نہ نافرمانی بلکہ معمولی قسم کی لغزش تھی۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ — شیطان نے ان دونوں سے لغزش کرا دی

اور اس کے بعد سورۂ "اعراف" اور "طٰہٰ" میں دو جگہ اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے "وسوسہ" سے تعبیر کیا۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ — شیطان نے اُن کو پھسلا دیا۔

اور "طٰہٰ" میں تیسری جگہ اس لغزش اور وسوسہ کا خود ہی سبب بیان کر کے حضرتِ آدمؑ کو ہر قسم کے ارادی اور عملی گناہ سے پاک ظاہر کیا اور اُن کی عصمت کے مسئلہ کو زیادہ سے زیادہ محکم اور مضبوط بنا دیا۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا

اور بلاشبہ ہم نے آدم سے ایک اقرار لیا تھا پس وہ اس کو بھول گیا اور ہم نے اس کو پختہ ارادہ کا نہیں پایا (یا ہم نے اس کو اقرار کے پورا کرنے میں اس کے ارادہ اور قصد کا دخل نہیں پایا)

یہ آیات صاف طور پر واضح کرتی ہیں کہ حضرتِ آدمؑ نے کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں کیا جس حد تک معاملہ پیش آیا اس میں بھی اُن کے قصد و ارادہ سے خلاف ورزی کا مطلق کوئی دخل نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسوسہ تھا جو لغزش کی شکل میں ان سے صادر ہو گیا اور وہ بھی نسیان اور بھول چوک کے ساتھ۔

ان تمام تصریحات کے بعد اب سورۂ طٰہٰ کی مسطورۂ ذیل آیت کا مقصد خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔

وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی اور آدمؑ نے اپنے پروردگار کا حکم پورا نہ کیا اور وہ بہک گیا۔

ہم نے اس جگہ عصیان اور غوایت کے وہ معنی نہیں لئے جو عام بول چال میں بولے جاتے ہیں یعنی "گناہ" اور "گمراہی" اور ایسا تاویلِ بعید یا دُور از کار توجیہ کے لئے نہیں کیا گیا بلکہ لغت اور علمِ معانی کے عام اصول کے زیرِ نظر ہی کیا گیا ہے اس لئے کہ لغتِ عربی کی مشہور کتاب "لسان العرب" اور "اقرب الموارد" وغیرہ میں ہے "المعصیة مصدر وقد تطلق علی الزلة مجازاً" (معصیة مصدر ہے اور کبھی مجازاً کے طور پر لغزش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) اسی طرح "غویٰ" کے معنی یہاں ضل یا خاب کے ہیں، پس اگر یہاں ضل مراد ہیں تو اس کا اُردو ترجمہ "بہک گیا" کیا جائے گا اور خاب مراد ہیں تو "نقصان میں پڑ گیا" فصیح ترجمہ ہے۔

بہر حال واقعہ سے متعلق ان تمام آیات کو اور ان آیات کو جو حضرت آدمؑ کی جلالتِ قدر، صفوت و برگزیدگی، اور خلعتِ خلافت سے سرفرازی کو ظاہر کرتی ہیں، جدا جدا کر کے نہ دیکھا جائے" جیسا کہ معترضین کا عام قاعدہ ہے اور جو اکثر قرآن فہمی

میں گمراہی کا سبب بنتا ہے" اور سب کو یکجا جمع کر کے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت آدمؑ کی عصمت کا مسئلہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور اس میں قطعی کسی شائبۂ ریب و شک کی گنجائش نہیں ہے۔

اور بالفرض اگر عصیٰ اور غویٰ کو عام معنی میں لیا جائے تب بھی وہ اصول پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جو مسئلۂ عصمت کی حقیقت کے سلسلہ میں ابھی بیان ہو چکا ہے کہ جب نصوصِ قرآن حضرت آدمؑ کی نبوت، صفوت، اور خلافت جیسے عظیم الشان مراتب کا اظہار کرتی ہیں تو اس آیت میں ان کی اس لغزش کو ان سخت الفاظ کے ساتھ اس لئے یاد کیا گیا کہ آدمؑ جیسے مقرب بارگاہِ الٰہی کے لئے کہ جس کو خود اللہ تعالیٰ کی براہِ راست ہمکلامی کا شرف حاصل ہے، یہ لغزش اور نسیان بھی اس کے مرتبہ سے نازل اور غیر موزوں ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ قابلِ گرفت ہے اگرچہ ابرار و نیکوکار انسانوں کے حق میں اس قسم کی غلطی ایک معمولی بات ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۰) حضرتِ آدمؑ دنیاءِ انسانی میں پہلے انسان اور کائناتِ بشری کے پہلے ابوالبشر ہیں یا اس سے بھی پہلے اس قسم کی دنیاءِ انسانی کا وجود اس کائنات میں رہا ہے اور اس کے لئے بھی اسی طرح ایک آدم ابوالبشر کی ہستی رہی ہے؟

اس مسئلہ کے متعلق اگرچہ بعض علماءِ طبقات الارض نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسانی دنیا سے قبل بھی ربعِ مسکون پر عالمِ انسانی کا وجود رہا ہے اور آج سے تیس ہزار سال قبل کی اس جنسِ بشری کا نام "نیاندرتال" تھا اور اس کا موجودہ نسلِ انسانی سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مستقل نسل تھی جو ہلاک ہو گئی اور اس کے بعد موجودہ نسلِ انسانی نے جنم لیا مگر ان کی یہ تحقیق تخمینی اور قیاسی ہے جو انسانی ڈھانچوں اور ان کی ہڈیوں کی تحقیق (ریسرچ) پر مبنی ہے اور کسی یقین اور علمِ حقیقی پر مبنی نہیں ہے اور قرآنِ عزیز نے ہم کو اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی، نہ کسی موقع پر اس کے بارہ میں کوئی اشارہ

کیا اور نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسئلہ میں کوئی تصریح موجود ہے لہٰذا ہمارے یقین اور اعتقاد کے لئے اسی قدر کافی ہے جو ہم کو قرآن کے یقینی علم اور وحیِ الٰہی کی صاف اور صریح اطلاع سے حاصل ہوا ہے۔

دراصل اس قسم کے مباحثِ علمیہ کے لئے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسائل علم یقین اور مشاہدہ کی حد تک پہنچ چکے ہیں اور قرآنی علوم اور وحیِ الٰہی ان حقائق کا انکار نہیں کرتے "کیونکہ قرآنِ عزیز مشاہدہ اور بداہت کا کبھی بھی انکار نہیں کرتا" تو ان کو بلاشبہ تسلیم کیا جائے اس لئے کہ ایسے حقائق کا انکار بیجا تعصب اور تنگ نظری کے سوا اور کچھ نہیں، اور جو مسائل ابھی تک یقین اور جزم کی اُس حد تک نہیں پہنچے جن کو مشاہدہ اور بداہت کہا جا سکے جیسا کہ مسئلہ زیرِ بحث" تو اُن کے متعلق قرآنِ عزیز کے مطالب میں تاویلات نہیں کرنی چاہئیں اور خواہ مخواہ ان کو جدید تحقیقات کے سانچہ میں ڈھالنے کی سعی ہرگز جائز نہیں، بلکہ وقت کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ مسائل اپنی حقیقت کو اس طرح آشکارا کر دیں کہ ان کے انکار سے مشاہدہ اور بداہت کا انکار لازم آجائے، اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ مباحثِ علمیہ کو تو بارہا اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا ہے، مگر علوم قرآنی کو کبھی ایک مرتبہ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور جب کبھی مسائلِ علمیہ بحث و نظر کے بعد یقینیات اور مشاہدات کی حد تک پہنچے ہیں وہ ایک نقطہ بھی اُس سے آگے نہیں گئے جس کو قرآن نے پہلے سے واضح کر دیا ہے۔

البتہ اگر کسی مفسر نے ایک آیت کی ایسی تفسیر کر دی ہے جو اس مسئلہ کی اصل حقیقت کے خلاف پڑتی ہے تو بلاشبہ اُس کے بیان کردہ معانی کو نظر انداز کر دینا اور آیتِ قرآن کو اصل حقیقت کے مطابق ظاہر کرنا قرآنِ عزیز کا اپنا مطالبہ ہے جو تعقل، تفکر اور تدبر کی بار بار دعوت سے ظاہر ہوتا ہے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، اَفَلَا تَتَدَبَّرُوْنَ، اَفَلَا یَتَفَکَّرُوْنَ۔

لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ یہ بحث صرف ان ہی مسائل سے متعلق ہے

جو تاریخی، جغرافی اور طبعی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآنِ عزیز نے اس حد تک ان کی طرف توجہ کی ہے جس سے اُس کے مقصدِ ارشاد و ہدایت کو مدد مل سکے، باقی وہ تمام مسائل جن کا تعلق ایک مسلمان کے "مسلم" ہونے اور عقائد و اعمال کے اعتبار سے اُس کے "مومن" کہلانے سے ہے۔ سو ان کو قرآنِ عزیز نے جس یقین اور علمِ حقیقی (وحی الٰہی) کے ذریعہ بیان کر دیا ہے ان میں مطلق کسی قسم کے تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں ہے، اور نہ وہ کسی تحقیق اور ریسرچ کے محتاج، مثلاً خدا کی ہستی، آخرت کے وجود، ملائکۃ اللہ، تقدیر اور انبیاء و رسل سے متعلق ایمان و اعتقاد یا نماز، روزہ کی اصل حقیقت، حج و زکوٰۃ کے معنی و مفہوم وغیرہ یہ تمام مسائل ایک مسلمان کے لئے مطلق کسی جدید تحقیق کے محتاج نہیں ہیں بلکہ اُنکے حقائق کے متعلق نصوص نے ہم کو دوسروں سے قطعی بے نیاز کر دیا ہے اور اس کا دیا ہوا علم، علمِ یقین (وحی الٰہی) پر مبنی ہے جو اپنی ابدیت کے ساتھ اٹل اور غیر متبدل ہے۔

(۱۱) توراۃ و انجیل (بائبل) میں اس قصہ سے متعلق جو واقعات مذکور ہیں مثلاً سانپ اور طاؤس کا قصہ یا اسی قسم کی اور باتیں جو قرآنِ عزیز اور صحیح روایاتِ حدیثی میں نہیں پائی جاتیں ان کے متعلق کیا حکم ہے؟

یہ سب اسرائیلیات کہلاتی ہیں اور بے اصل ہیں، ان کی پشت پر نہ علمِ یقین اور علمِ صحیح (وحی الٰہی) کی سند ہے اور نہ عقل و تاریخ کی شہادت، اس لئے من گھڑت اور بے سروپا باتیں ہیں، بعض مفسرین بھی ایسی روایات کے نقل میں سہل انگاری برتتے ہیں، جس سے بہت بڑا نقصان یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام نہیں بلکہ خواص بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان روایات کو اسلامی روایات میں دخل ہے اور یہ بھی صحیح روایات کی طرح صحیح اور قابلِ قبول ہیں، اس لئے ازبس ضروری ہے کہ تردید کے ارادہ سے علاوہ تفسیر قرآن میں ہرگز ان کو جگہ نہ دی جائے اور نہ صرف کتبِ تفسیر و حدیث بلکہ کتبِ سیرت کو بھی ان سے پاک رکھا جائے۔

(۱۲) حضرتِ آدمؑ کے واقعہ میں "مَلَک" (فرشتہ) اور "جن" کا ذکر بھی آیا ہے، یہ دونوں خدائے تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہیں یا صرف دو قوتوں کا نام ہے جو قوتِ ملکوتی اور قوتِ شیطانی سے موسوم ہیں؟

فرشتہ | قرآنِ عزیز اور احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو کچھ ہم کو بتایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم "فرشتہ" کی نہ حقیقتِ تخلیقی سے واقف کئے گئے ہیں اور نہ وہ ہم کو نظر آتے ہیں، البتہ ہمارے لئے یہ یقین واعتقاد ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ہم اُن کے وجود کو تسلیم کریں اور ان کو مستقل مخلوق یقین کریں، اس لئے کہ قرآنِ عزیز اور احادیثِ صحیح نے اُن میں سے بعض کے ناموں کی تصریح تک کی ہے اور جنسِ ملائکہ کی جن صفات کا تذکرہ فرمایا ہے وہ اُن کے ایک مستقل مخلوق ہونے کی صراحت کرتی ہیں، ذیل کی آیات ان ہی حقائق کو واضح کرتی ہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ) ع	تو کہدے، جو کوئی دشمن ہو جبرئیل کا سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے۔
مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ۔ (بقرہ ع)	جو کوئی دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے اُن کافروں کا۔
يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (النحل) ع	وہ اتارتا ہے فرشتوں کو بھید دے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (فاطر ع)	سب خوبی اللہ کو ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین، جس نے ٹھیرایا فرشتوں کو پیغام لانے والا جن کے پر ہیں دو دو اور تین تین اور چار چار، بڑھا دیتا ہے وہ پیدائش میں جو چاہے بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ (معارج)	پیش ہوں گے فرشتے اور روحیں اس کے آگے۔
وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۔ (الحاقہ) ع	اور فرشتے ہوں گے (قیامت کے دن) اس (آسمان) کے کناروں پر اور اٹھائیں گے عرش تیرے رب کا اپنے اوپر اس دن آٹھ (فرشتے)
وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا (بقرہ) ع	اور جب کہا تیرے پروردگار نے فرشتوں سے میں بنانے والا ہوں زمین میں خلیفہ تو انھوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس زمین میں فساد پھیلائے گا۔

ان آیات کو غور سے پڑھنے کے بعد خود انصاف کیجیے کہ جن ملحدوں نے فرشتوں کے مستقل مخلوق ہونے سے انکار کیا ہے ان کی باطل تاویلات اور قرآنِ عزیز میں معنوی تحریفات کس حد تک قابلِ قبول بلکہ لائقِ ذکر ہیں۔

قرآنِ عزیز میں مَلَک اور ملائکہ کا ذکر ۸۶ آیات میں ۸۸ مرتبہ آیا ہے جو ذیل کی جدول سے ظاہر ہے:

نمبر سورہ	سورۃ	تعدادِ آیات	نمبر سورہ	سورۃ	تعدادِ آیات
۲	البقرۃ	۳۰، ۳۱، ۳۴، ۹۸، ۱۰۲، ۱۶۱، ۱۷۷، ۲۱۰، ۲۴۸، ۲۸۵	۱۱	ھود	۱۲، ۳۱
			۱۲	یوسف	۳۱
۳	آلِ عمران	۱۸، ۳۹، ۴۲، ۴۵، ۸۰، ۸۷، ۱۲۴، ۱۲۵	۱۳	الرعد	۱۳، ۲۳
			۱۵	الحجر	۷، ۸، ۲۸، ۳۰
۴	النساء	۹۷، ۱۳۶، ۱۶۶، ۱۷۲	۱۶	النحل	۲، ۲۸، ۳۲، ۳۳، ۴۹
۶	الانعام	۸، ۹، ۵۰، ۹۳، ۱۱۱، ۱۹۸	۱۷	الاسراء	۴۰، ۶۱، ۹۲، ۹۵
۷	الاعراف	۱۱، ۲۰	۱۸	الکہف	۵۰
۸	الانفال	۹، ۱۲، ۵۰	۲۰	طٰہٰ	۱۱۶

نمبر سورہ	سورہ	تعدادِ آیات	نمبر سورہ	سورہ	تعدادِ آیات
۲۱	الانبیاء	۱۰۳	۴۲	الشوریٰ	۵
۲۲	الحج	۷۵	۴۳	الزخرف	۱۹، ۵۳، ۶۰
۲۳	المومنون	۲۴	۴۷	محمدؐ	۲۷
۲۵	الفرقان	۷، ۲۱، ۲۲، ۲۵	۵۳	النجم	۲۶، ۲۷
۳۲	السجدۃ	۱۱	۶۶	التحریم	۶۴
۳۳	الاحزاب	۴۳، ۵۶	۶۹	الحاقہ	۱۷
۳۴	سباء	۴۰	۷۰	المعارج	۴
۳۵	فاطر	۱	۷۴	المدثر	۳۱
۳۷	الصافات	۱۴۹	۷۸	النبأ	۳۸
۳۸	ص	۷۱، ۷۳	۷۹	الفجر	۲۲
۳۹	الزمر	۷۵	۸۷	القدر	۴
۴۱	فصلت	۱۴			

نیز احادیثِ صحیحہ اور قدیم آسمانی کتابوں توراۃ، زبور، انجیل وغیرہ میں بھی فرشتوں کا تذکرہ موجود ہے اور ان کو مستقل مخلوق ہی بتایا گیا ہے خصوصاً بخاری اور مسلم کی روایات میں بکثرت اس کی شہادتیں موجود ہیں۔

جن اسی طرح "جن" بھی خدائے تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہے جس کی حقیقتِ تخلیق سے ہم پوری طرح آگاہ نہیں ہیں اور نہ عام انسانی آبادی کی طرح وہ ہم کو نظر آتے ہیں لیکن قرآن عزیز نے جو تصریحات اس مخلوق کے متعلق کی ہیں وہ ہمارے لئے ضروری قرار دیتی ہیں کہ ہم یہ اعتقاد اور یقین رکھیں کہ وہ بھی انسان کی طرح مستقل مخلوق ہیں اور اُسی کی طرح شریعت کے مکلف بھی۔ ان میں توالد و تناسل کا بھی سلسلہ ہے اور اُن میں

نیک و بد بھی ہیں۔

قرآنِ عزیز کی یہ آیات ان ہی حقائق کو واضح اور ظاہر کرتی ہیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ	اور نہیں پیدا کیا ہم نے جن اور انسان کو مگر
إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات) ع	تا کہ وہ عبادت گزار ہوں۔
قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ	اور اے پیغمبر سب لوگوں کو بتا دو کہ میرے پاس خدا کی طرف سے
نَفَرٌ مِنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا	اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنّات میں سے چند شخصوں نے مجھے
سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا	قرآن پڑھتے سنا اور اُس نے پیچھے اپنے لوگوں سے جا کر کہا کہ
يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ	ہم نے عجیب طرح کا قرآن سُنا جو نیک راہ دکھاتا ہے سو ہم اُس پر
فَآمَنَّا بِهِ وَلَنْ نُشْرِكَ	ایمان لے آئے اور ہم تو کسی کو اپنے پروردگار کا شریک
بِرَبِّنَا أَحَدًا (جن) ع	ٹھہرائیں گے نہیں،
وَأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ	اور بلا شبہ کچھ ہم میں سے فرماں بردار ہیں
وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ (جن)	اور کچھ بے انصاف۔
إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ	بیشک وہ (شیطان) اور اس کی ذریات تم کو اُدھر سے
حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (اعراف)	دیکھتے رہتے ہیں جدھر سے تم اُن کو نہیں دیکھتے۔
وَكَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ	اور تھا (ابلیس) جنات میں سے پس
عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ (البقرہ)	نافرمانی کی اس نے اپنے رب کی۔

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بھی "جن" ہی کی نسل میں سے ہے، اور ابلیس (شیطان) نے خدائے تعالیٰ کے سامنے خود یہ اقرار کیا کہ اس کی تخلیق نار (آگ) سے ہوئی ہے،

مسطورۂ بالا آیات کے علاوہ لفظ جن، جان اور جنّۃ بتیس ۳۲ مرتبہ قرآن حکیم کی اکتیس ۳۱ آیات میں مذکور ہوئے ہیں، جو ذیل کی جدول سے ظاہر ہیں۔

نمبر سورہ	سورۃ	نمبر آیات	نمبر سورہ	سورۃ	نمبر آیات
۶	الانعام	۱۰۰، ۱۱۲، ۱۲۸، ۱۳۰	۳۴	السبأ	۱۲، ۱۴، ۴۱
۷	الاعراف	۳۸، ۱۹۷	۳۷	الصّافّات	۱۵۸
۱۱	ھود	۱۱۹	۴۱	فُصّلت	۲۵، ۲۶
۱۵	الحجر	۲۷	۴۶	الاحقاف	۱۸، ۲۹
۱۷	الاسراء	۸۸	۵۱	الذاریات	۵۶
۱۸	الکھف	۵۰	۵۵	الرحمٰن	۱۵، ۲۳، ۳۹، ۵۶، ۷۴
۲۷	النمل	۱۷، ۳۹	۷۲	الجن	۱، ۵، ۶
۳۲	السجدہ	۱۳	۱۱۴	الناس	۶

حاصلِ کلام یہ ہے کہ قرآنِ عزیز اور نبیِ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ "ملائکہ" اور "جن" اگرچہ ہماری اِن نگاہوں سے پوشیدہ ہیں لیکن بلاشبہ وہ مستقل مخلوق ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ مشاہدہ میں تو غلطی کا امکان بھی ہے اور بارہا ہوتا رہتا ہے لیکن "وحیِ الٰہی" اور "نبیِ معصوم" کی اطلاع میں غلطی کی مطلق گنجائش نہیں لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ وہ خدا کی مستقل مخلوق ہیں، اس کے علاوہ عقلی اعتبار سے بھی ان کا مستقل مخلوق ہونا ناممکن نہیں ہے بلکہ امکانِ عقلی کے دائرہ میں ہے۔

پس جو چیز عقل کے نزدیک ناممکن نہ ہو اور نقل یعنی "وحیِ الٰہی" اس کا یقین دلاتی ہو تو اس کا انکار "علم" اور "حقیقت" کا انکار ہے، اور تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کی زندہ مثال!

رہا یہ امر کہ وہ ہمارے مشاہدات و محسوسات سے باہر ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھتے تو یہ بھی انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی اس لئے کہ آج کی دوربینوں اور سائنس کے آلات سے پہلے ہزاروں برس تک ہم کو وہ بہت سی اشیاء محسوس نہیں ہوتی تھیں اور نہ آنکھیں اُن کو دیکھ سکتی تھیں جن کا وجود اُس وقت بھی موجود تھا مگر آج وہ نظر بھی آتی ہیں

اور محسوس بھی ہوتی ہیں تو کیا ہزاروں سال پہلے جن لوگوں نے اُن کے وجود کا انکار کیا وہ حقیقی علم پر مبنی تھا یا کوتاہیِ علم اور ذرائعِ معلومات وتحقیقات سے ناواقفیت کا نتیجہ، اسی طرح ہم آج بھی بجلی، مقناطیس اور روشنی کی صحیح حقیقت سے ناآشنا ہیں اور انکو صرف ان کے آثار وعلامات ہی سے پہچانتے ہیں۔

اسی طرح مادیین اور ملاحدہ کا انکار کسی علم اور یقین پر مبنی نہیں ہے بلکہ محسوسات و مشاہدات میں نہ آنے کی بناء پر "عدمِ علم" کی وجہ سے ہے جو کسی طرح عدمِ وجود کی دلیل نہیں بن سکتا، نیز علم دو ہی طرح حاصل ہو سکتا ہے، ایک علوم وفنون کے ذریعہ جو کسب و اکتساب کا محتاج ہے اور دوسرے موہبت اور عطیۂ الٰہی کی راہ سے اور اس کا سب سے بلند درجہ وحیِ الٰہی ہے، پس اگر کوئی شئے علوم وفنون کی راہ سے ہم نہ معلوم کر سکیں مگر عقل اُس کے وجود کو ناممکن نہ سمجھتی ہو اور "وحی الٰہی" اس کے وجود کا اعلان کرتی ہے تو ہر ذی ہوش اور ذی عقل کا فرض ہے کہ وہ علوم وفنون کی درماندگی کے اعتراف کے ساتھ اس کو تسلیم کرے، البتہ اگر اُس کو اس اطلاع کے وحی الٰہی ہونے ہی میں انکار ہو یا وہ سرتاسر وحی الٰہی کا ہی منکر ہو تو اب اُس کے لئے اس اطلاع پر ایمان لانے سے قبل ان دلائل کا مطالعہ ضروری ہے جو اس سلسلہ میں قرآنِ عزیز نے بیان کئے ہیں، اور جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ بلاشبہ "کلام اللہ" اور "وحی الٰہی" ہے۔

قصۂ آدمؑ میں چند اہم عبرتیں

یوں تو حضرت آدمؑ کے واقعہ میں بے شمار پند ونصائح، اور مسائل کا ذخیرہ موجود ہے اور اُن کا احاطہ اس مقام پر ناممکن تاہم چند اہم عبرتوں کی جانب اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے بھید بے شمار اور اَن گنت ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی ہستی بھی خواہ وہ کتنی ہی مقربینِ بارگاہِ الٰہی میں سے کیوں نہ ہو، ان تمام بھیدوں پر واقف ہو جائے اسی لئے ملائکۃ اللہ انتہائی مقرب ہونے کے باوجود خلافت آدمؑ کی حکمت

سے آشنا نہ ہو سکے اور جب تک معاملہ کی پوری حقیقت سامنے نہ آگئی وہ حیرت ہی میں غرق رہے۔

۲- اللہ تعالیٰ کی عنایت و توجہ اگر کسی حقیر شے کی جانب بھی ہو جائے تو وہ بڑے سے بڑے مرتبہ اور جلیل القدر منصب پر فائز ہو سکتی اور خلعتِ شرف و مجد سے نوازی جا سکتی ہے۔ ایک مشتِ خاک کو دیکھئے اور پھر خلیفۃ اللہ کے منصب پر نظر ڈالئے اور پھر اس کے منصبِ نبوت و رسالت کو ملاحظہ فرمائیے، مگر اس کی توجہ کا فیضان بخت و اتفاق کی بدولت یا خالی از حکمت نہیں ہوتا بلکہ اُس شے کی استعداد کے مناسب بے نظیر حکمتوں اور مصلحتوں کے نظام سے منظم ہوتا ہے۔

۳- انسان کو اگرچہ ہمہ قسم کا شرف عطا ہوا اور ہر طرح کی جلالت و بزرگی نصیب ہوئی، تاہم اس کی خلقی اور طبعی کمزوری اپنی جگہ اسی طرح قائم رہی اور بشریت و انسانیت کا وہ نقص پھر بھی باقی رہا یہی وہ چیز تھی جس نے حضرتِ آدم پر بایں جلالتِ قدر و منصبِ عظیم نسیان طاری کر دیا اور وہ ابلیس کے وسوسہ سے متاثر ہو گئے۔

۴- خطا کار ہونے کے باوجود اگر انسان کا دل ندامت و توبہ کی طرف مائل ہو تو اُس کے لئے بابِ رحمت بند نہیں ہے اور اُس درگاہ تک رسائی میں ناامیدی کی تاریک گھاٹی نہیں پڑتی، البتہ خلوص اور صداقت شرط ہے اور جس طرح حضرتِ آدم (علیہ السلام) کے نسیان و لغزش کا عفو اسی دامن سے وابستہ ہے، اسی طرح ان کی تمام نسل کے لئے بھی عفو و رحمتِ عالم کا دامن وسیع ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا	کہہ دے اے میرے وہ بندو جو اپنے نفسوں کے بارہ میں
عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن	حد سے گذر گئے ہو (گناہ کر کے نفسوں پر ظلم کیا ہے)
رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ	تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے بیشک اللہ سب
جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (الزمر)	گناہوں کو بخش دینے والا رحم کرنے والا ہے۔

۵ ۔ بارگاہِ الٰہی میں گستاخی یا بغاوت بڑی سے بڑی نیکی اور بھلائی کو بھی تباہ کر دیتی اور ابدی ذلت و خسران کا باعث بن جاتی ہے، ابلیس کا واقعہ عبرتناک واقعہ ہے اور اس کی ہزاروں سال کی عبادت گذاری کا جو حشر بارگاہِ الٰہی میں گستاخی اور بغاوت کی وجہ سے ہوا وہ بلاشبہ سرمایۂ صد ہزار عبرت ہے۔

فَاعْتَبِرُوْا يَآ اُولِي الْاَبْصَارِ — پس عبرت حاصل کرو اے چشم عبرت رکھنے والو

قابیل و ہابیل

ان دونوں کا واقعہ بھی چونکہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے واقعہ کا ایک حصہ ہے، اس لئے یہاں قابلِ ذکر ہے۔

قرآنِ عزیز نے حضرتِ آدمؑ کے ان دونوں صاحبزادوں کا نام ذکر نہیں کیا صرف اِبْنَيْ اٰدَمَ[1] کہہ کر مجمل چھوڑ دیا ہے، البتہ توراۃ میں ان کے یہی نام بیان کئے گئے ہیں جو عنوان میں درج ہیں، ان کے واقعہ کے متعلق حافظِ حدیث عماد الدین بن کثیر نے اپنی تاریخ میں سُدّی سے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) اور بعض دوسرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے، اس کا مضمون یہ ہے'

دنیائے انسانی میں اضافہ کے لئے حضرتِ آدمؑ کا یہ دستور تھا کہ حواؑ سے توام (جڑواں) پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے توام بچوں کے ساتھ کر دیا کرتے تھے، اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ پیش تھا قابیل عمر میں بڑا تھا اور اس کی ہمشیرہ ہابیل کی ہمشیرہ سے زیادہ حسین و خوبرو تھی، اس لئے قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمشیرہ سے اس کی شادی ہو اور ہابیل کی اس کی ہمشیرہ سے، معاملہ کو ختم کرنے کے لئے حضرتِ آدمؑ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کریں جس کی قربانی منظور

[1] آدم کے دو بیٹے۔

ہو جائے وہی اپنے ارادہ کے پورا کر لینے کا مستحق ہے۔

جیسا کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں قربانی (نذر) کی قبولیت کا یہ الہامی دستور تھا کہ نذر و قربانی کی چیز کسی بلند جگہ پر رکھ دی جاتی اور آسمان سے آگ نمودار ہو کر اس کو جلا دیتی تھی، اس قانون کے مطابق ہابیل نے اپنے ریوڑ میں سے ایک بہترین دنبہ خدا کی نذر کیا اور قابیل نے اپنی کھیتی کے غلہ میں سے ردی قسم کا غلہ قربانی کے لئے پیش کیا، دونوں کی حسنِ نیت اور نیتِ بد کا اندازہ اسی عمل سے ہو گیا، لہٰذا حسبِ دستور آگ نے آکر ہابیل کی نذر کو جلا دیا اور اس طرح قبولیت کا شرف اُس کے حصہ میں آیا۔

قابیل اپنی اس توہین کو کسی طرح برداشت نہ کر سکا اور اس نے غیظ و غضب میں آکر ہابیل سے کہا کہ میں تجھ کو قتل کئے بغیر نہ چھوڑوں گا تاکہ تو اپنی مراد کو نہ پہنچ سکے۔ ہابیل نے جواب دیا، میں تو کسی طرح تجھ پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا، باقی تیری جو مرضی آئے وہ کر، رہا قربانی کا معاملہ سو خدا کے یہاں تو نیک نیت ہی کی نذر قبول ہو سکتی ہے وہاں بدنیت کی نہ دھمکی کام آسکتی ہے اور نہ بے وجہ کا غم و غصہ، قابیل پر اس نصیحت کا اُلٹا اثر پڑا اور اس نے غصہ سے مشتعل ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔[1]

مگر قرآنِ عزیز میں شادی کا قصہ مذکور نہیں ہے، صرف قربانی (نذر) کا ذکر ہے، اور اس روایت سے زائد ہابیل کی نعش کے دفن کے متعلق یہ اضافہ ہے۔

قتل کے بعد قابیل حیران تھا کہ اس نعش کا کیا کرے؟ ابھی تک نسلِ آدمؑ موت سے دوچار نہیں ہوئی تھی اور اسی لئے حضرتِ آدمؑ نے مردے کے بارہ میں کوئی حکمِ الٰہی نہیں سُنایا تھا، یکایک اُس نے دیکھا کہ ایک کوّے نے زمین کُرید کُرید کر گڑھا کھودا، قابیل کو تنبہ ہوا کہ مجھے بھی اپنے بھائی کے لئے اسی طرح گڑھا کھودنا چاہئے اور بعض روایات میں ہے کہ کوّے نے دُوسرے مُردے کوّے کو اس گڑھے میں چُھپا دیا۔

قابیل نے یہ دیکھا تو اپنی ناکارہ زندگی پر بے حد افسوس کیا اور کہنے لگا کہ میں اِس

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۱ ص ۹۲۔

حیوان سے بھی گیا گذرا ہوں کہ اپنے اس جرم کو چھپانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا، ندامت سے سر جھکالیا اور پھر اسی طرح اپنے بھائی کی نعش کو سپرد خاک کردیا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ	اور سنا ان کو حال واقعی آدم کے دو بیٹوں کا جب نذر کی
قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ	دونوں نے کچھ نذر اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول
يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ	ہوئی دوسرے کی، کہا: میں تجھ کو مار ڈالوں گا، وہ بولا
إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ۝ لَئِنْ	اللہ قبول کرتا ہے پرہیزگاروں سے، اگر تو ہاتھ چلائے گا مجھ پر
بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا	مارنے کو میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر مارنے کو، میں ڈرتا ہوں اللہ
بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ إِنِّي	سے جو پروردگار ہے سب جہان کا، میں چاہتا ہوں کہ
أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ إِنِّي أُرِيدُ	(اس اقدام پر) تو میرا گناہ بھی حاصل کرلے اور اپنا
أَنْ تَبُوءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ فَتَكُونَ مِنْ	گناہ بھی، پھر ہو جائے تو دوزخ والوں میں سے اور
أَصْحَابِ النَّارِ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۝	یہی سزا ہے ظالموں کی، پس اس کو راضی کیا اس کے
فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُ	نفس نے خون پر اپنے بھائی کے، پھر اس کو مار ڈالا۔
فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ فَبَعَثَ اللَّهُ	سو ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں، پھر بھیجا اللہ نے
غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ	ایک کوا جو کریدتا تھا زمین کو تاکہ اس کو دکھلائے کس طرح
يُوَارِي سَوْءَةَ أَخِيهِ قَالَ يَا وَيْلَتَىٰ	چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی کی، بولا ہائے افسوس مجھ کو
أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَٰذَا الْغُرَابِ	اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کوے جیسا ہی ہوتا کہ چھپا لیتا
فَأُوَارِيَ سَوْءَةَ أَخِي فَأَصْبَحَ مِنَ	لاش اپنے بھائی کی، پھر لگا پچھتانے۔
النَّادِمِينَ ۝ مِنْ أَجْلِ ذَٰلِكَ كَتَبْنَا	اسی سبب سے لکھا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی
عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا	قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر
بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا	فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا ان سب
قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا	لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا

فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (مائدہ) زندہ کردیا سب لوگوں کو۔

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت کی ہے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں جب بھی کوئی
وسلم لا تقتل نفس ظلما الا	ظلم سے قتل ہوتا ہے تو اُس کا گناہ حضرت آدمؑ کے پہلے
کان علی ابن ادم الاول کفل	بیٹے (قابیل) کی گردن پر ضرور ہوتا ہے اس لئے کہ وہ پہلا
من دمھا لانہ کان اول من	شخص ہے جس نے ظالمانہ قتل کی ابتدا کی اور یہ ناپاک
سن القتل (مسند احمدؒ)	سنت جاری کی۔

دمشق کے شمال میں جبلِ قاسیون پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو مقتلِ ہابیل کے نام سے مشہور ہے، اور اس کے متعلق ابن عساکرؒ نے احمد بن کثیر کے تذکرہ میں انکا ایک خواب نقل کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپؐ کے ساتھ ہابیل بھی تھے، ہابیل نے بقسم کہا کہ میرا مقتل یہی ہے اور آپؐ نے ان کے قول کی تصدیق فرمائی، بہرحال یہ خواب ہی کی باتیں ہیں اور خواب کے سچے ہونے کے باوجود بھی اُس سے کوئی شرعی یا تاریخی حکم ثابت نہیں ہوسکتا۔

مقامِ عبرت | سورۂ مائدہ کی بیان کردہ آخری آیت اور سطورۂ بالا حدیث ہم پر یہ حقیقت آشکارا کرتی ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں ہرگز کسی بُری نئی ایجاد نہ کرنی چاہئے تاکہ وہ کل کو بدکاروں اور ظالموں کے لئے ایک نئے حربہ کا کام نہ دے، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات میں جو شخص بھی آئندہ اس "بدعت" کا اقدام کرے گا تو بانیٔ بدعت بھی برابر اس گناہ کا حصہ دار بنتا رہے گا اور موجد ہونے کی وجہ سے ابدی ذلت و خسران کا مستحق ٹھہرے گا، گناہ بہرحال گناہ ہے لیکن گناہ کی ایجاد موجد کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کا وبال سر سے باندھ دیتی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک)

۲- ہابیل خدائے تعالیٰ کا مقبول بندہ تھا اور قابیل بارگاہِ الٰہی کا راندہ ہوا،

اس لئے ضرورت تھی کہ ہابیل کے پاک جسم کی توہین نہ ہو، اور نسلِ آدمؑ کی کرامت و بزرگی قائم رکھنے کے لئے بعد مُردن "تدفین" کی سنت قائم ہو جائے اور تقاضائے انصاف تھا کہ قابیل کی اس کمینہ حرکت پر اس کو دنیا میں بھی ذلیل کیا جائے، اور اس قابل بنا دیا جائے کہ خود اس کو اپنی بے مائگیِ عقل و دانش اور کمینگی کا احساس ہو جائے اس لئے نہ اس کو الہام بخشا گیا اور نہ اس کمینہ حرکت کو چھپانے کے لئے عقل کی روشنی عطا کی گئی بلکہ ایک ایسے حیوان کو اُس کا رہنما بنایا گیا جو عیاری و مکاری میں طاق اور دنائتِ طبع میں ضرب المثل ہے، اور آخر کار قابیل کو یہ کہتے ہی بنا۔

يَا وَيْلَتَا أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ	ہائے افسوس! کیا میں ایسا گیا گذرا
مِثْلَ هَٰذَا الْغُرَابِ۔	ہو گیا کہ اس کوّے جیسا بھی نہ بن سکا۔

نوٹ:۔ اربابِ سیر و تاریخ کی عام روش یہ ہے کہ حضرتِ آدمؑ کے بعد حضرتِ ادریسؑ کا ذکر کرتے ہیں، اور حضرتِ نوحؑ کا اس کے بعد، مگر ہم نے ان اختلافات کے پیشِ نظر جو حضرتِ ادریسؑ سے متعلق عنقریب ذکر ہونے والے ہیں عام روش کے خلاف اُن کا تذکرہ حضرتِ نوحؑ کے تذکرہ کے بعد کیا ہے تاہم جن اربابِ ذوق کو یہ گراں گذرے وہ حضرتِ آدمؑ کے تذکرہ کے بعد حضرتِ ادریسؑ کے تذکرہ کا مطالعہ کریں اور پھر حضرتِ نوح علیہ السلام کا۔

حضرتِ نوح علیہ السلام

قرآنِ عزیز میں حضرتِ نوحؑ کا تذکرہ - حضرتِ نوحؑ پہلے رسول ہیں - نسب نامہ

حضرتِ نوحؑ پہلے رسول ہیں - نسب نامہ، قرآنِ عزیز میں حضرت نوحؑ کا تذکرہ، قومِ نوح - دعوت و تبلیغ اور قوم کی نافرمانی - بناءِ سفینہ - پسرِ نوح - کوہِ جودی - طوفانِ نوح عام تھا یا خاص - پسرِ نوح کی نسبی بحث، ایک اخلاقی مسئلہ، چند ضمنی مسائل،

حضرت نوح (علیہ السلام) پہلے رسول ہیں حضرت آدم (علیہ السلام) کے بعد یہ پہلے نبی ہیں جنکو رسالت[1] سے نوازا گیا، صحیح مسلم بابِ شفاعت میں حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت ہے، اس میں یہ تصریح ہے۔

یا نوح انت اول الرسل الی الارض اے نوحؑ تو زمین پر سب سے پہلا رسول بنایا گیا

نسب نامہ علم الانساب کے ماہرین نے حضرتِ نوحؑ کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:-

نوح بن لامک بن متوشلخ بن اخنوخ یا خنوخ بن یارد بن مہلئیل بن قینان بن انوش بن شیث (علیہ السلام) بن آدم (علیہ السلام)

اگرچہ مورخین اور تورات (سفرِ تکوین) نے اسی کو صحیح مانا ہے لیکن ہم کو اس کی صحت میں شک اور تردد ہے، بلکہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام اور حضرتِ نوح (علیہ السلام) کے درمیان ان بیان کردہ سلسلوں سے زیادہ سلسلے ہیں تورات میں خلقِ آدم (علیہ السلام) اور ولادتِ حضرتِ نوح (علیہ السلام) نیز وفاتِ آدمؑ اور ولادتِ نوحؑ کی درمیانی مدت کا جو تذکرہ ہے ہم اس کو بھی نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں، البتہ یہ

[1] جس انسان پر خدا کی وحی نازل ہوتی ہے وہ "نبی" ہے اور جس کو جدید شریعت بھی عطا کی گئی ہو وہ "رسول" ہے۔

بات پیشِ نظر ہے کہ توراۃ کے عبرانی، سامی اور یونانی زبان کے نسخوں میں بہت زیادہ اختلاف ہے اور اس بحث پر علامہ شیخ رحمۃ اللہ ہندی (کیرانہ ضلع مظفر نگر) کی مشہور کتاب "اظہارِ حق" قابلِ مطالعہ ہے، بہرحال توراۃ سے منقول نقشہ حسب ذیل ہے:-

نقشہ (۱)

سال	عمر بوقتِ ولادتِ پسر		
۱۳۰	آدم (علیہ السلام)	بوقتِ ولادتِ	شیثؑ
۱۵۰	شیثؑ	"	انوش
۹۰	انوش	"	قینان
۷۰	قینان	"	مہلئیل
۶۵	مہلئیل	"	یارُد
۱۶۲	یارُد	"	اُخنوخ
۶۵	اُخنوخ	"	متوشالح
۱۸۷	متوشالح	"	لامک
۱۸۲	لامک	"	نوحؑ

نقشہ (۲)

مدت درمیان خلق آدمؑ و ولادتِ نوحؑ	۱۰۵۶
عمر آدم علیہ السلام	۹۳۰
مدت درمیان وفاتِ آدمؑ و ولادتِ نوحؑ	۱۰۲۶

آپ اگر ان دونوں نقشوں کے درمیان حسابی مطابقت کرنا چاہیں تو کامیاب

نہ ہوسکیں گے اس لئے کہ سطورِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہوچکی ہے کہ یہ سب تخمین و ظن پر مبنی ہے اور اسی وجہ سے اس مسئلہ میں توراۃ کے مختلف نسخوں میں بھی کافی اختلاف و انتشار پایا جاتا ہے۔

قرآنِ عزیز میں حضرت نوحؑ کا تذکرہ قرآنِ عزیز کے معجز نما نظمِ کلام کی یہ سنت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں سے جب کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اپنے مقصد "وعظ و تذکیر" کے پیشِ نظر واقعہ کی اُن ہی جزئیات کو نقل کرتا ہے جو مقصد کے لئے ضروری ہیں اور اجمال و تفصیل اور تکرارِ واقعہ میں بھی صرف ایک ہی مقصد اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ یہی "موعظت و عبرت" کا مقصد ہے، چنانچہ اسی اسلوبِ بیان کے مطابق قرآنِ عزیز نے حضرتِ نوح علیہ السلام کے واقعہ کا اجمالی و تفصیلی ذکر تینتالیس ۴۳ جگہ کیا ہے، جس کا ثبوت مسطورۂ ذیل جدول سے ہوتا ہے۔

سورت	آیۃ	سورت	آیۃ	سورت	آیۃ
آل عمران	۳۳	مریم	۵۸	غافر	۵ - ۳۱
النساء	۱۶۳	الانبیاء	۷۶	الشوریٰ	۱۳
انعام	۸۴	الحج	۴۲	قٓ	۱۲
اعراف	۵۹ - ۶۹	المومنون	۲۳	الذاریات	۴۶
التوبہ	۷۰	الفرقان	۳۷	النجم	۵۲
یونس	۷۱	الشعراء	۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۶	القمر	۹
هود	۲۵-۳۲-۳۶-۴۲، ۴۵-۴۶-۴۸-۸۹	العنکبوت	۱۴	الحدید	۲۶
		الاحزاب	۷	التحریم	۱۰
ابراهیم	۹	الصافات	۷۵، ۷۹	نوح	۱، ۲۱، ۲۶
الاسراء	۳ - ۱۷	ص	۱۲		

لیکن اس واقعہ کی اہم تفصیلات صرف سورۂ اعراف، ہود، مومنون، شعراء، قمر، اور سورۂ نوح ہی میں بیان ہوئی ہیں، ان سے حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے متعلق جس قسم کی تاریخ بنتی ہے وہی ہمارا موضوعِ بیان ہے۔

قومِ نوحؑ

حضرت نوحؑ کی بعثت سے پہلے تمام قوم خدا کی توحید اور صحیح مذہبی روشنی سے یکسر ناآشنا ہو چکی تھی اور حقیقی خدا کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی تھی، غیر اللہ کی پرستش اور اصنام پرستی ان کا شعار تھا۔

دعوت و تبلیغ اور قوم کی نافرمانی

آخر سنت اللہ کے مطابق اُن کے رشد و ہدایت کے لئے بھی ان ہی میں سے ایک ہادی اور خدا کے سچے رسول نوح (علیہ السلام) کو مبعوث کیا گیا۔

حضرتِ نوحؑ نے اپنی قوم کو راہِ حق کی طرف پکارا اور سچے مذہب کی دعوت دی، لیکن قوم نے نہ مانا اور نفرت و حقارت کے ساتھ انکار پر اصرار کیا۔ امراء و رؤساءِ قوم نے اُن کی تکذیب و تحقیر کا کوئی پہلو نہ چھوڑا اور اُن کے پیرووں نے ان ہی کی تقلید و پیروی کے ثبوت میں ہر قسم کی تذلیل و توہین کے طریقوں کو حضرتِ نوحؑ پر آزمایا، انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ جس کو نہ ہم پر دولت و ثروت میں برتری حاصل ہے اور نہ وہ انسانیت کے رتبہ سے بلند "فرشتہ ہیکل" ہے، اُس کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارا پیشوا بنے، اور ہم اُس کے احکام کی تعمیل کریں؟

وہ غریب اور کمزور افرادِ قوم کو جب حضرتِ نوح علیہ السلام کا تابع اور پیرو دیکھتے تو مغرورانہ انداز میں حقارت سے کہتے "ہم ان کی طرح نہیں ہیں کہ تیرے تابع فرمان بن جائیں اور تجھ کو اپنا مقتدا مان لیں" وہ سمجھتے تھے کہ یہ کمزور اور پست لوگ نوحؑ کے اندھے مقلد ہیں، نہ یہ ذی رائے ہیں کہ ہماری طرح اپنی جچی پرکھی رائے سے کام لیتے اور نہ ذی شعور ہیں کہ حقیقت حال کو سمجھ لیتے۔ اور اگر وہ حضرتِ نوحؑ کی بات کی طرف

کبھی توجہ بھی دیتے تو اُن سے، اصرار کرتے کہ پہلے ان پست اور غریب افرادِ قوم کو اپنے پاس سے نکال دے تب ہم تیری بات سنیں گے کیوں کہ ہم کو اِن سے گھن آتی ہے اور ہم اور یہ ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔

حضرتِ نوحؑ اس کا ایک ہی جواب دیتے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کیونکہ یہ خدا کے مخلص بندے ہیں۔ اگر میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ کروں جس کے تم خواہش مند ہو تو خدا کے عذاب سے میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ میں اس کے دردناک عذاب سے ڈرتا ہوں، اُس کے یہاں اخلاص کی قدر ہے، امیر و غریب کا وہاں کوئی سوال نہیں ہے نیز ارشاد فرماتے کہ میں تمہارے پاس خدا کی ہدایت کا پیغام لے کر آیا ہوں، نہ میں نے غیب دانی کا دعویٰ کیا ہے اور نہ فرشتہ ہونے کا، خدا کا برگزیدہ پیغمبر اور رسول ہوں اور دعوت و ارشاد میرا مقصد و نصب العین ہے، اس کو سرمایہ دارانہ بلندی، غیب دانی، یا فرشتہ ہیکل ہونے سے کیا واسطہ؟ یہ کمزور و نادار افرادِ قوم جو خدا پر سچے دل سے ایمان لائے ہیں تمہاری نگاہ میں اس لئے حقیر و ذلیل ہیں کہ وہ تمہاری طرح صاحبِ دولت و مال نہیں ہیں اور اسی لئے تمہارے خیال میں یہ نہ خیر حاصل کر سکتے ہیں اور نہ سعادت، کیونکہ یہ دونوں چیزیں دولت و حشمت کے ساتھ ہیں نہ کہ نکبت و افلاس کے ساتھ۔

سو واضح رہے کہ خدا کی سعادت و خیر کا قانون ظاہری دولت و حشمت کے تابع نہیں ہے اور نہ اس کے یہاں سعادت و ہدایت کا حصول و ادراک سرمایہ کی رونق کے زیرِ اثر ہے بلکہ اس کے برعکس طمانیتِ نفس، رضاءِ الٰہی، غناءِ قلب اور اخلاصِ نیت و عمل پر موقوف ہے۔

حضرتِ نوحؑ نے یہ بھی بارہا تنبیہ کی کہ مجھ کو اپنی اس ابلاغِ دعوت و ارسالِ ہدایت میں نہ تمہارے مال کی خواہش ہے نہ جاہ و منصب کی۔ میں اجرت کا طلبگار نہیں ہوں، اس خدمت کا حقیقی اجر و ثواب تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اور وہی بہترین قدردان ہے

غرض سورۂ ہود حق و تبلیغ کے ان تمام مکالموں، مناظروں اور پیغاماتِ حق کے ان ہی ارشاداتِ عالیہ کا ایک غیر فانی ذخیرہ ہے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ	اس پر قوم کے اُن سرداروں نے جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا ہم
قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا	تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو
وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ	اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی اُن لوگوں کے سوا کوئی دکھائی
اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ	نہیں دیتا جو ہم میں ذلیل و حقیر ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لیے ہیں
عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ	ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔
كٰذِبِيْنَ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ	نوحؑ نے کہا "اے میری قوم کے لوگو تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے
كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ	پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں اور اس نے اپنے حضور سے ایک
رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ	رحمت بھی مجھے بخشدی ہو (یعنی راہِ حق دکھا دی ہو) مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے
عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ	(تو میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟) کیا ہم جبراً تمہیں
لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ	راہ دکھا دیں، حالانکہ تم اس سے بیزار ہو۔ لوگو! یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں تو اس
عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا	مال و دولت کا تم سے طالب نہیں، میری خدمت کی مزدوری جو کچھ ہے صرف اللہ
عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ	پر ہے، اور یہ بھی سمجھ لو کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں (وہ تمہاری نظروں میں کتنے ہی
اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ	ذلیل ہوں مگر) میں ایسا کرنے والا نہیں کہ اپنے پاس سے انہیں ہنکا دوں انہیں
اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ	بھی اپنے پروردگار سے (ایک دن) ملنا ہے (اور وہ ہم سب کے اعمال کا حساب
مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ	لینے والا ہے) لیکن (میں تمہیں سمجھاؤں تو کس طرح سمجھاؤں) میں دیکھتا ہوں کہ
طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَلَآ	تم ایک جماعت ہو (حقیقت سے) جاہل اے میری قوم کے لوگو! مجھے بتاؤ اگر
اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ	میں ان لوگوں کو اپنے پاس سے نکال باہر کردوں (اور اللہ کی طرف سے مواخذہ ہو
وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ	جس کے نزدیک معیار قبولیت ایمان و عمل ہے نہ تمہاری گھڑی ہوئی شرافت و ذلت)
مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ	تو اللہ کے مقابلہ میں کون ہے جو میری مدد کریگا؟ (افسوس تم پر!) کیا تم غور نہیں کرتے؟

أَعْيُنُكُمْ لَنْ يُؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۖ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ ۖ إِنِّي إِذًا لَمِنَ الظّٰلِمِينَ ۝ (هود عٓ)

اور دیکھو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ جن لوگوں کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو، اللہ انہیں بھلائی نہیں دے گا (جیسا کہ تمہارا اعتقاد ہے) اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے، اگر میں تمہاری خواہش کے مطابق ایسا کہوں، تو جو نہی ایسی بات کہی، میں ظالموں میں سے ہوگیا!"

بہرحال حضرت نوح ؑ نے انتہائی کوشش کی کہ بدبخت قوم سمجھ جائے اور رحمتِ الٰہی کی آغوش میں آجائے مگر قوم نے نہ مانا اور جس قدر اس جانب سے تبلیغِ حق میں جدّوجہد ہوئی اسی قدر قوم کی جانب سے بغض و عناد میں سرگرمی کا اظہار رہا، اور ایذا رسانی اور تکلیف دہی کے تمام وسائل کا استعمال کیا گیا اور اُن کے بڑوں نے عوام سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم کسی طرح وَدّ، سواع، یغوث، یعوق، اور نسر جیسے بتوں کی پرستش کو نہ چھوڑو۔

یہی وہ مباحث ہیں جن کو سورۂ نوح میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور جو بلاشبہ ہدایت و ضلالت کے مہم مسائل کو آشکارا کرتے ہیں۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ اللّٰهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ ۖ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۝

ہم نے بھیجا نوح ؑ کو اُس کی قوم کی طرف کہ ڈرا اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ پہنچے اُن پر عذاب دردناک، بولا اے قوم میری میں تم کو ڈر سناتا ہوں کھول کر کہ بندگی کرو اللہ کی اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو تاکہ بخشے وہ تم کو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک مقررہ وعدہ تک، وہ جو وعدہ کیا ہے اللہ نے، جب آپہونچے گا اس کو ڈھیل نہ ہوگی اگر تم کو سمجھ ہے۔ بولا اے رب میں بلاتا رہا اپنی قوم

فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ○	کو رات اور دن ، پھر میرے بلانے سے اور زیادہ
وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا	بھاگنے لگے ، اور میں نے جب کبھی ان کو بلایا تاکہ
اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا	تو ان کو بخشے ، ڈالنے لگے انگلیاں اپنے کانوں میں
ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ	اور لپیٹنے لگے اپنے اوپر کپڑے ، اور ضد کی اور غرور
ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۙ ثُمَّ اِنِّيْٓ	کیا بڑا غرور ، پھر میں نے اُن کو بُلایا برملا ، پھر میں نے
اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۙ	ان کو کھول کر کہا اور چھپ کر کہا چپکے سے تو
فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ	میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے ، بیشک
كَانَ غَفَّارًا ۙ (نوح ع)	وہ ہے بخشنے والا۔
وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ	اور انھوں نے (اپنے عوام سے) کہا ہرگز اپنے
وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ڏ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ	معبودوں کو نہ چھوڑو اور ودّ ، سواع ، یغوث
وَنَسْرًا ۚ (نوح ع)	یعوق اور نسر کو نہ چھوڑو۔

اور آخر میں زچ ہو کر کہنے لگے "اے نوحؑ ! اب ہم سے جنگ و جدل نہ کر اور ہمارے اس انکار پر اپنے خدا کا جو عذاب لا سکتا ہے لے آ۔"

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ	وہ کہنے لگے " اے نوح ! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور
جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ	بہت جھگڑا کیا اب اس کو ختم کر" اور جو تو نے ہم سے
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۔ (هود ع)	(عذابِ الٰہی کا) وعدہ کیا ہے وہ لے آ۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہ سُن کر اُن کو جواب دیا کہ عذابِ الٰہی میرے قبضہ میں نہیں ہے وہ تو اس کے قبضہ میں ہے جس نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا ہے ، وہ چاہے گا تو یہ سب کچھ بھی ہو جائے گا۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ	نوح نے کہا ضرور اگر اللہ چاہے گا تو اس عذاب کو بھی
وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (هود ع)	لے آئیگا اور تم اُس کو تھکا دینے والے نہیں ہو۔

بہرحال جب قوم کی ہدایت سے حضرت نوح علیہ السلام بالکل مایوس ہوگئے اور اس کی باطل کوشی اور عناد اور ہٹ دھرمی اُن پر واضح ہوگئی اور قرآنی تصریح کے مطابق ساڑھے نوسو سال کی پیہم دعوت و تبلیغ کا اُن پر کوئی اثر نہ دیکھا تو سخت ملول اور پریشان خاطر ہوئے تب خدائے تعالٰی نے ان کی تسلی کے لئے فرمایا۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ	اور نوح پر وحی کی گئی کہ جو ایمان لے آئے وہ لے آئے
قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ	اب ان میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے
بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ (هود ع)	پس ان کی حرکات پر غم نہ کر۔

جب حضرت نوحؑ کو یہ معلوم ہوگیا کہ ان کے ابلاغ حق میں کوتاہی نہیں ہے بلکہ خود نہ ماننے والوں کی استعداد کا قصور ہے، اور ان کی اپنی سرکشی کا نتیجہ، تب ان کے اعمال اور کینہ حرکات سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں یہ دعا فرمائی۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ	اے پروردگار، تو کافروں میں سے کسی کو بھی زمین پر باقی
دَيَّارًا۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ	نہ چھوڑ اگر تو ان کو یونہی چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں
وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ○	کو بھی گمراہ کرینگے اور اُن کی نسل بھی انہی کی طرح نافرمان
(نوح ع)	پیدا ہوگی۔

بناءِ سفینہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ نوحؑ کی دعاء قبول فرمائی۔ اور اپنے قانونِ جزاءِ اعمال کے مطابق سرکشوں کی سرکشی اور متمردوں کے تمرد کی سزا کا اعلان کر دیا، اور حفظِ ماتقدم کے لئے پہلے حضرتِ نوح علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ وہ ایک کشتی تیار کریں، تاکہ اسبابِ ظاہری کے اعتبار سے وہ اور مومنینِ قانتین اس عذاب سے محفوظ رہیں جو خدا کے نافرمانوں پر نازل ہونے والا ہے۔ حضرتِ نوحؑ نے جب حکمِ ربّ میں کشتی بنانی شروع کی تو کفار نے ہنسی اُڑانا اور مذاق بنانا شروع کر دیا۔ اور جب کبھی اُن کا اُدھر سے گذر ہوتا تو کہتے کہ خوب! جب ہم غرق ہونے لگیں گے تب تو اور تیرے پیرو اس کشتی میں

محفوظ رہ کر نجات پاجائیں گے، کیسا احمقانہ خیال ہے" حضرتِ نوح (علیہ السلام) بھی انکو انجامِ کار سے غفلت اور خدا کی نافرمانی پر جرأت دیکھ کر اُن ہی کے طرز پر جواب دیتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ۝ (هود ع)

اے نوح تو ہماری حفاظت میں ہماری وحی کے مطابق سفینہ تیار کئے جا اور اب مجھ سے انکے متعلق کچھ نہ کہو۔ یہ بلاشبہ غرق ہونے والے ہیں۔

آخر سفینۂ نوح (علیہ السلام) بن کر تیار ہو گیا۔ اب خدا کے وعدۂ عذاب کا وقت قریب آیا اور حضرتِ نوحؑ نے اُس پہلی علامت کو دیکھا جس کا ذکر اُن سے کیا گیا تھا، یعنی زمین کی تہ میں سے پانی کا چشمہ اُبلنا شروع ہو گیا۔ تب وحی الٰہی نے ان کو حکم سنایا کہ کشتی میں اپنے خاندان کو بیٹھنے کا حکم دو اور تمام جانداروں میں سے ہر ایک کا ایک جوڑا بھی کشتی میں پناہگیر ہو، اور وہ مختصر جماعت (تقریباً چالیس نفر) بھی جو تجھ پر ایمان لا چکی ہے کشتی میں سوار ہو جائے۔

جب وحی الٰہی کی تعمیل پُوری ہو گئی تو اب آسمان کو حکم ہوا کہ پانی برسنا شروع ہو' اور زمین کے چشموں کو امر کیا گیا کہ وہ پوری طرح اُبل پڑیں۔

خدا کے حکم سے جب یہ سب کچھ ہوتا رہا تو کشتی بھی اُس کی حفاظت میں پانی پر ایک مدت تک محفوظ تیرتی رہی تا آنکہ تمام منکرین و معاندین غرق آب ہو گئے اور خدائے تعالیٰ کے قانون "جزاءِ اعمال" کے مطابق اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے۔

پسرِ نوحؑ اس مقام پر ایک مسئلہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ حضرتِ نوح (علیہ السلام) نے طوفانی عذاب کے وقت خدائے تعالیٰ سے اپنے بیٹے کی نجات کے متعلق سفارش کی اور خدائے تعالیٰ نے ان کو اس سفارش سے روک دیا۔ اِس مسئلہ کی اہمیت قرآنِ عزیز کی

حسب ذیل آیات سے پیدا ہوتی ہے:۔

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ	اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا اے پروردگار میرا بیٹا
ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ	میرے اہل ہی میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین
وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ○ قَالَ	حاکموں میں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے کہا اے نوح! یہ تیرے
يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ	اہل میں سے نہیں ہے یہ بدکردار ہے، پس تجھ کو ایسا
عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِ	سوال نہ کرنا چاہئے جس کے بارہ میں تجھ کو علم نہ ہو میں بلاشبہ
مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعِظُكَ	تجھ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں سے نہ بن،
أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ○ قَالَ	نوح نے کہا " اے رب میں بلاتردد اس بارہ میں
رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ	کہ جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو تجھ سے سوال کروں
مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي	تیری پناہ چاہتا ہوں اور اگر تو نے معاف
وَتَرْحَمْنِي أَكُن مِّنَ الْخَاسِرِينَ ○	نہ کیا اور رحم نہ کیا تو میں نقصان اُٹھانے والوں میں
قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا	ہوں گا۔ نوح سے کہہ دیا گیا " اے نوح! ہماری
وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ	جانب سے تو اور تیرے ہمراہی ہماری سلامتی اور
مِّمَّن مَّعَكَ ○ (ہود ع ۴)	برکتوں کے ساتھ زمین پر اُترو۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ نوح (علیہ السلام) سے خدا کا وعدہ تھا کہ وہ ان کے اہل کو نجات دے گا، اس لئے حضرتِ نوح نے اپنے بیٹے (کنعان) کے لئے دعا مانگی جس پر رب العالمین کی جانب سے عتاب ہوا کہ تم کو جس شئے کا علم نہ ہو اس کے متعلق اس طرز سے سوال کرنے کا حق نہیں ہے اس پر حضرتِ نوح نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور خدائے تعالیٰ سے مغفرت و رحمت طلب کی اور اس کی جانب سے بھی خواہش کے مطابق جواب ملا۔

تو اب غور طلب بات یہ ہے کہ حضرتِ نوح (علیہ السلام) کا سوال کس وعدہ پر مبنی تھا۔

اور آیا وہ وعدہ پورا ہوا یا نہیں اور حضرتِ نوحؑ کو اس وعدہ کے سمجھنے میں کس قسم کی غلط فہمی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی تنبیہ پر انھوں نے کس طرح اصل حقیقت کو سمجھ لیا؟

اس سوال کے جواب میں حسبِ ذیل آیت قابلِ توجہ ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ	تا آنکہ جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا اور تنور سے پانی
قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ	اُبل پڑا تو ہم نے (نوح سے) کہا کہ ہر جاندار میں سے
اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ	ایک ایک جوڑا کشتی میں اٹھا لو اور اُس کے علاوہ جس پر خدا
عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ	کا فرمان ناطق ہو چکا ہے "اپنے اہل کو بھی اور جو تجھ پر ایمان
اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ (ہود ع)	لائے ہیں ان کو بھی اور وہ بہت تھوڑے ہیں۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرتِ نوحؑ سے حق تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ تم اپنی اس کشتی میں جو اہلِ نجات کے لئے تیار کی گئی ہے اپنے اہل کو بٹھا لو لیکن تمہارا پورا کنبہ نجات یافتہ نہیں ہے بلکہ بعض ایسے بھی ہیں جن پر خدا کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے "اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ"

چونکہ حضرتِ نوح علیہ السلام اپنی بیوی کے سابقہ کافرانہ عقائد و اعمال کی بنا پر اس بات سے مایوس ہو چکے تھے کہ وہ خدائے برحق پر ایمان لائے اور توحید کی آواز پر لبیک کہے! اس لئے اس استثناء کا مصداق صرف اُسی کو سمجھے اور بیٹے کی محبت میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ نوعمر ہے شاید کشتی میں مومنین کی صحبت سے فائدہ اٹھا کر ایمان لے آئے اور کافروں کی مجالس کے اثرات کو محو کر دے، خدائے تعالیٰ کے ارشاد "واھلک" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے درگاہِ الٰہی میں کنعان کی نجات کی دعا کی، مگر اللہ تعالیٰ کو اپنے جلیل القدر پیغمبر کا یہ "قیاس" پسند نہ آیا اور ان کو تنبیہ کی کہ جو ہستی خدا کی "وحی" سے ہر وقت مستفیض ہوتی رہتی ہو اس کو جذبۂ محبتِ پدری میں اس قدر سرشار نہ ہو جانا چاہیئے کہ "وحیِ الٰہی" کا انتظار کئے بغیر خود ہی قیاس آرائی کر کے انجام تک کا فیصلہ کر بیٹھے؟ حالانکہ وعدۂ نجات

صرف مومنین کے لئے مخصوص ہے اور کنعان کافروں کے ساتھ کافر ہی رہے گا، بلا شبہ تمہارا اس قسم کا سوال منصبِ رسالت و نبوت کے شایانِ شان نہیں ہے۔

گویا حضرتِ نوح ؑ سے خدائے تعالیٰ کا یہ خطاب دراصل عتاب نہیں تھا بلکہ مشاہدۂ حقیقت کے لئے ایک پکار تھی جس کو انھوں نے سُنا اور اپنی بشریت و عبدیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ مغفرت کے طالب ہوئے اور خدا کی سلامتی اور برکت حاصل کر کے شاد کام و بامُراد بنے، پس یہ سوال نہ معصیت کا سوال تھا اور نہ عصمتِ انبیاء کے منافی، اسلئے خطابِ الٰہی نے اس کو "نادانی" سے تعبیر کیا نہ کہ گناہ اور نافرمانی سے۔

بہرحال حضرتِ نوح ؑ کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ وعدۂ نجات کا منشاء نسل و خاندان نہیں ہے "بلکہ" ایمان باللہ" ہے، اس لئے انھوں نے اپنا رُخ بدل کر کنعان کو مخاطب کیا اور اپنا منصبِ دعوت ادا کرتے ہوئے چاہا کہ وہ بھی "مومن" بن کر "نجاتِ الٰہی" سے بہرہ ور ہو، مگر اُس بدبخت نے جواب دیا:۔

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ	کہا: میں بہت جلد کسی پہاڑ کی پناہ لیتا ہوں کہ وہ مجھ کو
مِنَ الْمَاۗءِ ۭ (ہود ع)	غرقابی سے بچالے گا۔

حضرتِ نوح ؑ نے یہ سُن کر فرمایا:۔

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ	آج کوئی خدا کے حکم سے بچانے والا نہیں ہے صرف وہی
اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ	بچے گا جس پر خدا کا رحم ہو جائے اس درمیان میں اُن
وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ	دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی اور وہ غرق ہونیوالوں
فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ (ہود ع)	میں سے ایک ہوگیا۔

کوہِ جودی | غرض جب حکمِ الٰہی سے عذاب ختم ہوا تو سفینۂ نوح "جودی" پر جا کر ٹھہر گیا۔

وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَي الْجُوْدِيِّ	اور حکم پورا ہوا اور کشتی جودی پر جا ٹھہری اور اعلان
وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ (ہود ع)	کر دیا گیا کہ قومِ ظالمین کے لئے ہلاکت ہے۔

توراۃ میں جودی کو اراراط کے پہاڑوں میں سے بتایا گیا ہے اراراط درحقیقت جزیرہ کا نام ہے یعنی اُس علاقہ کا نام جو فرات و دجلہ کے درمیان دیارِ بکر سے بغداد تک مسلسل چلا گیا ہے؛ پانی آہستہ آہستہ خشک ہونا شروع ہو گیا اور ساکنانِ کشتی نے دوسری بار امن و سلامتی کے ساتھ خدا کی سرزمین پر قدم رکھا، اسی بناء پر حضرتِ نوح (علیہ السلام) کا لقب "ابوالبشرِ ثانی" یا "آدمِ ثانی" (یعنی انسانوں کا دوسرا باپ) مشہور ہوا، اور غالباً اسی اعتبار سے حدیث میں ان کو "اوّل الرسل" کہا گیا۔

اگرچہ یہاں پہنچ کر واقعہ کی تفصیلات ختم ہو جاتی ہیں تاہم اس اہم واقعہ میں جو علمی اور تاریخی سوالات پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کیے گئے ہیں وہ بھی قابلِ ذکر و مذاکرہ ہیں جو ترتیب وار درج ذیل ہیں۔

۱۔ طوفانِ نوح عام تھا یا خاص | کیا طوفانِ نوح تمام کرۂ ارضی پر آیا تھا یا کسی خاص خطہ پر؟ اس کے متعلق علماءِ قدیم و جدید میں ہمیشہ سے دو رائے رہی ہیں، علمائے اسلام میں سے ایک جماعت، علماءِ یہود و نصاریٰ، اور بعض ماہرینِ علوم فلکیات، طبقات الارض، اور تاریخ طبیعات کی یہ رائے ہے کہ یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر نہیں آیا تھا بلکہ صرف اُسی خطہ میں محدود تھا جہاں حضرتِ نوحؑ کی قوم آباد تھی اور یہ علاقہ مساحت کے اعتبار سے ایک لاکھ چالیس ہزار کیلو میٹر مربع ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک طوفانِ نوح کے خاص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ طوفان عام تھا تو اس کے آثار کرۂ ارضی کے مختلف گوشوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ملنے چاہئیں تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، نیز اس زمانہ میں انسانی آبادی بہت ہی محدود تھی اور وہی خطہ تھا جہاں حضرتِ نوح (علیہ السلام) اور اُن کی قوم آباد تھی، ابھی حضرتِ آدم (علیہ السلام) کی اولاد کا سلسلہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہوا تھا جو کہ اس علاقہ میں آباد تھا۔ لہٰذا وہی مستحقِ عذاب تھے اور ان ہی پر طوفان کا یہ عذاب بھیجا گیا۔ باقی کرۂ زمین کو اس سے کوئی علاقہ نہ تھا۔

اور بعض علماءِ اسلام اور ماہرین طبقات الارض اور علماءِ طبیعات کے نزدیک یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر حاوی تھا اور ایک یہی نہیں بلکہ ان کے خیال میں اس زمین پر متعدد ایسے طوفان آئے ہیں، ان ہی میں سے ایک یہ بھی تھا اور وہ پہلی رائے کے تسلیم کرنیوالوں کو "آثار" سے متعلق سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ "جزیرہ" یا عراقِ عرب کی اس سرزمین کے علاوہ بلند پہاڑوں پر بھی ایسے حیوانات کے ڈھانچے اور ہڈیاں بکثرت پائی گئی ہیں جن کے متعلق ماہرینِ علمِ طبقات الارض کی یہ رائے ہے کہ یہ حیوانات مائی ہی ہیں اور صرف پانی ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں، پانی سے باہر ایک لمحہ بھی ان کی زندگی دشوار ہے، اس لئے کرۂ ارض کے مختلف پہاڑوں کی ان بلند چوٹیوں پر ان کا ثبوت اس کی دلیل ہے کہ کسی زمانہ میں پانی کا ایک ہیبتناک طوفان آیا جس نے پہاڑوں کی اُن چوٹیوں کو بھی اپنی غرقابی سے نہ چھوڑا۔

ان ہر دو خیالات و آراء کی اُن تمام تفصیلات کے بعد جن کا مختصر خاکہ مضمون زیرِ بحث میں درج ہے اہلِ تحقیق کی یہ رائے ہے کہ صحیح مسلک یہی ہے کہ طوفان خاص تھا عام نہ تھا۔ اور یہ مسئلہ بھی محلِ نظر ہے کہ تمام کائناتِ انسانی صرف حضرتِ نوح علیہ السّلام کی نسل سے ہے، اور آیت اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ بھی کچھ اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

البتہ قرآنِ عزیز نے "سنت اللہ" کے مطابق صرف ان ہی تفصیلات پر توجہ کی ہے جو عظمت و عبرت کے لئے ضروری تھے اور باقی مباحث سے قطعاً کوئی تعرض نہیں کیا اور ان کو انسانی علوم کی ترقی کے حوالہ کر دیا، وہ تو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ تاریخ کا یہ واقعہ اہلِ عقل و شعور کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ آج سے ہزاروں سال قبل ایک قوم نے خدا کی نافرمانی پر اصرار کیا اور اس کے بھیجے ہوئے ہادی حضرتِ نوح علیہ السلام کے رشد و ہدایت کے پیغام کو جھٹلایا، ٹھکرایا، اور قبول کرنے سے انکار کر دیا تو خدائے تعالیٰ نے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا اور ایسے سرکشوں اور متمردوں کو طوفانِ باد و باراں میں غرق کر کے تباہ و برباد کر دیا

اور اسی حالت میں حضرتِ نوحؑ اور مختصر سی ایمان دار جماعت کو محفوظ رکھ کر نجات دی۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔

پسرِ نوحؑ کی نسبی بحث

بعض علماء نے حضرتِ نوحؑ کے اِس بیٹے کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ حقیقی بیٹا نہ تھا اور پھر اس بارہ میں دو جدا جدا دعوے کئے ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ "ربیب" تھا، یعنی حضرتِ نوحؑ کی بیوی کے پہلے شوہر کا لڑکا تھا جو حضرتِ نوحؑ سے نکاح کے بعد ان کی آغوش میں پلا بڑھا، اور دوسری جماعت حضرتِ نوحؑ کی اُس کافرہ بیوی پر خیانتِ عصمت کا الزام لگاتی ہے۔

ان علماء کو ان غیر مستند اور دُور از صواب تاویلوں کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ اُن کے خیال میں پیغمبر کا بیٹا کافر ہو یہ بہت مستبعد اور عجیب معلوم ہوتا ہے۔؟

مگر تعجب ہے کہ وہ اس نصِ قرآنی کو کیوں فراموش کر جاتے ہیں کہ حضرتِ ابراہیمؑ کے باپ "آذر" بُت تراش و بُت پرست کافر تھے، پس اگر ایک جلیل القدر پیغمبر کے باپ کے کفر سے رسولِ خدا کی جلالت و عظمت اور منصبِ رسالت و نبوت میں مطلق فرق نہیں آتا تو پھر عظیم المرتبت رسول و نبی کے بیٹے کے کفر سے اس پیغمبر کی عظمت و جلالتِ قدر میں کیسا نقص آسکتا ہے بلکہ ایک حقیقت بین نگاہ اور حقیقت شناس کے نزدیک تو یہ ربُّ العٰلمین اور خالقِ کائنات کی قدرتِ کاملہ کا مظہرِ اَتم ہے کہ وہ بنجر زمین میں گلاب اگا دیتا، اور گلاب کے مہکتے ہوئے پھولوں کے ساتھ خار پیدا کر دیتا ہے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔

پس جبکہ قرآنِ عزیز نے یہ تصریح کی ہے کہ کنعان حضرتِ نوحؑ کا بیٹا تھا تو بلا وجہ ان رکیک اور بے سند تاویلات کی کیا حاجت ؟

ایک اخلاقی مسئلہ

اس مقام پر اگرچہ علامہ عبدالوہاب نجار نے قرآنِ عزیز کی تصریح ہی کو تسلیم کیا ہے، تاہم ان کے نزدیک حضرتِ نوحؑ کی بیوی بصراحتِ قرآن اگر کافر ہو سکتی ہے تو اس پر خیانتِ عصمت کا الزام عائد کرنا بھی کوئی نا واجب بات نہیں ہے۔

مگر مجھ کو ان جیسے تمام مقامات میں ان بزرگوں سے ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور میں ورطۂ حیرت و تعجب میں پڑ جاتا ہوں کہ ان علماء کے پیشِ نظر نبی و رسول کے معاملہ میں ان تمام نزاکتوں کا لحاظ کیوں نہیں، جو اخلاق، معاشرت اور تہذیب و تمدن کی زندگی سے وابستہ ہیں۔

مثلاً اسی مقام کو لیجئے کہ صاحب قصص الانبیاء اور بعض دوسرے علماء کہتے ہیں کہ حضرتِ نوح کی بیوی جب کافر ہو سکتی ہے تو خائنِ عصمت کیوں نہیں ہو سکتی اس لئے کہ دوسرا عمل پہلے سے کم درجہ رکھتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس کو تسلیم کر لینے کے باوجود کہ کفر زنا سے بہت زیادہ بُرا اور قبیح عمل ہے، مجھے اس سے سخت اختلاف ہے کہ کسی پیغمبر و نبی کی بیوی ان کے حبالۂ عقد میں رہتے ہوئے خائنِ عصمت ہو اور نبی و رسول اس کی اس حرکت سے غافل رہے۔ اس لئے کہ اگر کسی نیک اور صالح انسان کی بیوی شوہر سے چھپ کر اس قسم کی بدعملی میں مبتلا ہو جائے تو یہ ممکن ہے کیونکہ وہ ناواقف رہ سکتا ہے اور جب تک اس کے علم میں یہ بدعملی نہ آئے اس کی ثقاہت و تقویٰ پر کوئی حرف نہیں آتا، مگر ایک نبی و رسول کا معاملہ اس سے جُدا ہے، اُس کے پاس صبح و شام خدائے برتر کی وحی آتی ہے اور وہ خدائے برتر کی ہمکلامی سے مشرف ہوتا ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کے گھر میں ایک فاحشہ و زانیہ اس کی رفیقِ حیات بھی رہے اور خدا کی وحی اُس سے قطعاً خاموش ہو۔

خدا کے برگزیدہ پیغمبر جب اصلاح و ہدایت کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ظاہری و باطنی ہر قسم کے عیوب سے معصوم اور پاک رکھے جاتے ہیں تاکہ کوئی ایک شخص بھی ان کے حسب و نسب اور اخلاق و معاشرت پر نکتہ چینی نہ کر سکے۔ لہٰذا یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وحی الٰہی اور ربِ اکبر کی ہم کلامی کے مدعی کے گھر میں بداخلاقی کا جرثومہ مستقل ہو رہا ہو اور اس کو بے خبر اور غافل چھوڑ دیا جائے۔

ہمارے سامنے حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ دلیلِ راہ ہے، اَن ہوئی کو ہوئی کرنے والوں اور بے پر کی اُڑانے والوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمعِ مبارک نے بھی سُنا۔ چند روز بدبخت و خوش بخت بننے والوں کے لئے آزمائش کے بھی ملے۔ مگر آخر کار وحی الٰہی نے معاملہ کو اس طرح صاف کردیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوکر رہ گیا۔

یہ ہوسکتا ہے کہ (العیاذ باللہ) پیغمبر اور نبی کی بیوی سے زنا سرزد ہوجائے کیونکہ وہ نبی کی طرح معصوم نہیں ہے لیکن یہ محال اور ناممکن ہے کہ اس ارتکاب کے بعد وہ نبی کی بیوی رہے اور وحی الٰہی نبی اور پیغمبر کو اس کی بداخلاقی سے غافل رکھے۔

کفر، بلاشبہ سب سے بڑا جرم اور گناہ ہے لیکن وہ معاشرتی اور اخلاقی بول چال میں بداخلاقی اور فحش نہیں ہے بلکہ ایک عقیدہ ہے جو عقیدۂ بد کہلانے کا مستحق ہے، اسلئے بعض اسلامی مصالح کی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کی شریعتوں اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں کافر سے مناکحت کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا البتہ مدنی زندگی کے دور میں قرآنِ عزیز کی نص نے مشرک و مسلم کے درمیان رشتۂ مناکحت کو ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار دیدیا، لیکن زنا کسی حال اور کسی وقت میں بھی جائز نہیں رکھا گیا۔

پس اس معاملہ میں کفر و زنا کے تقابل کا سوال صحیح نہیں ہوسکتا بلکہ معاشرتی بدکرداری و نیک کرداری کی بقاء و قیام کا سوال پیدا ہوتا ہے لہٰذا میرے نزدیک حضرت نوح کی زندگیِ پاک کے ساتھ زانیہ رفیقہ کا تعلق ناممکن تھا۔ اگر امرأۃ نوح ایک مرتبہ بھی ایسا اقدام کرتی تو وحی الٰہی فوراً نبی کو مطلع کرکے تفریق کرادیتی، یا کم از کم "توبۃً نصوحاً" پر جاکر معاملہ ٹھہرتا۔ میں اس سے آگے بڑھ کر یہ جرأت کرتا ہوں کہ اگر خدانہ کردہ کسی روایت میں بھی اس قسم کے معاملات کا اشارہ پایا جاتا تو بھی ہمارا فرض تھا کہ اُس کی صحیح توجیہ تلاش کرکے اصل حقیقت کو سامنے لاتے، چہ جائیکہ نہ قرآنِ عزیز اس کے متعلق کچھ کہتا ہے اور نہ صحیح و

ضعیف روایات میں سے کوئی روایتِ حدیث وسیرت اس کا ذکر کرتی ہے تو پھر خواہ مخواہ اس قسم کی دُور از کار تاویلات سے عوام و متوسطین اور موافقین و مخالفین کے دل و دماغ پر غلط نقوش نقش کرنے سے بجز مضرت و نقصان کے اور کیا حاصل ہے۔

بہر حال صحیح یہی ہے کہ کنعان حضرت نوحؑ کا بیٹا تھا مگر اس پر حضرت نوحؑ کی ہدایت و رشد کی جگہ اپنی کافر والدہ کی آغوشِ تربیت اور خاندان و قوم کے ماحول نے بُرا اثر ڈالا، اور وہ نبی کا بیٹا ہونے کے باوجود کافر ہی رہا۔

پسرِ نوح بابداں بنشست خاندانِ نبوتش گم شد

نبی و پیغمبر کا کام فقط رشد و ہدایت کا پیغام پہنچانا ہے۔ اولاد، بیوی، خاندان، قبیلہ اور قوم پر اُس کو زبردستی عائد کرنا اور اُن کے قلوب کو پلٹ دینا نہیں ہے۔

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (غاشیہ) تو ان (کافروں پر) مسلط نہیں کیا گیا۔

وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (ق) اور تو اُن کو (قبولِ حق کے لئے) مجبور نہیں کر سکتا۔

اربابِ تاریخ نے حضرتِ نوحؑ کے اس بیٹے کا نام کنعان بتایا ہے یہ تورات کی روایت کے مطابق ہے، قرآنِ عزیز اس کے نام کی صراحت سے ساکت ہے جو نفسِ واقعہ کے لئے غیر ضروری تھا۔

چند ضمنی مسائل (۱) طوفانِ نوح (علیہ السلام) خاص حصۂ زمین سے وابستہ رہا ہو یا تمام کرۂ زمین سے، مذاہبِ عالم کی تاریخ اور علمِ آثارِ ارض سے یہ قطعی ثابت ہو چکا ہے کہ یہ واقعہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ تورات کے علاوہ قدیم ہند و مذہب کی کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے اور اگرچہ قرآنِ عزیز کے بیان کئے ہوئے سادہ اور صاف واقعات کے مقابلہ میں ان میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے تاہم نفسِ واقعہ کے اظہار میں یہ سب متفق نظر آتی ہیں، مولانا سید ابو نصر احمد حسین بھوپالی نے اپنی کتاب "تاریخ الادب[1] الہندی" میں تفصیل

[1] صفحہ ۳۴-۳۵۔

کے ساتھ اس واقعہ کو نقل کیا ہے، جس کا عنوان ہے "برہماناداوبانیشاد" اس میں حضرتِ نوح (علیہ السلام) کو مانو کہا گیا ہے، جس کے معنی "خدا کا بیٹا" یا "نسلِ انسانی کا جدِ اعلیٰ" بتائے جاتے ہیں۔

(۲) قرآنِ عزیز نے صراحت کی ہے کہ حضرتِ نوح (علیہ السلام) نے اپنی قوم میں ساڑھے نو سو ۹۵۰ سال تبلیغ ودعوت کا فرض انجام دیا:-

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ	اور بلاشبہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی
فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ	جانب رسول بناکر بھیجا، پس وہ رہا ان میں
عَامًا ؕ (عنکبوت ع ۲)	پچاس کم ایک ہزار سال۔

یہ عمر موجودہ عمرِ طبعی کے اعتبار سے بعید از عقل معلوم ہوتی ہے لیکن محال اور ناممکن نہیں ہے اس لئے کہ کائنات کی ابتداء میں ہجوم وافکار اور امراض کی یہ فراوانی نہیں تھی جو چند ہزار برسوں میں انسانی تمدن کے مصنوعی سامانوں نے پیدا کردی ہے، اور تاریخِ قدیم بھی یہ اقرار کرتی ہے کہ چند ہزار سال قبل کی عمرِ طبعی کا تناسب موجودہ تناسب سے بہت زیادہ تھا۔ نیز حضرتِ نوحؑ کی عمرِ طبعی کا معاملہ اُسی قسم کی مستثنیات میں سے ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں موہبتِ الٰہی اور آیۃ اللہ کی فہرست میں شمار ہوتی ہیں اور جن کی حکمت وغایت کا معاملہ خود خدائے تعالیٰ کے سپرد ہے۔

قرآنِ عزیز نے کسی نبی اور پیغمبر کی دعوت وتبلیغ کی مدت کا صراحت کے ساتھ اس طرح تذکرہ نہیں فرمایا جیسا کہ حضرتِ نوحؑ کے واقعہ میں مذکور ہے، لہٰذا آج تقریباً سات ہزار سال قبل کی طویل عمر کے تاریخی شواہد کے اعتبار سے اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس کی پوری گنجائش ہے اور اگر تاریخ کی ان شہادتوں کو غیر وقیع مان کر انکار کردیا جائے تب بھی اس واقعہ کو مخصوص حالات کے زیرِ اثر ایک عطیۂ الٰہی سمجھنا چاہیے جو ایک رسول یا پیغمبر کی دعوت وتبلیغ کی حکمتوں سے وابستہ ہے، حق اور صحیح مسلک یہی ہے اور اس مدت کو

گھٹانے کے لیئے دُور از کار تاویلات کی قطعاً ضرورت نہیں۔

مشہور شاعر ابوالعلاء معرّی اپنے چند اشعار میں یہ بیان کرتا ہے کہ قدیم زمانہ میں یہ دستور تھا کہ لوگ سنہ، عام (سال) بول کر شہر (مہینہ) مراد لیا کرتے تھے، اس قول کے پیش نظر بعض مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ حضرتِ نوح (علیہ السلام) کی تبلیغی خدمات کی عمر اسّی سال ہوتی ہے اور اُن کی کُل عمر ڈیڑھ سو سال سے آگے نہیں بڑھتی۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اگر ابوالعلاء کا یہ قول تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ عرب کے کسی غیر معروف حساب کا تذکرہ سمجھا جائے گا کیونکہ قرآنِ عزیز کے نزول کے وقت عرب کے کسی قبیلہ کے متعلق یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ "سنہ" یا "عام" بول کر "شہر" (مہینہ) مراد لیا کرتے تھے لہٰذا قرآنِ عزیز کی بیان کردہ تعبیر پر اس قول کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

نیز سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے جس انداز میں اس مدت کا ذکر کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کی غیر معمولی تبلیغی مدت کے اظہار کو خاص اہمیت دے رہا ہے، ورنہ قرآنِ عزیز کی عام سنت یہ ہے کہ وہ سخت اہم ضرورت کے بغیر واقعات و حالات کی اس قسم کی جزئیات سے بہت ہی کم تعرض کرتا ہے۔

(۳) بعض مفسرین نے اسرائیلیات (تورات و یہود کی روایات) سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طوفانِ نوحؑ سے چالیس سال قبل قومِ نوحؑ کی عورتوں کو بانجھ کر دیا تھا کہ جدید نسل عالمِ وجود میں نہ آئے۔ مگر یہ روایت "غپ شپ" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور غالباً اسے اس لئے گھڑا گیا ہے کہ یہ اعتراض پیدا نہ ہو کہ طوفانِ نوحؑ کی صورت میں بچوں نے کیا قصور کیا تھا کہ وہ بھی لقمۂ اجل ہو گئے۔

ان احتیاط پسند حضرات کو شاید یہ بات فراموش ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کا قانون جس کا نام "سنۃ اللہ" ہے، اس بارہ میں کیا ہے؟ ورنہ ان کو ایسی لایعنی روایت کے بیان کی ضرورت پیش نہ آتی جو اکثر یہود کے غلط افکار و عقائد کی مخلوق ہوتی ہیں۔

کائناتِ ہست و بود میں" عادۃ اللہ" یہ جاری ہے کہ امراض، وبا، طوفان اور زلزلے جیسے امور جب بھی کسی سبب سے نمودار ہوتے ہیں" خواہ وہ عذاب کے لئے ہوں یا عام حالاتِ زندگی کے اعتبار سے کسی خارجی سبب کے ذریعہ ظاہر ہوئے ہوں" تو جس مقام پر وہ نازل ہوتے ہیں، وہاں کی آبادی میں نیک و بد، ولی و شیطان، زاہد و عابد، اور فاسق و فاجر کے مابین کوئی تمیز نہیں کرتے بلکہ اسبابِ عادیہ کے زیرِ اثر مسببات کو وجود میں لانے کے لئے منجانب اللہ مامور ہیں، اور دُنیوی زندگی کے اعتبار سے ان کی لپیٹ میں ہر وہ انسان آجاتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ان اسباب کا مسبّب بن گیا ہے۔

البتہ عالمِ آخرت کے اعتبار سے یہ امتیاز نمایاں رہتا ہے کہ فاسق و فاجر اور خدا کے دشمن کے لئے یہ اسباب عذابِ الٰہی بن جاتے ہیں اور مطیع و فرماں بردار اور نیک کردار انسان کے لئے موجبِ سعادت اور درجاتِ عالیہ کا مستوجب ہوتے ہیں۔

کیا ہماری نگاہیں روزمرہ یہ مشاہدہ نہیں کرتیں کہ جب زلزلہ آتا ہے تو نیک و بد دونوں پر یکساں اثر کرتا ہے، وبا پھیلتی ہے تو نیک کردار و بدکردار دونوں ہی اس کی زد میں آجاتے ہیں اور دونوں کے رشتۂ حیات کے لئے وہ یکساں مہلک ثابت ہوتی ہے۔

البتہ یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ جب کبھی اس قسم کا عذاب نبی اور پیغمبر کی پیہم نافرمانی کی وجہ سے کسی قوم پر نازل ہوتا ہے تو پیغمبر کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع دے دی جاتی ہے اور یہ حکم ہو جاتا ہے کہ وہ مع اپنے پیرؤوں کے جو اسلام کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں عذاب کی اس بستی سے باہر چلا جائے، اور بابانگِ دُہل یہ کہہ کر جائے کہ یا قوم اس کے لائے ہوئے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے ورنہ خدا کے عذاب کو قبول کرے، اور اس طرح مومنین اُس عذاب کی زد سے محفوظ رہتے ہیں۔

بہرحال مفسرین نے جس احتیاط کی خاطر اسرائیلیات کے اس ذخیرہ سے مدد لینی چاہی ہے وہ قطعاً بے ضرورت ہے۔

پس طوفانِ نوحؑ میں قومِ نوحؑ کے مرد و عورت بوڑھے جوان، بچے اور بچیاں سب ہی طوفان کی ہلاکت خیزی کا شکار ہوئے اور دنیا، کفر کا وہ حصہ سب ہی برباد کر دیا گیا، اب یہ معاملہ خدا کے سپرد ہے کہ جن عاقل و بالغ انسانوں نے نافرمانی کی تھی اُن کے حق میں دائمی اور سرمدی عذاب بنے اور جو معصوم اور غیر عاقل تھے وہ آخرت کے عذاب سے مامون و محفوظ قرار پائیں۔

(۴) سفینۂ نوحؑ طوفان کے بعد کس مقام پر ٹھہرا؟ توراۃ نے اس کا نام اراراط بتایا ہے۔ حضرتِ نوحؑ کی دعوت و تبلیغ اُس سرزمین سے وابستہ تھی جو دجلہ اور فرات کے درمیان واقع ہے اور یہ دونوں دریا آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلے ہیں، اور جدا جدا بہہ کر عراق کے حصۂ زیریں میں آکر مل گئے ہیں، پھر خلیج فارس میں سمندر میں جا گرے ہیں، آرمینیا کے یہ پہاڑ اراراط کے علاقہ میں واقع ہیں، اسی لئے توراۃ میں ان کو اراراط کا پہاڑ کہا ہے، مگر قرآنِ عزیز نے اس پورے علاقہ کی بجائے صرف اس خاص مقام کا تذکرہ کیا ہے جہاں کشتی جا کر ٹھہری تھی، یعنی جودی کا، توراۃ کے شارحین کا یہ خیال ہے کہ جودی اُس سلسلۂ کوہ کا نام ہے جو اراراط اور جارجیا کے پہاڑی سلسلہ کو باہم ملاتا ہے، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سکندرِ اعظم کے زمانہ کی یونانی تحریرات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں، اور اس تاریخی واقعہ کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آٹھویں صدی مسیحی تک اس جگہ ایک معبد اور ہیکل موجود تھا جو "کشتی کا معبد" کہا جاتا تھا۔

(۵) ایک مفسّر نے حضرتِ نوح (علیہ السلام) کے بیٹے کنعان کے نجات نہ پانے کے متعلق لطیف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرتِ نوح (علیہ السلام) جلیل القدر پیغمبر اور مستجاب الدعوات تھے، انھوں نے دعا، اور بددعا، دونوں حالتوں میں خود اپنے بیٹے کو فراموش کر دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کافر بیٹے کی سرکشی، پاداشِ عمل کی صورت میں نمودار ہوئی اور وہ بھی ہالکین کے ساتھ غرقِ دریا ہو کر رہ گیا۔

حضرت نوح (علیہ السلام) نے جبکہ وہ قوم کو راہِ راست پر لانے سے عاجز آ گئے تھے سب سے پہلے یہ دعا کی :-

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ (نوح ع)

اے پروردگار تو اس زمین پر کسی بسنے والے کافر کو زندہ نہ چھوڑ اس لئے کہ اگر تو ان کو زندہ چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کرتے رہیں گے اور ان کی اولاد کا سلسلہ بھی گمراہی اور کفر ہی پر قائم رہے گا۔

اور یہ قطعاً فراموش کر دیا کہ اس موقع پر کنعان کو مستثنیٰ کر کے اس کے لئے قبولِ ہدایت کی دعا مانگنا چاہیے یا شاید اُس وقت تک ان کو بیٹے کے کفر کا علم ہی نہ تھا۔

دوسری مرتبہ جناب باری میں یہ دعا کی :-

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (نوح ع)

اے پروردگار مجھ کو اور میرے ماں باپ کو بخش دے اور اُس شخص کو بھی بخشش سے نواز جو مومن ہو کر میرے گھر میں داخل ہوا اور مومنین و مومنات کو بھی بخش دے۔

اس موقع پر بھی انھوں نے کنعان کا استثناء نہیں کیا اور یا اُس کے مومن ہو کر گھر میں داخل ہونے کی دعاء نہیں فرمائی۔

تیسری مرتبہ پھر یہ دعا کی۔

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ۝ (ع) اور ظالموں کے لئے ہلاکت کے سوا کچھ اضافہ نہ کر۔

کنعان ظالم تھا اس لئے کہ کافر تھا، موقع تھا کہ استثناء کر کے اُس کے لئے ظالم نہ رہنے کی دعا بھی فرما دیتے اور اگر معلوم نہ تھا تو یہ بد قسمت بیٹے کی بد قسمتی پر ازلی مہر تھی جو ثبت ہو کر رہی۔

پس جب وقتِ قبولیتِ دعا آ پہنچا اور کنعان کی سرکشی بدستور رہی تو اب محبتِ پدری کا جوش خدا کے عادلانہ فیصلہ کے سامنے نہ ٹھہر سکا، اور اس کی نجات کی دعا پر اپنی نادانی کے اعتراف کے ساتھ عذر خواہی کرنی پڑی۔ اور بایں ہمہ جلالتِ قدر خدا کے سامنے اپنی

بندگی کے اظہار ہی کو بہتر سمجھ کر عبدِ کامل ہونے کا ثبوت پیش فرمایا، اور درگاہِ الٰہی سے شرفِ مغفرت اور قربتِ الٰہی کو حاصل کیا۔

اہم نتائج (۱) ہر ایک انسان اپنے کردار و عمل کا خود ہی جواب دہ ہے، اس لئے باپ کی بزرگی بیٹے کی نافرمانی کا مداوا اور علاج نہیں بن سکتی اور نہ بیٹے کی سعادت باپ کی سرکشی کا بدل ہو سکتی ہے، حضرت نوح (علیہ السلام) کی نبوت و پیغمبری کنعان کے کفر کی پاداش کے آڑے نہ آسکی اور حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ جلالتِ قدر شرکِ آذر کے لئے نجات کا باعث نہ ہو سکی۔

كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ہر شخص اپنے ڈھنگ پر کام کرتا ہے۔

(۲) بُری صحبت زہرِ ہلاہل سے بھی زیادہ قاتل ہے اور اس کا ثمرہ و نتیجہ ذلت و خسران اور تباہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے، انسان کے لئے جس طرح نیکی ضروری شے ہے اس سے زیادہ صحبتِ نیکاں ضروری ہے، اور جس طرح بدی سے بچنا اس کی زندگی کا نمایاں امتیاز ہے اُس سے کہیں زیادہ بُروں کی صحبت سے خود کو بچانا ضروری ہے۔

پسرِ نوح با بداں بہ نشست خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحابِ کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد
صحبتِ صالح ترا صالح کند صحبتِ طالح ترا طالح کند

(۳) خدائے تعالیٰ پر صحیح اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ ظاہری اسباب کا استعمال توکّل کے منافی نہیں ہے بلکہ توکل علی اللہ کے لئے صحیح طریق کار ہے، تب ہی تو طوفانِ نوح سے بچنے کے لئے کشتیِ نوح ضروری ٹھہری۔

(۴) انبیاء علیہم السلام سے "پیغمبرِ خدا اور معصوم ہونے کے باوجود" بہ تقاضائے بشریت لغزش ہو سکتی ہے مگر وہ اُس پر قائم نہیں رہتے بلکہ منجانب اللہ ان کو تنبیہ کردی جاتی ہے اور اس سے ہٹا لیا جاتا ہے، حضرتِ آدمؑ اور حضرتِ نوحؑ کے واقعات اس

کے لئے شاہد عدل ہیں، نیز وہ عالم الغیب بھی نہیں ہوتے جیسا کہ اسی واقعہ میں "فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ" سے واضح ہے۔

(۵) اگرچہ پاداشِ عمل کا خدائی قانون کائنات کے ہر گوشہ میں اپنا کام کر رہا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جرم اور ہر طاعت کی سزا یا جزا اسی عالم میں مل جائے، کیونکہ یہ کائنات عمل کی کشت زار ہے اور پاداشِ کردار کے لئے معاد اور عالم آخرت کو مخصوص کیا گیا ہے تاہم ظلم اور غرور ان دو بدعملیوں کی سزا کسی نہ کسی نہج سے یہاں دنیا میں بھی ضرور ملتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ ظالم اور متکبر اپنی موت سے قبل ہی اپنے ظلم و کبر کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور پاتا، اور ذلت و نامرادی کا منہ دیکھتا ہے، چنانچہ خدا کے سچے پیغمبروں سے الجھنے والی قوموں اور تاریخ کی ظالم و مغرور ہستیوں کی عبرتناک ہلاکت و بربادی کی داستانیں اس دعوے کی بہترین دلیل ہیں۔

حضرتِ ادریس علیہ السلام

قرآنِ عزیز میں ذکرِ مبارک، نام و نسب، اختلافِ روایات، نبوت، تبلیغ و تعلیم، فلاسفہ کی بے سند باتیں، محاکمہ،

حضرت ادریسؑ کا ذکر قرآن میں

قرآنِ عزیز میں حضرتِ ادریسؑ کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے، سورۂ مریم میں اور سورۂ انبیاء میں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (مریم ع۴)

اور یاد کر قرآن میں ادریس کو بلاشبہ وہ تھے سچے نبی اور بلند کیا ہم نے ان کا مقام۔

وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ ۝ (انبیاء ع۶)

اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذاالکفل ان میں سے ہر ایک تھا صبر کرنے والا۔

نام و نسب اور زمانہ: حضرتِ ادریسؑ کے نام، نسب اور زمانہ کے متعلق مؤرخین کو سخت اختلاف ہے اور تمام اختلافی وجوہ کو سامنے رکھنے کے بعد بھی کوئی فیصلہ کن یا کم از کم راجح رائے نہیں قائم کی جاسکتی، وجہ یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے تو اپنے مقصدِ رشد و ہدایت کے پیشِ نظر تاریخی بحث سے جدا ہو کر صرف ان کی نبوت، رفعتِ مرتبت اور ان کی صفاتِ عالیہ کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح حدیثی روایات بھی اس سے آگے نہیں جاتیں، اس لئے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی ہے وہ اسرائیلی روایات ہیں اور وہ بھی تضاد و اختلاف سے معمور، ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ نوح (علیہ السلام) کے جدِ امجد ہیں،

اور اُن کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب ہے یا عربی زبان میں ادریس اور عبرانی یا سریانی میں اُن کا نام اخنوخ ہے اور اُن کا نسب نامہ یہ ہے۔

خنوخ یا اخنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم (علیہ السلام)، ابن اسحٰق کا رجحان اِسی جانب ہے اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں اور الیاس و ادریس ایک ہی ہستی کے نام اور لقب ہیں اور ان دونوں روایات کے پیشِ نظر بعض علماء نے یہ تطبیق دینے کی سعی کی ہے کہ جدِ نوح علیہ السلام کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کا نام ادریس ہے اور الیاس لقب، مگر یہ رائے بے سند اور بے دلیل ہے، بلکہ قرآنِ عزیز کا الیاس اور ادریس کو جدا جدا بیان کرنا شاید اس کو متحمل نہ ہو سکے[۱]

صحیح ابنِ حبان میں روایت ہے کہ حضرتِ ادریسؑ پہلے شخص ہیں جنھوں نے قلم کو استعمال کیا، ایک حدیث میں ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کسی نے رمل کے خطوط کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ علم ایک نبی کو دیا گیا تھا، پس اگر کسی شخص کے نقوش اس کے مطابق آجاتے ہیں تو نشانہ صحیح بیٹھ جاتا ہے ورنہ نہیں۔

حافظ عماد الدین ابنِ کثیر ان روایات کے ساتھ یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ بہت سے علماءِ تفسیر و احکام کا یہ خیال ہے کہ حضرتِ ادریسؑ ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے رمل کے کلمات ادا کئے[۲] اور وہ ان کو ہرمس الہرامسہ[۳] کا لقب دیتے ہیں اور ان کی جانب بہت سی غلط باتیں اسی طرح منسوب کرتے ہیں جس طرح اُن کے علاوہ بہت سے

---

[۱] ان اختلافات کے مطالعہ کے بعد غالباً آپ اُس نوٹ سے اتفاق فرمائیں گے جو صفحہ ۸۵ پر درج ہے، حضرت ادریس سے متعلق مزید اختلافی بحث کے لئے فتح الباری جلد ۶ ص ۲۸۸ اور البدایۃ والنہایۃ ابنِ کثیر ص ۳۶ - ۳۷ قابلِ مطالعہ ہیں [۲] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر جلد اول ص ۹۹ [۳] ہرمس علم نجوم کے ماہر عالم کو کہتے ہیں، اس لئے ہرمس الہرامسہ کے معنی یہ ہیں کہ ماہرینِ علم نجوم کا استاذِ اول، ہرمیس یونان کا ایک مشہور منجم گذرا ہے۔

انبیاء، علماء، حکما اور اولیاء اللہ کے متعلق منسوب کی گئی ہیں۔
معراج کی صحیحین[1] والی حدیث میں صرف اسی قدر ذکر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ ادریس علیہ السّلام سے چوتھے آسمان پر ملاقات کی۔
مگر مشہور مفسر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں ہلال بن یساف کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کعب احبار سے دریافت کیا کہ حضرتِ ادریس سے متعلق اس آیت "وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا" کا کیا مطلب ہے؟ تو کعب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ادریس علیہ السلام پر ایک مرتبہ یہ وحی نازل فرمائی۔ اے ادریس تمام اہلِ دنیا جس قدر روزانہ نیک عمل کریں گے اُن سب کے برابر میں تجھ کو ہر دن اجر عطا کروں گا۔ حضرتِ ادریس علیہ السلام نے یہ سنا تو ان کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے اعمال میں روز افزوں اضافہ ہو اور اس لئے عمر کا حصہ طویل ہو جائے تو اچھا ہے انھوں نے وحی الٰہی اور اپنے اس خیال کو ایک رفیق فرشتہ پر ظاہر کر کے کہا کہ اس معاملہ میں فرشتۂ موت سے گفتگو کر تاکہ مجھ کو نیک اعمال کے اضافہ کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے، اس فرشتہ نے جب یہ سنا تو حضرتِ ادریس علیہ السلام کو اپنے بازوؤں پر بٹھا کر لے اُڑا، جب یہ چوتھے آسمان سے گذر رہے تھے تو فرشتۂ موت زمین کے لئے اتر رہا تھا، وہیں دونوں کی ملاقات ہو گئی، دوست فرشتہ نے فرشتۂ موت سے حضرتِ ادریس کے معاملہ کے متعلق گفتگو کی، فرشتۂ موت نے دریافت کیا۔ ادریس ہیں کہاں؟ اُس نے کہا میری پشت پر سوار ہیں، فرشتۂ موت کہنے لگا درگاہِ الٰہی سے یہ حکم ہوا ہے کہ ادریس کی روح چوتھے آسمان پر قبض کروں، اس لئے میں سخت حیرت و تعجب میں تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے جبکہ ادریس علیہ السلام زمین میں ہیں، اُسی وقت فرشتۂ موت نے حضرتِ ادریس کی روح قبض کر لی۔
یہ واقعہ نقل کر کے کعب احبار نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا

---

[1] صحیح بخاری باب الاسراء، مسلم جلد (۱) باب الاسراء،

علیًّا کی یہی تفسیر ہے، ابن جریرؒ کی طرح ابن ابی حاتمؒ نے اپنی تفسیر میں اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔

ان ہر دو نقول کو روایت کرنے کے بعد حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب اسرائیلی خرافات ہیں اور ان میں روایتی اعتبار سے بھی "نکارت" یعنی ناقابلِ اعتبار اچنبھا ہے، اس لئے صحیح تفسیر وہی ہے جو آیت کے ترجمہ میں بیان کی گئی۔

امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ الیاسؑ نبی کا نام ہی ادریسؑ ہے اور ان کے اس قول کی وجہ حضرت انسؓ کی وہ روایت ہے جو زہری نے معراج کے سلسلہ میں بیان کی ہے اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء علیہم السلام کی آسمان پر ملاقات کا جو ذکر ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جب آپ کی ملاقات حضرت ادریسؑ سے ہوئی تو انہوں نے فرمایا "مرحبا بالاخ الصالح" (برادرِ نیک تمہارا آنا مبارک) پس اگر حضرت ادریس، اخنوخ ہوتے تو حضرت آدمؑ و حضرت ابراہیمؑ کی طرح "بالابن الصالح" کہتے یعنی نیک بھائی کی جگہ "نیک بیٹے" کے ساتھ خطاب کرتے، اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ دلیل کمزور ہے اس لئے کہ اوّل تو یہ امکان ہے کہ اس طویل حدیث میں راوی الفاظ کی پوری حفاظت نہ کر سکا ہو، دوم ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالتِ قدر اور رفعتِ مرتبت کے پیشِ نظر انہوں نے پدری انتساب کو نمایاں نہ کیا ہو اور ازرہِ تواضع برادرانہ حیثیت کو ہی ظاہر کرنا مناسب سمجھا ہو۔

رہا حضرتِ آدمؑ و حضرتِ ابراہیمؑ کا معاملہ سو ایک ابو البشر ہیں اور دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر اور رفیع الشان پیغمبر جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا[1] لہٰذا ان کا "ابن" کے ساتھ خطاب کرنا ہر طرح موزوں اور برمحل ہے۔

[1] آل عمران

ابن کثیر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ حضرت ادریسؑ حضرت نوحؑ سے قبل کے نبی نہیں ہیں بلکہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی ہیں، اور الیاسؑ ہی ادریسؑ ہیں۔

تورات میں ان مقدس نبی کے متعلق صرف اسی قدر لکھا ہے۔

"اور حنوک (اخنوخ) پینسٹھ برس کا ہوا کہ اُس سے متوشلح پیدا ہوا اور متوشلح کی پیدائش کے بعد حنوک تین سو برس خدا کے ساتھ چلتا تھا، اور اس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور حنوک کی ساری عمر تین سو پینسٹھ برس کی ہوئی اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا، اور غائب ہو گیا، اس لئے کہ خدا نے اُسے لے لیا۔[1]

حضرت ادریس حکماء اور فلاسفہ کی نظر میں | علامہ جمال الدین قفطی نے تاریخ الحکماء[2] میں حضرت ادریس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے، حضرت ادریسؑ کے متعلق علماء تفسیر اور ارباب تاریخ وقصص نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ بہت مشہور ہے، اس لئے اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، البتہ حکماء اور فلاسفہ نے خصوصیت کے ساتھ اُن کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرتِ ادریسؑ کا مولد ومنشاء (جائے ولادت وپرورش) کہاں ہے، اور انھوں نے نبوت سے پہلے کس سے علم حاصل کیا؟ حکماء اور فلاسفہ کے اقوال ان مسائل میں مختلف ہیں۔

ایک فرقہ کی رائے ہے کہ ان کا نام ہرمس الہرامسہ ہے اور مصر کے قریہ منف میں پیدا ہوئے، یونانی ہرمس کو ارمیس کہتے ہیں، ارمیس کے معنی عطارد[3] ہیں۔

---

[1] باب پیدائش آیت ۲۱-۲۴ [2] اس تاریخ کا پورا نام المنتخبات الملتقطات من کتاب اخبار العلماء باخبار الحکماء ہے اور علامہ جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف قفطی کی تصنیف ہے اور مختصر زوزنی کے نام سے مشہور ہے۔

[3] ادریس یا ہرمس یونان کا ایک مشہور منجم اور ماہر فلکیات حکیم تھا اسی لئے اس کو ارمس (عطارد) کہتے تھے، یونانی غلطی سے ادریس اور ارمیس کو ایک ہی شخص تسلیم کرتے ہیں حالانکہ یہ ایسی فاش غلطی ہے جس کے لئے کوئی دلیل نہیں۔

اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ ان کا نام یونانی میں طرمیس، عبرانی میں خنوخ اور عربی میں اخنوخ ہے، اور قرآن عزیز میں ان کو اللہ تعالیٰ نے ادریس کہا ہے، یہی جماعت کہتی ہے کہ انکے استاذ کا نام غوثاذیمون یا اغوثاذیمون (مصری) ہے، وہ غوثاذیمون کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتے کہ وہ یونان یا مصر کے انبیاء میں سے ایک نبی ہیں اور یہ جماعت انکو ادرین دوم اور حضرتِ ادریسؑ کو ادرین سوم کا لقب دیتی ہے اور غوثاذیمون کے معنی "سعد اور بہت نیک بخت" ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہرمس نے مصر سے نکل کر اقطاعِ عالم کی سیر کی اور تمام دنیا کو چھان ڈالا اور جب مصر واپس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بیاسی سال کی عمر میں اپنی جانب اٹھا لیا۔

ایک تیسری جماعت یہ کہتی ہے کہ ادریس بابل میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی، اور اوائل عمر میں انھوں نے حضرت شیث بن آدمؑ سے علم حاصل کیا، علم کلام کے مشہور عالم علامہ شہرستانی کہتے ہیں کہ اغثاذیمون حضرت شیث علیہ السلام ہی کا نام ہے

بہرحال جب حضرتِ ادریسؑ سنِ شعور کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو نبوت سے سرفراز فرمایا، تب انھوں نے شریر اور مفسدوں کو راہِ ہدایت کی تبلیغ شروع کی مگر مفسدوں نے انکی ایک نہ سنی اور حضرتِ آدمؑ وشیثؑ کی شریعت کے مخالف ہی رہے، البتہ ایک چھوٹی سی جماعت ضرور مشرف باسلام ہوگئی۔

حضرتِ ادریسؑ نے جب یہ رنگ دیکھا تو وہاں سے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے پیرووں کو بھی ہجرت کی تلقین فرمائی، پیروانِ ادریسؑ نے جب یہ سنا تو ان کو ترکِ وطن بہت شاق گذرا اور کہنے لگے کہ بابل جیسا وطن ہم کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے [1] حضرتِ ادریسؑ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم یہ تکلیف اللہ کی راہ میں اٹھاتے ہو تو

[1] بابل کے معنی نہر کے ہیں اور چونکہ بابل دجلہ وفرات کی نہروں سے سرسبز وشاداب تھا اس لئے اس نام سے موسوم ہوا، یہ عراق کا مشہور شہر تھا جو فنا ہوگیا۔

اس کی رحمت وسیع ہے وہ اس کا نعم البدل ضرور عطا کرے گی، پس ہمت نہ ہارو اور خدا کے حکم کے سامنے سرِ نیاز جھکا دو۔

مسلمانوں کی رضامندی کے بعد حضرتِ ادریسؑ اور ان کی جماعت مصر کی جانب ہجرت کر گئی۔ جماعت نے جب نیل کی روانی اور اس کی سرزمین کی شادابی دیکھی تو بہت خوش ہوئی، اور حضرتِ ادریسؑ نے یہ دیکھ کر اپنی جماعت سے فرمایا، بابلیون[1] (تمہارے بابل کی طرح شاداب مقام) اور ایک بہترین جگہ منتخب کر کے نیل کے کنارے بس گئے حضرتِ ادریسؑ کے اس جملہ "بابلیون" نے ایسی شہرت پائی کہ عرب کے علاوہ قدیم اقوام اس سرزمین کو بابلیون ہی کہنے لگیں، البتہ عرب نے اس کا نام مصر بتایا اور اس کی وجہِ تسمیہ یہ سنائی کہ طوفانِ نوحؑ کے بعد یہ مصر بن حام کی نسل کا مسکن و موطن بنا ہے۔

حضرتِ ادریسؑ اور اُن کی پیرو جماعت نے جب مصر میں سکونت اختیار کر لی تو یہاں بھی انھوں نے پیغامِ الٰہی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا شروع کر دیا کہا جاتا ہے کہ اُن کے زمانہ میں بہتر زبانیں بولی جاتی تھی، اور خدائے تعالیٰ کی عطا و بخشش سے یہ وقت کی تمام زبانوں کے زباں داں تھے اور ہر ایک جماعت کو اسی کی زبان میں تبلیغ فرمایا کرتے تھے،

حضرتِ ادریسؑ نے دینِ الٰہی کے پیغام کے علاوہ سیاستِ مُدن، شہری زندگی اور بود و ماند کے متمدن طریقوں کی بھی تعلیم و تلقین کی اور اس کے لئے انھوں نے ہر ایک فرقہ و جماعت سے طلباء جمع کئے اور ان کو مدنی سیاست اور اُس کے اصول و قواعد سکھائے جب یہ طلبہ کامل و ماہر بن کر اپنے قبائل کی طرف لوٹے تو انھوں نے شہر اور بستیاں آباد کیں جن کو مدنی اصول پر بسایا۔ ان شہروں کی تعداد کم و بیش دو صد کے قریب

[1] بابلیون کے معنی میں مختلف اقوال ہیں مثلاً تمہاری طرح کی نہر، مبارک نہر، مگر سب سے بہتر قول یہ ہے کہ "ین" سریانی میں تفضیل کی علامت ہے اور معنی ہیں "بڑی نہر"

تھی، جن میں سب سے چھوٹا شہر رُہا[1] تھا، حضرتِ ادریسؑ نے ان طلبہ کو دوسرے علوم کی بھی تعلیم دی جس میں علمِ حکمت اور علمِ نجوم جیسے علوم بھی شامل ہیں۔

حضرتِ ادریسؑ پہلی ہستی ہیں جنھوں نے علمِ حکمت و نجوم کی ابتدا کی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو افلاک اور اُن کی ترکیب، کواکب اور اُن کے اجتماع و افتراق کے نقاط اور اُن کے باہم کشش کے رموز و اسرار کی تعلیم دی اور اُن کو علمِ عدد و حساب کا عالم بنایا، اور اگر اس پیغمبرِ خدا کے ذریعہ ان علوم کا انکشاف نہ ہوتا تو انسانی طبائع کی وہاں تک رسائی مشکل تھی، انھوں نے مختلف گروہوں اور امتوں کے لئے ان کے مناسبِ حال قوانین و قواعد مقرر فرمائے اور اقطاعِ عالم کو چار حصوں میں منقسم کر کے ہر ربع کے لئے ایک حاکم مقرر کیا جو اس حصۂ زمین کی سیاست و ملوکیت کا ذمہ دار قرار پایا، اور ان چاروں کے لئے ضروری قرار دیا کہ تمام قوانین سے مقدم شریعت کا وہ قانون رہے گا جس کی تعلیم وحی الٰہی کے ذریعے میں نے تم کو دی ہے، اس سلسلہ کے سب سے پہلے چار بادشاہوں کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) ایلادس (بمعنی رحیم) (۲) زوس (۳) اسقلیبوس (۴) زوس امون یا ایلاوس امون یا بسیلوس

حضرت ادریسؑ کی تعلیم کا خلاصہ: خدا کی ہستی اور اس کی توحید پر ایمان لانا، صرف خالقِ کائنات کی پرستش کرنا، آخرت کے عذاب سے رستگاری کے لئے اعمالِ صالحہ کو ڈھال بنانا، دنیا سے بے التفاتی اور تمام امور میں عدل و انصاف کو پیشِ نظر رکھنا، اور مقررہ طریقہ پر عبادتِ الٰہی ادا کرنا، اور ایامِ بیض[2] کے روزے رکھنا، دشمنانِ اسلام سے جہاد کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، طہارت و نظافت سے رہنا خصوصیت کے ساتھ جنابت، کتے اور سور سے اجتناب کرنا، ہر نشہ آور شے سے پرہیز کرنا ان کی تعلیم کا لبِّ لباب ہے۔

---

[1] یہ شہر صفحۂ عالم سے مٹ گیا مگر اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔
[2] ہر ماہ قمری کی ۱۴، ۱۵، ۱۶ تاریخ۔

انھوں نے اپنے پیروؤں کے لئے بحکمِ الٰہی سال میں چند دن عید کے مقرر فرمائے اور چند مخصوص اوقات میں نذر اور قربانی دینا فرض قرار دیا، ان میں سے بعض رویتِ ہلال پر ادا کی جاتی تھیں اور بعض اس وقت جبکہ سورج کسی برج میں داخل ہونے لگا ہو، اور بعض جبکہ سیارے اپنے بیوت و برجِ شرف میں داخل ہوں اور بعض سیارے بعض سیاروں کے مقابل آجائیں۔

نذرِ الٰہی کے طریقے اللہ تعالیٰ کے سامنے نذر و قربانی پیش کرنے کے لئے اُن کے یہاں تین چیزیں اہمیت رکھتی تھیں، خوشبوؤں کی دھونی، جانوروں کی قربانی اور شراب[1] اور ان کے علاوہ میووں پھلوں اور پھولوں وغیرہ میں سے موسم کی پہلی چیز کی نذر ضروری تھی، اور میووں میں سے سیب کو، اناج میں سے گیہوں کو، اور پھولوں میں سے گلاب کو ترجیح حاصل تھی۔

بعد میں آنے والے نبیوں کے متعلق بشارت حضرت ادریسؑ نے اپنی امت کو یہ بھی بتایا کہ میری طرح اس عالم کی دینی و دُنیوی اصلاح کے لئے بہت سے انبیاء علیہم السلام تشریف لائیں گے اور اُن کی نمایاں خصوصیات یہ ہوں گی (۱) وہ ہر ایک بُری بات سے بَری اور پاک ہوں گے (۲) قابلِ ستائش اور فضائل میں کامل ہونگے، زمین و آسمان کے احوال سے اور ان امور سے کہ جن میں کائنات کے لئے شفا ہے یا مرض، وحی الٰہی کے ذریعہ اس طرح واقف ہوں گے کہ کوئی سائل تشنہ کام نہ رہے گا، وہ مستجاب الدعوات ہوں گے اور ان کے مذہب کی دعوت کا خلاصہ اصلاحِ کائنات ہوگا۔

حضرتِ ادریسؑ کی خلافتِ ارضی جب حضرت ادریسؑ خدا کی زمین کے مالک بنادئے گئے تو انھوں نے علم و عمل کے اعتبار سے خدا کی مخلوق کو تین طبقات میں تقسیم کردیا۔

[1] حکماء کا یہ تضادِ بیان حیرت میں ڈالتا ہے کہ ایک جانب تو وہ شریعتِ ادریسی میں شراب کو حرام بتاتے ہیں اور دوسری جانب خدا کی جناب میں شراب کی قربانی و نذر کو مقبول کہتے ہیں۔ "اِنَّ ھٰذَا الشَّیْ ءُ عُجَابٌ"۔

کاہن، بادشاہ اور رعیت' اور حسب ترتیب اُن کے مراتب مقرر فرمائے، کاہن سب سے پہلا اور بلند درجہ [illegible] اس لئے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے سامنے اپنے نفس کے علاوہ بادشاہ اور رعیت کے معاملات میں بھی جوابدہ ہے اور بادشاہ کا دوسرا درجہ رکھا گیا، اس لئے کہ وہ اپنے نفس اور امورِ مملکت کے متعلق جواب دہ ہے اور رعیت صرف اپنے نفس ہی کے لئے جواب دہ ہے، اس لئے وہ تیسرے طبقہ میں شامل ہے' لیکن یہ طبقات فرائض کے اعتبار سے تھے نہ کہ نسل وخاندان کے امتیازات کے لحاظ سے' بہرحال حضرتِ ادریسؑ رفع الی اللہ "تک انہی قوانینِ شریعت و سیاست کی تبلیغ فرماتے رہے۔

مذکورۂ بالا چار بادشاہوں میں سے اسقلیبوس بہت پختہ عزم و ارادہ کا بادشاہ تھا، اُس نے حضرتِ ادریسؑ کے کلمات کی حفاظت اور قوانینِ شریعت کی نگہداشت خوب کی اور حضرتِ ادریسؑ کے اٹھالئے جانے پر بیحد حزن وملال کا اظہار کیا اور ہیکلوں میں اُن کی اور ان کے رفع کی حالت کی تصاویر بنوائیں۔

اسقلیبوس اس خطہ پر حکومت کرتا تھا جو طوفانِ نوح کے بعد خطۂ یونان کہلایا۔ یونانیوں نے طوفان کی تباہ کاریوں سے بچے ہوئے ٹوٹے پھوٹے ہیکلوں میں جب حضرتِ ادریسؑ کے مجسمہ اور ان کے رفع کی تصویر کو دیکھا اور ساتھ ہی اسقلیبوس کی عظمت اور ہیکلوں میں حکمت وفلسفہ کی تدوین کا شہرہ سنا تو ان کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اسقلیبوس ہی وہ ہستی ہے جس کا رفع ہوا، حالانکہ یہ صریح غلطی ہے جو محض اٹکل وتخمین سے انھوں نے اختیار کی۔

حضرتِ ادریسؑ کا حُلیہ حضرتِ ادریس کا حُلیہ یہ ہے، گندم گوں رنگ، پورا قد وقامت، سر پر بال کم، خوبصورت وخوبرو، گھنی ڈاڑھی، رنگ وروپ اور چہرہ کے خطوط میں ملاحت مضبوط بازو، چوڑے مونڈھے، مضبوط ہڈی، دُبلے پتلے، سرگیں چمکدار آنکھیں، گفتگو باوقار، خاموشی پسند سنجیدہ اور متین، چلتے ہوئے نیچی نظر، انتہائی فکر وخوض کے عادی،

غصہ کے وقت سخت غضبناک باتیں کرنے میں شہادت کی انگلی سے باربار اشارہ کے عادی، حضرت ادریسؑ نے بیاسی سال کی عمر پائی،

ان کی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ تھی۔

الصبر مع الایمان باللہ یورث الظفر — اللہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ صبر فتحمندی کا باعث ہے

اور کمر سے باندھنے والے پٹکہ پر یہ تحریر تھا۔

الاعیاد فی حفظ الفروض والشریعۃ من تمام الدین وتمام الدین کمال المروۃ۔ — حقیقی عیدیں اللہ تعالیٰ کے فرائض کی حفاظت میں پوشیدہ ہیں اور دین کا کمال شریعت سے وابستہ ہے اور مروت میں کمال دین کی تکمیل ہے۔

اور نمازِ جنازہ کے وقت جو پٹکہ باندھتے اس پر حسب ذیل جملے ثبت ہوتے :۔

السعید من نظر لنفسہ و شفاعتہ عند ربہ اعمالہ الصالحۃ — سعادت مند وہ ہے جو اپنے نفس کی نگرانی کرے اور پروردگار کے سامنے انسان کے شفیع اس کے اپنے نیک اعمال ہیں،

حضرتِ ادریسؑ کے بہت سے پند و نصائح اور آداب و اخلاق کے جملے مشہور ہیں جو مختلف زبانوں میں ضرب المثل اور رموز و اسرار کی طرح مستعمل ہیں، ان میں سے بعض درجِ ذیل ہیں :۔

(۱) خدا کی بیکراں نعمتوں کا شکریہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔

(۲) جو علم میں کمال اور عملِ صالح کا خواہش مند ہو اس کو جہالت کے اسباب اور بدکرداری کے قریب بھی نہ جانا چاہیئے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر فن مولا کاریگر اگر سینے کا ارادہ کرتا ہے تو سوئی ہاتھ میں لیتا ہے نہ کہ برما، پس ہر وقت یہ پیشِ نظر رہے۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں — این خیال است و محال است و جنوں

(۳) دنیا کی بھلائی "حسرت" ہے اور برائی "ندامت"

(۴) خدا کی یاد، اور عملِ صالح کے لئے خلوصِ نیت شرط ہے۔

(۵) نہ جھوٹی قسمیں کھاؤ، نہ اللہ تعالیٰ کے نام کو قسموں کے لئے تختۂ مشق بناؤ اور نہ جھوٹوں کو قسمیں کھانے پر آمادہ کرو، کیوں کہ ایسا کرنے سے تم بھی شریکِ گناہ ہو جاؤ گے۔

(۶) ذلیل پیشوں کو اختیار نہ کرو (جیسے سینگی لگانا، جانوروں کے جفتی کرانے پر اجرت لینا وغیرہ)

(۷) اپنے بادشاہوں کی (جو کہ پیغمبر کی جانب سے احکامِ شریعت کے نفاذ کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں) اطاعت کرو اور اپنے بڑوں کے سامنے پست رہو اور ہر وقت حمدِ الٰہی میں اپنی زبان کو تر رکھو۔

(۸) حکمت روح کی زندگی ہے۔

(۹) دوسروں کی خوش عیشی پر حسد نہ کرو اس لئے کہ انکی یہ سرور زندگی چند روزہ ہے۔

(۱۰) جو ضروریاتِ زندگی سے زیادہ طالب ہوا وہ کبھی قانع نہ رہا۔[1]

تاریخ الحکماء کے صفحہ ۳۴۵ پر ہرمس ثالث کے تذکرہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ علماء کی ایک جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ طوفانِ نوح سے قبل دنیا میں جس قدر علوم شائع ہوئے اُن سب کے معلم اول یہی ہرمس اول ہیں جو مصر کے حصۂ اعلیٰ کے باشندہ تھے اور عبرانی حضرات اُن کو خنوخ نبی مانتے ہیں اور جو اپنے نسب میں حضرتِ آدمؑ کے پرپوتے ہیں۔ یعنی خنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل بن قینان، بن انوش، بن شیث، بن آدم (علیہم السلام)

ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ فلسفہ کی کتابوں میں جن علمی جواہر اور حرکاتِ نجوم کا تذکرہ آتا ہے سب سے پہلے ان کا ذکر ان ہی کی زبان سے ہو ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے ہیکلوں کی تعمیر، علمِ طب کی ایجاد، ارضی و سماوی اشیاء کے متعلق موزوں قصائد کے ذریعہ اظہارِ خیال بھی ان ہی کی اوّلیات میں سے ہیں، اور انھوں نے ہی سب سے پہلے طوفان کی اطلاع دے کر بندگانِ خدا کو ڈرایا اور بتایا کہ اُن کو

[1] تاریخ الحکماء ج ۱۔

دکھایا گیا ہے کہ ایک آسمانی آفت ہے جو زمین کو پانی اور آگ میں لپیٹ رہی ہے، انہیں یہ دیکھ کر علوم کی بربادی اور صنعت و حرفت کی تباہی کا خوف ہوا اور اس لئے انھوں نے مصر میں اہرام اور برابی[1] بنائے اور ان میں تمام صنائع اور نو ایجاد آلات کی تصاویر بنوائیں اور تمام علوم کے حقائق و اوصاف کو منقش کیا تاکہ یہ علوم و صناعات تا ابد باقی رہیں اور فنا کا ہاتھ ان کو گزند نہ پہنچا سکے[2]۔

محاکمہ: فلاسفہ اور حکمت و فلسفہ کی قدیم کتابوں کی (بعض باتوں سے قطع نظر) اُن یاوہ گویوں اور بے سروپا باتوں کا یہ خلاصہ ہے جو حضرتِ ادریسؑ کے متعلق افسانوی حیثیت میں گھڑا گیا ہے کہ جس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ نقل اس کی تائید میں ہے بلکہ تحقیق اور صحیح علمِ تاریخ کے حقائق ان میں سے اکثر باتوں کی خرافات کو آج اس طرح ظاہر کر رہے ہیں کہ جس کا انکار حقیقت کے انکار کے مرادف ہے مثلاً اہرام و برابی کی تاریخ آج جدید اکتشافات کی بدولت ہمارے سامنے بے نقاب ہے اور اہرام اور ان مقابر کی کھدائی نے علوم و نقوش اور صنائع کی تصویر کے بنانیوالوں، اور ان کے مختلف زمانوں میں مختلف مدارج کے ترقی دینے والوں کے نام ان کے اجسام اور ان کے زر و جواہر کے خزانوں اور مختلف زمانوں کی تحریروں، اور رسم الخط کی ترکیبوں کو سامنے لا کر روزِ روشن کی طرح آشکارا کر دیا ہے، کہاں وہ حقیقتیں اور کہاں یہ دور از کار باتیں، آج مینا، خوفو، منقرع اور طوطامن خامن وغیرہ بادشاہوں کے حالات سے کون آشنا نہیں ہے۔

تاہم ان بے سروپا باتوں کو بھی نقل کر دینا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ یہ آگاہی رہے کہ ان پیغمبر کے متعلق حکماء کی کتابوں میں بھی کس قسم کی دُور از کار باتیں درج ہیں۔

اس سلسلہ میں بس اُسی قدر سچ اور حق ہے جس کو ہم قرآنِ عزیز اور احادیث صحیحہ سے نقل کر آئے ہیں یا توقف کے درجہ میں وہ چند جملے جو تورات سے نقل کئے گئے ہیں، یا وہ اقوال جو پیغمبرانہ تعلیمات کے شایانِ شان ہیں۔

[1] برابی ایسے ہیکل جو چلہ کشی کے لئے چاروں جانب سے بند ہوں۔ [2] تاریخ الحکماء جلد ۱۔

حضرت ہُود علیہ السلام

قرآنِ عزیز میں ہود (علیہ السلام) کا ذکر، ہُود کا نسب، عاد کی بستیاں اور اُن کا طریقِ عبادت، عاد کی ہلاکت، ہود اور قومِ ہود کے واقعات سے حصولِ عبرت،

قرآنِ عزیز میں ہودؑ کا ذکر

قرآنِ عزیز میں حضرت ہود (علیہ السلام) کا سات جگہ ذکر آیا ہے جو ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

نمبر شمار	سورۃ	آیات
۱	اعراف	۶۵
۲	ہود	۵۰، ۵۳، ۵۸، ۶۰، ۸۹
۳	شعراء	۱۲۴

قرآنِ عزیز میں عاد کا ذکر

اور عاد کا ذکر نو سورتوں میں ہوا ہے، یعنی اعراف، ہود، مومنون، شعراء، فصلت، احقاف، الذاریات، القمر اور الحاقہ میں۔

قومِ عاد

اس سے قبل کہ ہم عاد کے متعلق تفصیلی بحث کریں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قرآنِ عزیز کے علاوہ کوئی تاریخ کی کتاب یا توراۃ عاد کے متعلق روشنی نہیں ڈالتی، اس لئے اِس قوم کے حالات کا نقشہ یا قرآنِ عزیز کے ذریعہ بن سکتا ہے اور یا پھر اُن اثریات کے ذریعہ جو محققینِ علم الآثار نے اس راہ میں حاصل کی ہیں۔

پہلا ذریعہ چونکہ قطعی اور یقینی ہے اس لئے اُس کے بیان کردہ حقائق کو بھی بلا شبہ

قطعیت حاصل ہے اور دوسرا ذریعہ تخمینی اور قیاسی، اس لئے اس کے بیان کردہ واقعات کی حیثیت ظن وتخمین سے آگے نہیں جاتی۔

عاد، عرب کے قدیم قبیلہ یا امم سامیہ کے صاحب قوت و اقتدار افرادِ جماعت کا نام ہے، تاریخ قدیم کے بعض یورپی مصنفین عاد کو ایک فرضی کہانی (میتھالوجی) یقین کرتے ہیں، مگر اُن کا یہ یقین بالکل غلط اور سراسر وہم ہے، اس لئے کہ جدید تحقیقات کا یہ مسلّم فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے کثرتِ افراد و قبائل کے اعتبار سے ایک باعظمت وسطوت جماعت کی حیثیت میں تھے جو عرب سے نکل کر شام، مصر اور بابل کی طرف بڑھے اور وہاں زبردست حکومتوں کی بنیادیں قائم کیں، اب فرق صرف [illegible] ہے کہ عرب ان باشندوں کو اُمم بائدہ (ہلاک ہوجانے والی قومیں) یا عربِ عاربہ (خالص عرب) اور [illegible] ن کے افراد کو عاد، ثمود، طسم، اور جدیس کہتے ہیں[1] اور مستشرقینِ یورپ (امم سامیہ) نام رکھتے ہیں، پس اصطلاحات وتعبیرات کے فرق سے حقیقت و واقعہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوجاتی۔ اس لئے قرآنِ عزیز نے ان کو عاد اولیٰ کہا ہے کہ یہ واضح ہوجائے کہ عرب کی قدیم قوم بنو سام اور عادِ اولیٰ ایک ہی حقیقت کے ۲ دو نام ہیں۔

اہلِ جغرافیہ کا قول ہے کہ لفظِ عرب دراصل عربہ تھا جس کے معنی صحرا اور بادیہ کے ہیں، خود عربی زبان میں اعراب اہلِ بادیہ کو کہتے ہیں اور عرابہ کے معنی بدویت کے آتے ہیں۔

اور بعض اہلِ تحقیق کی رائے یہ ہے کہ عرب اصل میں غرب (غین معجمہ کے ساتھ) تھا اور چونکہ اس کا جائے وقوع فرات کے غرب میں ہے اس لئے وہ آرامی قومیں (امم سامیہ) جو کہ فراتِ غربی پر آباد تھیں، اول غرب اور پھر غین کے نقطہ کے سقوط کے بعد عرب کہلائیں، ان میں سے عرب کی وجہ تسمیہ جو بھی صحیح ہو یہ حقیقت ہے کہ یہ مقام قدیم امم سامیہ یا بدوی جماعتوں یا عاد کا مسکن تھا۔ اس لئے عاد بغیر کسی اختلاف کے عرب نژاد تھے، اور

[1] معجم البلدان ص ۱۲۹ جلد ۶

لفظِ عاد عربی ہے نہ کہ عجمی بلکہ کے معنی عبرانی میں "بلند و مشہور" کے ہیں، قرآنِ عزیز میں عاد کے ساتھ ارم کا لفظ لگا ہوا ہے اور ارم (سام) کے معنی بھی بلند و مشہور ہی کے ہیں، انہی عاد کو توراۃ کی غلط پیروی میں کہیں کہیں عمالقہ بھی کہا گیا ہے۔

عاد کا زمانہ | عاد کا زمانہ تقریباً دو ہزار قبل حضرت مسیح علیہ السلام مانا جاتا ہے، اور قرآنِ عزیز میں عاد کو "مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ" کہہ کر قوم نوح کے خلفاء میں سے شمار کیا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شام کی دوبارہ آبادی کے بعد امم سامیہ کی ترقی عاد ہی سے شروع ہوتی ہے۔

عاد کا مسکن | عاد کا مرکزی مقام ارضِ احقاف ہے یہ حضرموت کے شمال[1] میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے شرق میں عمان ہے اور شمال میں ربع الخالی، مگر آج یہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہیں ہے، اور بعض مورخین کہتے ہیں کہ اُن کی آبادی عرب کے سب سے بہترین حصہ حضرموت اور یمن میں خلیجِ فارس کے سواحل سے حدود عراق تک وسیع تھی اور یمن ان کا دارالحکومت تھا۔

عاد کا مذہب | عاد بُت پرست تھے اور اپنے پیشرو قوم نوح کی طرح صنم پرستی اور صنم تراشی میں ماہر تھے، تاریخ قدیم کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ اُن کے معبودانِ باطل بھی قومِ نوح کی طرح وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق، اور نسر ہی تھے، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اثر منقول ہے، اس میں ہے کہ ان کے ایک صنم کا نام صمود اور ایک کا نام ہتار تھا[2]۔

حضرت ہودؑ | عاد اپنی مملکت کی سطوت و جبروت، جسمانی قوت و صولت کے غرور میں

---

[1] عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ مجھ سے سید عبداللہ بن احمد بن عمر بن یحییٰ علوی نے (جو حضرموت کے باشندہ ہیں) بیان کیا کہ وہ ایک جماعت کے ساتھ ان ہلاک شدہ قوموں کے قدیم مساکن کے کھوج میں حضرموت کے شمالی حدان میں مقیم تھے، طویل جد و جہد کے بعد ہم نے مرمر کے بعض ظروف کو ریت کے ٹیلوں کی کھدائی میں حاصل کیا جن پر خط مسماری میں تحریر تھا، مگر افسوس کہ مالیہ کی کمی نے اس عظیم الشان مہم کو پورا نہ ہونے دیا۔ (قصص الانبیاء ص ۱۷)

[2] صدا بھی ان کا مشہور بُت تھا۔ البدایۃ والنہایۃ جلد ۱

ایسے چمکے کہ انھوں نے خدائے واحد کو بالکل بھلا دیا اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود مان کر ہر قسم کے شیطانی اعمال بے خوف و خطر کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک پیغمبر حضرت ہودؑ (علیہ السلام) کو مبعوث فرمایا، حضرت ہودؑ عاد کی سب سے زیادہ معزز شاخ خلود کے ایک فرد تھے سرخ و سپید رنگ اور وجیہ تھے، اُن کی ڈاڑھی بڑی تھی [1]

تبلیغِ اسلام انھوں نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دی اور لوگوں پر ظلم و جور کرنے سے منع فرمایا، مگر عاد نے ایک نہ مانی اور ان کو سختی کے ساتھ جھٹلایا اور غرور و تکبر کے ساتھ کہنے لگے "مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً" آج دنیا میں ہم سے زیادہ شوکت و جبروت کا کون مالک ہے؟ مگر حضرتِ ہودؑ مسلسل اسلام کی تبلیغ میں لگے رہے، وہ اپنی قوم کو عذابِ الٰہی سے ڈراتے اور غرور و سرکشی کے نتائج بتا کر قومِ نوحؑ کے واقعات یاد دلاتے اور کبھی ارشاد فرماتے :-

اے قوم! اپنی جسمانی طاقت اور حکومت کے جبروت پر گھمنڈ نہ کر بلکہ خدا کا شکر ادا کر کہ اس نے تجھ کو یہ دولت بخشی، قومِ نوح کی تباہی کے بعد تجھ کو زمین کا مالک بنایا، خوش عیشی، فارغ البالی اور خوش حالی عطا کی لہٰذا اس کی نعمتوں کو نہ بھول اور خود ساختہ بتوں کی پرستش سے باز آ جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ دکھ دے سکتے ہیں، موت و زیست، نفع و ضرر سب ایک خدا ہی کے ہاتھ میں ہے' اے افرادِ قوم! مانا کہ تم عرصہ تک سرکشی اور اُس کی نافرمانی میں مبتلا رہے ہو مگر آج بھی اگر توبہ کر لو، اور باز آجاؤ تو اس کی رحمت وسیع ہے اور دروازۂ توبہ بند نہیں ہوا، اُس سے مغفرت چاہو وہ بخش دے گا، اس کی طرف رجوع ہو جاؤ وہ معاف کر دے گا، تقویٰ و طہارت کی زندگی اختیار کر لو، وہ تم کو دن دونی، رات چوگنی ترقی عطا کرے گا، بیش از بیش عزت دیگا، اور مال و عزت میں سرفرازی بخشے گا۔

[1] عینی جلد ۷ کتاب الانبیاء۔

حضرتِ ہودؑ اپنی تبلیغ اور پیغامِ حق کے ساتھ ساتھ بار بار یہ بھی دُہراتے کہ میں تم سے کسی اجر و عوض کا خواہاں نہیں، میرا اجر تو خدا ہی کے پاس ہے، اور یہ نبی کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، ان کو کوئی یہ تہمت نہیں لگا سکتا کہ وہ مال کی طلب میں ایسا کرتے ہیں، یا عزت وجاہ اور ریاست کے طالب ہیں، وہ نہ قوم سے اپنی ریاست و عزت کے طالب ہوتے ہیں، اور نہ مال و منال کے، ان کے سامنے تو صرف ایک ہی نقطہ ہوتا ہے اور وہ ادائے فرض اور اپنے مالکِ حقیقی کے احکام کی پیغامبری ہے۔

عادؑ میں ایمان دار تو چند ہی تھے باقی تمام سرکش اور متمرد انسانوں کا گروہ تھا، انکو حضرتِ ہودؑ کی یہ نصائح سخت شاق گذرتی تھیں، اور وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے خیالات، ان کے عقائد و اعمال، غرض ان کے کسی ارادہ میں بھی کوئی شخص حائل ہو اُن کے لئے ناصح مشفق بنے، اس لئے اب انھوں نے یہ روش اختیار کی کہ حضرتِ ہودؑ کا مذاق اُڑایا، اُن کو بے وقوف گردانا اور ان کی معصومانہ حقانیتوں اور صداقتوں کی تمام یقینی دلائل براہین کو جھٹلانا شروع کر دیا اور حضرتِ ہودؑ سے کہنے لگے۔

يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ	اے ہود! تو ہمارے پاس ایک دلیل بھی نہ لایا،
اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ	اور تیرے کہنے سے ہم اپنے خداؤں کو چھوڑنیوالے
(ہود ع ۵)	نہیں، اور نہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے ہیں۔

ہم اس ڈھونگ میں آنے والے نہیں کہ تجھ کو خدا کا رسول مان لیں اور اپنے خداؤں کی عبادت چھوڑ کر یہ یقین کر لیں کہ وہ خدائے اکبر کے سامنے ہمارے سفارشی نہیں ہوں گے،

حضرتِ ہودؑ نے ان سے کہا کہ نہ میں بے وقوف ہوں اور نہ پاگل، بلاشبہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے بیوقوف کو منتخب نہیں کیا کرتا کہ اس کا نقصان اس کے نفع سے بڑھ جائے اور ہدایت کی جگہ گمراہی آجائے، وہ اس عظیم الشان خدمت کے لئے اپنے بندوں میں سے ایسے شخص کو چُنتا ہے جو ہر طرح اس کا

اہل ہو اور اس خدمتِ حق کو بخوبی انجام دے سکے۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ۔ اور اللہ خوب جاننے والا ہے کہ اپنے منصبِ رسالت کو کس جگہ رکھے۔

مگر قوم کی سرکشی اور مخالفت بڑھتی ہی رہی اور ان پر آفتاب سے زیادہ روشن دلائل ونصائح کا مطلق اثر نہ ہوا، اور وہ حضرتِ ہودؑ کی تکذیب وتذلیل کے اور زیادہ درپے ہوگئے اور (العیاذ باللہ) مجنوں اور خبطی کہہ کر اور زیادہ مذاق اڑانے لگے، اور کہنے لگے اے ہودؑ! جب سے تو نے ہمارے معبودوں کو بُرا کہنا اور ہم کو اُن کی عبادت سے باز رہنے کے لئے تلقین کرنا شروع کیا ہے ہم دیکھتے ہیں اس وقت سے تیرا حال خراب ہوگیا ہے اور ہمارے خداؤں کی بددعا سے تو پاگل ومجنون ہوگیا ہے تو اب ہم اس کے علاوہ تجھ کو اور کیا سمجھیں؟ ان کو اپنی اس گستاخانہ جرأت وتہمت سے یہ خیال ہو چلا تھا کہ اب کوئی شخص حضرتِ ہودؑ کی طرف دھیان نہ دے گا، اور ان کی باتوں کو توجہ سے نہ سُنے گا۔

حضرتِ ہودؑ نے یہ سب کچھ نہایت ضبط وصبر سے سُنا اور پھر اُن سے یُوں مخاطب ہوئے

"میں خدا کو اور تم سب کو گواہ بنا کر سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں اس اعتقاد سے قطعاً بَری ہوں کہ ان بتوں میں یہ قدرت ہے کہ مجھ کو یا کسی کو کسی قسم کی بھی کوئی بُرائی پہنچا سکتے ہیں اس کے بعد تم کو اور تمہارے اِن معبودانِ باطل کو تحدّی (چیلنج) کرتا ہوں کہ اگر ان میں ایسی قدرت ہے تو وہ مجھ کو نقصان پہنچانے میں جلدی سے اقدام کریں، میں اپنے خدا کے فضل وکرم سے صاحبِ عقل وخرد ہوں، فراست وکیاست کا مالک ہوں اور حکمت ودانائی کا حامل۔ میں تو صرف اپنے اس خدا ہی پر بھروسہ کرتا اور اسی پر وثوق رکھتا ہوں جس کے قبضہ وقدرت میں کائنات کے تمام جانداروں کی پیشانیاں ہیں اور جو حیات وممات کا مالک ہے، وہ ضرور میری مدد کرے گا اور ہر نقصان پہنچانے والے کے نقصان سے محفوظ رکھے گا۔"

آخر حضرتِ ہودؑ نے اُن کی مسلسل بغاوت وسرکشی کے خلاف یہ اعلان کر دیا کہ اگر عاد

کاروبیہی رہا اور حق سے اعراض و روگردانی کی روش میں انھوں نے کوئی تبدیلی نہ کی، اور میری پند و نصائح کو گوشِ دل سے نہ سُنا تو میں اگرچہ اپنی مفوّضہ خدمت کے لئے ہر وقت چست کمر اور باہمت ہوں مگر ان کے لئے ہلاکت یقینی ہے، اللہ تعالیٰ عنقریب اُن کو ہلاک کردے گا، اور ایک دوسری قوم کو زمین کا مالک بنا کر ان کی جگہ قائم کردے گا، اور بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، وہ تو ہر شے پر قادر و مسلط اور ہر شے کا حافظ و نگہبان ہے، اور تمام کائنات اس کے یدِ قدرت میں مسخر ہے۔

اے قوم! اب بھی سمجھ اور عقل و ہوش سے کام لے، قوم نوحؑ کے حالات سے عبرت حاصل کر اور خدا کے پیغام کے سامنے سرِ نیاز جھکا دے، ورنہ قضاء و قدر کا ہاتھ ظاہر ہو چکا ہے اور بہت قریب ہے وہ زمانہ کہ تیرا یہ سارا غرور و گھمنڈ خاک میں مل جائے گا، اور اس وقت ندامت سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

حضرتِ ہودؑ نے بار بار ان کو یہ بھی باور کرایا کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں دوست ہوں، تم سے زر و سیم اور ریاست کا طالب نہیں ہوں بلکہ تمہاری فلاح و نجاح چاہتا ہوں، میں اللہ تعالیٰ کے پیغام کے بارہ میں خائن نہیں بلکہ امین ہوں، وہی کہتا ہوں جو مجھ سے کہا جاتا ہے جو کچھ کہتا ہوں قوم کی سعادت اور حسنِ حال و مآل کے لئے کہتا ہوں بلکہ دائمی و سرمدی نجات کے لئے کہتا ہوں۔

تم کو اپنی ہی قوم کے ایک انسان پر خدا کے پیغام نازل ہونے سے اچنبھا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ قدیم سے خدا کی سنتِ جاریہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت و سعادت کے لئے اُن ہی میں سے ایک شخص کو چُن لیتا اور اپنا رسول بنا کر اس کو خطاب کرتا ہے اور اپنی مرضیات و نامرضیات سے اس کی معرفت اپنے بندوں کو مطلع کرتا رہتا ہے، اور فطرت کا تقاضا بھی تو یہی ہے کہ کسی قوم کے رشد و ہدایت کے لئے ایسے شخص کا ہی انتخاب کیا جائے جو بول چال میں ان ہی کی طرح ہو، اُن کے اخلاق و عادات کا واقف و دانا ہو، ان کے خصوصی امتیازات

سے آشنا، اور اُن ہی کے ساتھ زندگی گزارتا رہا ہو کہ اُسی سے قوم مانوس ہوسکتی ہے اور وہی ان کا صحیح ہادیِ مشفق بن سکتا ہے۔

عادؔ نے جب یہ سنا تو وہ عجیب حیرت میں پڑ گئے اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک خدا کی پرستش کے کیا معنی؟ وہ غم وغصہ میں آ گئے کہ کس طرح ہم باپ دادا کی ریت "اصنام پرستی" کو چھوڑ دیں؟ یہ تو ہماری اور ہمارے باپ دادا کی سخت توہین ہے، ان کا غیظ وغضب بھڑک اٹھا کہ ان کو کافر اور مشرک کیوں کہا جاتا ہے جبکہ وہ بتوں کو خدا کے سامنے اپنا شفیع مانتے ہیں؟ اُن کے نزدیک ہودؔ (علیہ السّلام) کی بات مان لینے میں ان کے معبودوں اور بزرگوں کی توہین وتحقیر تھی جن کو وہ خدائے اکبر کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ اور شفیع مانتے تھے اور اُسی کے لئے ان تصویروں اور مجسموں کو پوجتے تھے کہ وہ خوش ہوکر ہماری سفارش کرینگے اور عذابِ الٰہی سے نجات دلائیں گے۔

آخر وہ شعلہ کی طرح بھڑک اُٹھے اور حضرت ہودؔ (علیہ السّلام) سے بگڑ کر کہنے لگے تو نے ہم کو اپنے خدا کے عذاب کی دھمکی دی اور ہم کو اس سے یہ کہہ کر ڈرایا:

اِنِّیٓ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۝ (الشعراء)	میں تمہارے اوپر بڑے دن کے عذاب آنے سے ڈرتا ہوں (کہ کہیں تم اُس کے مستحق نہ ٹھہر جاؤ)

تو اے ہودؔ! اب ہم سے تیری روز روز کی نصیحتیں نہیں سُنی جاتیں، ہم ایسے نالۂ مشفق سے باز آئے، اگر تو واقعی اپنے قول میں سچا ہے تو وہ عذاب جلد لے آ کہ ہمارا تیرا قصہ پاک ہو،

فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ (الاعراف)	پس لا تو ہمارے پاس اس شے کو جس کا تو ہم سے وعدہ کرتا ہے اگر تو واقعی سچوں میں سے ہے

حضرتِ ہودؔ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ اگر میری مخلصانہ اور صادقانہ نصائح کا یہی جواب ہے تو سنو اللہ اور تم کو عذاب کا اگر اتنا ہی شوق ہے تو وہ بھی کچھ دُور نہیں۔

قَدۡ وَقَعَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ	بلاشبہ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر

رِجْسٌ وَّغَضَبٌ (الاعراف ع ۹) عذاب وغضب آپہونچا۔

تم کو شرم نہیں آتی کہ تم چند خود ساختہ بتوں کو ان کے نام گھڑ کر پکارتے ہو اور تم اور تمہارے آباواجداد اُن کو خدا کی دی ہوئی دلیل کے بغیر من گھڑت طریقہ پر ان کو اپنا شفیع اور سفارشی مانتے ہو، اور میری روشن دلائل سے انحراف اور سرکشی کرکے عذاب کے طالب ہوتے ہو، اگر ایسا ہی شوق ہے تو اب تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں کہ وقت قریب آپہنچا۔

اَتُجَادِلُوْنَنِیْ فِیْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّیْتُمُوْهَآ کیا تم مجھ سے ان من گھڑت ناموں (بتوں) کے بارہ میں جھگڑتے ہو

اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ جس کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے گھڑ لیا ہے کہ جس کے

سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ متعلق تمہارے پاس خدا کی کوئی حجت نہیں آئی پس اب تم

مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ○ (الاعراف ع ۹) (عذابِ الٰہی کا) انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

الحاصل قوم ہود (عاد) کی انتہائی شرارت وبغاوت اور اپنے پیغمبر کی تعلیم سے بے پناہ بغض و عناد کی پاداشِ عمل اور قانونِ جزاء کا وقت آپہنچا اور غیرتِ حق حرکت میں آئی اور عذابِ الٰہی نے سب سے پہلے خشک سالی کی شکل اختیار کی، عاد سخت گھبرائے پریشان ہوئے اور عاجز و درماندہ نظر آنے لگے تو حضرتِ ہود ؑ کو جوشِ ہمدردی نے اکسایا اور مایوسی کے بعد پھر ایک مرتبہ اُن کو سمجھایا کہ راہِ حق اختیار کرلو، میری نصائح پر ایمان لے آؤ کہ یہی نجات کی راہ ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ورنہ پچھتاؤ گے، لیکن بدبخت وبدنصیب قوم پر کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ بغض وعناد اور دوبالا ہوگیا۔ تب ہولناک عذاب نے اُن کو آگھیرا، آٹھ دن اور سات راتیں پیہم تیز و تند ہوا کے طوفان اُٹھے اور اُن کو اور اُن کی آبادی کو تہ وبالا کرکے رکھ دیا، تنومند اور قوی ہیکل انسان جو اپنی جسمانی قوتوں کے گھمنڈ میں سرمستِ سرکشی تھے اس طرح بے حس وحرکت پڑے نظر آتے تھے جس طرح آندھی سے تناور درخت بے جان ہوکر گر جاتا ہے، غرض انکو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے عبرت بنیں اور دنیا و آخرت کی لعنت اور عذاب اُن پر مسلط کر دیا گیا کہ وہ اس کے مستحق[1] تھے اور حضرتِ ہود ؑ اور ان کے مخلص پیروانِ اسلام خدا کی رحمت و نعمت میں

[1] ان: ہلاک شدگان کی تعداد کو مفسرین نے تین سے چار ہزار تک بتائی ہے جیسا کہ روح المعانی وغیرہ میں مذکور ہے (باقی صفحہ ۱۱۱ پر)

عذابِ الٰہی سے محفوظ رہے اور سرکش قوم کی سرکشی و بغاوت سے مامون ہو گئے۔

یہ ہے عادِ اولیٰ کی وہ داستانِ عبرت جو اپنے اندر چشمِ عبرت بیں کے لئے بیشمار پند و نصائح رکھتی اور خدائے برتر کے احکام کی تعمیل اور تقویٰ و طہارت کی زندگی کی جانب دعوت دیتی ہے شرارت، سرکشی اور خدا کے احکام سے بغاوت کے انجامِ بد سے آگاہ کرتی اور وقتی خوش عیشی پر گھمنڈ کے نتیجہ کی بدبختی پر مذاق اُڑانے سے ڈراتی اور باز رکھتی ہے۔

غرض حضرتِ ہود کے اِس واقعہ کا تفصیلی ذکر قرآنِ عزیز نے جس عبرت آموز طریقہ پر کیا ہے اس کو پڑھیے اور موعظت و عبرت، اور گرانمایہ پند و نصائح کا سامان فراہم کیجیے کہ دنیا و آخرت کی سعادت و فلاح کا یہی بہترین ذخیرہ ہے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ
يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ
اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قَالَ
الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ
اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا
لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ قَالَ
يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ
رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ
نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ
جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى

اور اسی طرح ہم نے قوم عاد میں اس کے بھائی بندوں میں سے ہود کو بھیجا، اس نے کہا "اے قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا معبود نہیں، کیا تم (انکار و بدعملی کے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟" اس پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے جنھوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا تھا، کہا "ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو" ہود نے کہا بھائیو! میں احمق نہیں ہوں میں تو اس کی طرف سے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے فرستادہ ہوں میں اُس کا پیام تمہیں پہنچاتا ہوں اور یقین کرو کہ تمہیں دیانتداری کے ساتھ نصیحت کرنے والا ہوں کیا تمہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ایک ایسے آدمی کے ذریعہ تمہارے پروردگار

(بقیہ صفحہ گذشتہ) لیکن قرآنِ عزیز نے جس طرح ان کی شوکت و حکومت کا تذکرہ کیا ہے اور بنو سام کی قدیم تاریخ سے جیسا پتہ چلتا ہے اس اعتبار سے یہ تعداد بہت زیادہ ہونی چاہیے، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ	کی نصیحت تم تک پہنچی جو خود تم ہی میں سے ہے خدا کا
وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ	یہ احسان یاد کرو کہ قومِ نوحؑ کے بعد تمہیں اس کا جانشین
مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ	اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی، پس
فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا	چاہیے کہ اللہ کی نعمتوں کی یاد سے غافل نہ ہو تاکہ ہر طرح
اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝	کامیاب ہو" انھوں نے کہا "کیا تم اس لئے ہمارے پاس
قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ	آئے کہ ہم صرف ایک ہی خدا کے پجاری ہو جائیں اور
وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ	اُن معبودوں کو چھوڑ دیں جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے
اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ	آئے ہیں؟ اگر تم سچے ہو تو وہ بات لا دکھاؤ جس کا
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ	ہمیں خوف دلا رہے ہو، ہودؑ نے کہا "یقین کرو
قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ	تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب
رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ	واقع ہو گیا ہے (کہ عقلیں ماری گئی ہیں اور اپنے ہاتھوں
فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ	اپنے کو تباہی کے حوالے کر رہے ہو) کیا ہے جس کی بناء پر
وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا	تم مجھ سے جھگڑ رہے ہو؟ محض چند نام جو تم نے اور تمہارے
مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ	بزرگوں نے اپنے جی سے گھڑ لئے ہیں اور جن کے لئے
مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝	خدا نے کوئی سند نہیں اتاری، اچھا (آنے والے وقت کا)
فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ	انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کروں گا، پھر ایسا
بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا	ہوا کہ ہم نے ہودؑ کو اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے
دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا	بچا لیا اور جنھوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں ان کی
وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝	بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دی، حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان
(الاعراف ٤)	لانے والے نہ تھے۔
وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ	اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف اُس کے بھائی بندوں میں سے ہودؑ کو بھیجا

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ
اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝ يٰقَوْمِ لَآ
اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ
اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ
فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝
وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ
ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ
عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ
قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا
مُجْرِمِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا
جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ
بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ
قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ
بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ نَّقُوْلُ
اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا
بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ
وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا
تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِهٖ
فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ
لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ

ہود نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا
تمہارا کوئی معبود نہیں یقین کرو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ
(حقیقت کے خلاف) افتراپردازیاں کر رہے ہو" اے میری قوم کے
لوگو! میں اس بات کے لئے تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا، میرا بدلہ تو
اسی پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ پھر کیا تم (اتنی صاف بات بھی)
نہیں سمجھتے؟ اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے پروردگار سے
(اپنے قصوروں کی) مغفرت مانگو اور (آئندہ کے لئے) اُسکی
جناب میں توبہ کرو، وہ تم پر برستے ہوئے بادل بھیجتا ہے (جس سے
تمہارے کھیت اور باغ شاداب ہو جاتے ہیں) اور تمہاری قوتوں
پر نئی نئی قوتیں بڑھاتا ہے (کہ روز بروز گھٹنے کی جگہ بڑھتے جاتے ہو)
اور (دیکھو) جرم کرتے ہوئے اُس سے مُنہ نہ موڑو (ان لوگوں نے)
کہا "اے ہود تو ہمارے پاس کوئی دلیل لے کر تو آیا نہیں (جسے ہم
دلیل سمجھیں) اور ہم ایسا کرنے والے نہیں کہ تیرے کہنے سے اپنے
معبودوں کو چھوڑ دیں، ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں ہم جو
کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی معبود
کی تجھ پر مار پڑ گئی ہے (اسی لئے اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہے)
ہود نے کہا "میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جن
ہستیوں کو تم نے اس کا شریک بنا رکھا ہے، مجھے ان سے کوئی
سروکار نہیں تم سب مل کر میرے خلاف جو کچھ تدبیریں کر سکتے ہو ضرور
کرو، اور مجھے (ذرا بھی) مہلت نہ دو" پھر دیکھ لو، نتیجہ کیا نکلتا ہے؟)
میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی،

عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ	کوئی چلنے والا وجود نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی
مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ	پیشانی کے بالوں سے پکڑ رکھا ہے (یعنی کوئی حرکت کرنے والی ہستی
بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى	نہیں کہ اس کے قبضہ سے باہر ہو) میرا پروردگار (حق و عدل کی سیدھی
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ فَاِنْ	راہ پر ہے) یعنی اس کی راہ ظلم کی راہ نہیں ہو سکتی، پھر اگر (اس پر
تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ	بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا وہ میں
اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ	نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے اور مجھے
وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ	تو نظر آرہا ہے کہ) کہ میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ
وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْــًٔا ؕ اِنَّ	دے دیگا، اور تم اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے، یقیناً میرا پروردگار
رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝	ہر چیز کا نگرانِ حال ہے۔
وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا	اور (دیکھو) جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آپہنچا تو ہم
هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	نے اپنی رحمت سے ہود کو بچا لیا جو اُس کے ساتھ (سچائی پر) ایمان
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ	لائے تھے، اور ایسے عذاب سے بچایا کہ بڑا ہی سخت عذاب تھا،
وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ	یہ ہے سرگزشت عاد کی۔
غَلِيْظٍ ۝ وَتِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا	انھوں نے اپنے پروردگار کی نشانیاں (ہٹ دھرمی اور سرکشی
بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ	کرتے ہوئے) جھٹلائیں اور اُس کے رسولوں کی نافرمانی
وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ	کی، اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی! اور ایسا ہوا کہ
عَنِيْدٍ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ	دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت پڑی (یعنی رحمتِ الٰہی کی
الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ	برکتوں سے محرومی ہوئی) اور قیامت کے دن بھی۔
اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ	تو سن رکھو کہ قوم عاد کیلئے محرومی کا اعلان ہوا جو ہود کی
اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝	قوم تھی۔

ثم انشانا من بعدهم قرنا
اخرين ۝ فارسلنا فيهم
رسولا منهم ان اعبدوا الله
ما لكم من اله غيره افلا
تتقون ۝ وقال الملا من
قومه الذين كفروا وكذبوا
بلقاء الاخرة واترفنهم في
الحيوة الدنيا ما هذا الا بشر
مثلكم ياكل مما تاكلون منه
ويشرب مما تشربون ۝ ولئن
اطعتم بشرا مثلكم انكم
اذا لخسرون ۝ ايعدكم
انكم اذا متم وكنتم ترابا وعظاما
انكم مخرجون ۝ هيهات هيهات
لما توعدون ۝ ان هي الا حياتنا
الدنيا نموت ونحيا وما نحن
بمبعوثين ۝ ان هو الا رجل
افترى على الله كذبا وما نحن
له بمؤمنين ۝ قال رب انصرني
بما كذبون ۝ قال عما قليل
ليصبحن ندمين ۝ فاخذتهم

پھر ہم نے قوم نوح کے بعد قوموں کا ایک دوسرا دور پیدا کر دیا،
ان میں بھی اپنا رسول بھیجا جو خود انہی میں سے تھا (اس کی پکار
بھی یہی تھی) کہ اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود
نہیں، کیا تم (انکار و فساد کے نتائج بد سے) ڈرتے نہیں؟
اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی
اور آخرت کے پیش آنے سے منکر تھے اور جنھیں دنیا کی
زندگی میں ہم نے آسودگی دے رکھی تھی کہنے لگے "اس سے
زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے
جو تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے،
اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کر لی تو بس
سمجھ لو تم تباہ ہوئے، تم سنتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ یہ تمہیں
امید دلاتا ہے کہ جب مرنے کے بعد محض مٹی اور
ہڈیوں کا چورا ہو جاؤ گے تو پھر تمہیں موت سے نکالا جائے گا
کیسی ان ہوئی بات ہے جس کی تمہیں توقع باقی ہے! زندگی
تو بس یہی زندگی ہے جو دنیا میں ہم بسر کرتے ہیں یہیں
مرنا ہے یہیں جینا ہے، ایسا کبھی ہونے والا نہیں کہ
مر کر پھر جی اٹھیں گے، کچھ نہیں یہ ایک مفتری آدمی ہے
جس نے اللہ کے نام سے جھوٹ موٹ بات بنا دی، ہم
کبھی اس پر یقین لانے والے نہیں"، اس پر اس رسول نے
دعا مانگی "خدایا! انھوں نے مجھے جھٹلایا ہے، پس تو میری مدد کر"
حکم ہوا "عنقریب ایسا ہونے والا ہے کہ یہ اپنے کیے پر شرمسار ہوں گے"

الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (المومنون)

چنانچہ فی الحقیقت ایک ہولناک آواز نے انھیں آپکڑا اور ہم نے خس وخاشاک کی طرح انھیں پامال کردیا، تو محرومی ہو اُس گروہ کے لئے کہ ظلم کرنے والا ہے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (الشعرا)

عاد نے (اللہ کے) پیغام لانے والوں کو جھٹلایا جب اُنکے بھائی ہود نے اُن کو کہا" کیا تم کو (خدا کا ڈر نہیں!) میں تمہارے پاس پیغام لانے والا معتبر ہوں، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر بدلہ میرا بدلہ اس جہان کے مالک پر ہے کیا بناتے ہو تم ہر اونچی زمین پر ایک نشان کھیلنے کو، اور بناتے ہو کاریگریاں شاید تم ہمیشہ رہو گے اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو ظلم کا پنجہ ہی مارتے ہو، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور ڈرو اُس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں جو تم جانتے ہو، پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے، اور باغ اور چشمے، میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کی آفت سے۔

وہ بولے" ہم کو برابر ہے تو نصیحت کرے یا نہ کرے اور کچھ نہیں ہیں یہ باتیں مگر عادت ہے اگلے لوگوں کی، اور ہم پر آفت آنے والی نہیں، پھر اُس کو جھٹلانے لگے، تب ہم نے ان کو غارت کردیا۔ اس بات میں البتہ نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ ماننے والے نہیں، اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

سو وہ عاد تھے وہ تو غرور کرنے لگے ملک میں ناحق، اور

وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۖ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ
اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۖ
وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ۝ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا
صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَحِسَاتٍ لِنُذِيقَهُمْ عَذَابَ
الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ
أَخْزَىٰ ۖ وَهُمْ لَا يُنْصَرُونَ ۝ (حم سجدہ)
وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ
وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ
خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ
عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ قَالُوا أَجِئْتَنَا
لِتَأْفِكَنَا عَنْ آلِهَتِنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ
كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ
عِنْدَ اللَّهِ وَأُبَلِّغُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ
وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ۝ فَلَمَّا رَأَوْهُ
عَارِضًا مُسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هَٰذَا
عَارِضٌ مُمْطِرُنَا ۚ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ ۖ
رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ
رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ ۚ كَذَٰلِكَ
نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۝ وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا
إِنْ مَكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَ
أَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ

کہنے لگے "کون ہے ہم سے زیادہ زور (قوت) میں" کیا
دیکھتے نہیں کہ اللہ جس نے ان کو بنایا وہ زیادہ ہے اُن سے
زور میں؟ اور تھے ہماری نشانیوں کے منکر، پھر بھیجی ہم نے
اُن پر ہوا بڑے زور کی کئی دن جو مصیبت کے تھے، تاکہ
چکھائیں اُن کو رسوائی کا عذاب دنیا کی زندگانی میں،
اور آخرت کے عذاب میں تو پوری رسوائی ہے۔
اور یاد کر عاد کے بھائی کو جب ڈرایا اُس نے اپنی قوم
کو احقاف میں اور گذر چکے تھے ڈرانے والے اُس کے
سامنے سے اور پیچھے سے (یہ کہتے ہوئے) کہ بندگی نہ کرو
کسی کی اللہ کے سوائے، میں ڈرتا ہوں تم پر آفت سے
ایک بڑے دن کی، بولے کیا تو آیا ہمارے پاس کہ پھیر دے
ہم کو ہمارے معبودوں سے! سو لے آ ہم پر جو وعدہ کرتا ہے
اگر ہے تو سچا۔ کہا یہ خبر تو اللہ ہی کو ہے اور میں تو پہنچا دیتا ہوں
جو کچھ بھیج دیا ہے میرے ہاتھ، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم
لوگ نافرمانی کرتے ہو، پھر جب دیکھا اس (عذاب کو)
ابر سامنے آیا ہوا اپنی وادیوں کے، بولے! یہ ابر ہے ہمارے
اوپر برسے گا" کوئی نہیں "یہ تو وہ چیز ہے جس کی تم جلدی
کرتے تھے ہوا ہے جس میں عذاب ہے دردناک، اکھاڑ پھینکے
ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے، پھر کل کے دن رہ گئے کہ کوئی نظر
نہیں آتا تھا سوائے ان کے گھروں کے، یوں ہم سزا دیتے
ہیں گنہگار لوگوں کو اور ہم نے مقدور دیا تھا انکو ان چیزوں کا

وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (احقاف)

جن کا تم کو مقدور نہیں دیا اور ہم نے اُن کو دیئے تھے کان اور آنکھیں اور دل، پھر کام نہ آئے کان اُن کے اور نہ آنکھیں اُن کی اور نہ دل اُن کے کسی چیز میں، اس لئے کہ منکر ہوتے تھے اللہ کی باتوں سے اور اُلٹ پڑی ان پر جس بات سے کہ وہ ٹھٹھا کرتے تھے،

وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ۝ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ۝ (الذاریات)

اور قوم عاد (کے ہلاک ہونے میں بھی قدرت خدا کی بہتری نشانیاں ہیں) جب ہم نے اُن پر ایک منحوس آندھی چلائی، جس چیز سے ہو کر گذرتی اس کو بوسیدہ ہڈی کی طرح (چورا) کئے بدون نہ چھوڑتی۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝ اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۝ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝ (القمر)

جھٹلایا عاد نے پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا۔ ہم نے بھیجی اُن پر ہوا تند، ایک نحوست کے دن جو ٹلنے والی نہ تھی اکھاڑ پھینکا لوگوں کو گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی اکھڑی پڑی، پھر کیسا رہا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا۔

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝ (الحاقہ)

اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے کہ نکل جائے ہاتھوں سے مقرر کر دیا اس کو ان پر سات رات اور آٹھ دن لگاتار، پھر تو دیکھے کہ وہ لوگ اس میں بچھڑ گئے گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی، پھر تو دیکھتا ہے کوئی اُن میں کا بچا ؟

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ (الفجر)

تو نے دیکھا، کیسا کیا تیرے رب نے عاد ارم کے ساتھ جو تھے بڑے ستونوں والے کہ ان جیسی (چیز) سارے شہروں میں نہیں بنائی گئیں۔

حضرت ہود کی وفات اہلِ عرب حضرت ہود (علیہ السلام) کی وفات اور ان کی قبر مبارک سے متعلق

مختلف دعوے کرتے ہیں، مثلاً اہلِ حضرموت کا دعویٰ ہے کہ عاد کی ہلاکت کے بعد وہ حضرموت کے شہروں میں ہجرت کر آئے تھے، وہیں اُن کی وفات ہوئی اور وادی برہوت کے قریب حضرموت کے مشرقی حصہ میں شہر تریم سے قریباً دو مرحلے پر دفن ہوئے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک اثر منقول ہے کہ اُن کی قبر حضرموت میں کثیب احمر (سرخ ٹیلہ) پر ہے اور ان کے سرہانے جھاؤ کا درخت کھڑا ہے۔

اور اہلِ فلسطین کا دعویٰ ہے کہ وہ فلسطین میں دفن ہیں، اور انھوں نے وہاں اُن کی قبر بھی بنا رکھی ہے اور اس کا سالانہ عرس بھی کرتے ہیں[1]

مگر ان تمام روایات میں سے حضرموت کی روایت صحیح اور معقول معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ عاد کی بستیاں حضرموت ہی کے قریب تھیں، لہٰذا قرینہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی تباہی کے بعد قریب ہی کی آبادیوں میں حضرتِ ہود (علیہ السلام) نے قیام فرمایا ہوگا اور وہیں پیغامِ اجل کو لبیک کہا اور وہ یہی حضرموت کا مقام ہے۔

چند عبرتیں علاوہ اس خاص عبرت کے جس کا ذکر اس طویل واقعہ میں ہو چکا ہے، یہ چند عبرتیں بھی قابلِ توجہ اور نظرِ التفات کے لائق ہیں۔

(۱) جو شخص قومِ عاد کے واقعہ کو پڑھتا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی ہستی کا تصور آجاتا ہے جو وقار اور متانت کا مکمل مجسمہ ہے اور شرافت و نجابت چہرہ سے عیاں، جو کچھ کہتا ہے پہلے اس کو وزن کر لیتا ہے کہ اس کا انجام نیک ہے یا بد، قوم کی درشتی، تمسخر واستہزا کا جواب ضبط و صبر سے دیتا اور پھر بھی اُن کی بھلائی کا جویاں نظر آتا ہے، اخلاص اور حسنِ نیت اس کی پیشانی سے عیاں ہے، اس کی قوم کہتی ہے:-

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ○	بے شک ہم تجھ کو بے وقوف پاتے ہیں اور بیشک ہم تجھ کو جھوٹوں میں شمار کرتے ہیں۔

[1] قصص الانبیاء - ص ۴۲

مگر وہ اس کا جواب یہ دیتا ہے:۔

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ	اے قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں، البتہ میں جہانوں کے
مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ	پروردگار کی جانب سے رسول ہوں تم تک اپنے پروردگار
رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۔	کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لئے امانتدار خیر خواہ ہوں'

یہ سوال وجواب ہم کو توجہ دلاتے ہیں کہ خدا کے برگزیدہ انسان جب کسی کی نیک خواہی کرتے اور کج رووں کی کجی کو سیدھا کرنے کے لئے نصیحت فرماتے ہیں تو کور چشموں اور بد باطنوں کی ہرزہ سرائی تمسخر وتحقیر کی پرواہ نہیں کرتے، دلگیر ورنجیدہ ہو کر امر حق سے مُنہ نہیں موڑتے ناراض ہو کر خیر خواہی اور نصیحت کوشی کو نہیں چھوڑتے، اور بلندی اخلاق اور نرمی و مہربانی کے ساتھ روحانی مریضوں کے علاج میں مشغول رہتے ہیں اور ان کی ان تمام خصوصیات میں نمایاں امتیاز یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس نصیحت و نیک خواہی کے لئے قوم سے مطلق کسی قسم کے نفع کے خواہشمند نہیں ہوتے اور ان کی زندگی بدلہ اور عوض سے یکسر بلند اور برتر ہوتی ہے۔

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ	اور میں تم سے اس نصیحت پر اجرت نہیں مانگتا
اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۔	میرا اجر تو صرف اللہ کے ذمہ ہے اور بس،

(۲) حضرت ہودؑ نے لطف ومہربانی کے ساتھ اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے کی ترغیب دی، اُس کی لازوال نعمتوں کو یاد دلایا اور آئندہ کے لئے وعدہ کیا مگر بدبخت قوم نے کسی طرح مان کر نہ دیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب وہ جاہلانہ عقیدہ تھا کہ باپ دادا کی ریت ورسم اور ان کے خود ساختہ اصنام کی قہرمانیت کے خلاف جو شخص بھی آواز اُٹھائے گا وہ ان بتوں کی پھٹکار میں آجائے گا، یہ مہلک عقیدہ جن قوموں کے اندر اپنے جراثیم پیدا کر دیتا ہے ان قوموں کا اپنے مصلح اور اپنے نبی و پیغمبر کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو قوم ہود اور قوم نوح کے تذکروں میں نظر آتا ہے، اپنے مصلحین اور انبیاء و صادقین کے خلاف قوموں کا بغض وعناد اسی ایک عقیدہ پر مبنی رہا ہے کہ ہمارے باپ دادا کی ریت ورسم اور اُن کے خود ساختہ اصنام کی قہرمانیت کے خلاف

کیوں کچھ کہا جاتا ہے، یونان کے مشہور حکیم سقراط کو زہر کا پیالہ اسی لئے پینا پڑا کہ وہ اپنی قوم کے معبودانِ باطل کی قہرمانیت کا کیوں انکار کرتا اور ان کو کس لئے ان کے غلبہ و اقتدار کا مخالف بناتا ہے۔ پس یہ جرثومہ اقوام کی روحانی زندگی کے لئے ہمیشہ تباہ کن اور ان کی فلاح و سعادتِ ابدی کے لئے ہلاکت آفریں رہا ہے۔

(۳) حضرتِ ہود علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی یہ سنت بہترین اُسوہ ہے کہ تبلیغ و پیغامِ حق کی راہ میں بدی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے اور تلخی کا جواب شیریں کلامی سے پورا کیا جائے، البتہ مبلغ ان کی بدکرداری اور مسلسل سرکشی پر اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون "جزائے عمل یا پاداشِ عمل" کو ضرور یاد دلائے اور آنے والے انجامِ بد پر یقیناً ان کو تنبیہ کرے اور یہ حقیقت بار بار سامنے لائے کہ جب کوئی قوم اجتماعی سرکشی، ظلم اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتی اور اس پر پیہم اصرار کرتی رہتی ہے تو پھر خدائے تعالیٰ کا قہر و غضب اس کو صفحۂ عالم سے مٹا دیا کرتا ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے چنانچہ قومِ نوحؑ اور قومِ ہودؑ اس کی عبرت زا مثالیں ہیں۔

حضرت صالح (علیہ السلام)

حضرت صالح (علیہ السلام) کا ذکر قرآنِ عزیز میں، حضرت صالح اور ثمود کا نسب نامہ، ثمود کی آبادیاں، اہلِ ثمود کا دین، قرآنِ عزیز میں قصص کا مطلب معجزہ کی حقیقت، ناقہ کا واقعہ، ناقہ ثمود کے لئے خدا کا ایک نشان تھی، ثمود کے ہاتھوں ناقہ کی ہلاکت، واقعہ سے متعلق چند عبرتیں!

حضرتِ صالح اور ثمود کا ذکر قرآنِ عزیز میں قرآنِ عزیز میں صالح علیہ السلام کا نام آٹھ جگہ آیا ہے، حسب ذیل اعداد اس کی تصدیق کرتے ہیں:-

سورۃ	آیات	میزان
اعراف	۷۳- ۷۵- ۷۷	۳
ہود	۶۱- ۶۲- ۶۶- ۸۹	۴
شعراء	۱۴۲	$\frac{1}{8}$

حضرتِ صالحؑ جس قوم میں پیدا ہوئے اُس کو ثمود کہتے ہیں اور ثمود کا ذکر نو سورتوں میں کیا گیا ہے۔ ذیل کا نقشہ اس کو واضح کرتا ہے:-

اعراف ہود حجر نمل فُصِّلَتْ النجم القمر الحاقہ الشمس

حضرتِ صالح اور ثمود کا نسب نامہ علماءِ انساب قومِ ثمود کے پیغمبر حضرتِ صالح (علیہ السلام) کے نسب نامہ میں مختلف نظر آتے ہیں۔ مشہور حافظِ حدیث امام بغویؒ نے آپ کا نسب اس طرح بیان کیا ہے:- صالح بن عُبَید بن آسف بن ماشح بن عبید بن حادر بن ثمود اور وہب بن مُنَبِّہ، مشہور تابعی اس طرح نقل کرتے ہیں۔ صالح بن عبید بن حابر بن ثمود۔[1]

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف۔

اگرچہ بغوی زمانہ کے اعتبار سے وہب سے بہت بعد میں ہیں اور وہب تورات کے بہت بڑے عالم بھی ہیں تاہم حضرتِ صالح سے ثمود تک نسب کی جو کڑیاں بغوی نے جوڑی ہیں علماءِ انساب کے نزدیک وہی تاریخی حیثیت سے راجح اور قرینِ صواب ہیں۔

اس نسب نامہ سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس قوم کو (جس کے ایک فرد حضرتِ صالح (علیہ السلام) بھی ہیں) ثمود اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے نسب نامہ کا جدِّ اعلیٰ ثمود ہے، اور اُسی کی جانب یہ قبیلہ یا قوم منسوب ہے۔

ثمود سے حضرتِ نوح (علیہ السلام) تک بھی دو قول ہیں، اوّل ثمود بن عامر بن ارم بن سام دوم، ثمود بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام۔

سید محمود آلوسی صاحبِ تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں کہ امام ثعلبی دوسرے قول کو راجح سمجھتے ہیں۔[1]

بہرحال اِن دونوں روایتوں سے یہ باتفاق ثابت ہوتا ہے کہ قومِ ثمود بھی سامی اقوام ہی کی ایک شاخ ہے اور غالباً بلکہ یقیناً یہی وہ افرادِ قوم ہیں جو عادِ اولیٰ کی ہلاکت کے وقت حضرتِ ہود کے ساتھ بچ گئے تھے اور یہی نسل عادِ ثانیہ کہلائی، اور بلا شبہ یہ قوم بھی عرب بائدہ (ہلاک شدہ عربی نسل) میں سے ہے۔

ثمود کی بستیاں ثمود کہاں آباد تھے اور کس خطہ میں پھیلے ہوئے تھے؟ اس کے متعلق یہ طے شدہ امر ہے کہ اُن کی آبادیاں حِجر میں تھیں، حجاز اور شام کے درمیان وادیٔ قریٰ تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب اُن کا مقامِ سکونت ہے، اور آج کل "فجّ النّاقہ" کے نام سے مشہور ہے۔

ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور آثار آج تک موجود ہیں، اور اس زمانہ میں بھی بعض مصری اہلِ تحقیق نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہوئے جو "شاہی حویلی" کہی جاتی ہے، اس میں متعدد کمرے ہیں اور اس حویلی کے ساتھ ایک بہت بڑا حوض ہے اور یہ پورا مکان پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

[1] جلد ۹ ص ۱۴۲۔

عرب کا مشہور مؤرخ مسعودی لکھتا ہے :۔

ورسمهم باقیة وآثارهم بادیة فی طریق من ورد من الشام (ج ۳ ص ۱۳۹)	جو شخص شام سے حجاز کو آتا ہے اُس کی راہ میں اُن کے مٹے نشان اور بوسیدہ کھنڈرات پڑتے ہیں،

حجر کا یہ مقام جو حجر ثمود کہلاتا ہے شہر مدین سے جنوب مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ خلیج عقبہ اس کے سامنے پڑتی ہے اور جس طرح عاد کو عادِ ارم کہا گیا ہے (حتیٰ کہ قرآن عزیز نے تو ارم کو اُن کی مستقل صفت ہی بنا دیا) اسی طرح اُن کی ہلاکت کے بعد اُن کو ثمودِ ارم یا عادِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

مشرق خصوصاً عرب کے بارہ میں یورپ کے مستشرقین[1] جس طرح اپنی حذاقت و مہارتِ تاریخ کا ثبوت دیا کرتے ہیں اور تحقیق کے نام سے غلط دعاوی کرنے کے عادی ہیں اسی طرح انھوں نے ثمود کو بھی اپنی تحقیق کا تختۂ مشق بنایا ہے، وہ سوال کرتے ہیں کہ ثمود کی اصل کیا ہے اور اُن کا وجود کب ہوا اور کس زمانہ میں؟ اس سوال کے جواب میں اُن کے دو گروہ ہیں ایک فریق کہتا ہے کہ یہ یہود کا ایک گروہ تھا جو فلسطین میں داخل نہیں ہوا تھا اور یہیں بس گیا تھا، مگر یہ قول نہ صرف پایۂ تحقیق سے گرا ہوا ہے بلکہ قطعاً غلط اور مہمل ہے، اس لئے کہ تمام مؤرخین باتفاق آراء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی وہ زمانہ قریب بھی نہ آیا تھا کہ حضرتِ موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے کہ ثمود کی آبادیاں ہلاک و تباہ ہو چکی تھیں اور اُن کا قلع قمع ہو چکا تھا، نیز قرآن عزیز تصریح کرتا ہے کہ جب حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کو قومِ فرعون نے جھٹلایا تو آلِ فرعون ہی میں سے ایک مردِ مومن نے یہ کہہ کر اپنی قوم کو ڈرایا کہ تمہاری اِس تکذیب کا نتیجہ کہیں وہی نہ ہو جو تم سے پہلے قومِ نوح، عاد اور ثمود اور اُن کے بعد کی قوموں کا اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی وجہ سے ہوا تھا۔

---

[1] یورپ میں جو علماء مشرق کی تاریخ اور مشرقی علوم سے شغف رکھتے اور اُن کے متعلق مباحث و نظریات قائم کرتے ہیں اُن کو مستشرق کہتے ہیں، ان میں سے بعض اگرچہ حقیقۃً حذاقت و مہارت رکھتے ہیں، مگر اکثر محض ظنی اور تخمینی بلکہ من گھڑت نظریئے قائم کر کے مشرق سے یا تعصب کا ثبوت دیتے ہیں یا اپنی کم مائگیِ علم کا۔

مستشرقین کی دوسری جماعت کہتی ہے کہ یہ عمالقہ میں سے تھے اور فرات کے مغربی ساحل سے اٹھ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔

ان میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ اُن عمالقہ میں سے تھے جن کو مصر کے بادشاہ احمس نے خارج البلد کر دیا تھا اور چونکہ مصر کے زمانہ میں فنِ سنگ تراشی میں انھوں نے کمال حاصل کر لیا تھا اس لئے حجر جا کر پہاڑوں اور پتھروں کو تراش کر بے نظیر عمارات تعمیر کیں اور عام رائج طریقہ پر بھی عالی شان محل بنائے۔

مگر ہم عاد کے واقعہ میں یہ ثابت کر آئے ہیں کہ عاد و ثمود سامی اقوام میں سے ہیں اور یہ کہ اہلِ عرب ان کو محض یہود کی غلط تقلید میں عمالقہ میں سے کہہ دیتے ہیں، حالانکہ عملیق بن اُد کا اس نسل سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ اس لئے یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔

ان تمام آراء کے خلاف محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ عاد کا بقیہ ہیں اور یہی صحیح اور راجح قول ہے، اور اہلِ حضرموت کا یہ دعویٰ کہ ثمود کی آبادیاں اور محلات عاد کی صناعی کا نتیجہ ہیں اس قول کا مخالف نہیں ہے کہ ثمود فنِ تعمیر میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور یہ عمارت اُن کی اپنی تعمیر ہیں، اس لئے کہ عادِ اولیٰ اور عادِ ثانیہ بہرحال عاد ہیں۔ حضرتِ صالحؑ کا اپنی قوم سے یہ خطاب بھی اسی کا مؤید ہے:۔

وَاذْكُرُوٓا۟ إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ	اور تم اُس وقت کو یاد کرو کہ تم کو خدا نے عاد کے بعد
بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِى ٱلْأَرْضِ	اُن کا قائم مقام بنایا اور تم کو زمین پر جگہ دی کہ تم اس
تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا قُصُورًا	کی سطح اور نرم حصوں پر محلات بناتے ہو اور سنگ
وَتَنْحِتُونَ ٱلْجِبَالَ بُيُوتًا	تراشی کر کے پہاڑوں میں مکان تراشتے ہو۔

رہا ثمود کے زمانہ کا مسئلہ سو اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن منضبط وقت نہیں بتایا جا سکتا اس لئے کہ تاریخ اس بارہ میں غیر مطمئن ہے، البتہ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا زمانہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے پہلے کا زمانہ ہے اور وہ اس جلیل القدر پیغمبر کی بعثت سے

بہت پہلے ہلاک ہو چکے تھے۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ثمود کی آبادیوں کے قریب بعض ایسی قبریں پائی جاتی ہیں کہ جن پر آرامی زبان کے کتبے لگے ہوئے ہیں اور ان کتبوں پر جو تاریخ کندہ ہے وہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت سے پہلے کی ہے، تو اس سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ یہ قوم حضرتِ موسیٰ ؑ کے بعد وجود میں آئی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

یہ دراصل اُن لوگوں کی قبریں ہیں جو اس قوم کی ہلاکت کے ہزاروں برس کے بعد اتفاقاً یہاں آکر بس گئے ہیں اور انھوں نے اپنے بزرگوں کے آثار کی قدامت ظاہر کرنے کے لئے آرامی خط میں (جو کہ قدیم خط ہے) اپنے کتبے لکھ کر لگا دیئے تاکہ یادگار رہیں ورنہ وہ قبریں نہ ثمود کی ہیں اور نہ اُن کا یہ زمانہ ہے۔

مصر کا مشہور عیسائی مؤرخ جورجی زیدان اپنی کتاب "العرب قبل الاسلام" میں اسی کے قریب قریب لکھتا ہے، کہتا ہے:-

آثار و کتبات کے پڑھنے سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ صالح (علیہ السلام) کی قوم کی بستیاں ولادتِ مسیح سے کچھ پہلے نبطیوں کے اقتدار میں آگئی تھیں یہ لوگ بطرہ کے ساکنین میں سے تھے، (جن کا ذکر عنقریب کتاب میں آنے والا ہے) اور ان کے آثار اور ٹیلوں کو بہت سے مستشرقین نے خود دیکھا ہے اور مقدمہ کتاب میں اس کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں، ان ہی کے آثار کو انھوں نے پڑھا ہے جو پتھروں پر کندہ ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم وہ کھنڈر ہیں جو قصر بنت، قبر باشا، قلعہ اور برج کے ناموں سے موسوم ہیں۔ ان پر جو کچھ تحریر ہے وہ نبطی تحریریں ہے اور ان میں سے بعض یا سب کی سب وہی تحریریں ہیں جو قبروں پر کندہ ہیں۔

مستشرقین نے یہاں جو کچھ پایا اُن میں سے حسب ذیل ایک کتبہ بھی ہے جو پتھر پر نبطی حروف میں کندہ ہے اور ولادتِ مسیح علیہ السلام سے قریب زمانہ کا مکتوب ہے (کندہ عبارت کا مضمون یہ ہے)

"مقبرہ کلکم بنت وائلہ بنت حرم نے اور کلکم کی بیٹی کلیبہ نے اپنے لئے اور اپنی اولاد کیلئے بنوایا ہے۔

اِس کی بنا بہت اچھے مہینوں میں شروع کی گئی ہے، یہ نبطیوں کے بادشاہ حارث کی تخت نشینی کا نواں سال ہے، وہ حارث جو اپنے قبیلے کا عاشقِ صادق ہے۔

پس "عمی ذوالشریٰ[1] و عرشہ" ! لات، عمند، منوت اور قیس کی اُن پر لعنت ہو جو ان قبروں کو فروخت کرے یا رہن رکھے، یا اُن سے کسی جسم کو یا عضو کو نکالے، یا لکم، اس کی بیٹی اور اس کی اولاد کے علاوہ کسی کو دفن کرے۔

اور جو شخص بھی اس پر لکھے ہوئے کی مخالفت کرے اس پر ذوالشریٰ ہبل، منوت کی پانچ لعنتیں ہوں، اور جو ساحر اس کے خلاف کرے اس پر ایک ہزار درہم حارثی کا تاوان واجب ہے مگر یہ کہ اس کے ہاتھ میں لکم کلیبہ یا اس کی اولاد میں سے کسی کے ہاتھ کی تحریر ہو جس میں اس اجنبی قبر کے لئے صاف اور صریح الفاظ میں اجازت موجود ہو، اور وہ اصلی ہو جعلی نہ ہو۔

اس مقبرہ کو وہب اللات بن عبادہ نے بنایا۔[2]

اہلِ ثمود کا مذہب ثمود اپنے بُت پرست پیشروؤں کی طرح بُت پرست تھے، وہ خدائے واحد کے علاوہ بہت سے معبودانِ باطل کے پرستار اور شرک میں مبتلا تھے، اس لئے اُن کی اصلاح اور احقاقِ حق کے لئے اُن ہی کے قبیلہ میں سے حضرتِ صالح کو ناصح پیغمبر اور رسول بنا کر بھیجا گیا تاکہ وہ اُن کو راہِ راست پر لائیں، اُن کو خدا کی نعمتیں یاد دلائیں جن سے صبح و شام وہ محظوظ ہوتے رہتے ہیں اور ان پر واضح کریں کہ کائنات کی ہر شئے خدا کی توحید اور یکتائی پر شاہد ہے اور یقینی دلائل اور مُسکت براہین کے ساتھ اُن کی گمراہی کو ظاہر کریں اور بتائیں کہ پرستش و عبادت کے لائق ذاتِ احد کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔

قرآنِ عزیز میں قصص کا مطلب قرآنِ عزیز کی یہ سنت ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے گذشتہ اقوام اور ان کے ہادیوں کے واقعات و حالات بیان کر کے نصیحت و موعظت کا سامان مہیا کرتا ہے، اس کا موضوع حکایات و قصص بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ

[1] سوالیہ نشان زدہ عربی عبارت کتبہ پر صاف نہیں پڑھی جا سکی اس لئے اصل الفاظ نقل کر دیئے گئے۔ [2] صفحہ

نے جبکہ انسان کو عقل کی روشنی عطا فرمائی ہے تو اس کی ہدایت و نجاتِ اخروی کا کیا سامان مہیا کیا ہے تاکہ وہ ان اسباب کی مدد سے اپنی عقل سے کام لے اور خدا کی مرضیات و نامرضیات کو پہچانے؟ اُس نے بتایا کہ خدائے تعالیٰ کی یہ سنتِ جاریہ ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے ان ہی میں سے پیغمبر اور رسول بھیجتا ہے، وہ اُن کو حق کی راہ بتاتے اور ہر قسم کی گمراہی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور تائید میں اقوام و امم کے واقعات بیان کرتا اور تاریخِ ماضی کو دُہراتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ جن اقوام نے اپنے رسولوں کی ہدایات کو تسلیم کیا انھوں نے دنیا و آخرت کی فلاح پائی اور جن امتوں نے ان کی تلقین کا انکار کیا، اُن کا مذاق اڑایا اور اُن کو جھٹلایا تو خدائے تعالیٰ نے اپنے سچے رسول کی تصدیق کے لئے کبھی بطورِ خود اور کبھی قوم کے مطالبہ پر ایسی نشانیاں نازل فرمائیں جو نبیوں اور رسولوں کی تصدیق کا باعث بنیں اور "معجزہ" کہلائیں۔

لیکن اگر قوم نے اس نشانی "معجزہ" کے بعد بھی تکذیب کو نہ چھوڑا اور بغض و عناد سے وہ انکار پر اَڑے رہے تو پھر "عذابِ الٰہی" نے آکر اُن کو تباہ و ہلاک کر دیا اور اُن کے واقعات کو آنیوالی اقوام کے لئے عبرت و موعظت کا سامان بنا دیا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ○	اور تیرا رب بستیوں کو اس وقت تک ہلاک کرنے والا نہیں جب تک نہ بھیج دے اُن کے صدر مقام میں اپنا رسول جو پڑھ کر سنائے اُن کو ہماری آیات اور ہم (اُس وقت تک) بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے جب تک اُن کے بسنے والے خود ہی ظلم پر نہ اُتر آئیں۔

(قصص ع ۶)

معجزہ کی حقیقت "معجزہ" لغت میں عاجز کر دینے اور تھکا دینے والی چیز کو کہتے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں ایسے عمل کا نام ہے جو سلسلۂ اسباب کے بغیر عالمِ وجود میں آجائے، اس کو عام بول چال میں "خرقِ عادت" بھی کہتے ہیں، اور اسی بنا پر اس جگہ یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا "عادت اللہ" (کہ جس کو ناموسِ فطرت بھی کہا جاتا ہے) کا ٹوٹنا ممکن ہے؟

دوسرے الفاظ میں اس سوال کی تعبیر اس طرح کی جا سکتی ہے کہ کیا قانونِ قدرت میں تبدیلی ممکن ہے؟

اس سوال کا حل یہ ہے کہ معجزہ کی یہ تعبیر کہ وہ خارقِ عادت شے کا نام ہے، غلط تعبیر ہے اِس لئے کہ خدائے تعالیٰ کے قوانینِ قدرت یا نوامیسِ فطرت دراصل دو قسموں میں تقسیم ہیں، عادتِ عام اور عادتِ خاص۔ عادتِ عام سے قدرت کے وہ قوانین مراد ہیں جو باہم اسباب و مسببات کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں مثلاً آگ جلاتی ہے اور پانی خنکی پہنچاتا ہے، اور عادتِ خاص کا مطلب یہ ہے کہ اسباب و مسببات میں علاقہ پیدا کرنے والے یدِ قدرت نے کسی خاص مقصد کے لئے سبب اور مسبب کے درمیانی رشتہ کو کسی شے سے الگ کر دیا یا بغیر سبب کے مسبب کو وجود بخش دیا، جیسا کہ جلنے کے اسباب موجود ہونے کے باوجود کسی جسم کا آگ سے نہ جلنا، یا دو تین انسانوں کے قابل خوراک سے سَو دو سو انسانوں کا شکم سیر ہو جانا اور اپنی اصل مقدار کی حد تک پھر بھی باقی بچ جانا۔

یہ دونوں باتیں چونکہ عام نگاہوں میں قانونِ قدرت کے خلاف ہیں اس لئے جب یہ اور اسی طرح کی کوئی شے رُونما ہوتی یا اس کے وجود پذیر ہو جانے کی اطلاع دی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قدرت کے قانون یا عادت اللہ کے خلاف ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ قوانینِ فطرت کی پہلی قسم یعنی عام عادت کے خلاف تو ہوتا ہے مگر عادتِ خاص کے خلاف نہیں ہوتا اور وہ بھی قانونِ قدرت ہی کی ایک کڑی ہوتی ہے جو عام حالات سے الگ کسی خاص مقصد کے پورا کرنے کے لئے ظاہر کی جاتی ہے، اور اس جگہ وہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طرح خدائے تعالیٰ اپنے سچے رسول اور پیغمبر کی صداقت و حقانیت کی تصدیق کرتا اور جُھٹلانے والوں کو یہ باور کراتا ہے کہ اگر یہ مدعیٔ رسالت اپنے دعوے میں صادق نہ ہوتا تو خدا کی تائید کبھی اس کے ساتھ نہ ہوتی، پس عام قانونِ قدرت سے جُدا رسول و پیغمبر کا یہ عمل ظاہر کرتا ہے کہ درحقیقت یہ اس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا فعل ہے جو عادتِ خاص کی

صورت میں نبی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتا تاکہ اس کی صداقت کی دلیل بن سکے ۔

اور اس میں شک نہیں کہ اگر کسی نبی اور پیغمبر کو معجزہ نہ بھی دیا جاتا تب بھی پیغمبر کی پیغمبرانہ زندگی، کتابِ ہدایت کی موجودگی، اور عقلی دلائل و براہین کی روشنی میں اُس کی صداقت پر ایمان لانا از بس ضروری ہوتا اور اُس کا انکار مذہب کی اصطلاح میں کفر و جحود مانا جاتا تاہم یہ بھی ایک حقیقتِ تامہ ہے کہ آفتابِ صبح سے زیادہ روشن عقلی و نقلی دلائل کے باوجود عوام کی فطرت اکثر و بیشتر حق و صداقت کے قبول کے لئے بھی دلائل سے زیادہ ایسے امور سے جلد متاثر ہوتی ہے جو عقل کو حیران اور دماغ کو مرعوب کر کے اُن پر یہ ظاہر کر دے کہ دعوائے نبوت کے ساتھ نبی کا یہ عمل بلاشبہ خدا کی دی ہوئی ایسی طاقت رکھتا ہے جس کا مقابلہ انسانی طاقت سے بالاتر ہے اور اُس کے مظاہرہ کے سامنے عاجز و درماندہ، اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ بے شک و شبہ اس ہستی کو خدا کی تائید حاصل ہے اور اس لئے یہ جو کچھ بھی کہتا ہے خدا کی جانب سے کہتا ہے ۔

تب اس مرحلہ پر پہنچ کر عقلیین کا "یہ کہنا کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہے سرتاسر باطل اور حق تعالیٰ کی صداقت کو جھٹلانا ہے جو کسی طرح بھی ایمان کی علامت نہیں ہو سکتی ۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک نبی اور رسول، معجزہ نہ دکھلائے نبی کی صداقت اُس پر موقوف نہیں ہے لیکن اگر منکرین کے مطالبہ پر یا از خود پیغمبرِ خدا معجزہ کا مظاہرہ کرے تو یقیناً معجزہ دلیلِ نبوت ٹھہرے گا اور اُس کا انکار صداقت و حقانیت کا انکار اور کفر و جحود کہلائے گا ۔

پس ہر خاص و عام کے لئے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ انبیاء و رسل سے جو معجزات ثبوت اور دلالت کے اعتبار سے قطعی اور یقینی ثابت ہو چکے ہیں اُن پر ایمان لائے اور ان کے وجود اور انکی حقیقت کا اعتراف کرے ۔ اس لئے کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار درحقیقت اسلام سے انکار ہے

البتہ یہ حقیقت کبھی فراموش نہ ہونی چاہیئے کہ کسی شخص سے صرف اس قسم کے خارقِ عادت عمل صادر ہونے کا نام معجزہ نہیں ہے اور محض اس عمل کے بروئے کار لانے سے وہ نبی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ نبی اور رسول کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اُس کی تمام زندگی اس طرح

آزمائش وامتحان کی کسوٹی پر اُتر چکی ہو کہ اُس کا کوئی شعبۂ زندگی ناقص اور قابلِ اعتراض نہ ہو بلکہ اس کی تمام تر زندگی میں اخلاق کی بلندی، گناہوں سے معصومیت اور صداقتِ گفتار و کردار کا کمال ہی پایا جاتا ہو، پھر اگر ایسا شخص دعوائے نبوت کرتا اور اپنے دعوے کی صداقت میں علمی دلائل وبراہین کے علاوہ خدا کے نشانات (معجزات) بھی پیش کرتا ہے تو بلاشبہ وہ نبی ہے اور بلا ریب اس کا یہ فعل "معجزہ" ہے۔

ہم نے ابھی کہا کہ "معجزہ" درحقیقت نبی کا اپنا عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو نبی کے ہاتھوں سے ظاہر ہوتا اور معجزہ کہلاتا ہے، یہ اس لئے کہ نبی ورسول بھی ایک انسان اور بشر ہی ہوتا ہے اور کسی انسان کی قدرت میں یہ نہیں ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے قوانینِ عام وخاص میں دخل اندازی یا در اندازی کر سکے، یہ تو خدا ہی کی مرضی پر ہے کہ اگر وہ چاہے اور مناسبِ حال اور تقاضاءِ وقت سمجھے تو نبی اور رسول کے ہاتھ پر ایسے فعل کا ظہور کرادے جو اُس کے قوانینِ فطرت کی عادتِ خاص کی قسم میں داخل ہوں، اور اگر نہ چاہے تو نبی ورسول کے لئے بھی اُس کا اظہار ناممکن اور محال ہے۔

غزوۂ بدر میں جبکہ تین سو تیرہ کے مقابلہ میں سازوسامان سے مسلح ایک ہزار دشمنوں کا لشکر مسلمانوں پر یلغار کر کے آیا تھا تو آپؐ نے اُن کی جانب مٹھی بھر خاک پھینک دی جس کی وجہ سے ہر لشکری کی آنکھ میں خاک کے ریزے پہنچے اور وہ بے چین ہو کر آنکھیں ملنے لگا اور اس طرح مسلمانوں کو حملہ کر کے فتح حاصل ہو گئی، اس واقعہ کا مختصر اور معجزانہ انداز میں قرآنِ عزیز نے جس طرح تذکرہ کیا ہے وہ ہمارے اس دعوے کی قوی اور یقینی دلیل ہے:-

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (انفال)	اور تم نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) وہ مٹھی بھر خاک نہیں پھینکی تھی جو تم نے (اپنے ہاتھ سے) پھینکی، لیکن وہ تو (حقیقت میں) اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی،

غور فرمایئے کہ اس مقام پر نبی کے اِس عمل کا (جو اُن کے ہاتھوں انجام پایا تھا) کس عجیب و غریب انداز سے معجزہ ہونا ثابت کیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ اے پیغمبر! مٹھی بھر خاک بے شک

تمہارے ہاتھ سے پھینکی گئی اس لئے کہ تمہارے ہاتھ میں تھی۔ لیکن مٹھی بھر خاک کا یہ اثر کہ دشمن کے محاذ کی دوری اور دشمن کے اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ان سب کی آنکھوں میں جھونک دی گئی تمہارے ہاتھ سے ناممکن تھا، یہ درحقیقت خدا کا فعل تھا کہ اُس کے یدِ قدرت نے ان تمام دشواریوں کو یک لخت ختم کر کے اس مٹھی بھر خاک کو اس حالت تک پہنچا دیا کہ دشمنوں کا پورا لشکر ہزیمت کھا کر فرار کر گیا۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو آپ کے سامنے اس طرح واضح کیا گیا کہ معجزہ نبی کا اپنا فعل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست خدا کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھوں سے اسکی تائید میں کیا جاتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ۔ (المومن)	اور کسی رسول کی طاقت میں نہیں کہ وہ کوئی نشانی (معجزہ) لا سکے خدا کی اجازت بغیر، پس جب خدا کا حکم آپہنچتا ہے تو حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اس موقع پر جھٹلانے والے خسارہ میں پڑ جاتے ہیں۔
وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (الانعام ع۱۳)	اور وہ اللہ کی سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آجائے تو اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہدیجئے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے قبضے میں ہیں۔ اور (اے مسلمانو!) تم کو خبر نہیں کہ ان کے پاس اگر یہ نشانیاں آبھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

معجزہ سے متعلق ہماری یہ بحث اُسی شخص کے لئے باعثِ تسکین ہے جو مذہب کے اس بنیادی عقیدہ کا قائل ہو کہ تمام اشیاء کے خواص ان کے اپنے ذاتی خواص نہیں ہیں بلکہ کسی پیدا کرنے والے نے اُن کو عطا کئے ہیں۔ پس جو شخص اس عقیدہ کا حامی ہے وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا کرنے والے نے عام قانونِ قدرت اس کے لئے یہی رکھا ہے کہ جو شے اس سے چھو جائے وہ جل جائے لیکن یہ عقلاً ناممکن نہیں ہے کہ وہ کسی اہم مقصد

کی تکمیل کے لئے آگ کی اس خاصیت کو کسی خاص حالت میں سلب کر لے اور وہ اس کے قانونِ قدرت کی خاص حالت یا خاص عادت شمار ہو۔

لیکن جو شخص اس بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتا اور ہر شے کے خواص کو اس طرح اس کے ذاتی خواص مانتا ہے کہ کسی حالت اور کسی وقت میں بھی اس خاصیت کا اُس شے سے جُدا ہونا ممکن نہیں ہے تو اس شخص سے اول یہ طے کرنا چاہئے کہ کیا عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ جو شے خود اپنے وجود میں دوسرے کی محتاج ہو اس کا کوئی خاصہ بھی ذاتی اور غیر منفک ہو سکتا ہے؟ "گذشتہ سال لندن اور امریکہ میں خدا بخش کشمیری نے دہکتی ہوئی آگ پر چلنے کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ خود بھی چلا اور دوسرے اشخاص کو بھی اپنے ساتھ آگ پر سے گذارا اور اُس کے بعد تمام سائنسدانوں نے اس کے جسم کا طرح طرح سے تجربہ کر کے یہ معلوم کرنا چاہا کہ شاید وہ فائر پروف ہو مگر ناکام رہے اور اُن کو اقرار کرنا پڑا کہ اُس کا جسم اور آگ پر گذرنے والے دوسرے اشخاص کا جسم عام انسانوں کے جسم سے زیادہ کوئی خاص کیفیت نہیں رکھتا اور انتہائے حیرت و استعجاب کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ وہ اس حقیقت کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ آگ موجود ہے اور نہیں جلاتی"[1] تو اس کا اُس کے پاس کیا جواب ہے۔

پس علم کی فراوانی کے باوجود جبکہ ہمارے عجز کا یہ عالم ہے تو ہم کو کیا زیبا ہے کہ علمِ یقین (وحی) کی بیان کردہ حقیقت (معجزہ) کا اس لئے انکار کر دیں کہ ہماری عقل عام حالات میں سبب کے بغیر کسی مسبب کو دیکھنے کی عادی نہیں ہے۔

بہر حال ایسے شخص کو خدا اور اس کی صفات خصوصاً صفتِ قدرت پر پہلے بحث کرنی چاہئے اس کے بعد اس مسئلہ کی نوبت آسکتی ہے مگر اس کا اصل مقام یہ نہیں بلکہ "علمِ کلام" ہے۔

ناقۃ اللہ | غرض حضرتِ صالح (علیہ السلام) قوم (ثمود) کو بار بار سمجھاتے اور نصیحت فرماتے رہے، مگر قوم پر مطلق اثر نہیں ہوا بلکہ اُس کا بغض و عناد ترقی پاتا رہا اور اُن کی مخالفت بڑھتی ہی رہی اور وہ کسی طرح بُت پرستی سے باز نہ آئی، اگرچہ ایک مختصر اور کمزور جماعت نے ایمان

[1] لندن ٹائمز۔

قبول کرلیا اور وہ مسلمان ہوگئی مگر قوم کے سردار اور بڑے بڑے سرمایہ دار اسی طرح باطل پرستی پر قائم رہے اور انھوں نے خدا کی دی ہوئی ہر قسم کی خوش عیشی اور رفاہیت کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے کفرانِ نعمت کو شعار بنا لیا۔ وہ حضرت صالحؑ کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا کرتے کہ صالحؑ! اگر ہم باطل پرست ہوتے، خدا کے صحیح مذہب کے منکر ہوتے اور اس کے پسندیدہ طریقہ پر قائم نہ ہوتے تو آج ہم کو یہ دھن دولت، سرسبز و شاداب باغات کی فراوانی، سیم و زر کی بہتات، بلند و عالی شان محلات کی رہائش، میوہ جات اور پھلوں کی کثرت، شیریں نہروں اور عمدہ مرغزاروں کی افزائش حاصل نہ ہوتی تو خود کو اور اپنے پیروؤں کو دیکھ اور پھر ان کی تنگ حالی اور غربت پر نظر کر اور بتلا کہ خدا کے پیارے اور مقبول کون ہیں۔ ہم یا تم؟

حضرت صالحؑ فرماتے کہ تم اپنی اس رفاہیت اور عیش سامانی پر شیخی نہ مارو اور خدا کے سچے رسول اور اس کے دینِ برحق کا مذاق نہ اُڑاؤ، اس لئے کہ اگر تمہارے کبر و غرور اور عناد کا یہی حال رہا تو پل بھر میں یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا اور پھر نہ تم رہو گے اور نہ تمہارا یہ ساز و سامان، بیشک یہ سب کچھ خدا کی نعمتیں ہیں بشرطیکہ اُن کو حاصل کرنے والے اُس کا شکر ادا کریں اور اس کے سامنے سرِ نیاز جھکائیں اور بلاشبہ یہی سامان عذاب و لعنت ہیں اگر ان کا استقبال شیخی اور غرور کے ساتھ کیا جائے، اس لئے یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ ہر سامانِ عیش خوشنودیِ الٰہی کا ثمرہ ہے،

ثمود کو یہ بھی حیرانی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ہی میں کا ایک انسان خدا کا پیغمبر بن جائے اور وہ خدا کے احکام سُنانے لگے، وہ سخت تعجب سے کہتے۔

أَأُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا کیا ہماری موجودگی میں اس پر (خدا کی) نصیحت اُترتی ہے۔

یعنی اگر ایسا ہونا ہی تھا تو اس کے اہل ہم تھے نہ کہ صالحؑ اور کبھی اپنی قوم کے کمزور افراد کو (جو کہ مسلمان ہو گئے تھے) خطاب کر کے کہتے:۔

أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُرْسَلٌ مِنْ رَبِّهِ۔ کیا تم کو یقین ہے کہ بلاشبہ صالحؑ اپنے پروردگار کا رسول ہے؟

اور مسلمان جواب دیتے:۔

قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۔ انھوں نے کہا بیشک ہم تو اُسکے لائے ہوئے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں،

تب یہ متکبرین غصہ میں کہتے :۔

اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۔ بلاشبہ ہم تو اُس شے کا جس پر تمہارا ایمان ہے انکار کرتے ہیں،

بہرحال حضرتِ صالح علیہ السلام کی مغرور اور سرکش قوم نے اُن کی پیغمبرانہ دعوت ونصیحت کو یوں تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور خدا کے نشان (معجزہ) کا مطالبہ کیا۔ تب صالح (علیہ السلام) نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی اور قبولیت کے بعد اپنی قوم سے فرمایا کہ تمہارا مطلوبہ نشان اونٹنی کی شکل میں یہ موجود ہے۔ دیکھو اگر تم نے اس کو ایذا پہنچائی تو پھر یہی تمہاری ہلاکت کا نشان ثابت ہوگی، اور خدائے تعالیٰ نے تمہارے اور اس کے درمیان پانی کے لئے باری مقرر فرمادی ہے، ایک دن تمہارا ہے اور ایک دن اس کا لہٰذا اس میں فرق نہ آئے۔

قرآنِ عزیز نے اس کو "ناقۃ اللہ" (خدا کی اونٹنی) کہا ہے تاکہ پیش نظر رہے کہ یوں تو تمام مخلوق خدا ہی کی ملکیت ہے، مگر ثمود نے چونکہ اس کو خدا کی ایک نشانی کی شکل میں طلب کیا تھا اس لئے اس کی موجودہ خصوصیت اور اعزاز نے اس کو "ناقۃ اللہ" کا لقب دلایا۔[1] اور نیز اس کو "لَكُمْ اٰيَةً" کہہ کر یہ بھی بتایا کہ یہ نشانی اپنے اندر خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن بدقسمت قوم ثمود زیادہ

---

[1] قرآنِ عزیز سے اس سلسلہ میں صرف دو باتیں ثابت ہیں ایک یہ کہ ثمود نے حضرتِ صالحؑ سے نشان (معجزہ) طلب کیا اور حضرتِ صالحؑ نے "ناقہ" کو بطور نشانی پیش کیا، دوسرے یہ کہ حضرتِ صالحؑ نے قوم کو یہ ہدایت کردی تھی کہ وہ اس کو ضرر نہ پہنچائے اور پانی کی باری مقرر کرے کہ ایک روز ناقہ کا اور دوسرا قوم کا، اور اگر اس کو نقصان پہنچایا تو یہی قوم کی ہلاکت کا نشان ہوگا، چنانچہ انھوں نے "ناقہ" کو ہلاک کردیا اور خدا کے عذاب سے خود بھی ہلاک ہوگئے۔

اس سے زائد جو کچھ ہے اس کا مدار یا ان روایاتِ حدیثی پر ہے جو اخبارِ آحاد کے درجہ میں شمار ہیں اور یا بائبل اور تاریخِ قدیم کی روایات پر، جہاں تک اخبارِ آحاد کا تعلق ہے محدثین کے نزدیک ان میں سے بعض صحیح روایات ہیں اور بعض ضعیف، اس لئے حافظ عماد الدین بن کثیر نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں "ناقۃ اللہ" کے وجود میں آنے کی روایات کو سندِ روایات کے اصول پر نقل نہیں فرمایا بلکہ ایک تاریخی واقعہ کی طرح تحریر فرمایا ہے۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قومِ ثمود جب حضرتِ صالحؑ کی تبلیغِ حق سے اکتا گئی تو اس کے سرخیل اور سرگروہ افراد نے قوم کی موجودگی میں مطالبہ کیا کہ اے صالح! اگر تو واقعی خدا کا فرستادہ ہے تو کوئی نشانی دکھا تاکہ ہم (باقی صفحہ ۱۳۶ پر)

دیر تک اس کو برداشت نہ کر سکی اور ایک روز سازش کر کے قدار بن سالف کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ اُس کے قتل میں پہل کرے اور باقی اعانت کریں۔ اور اس طرح ناقہ کو ہلاک کر ڈالا حضرت صالح (علیہ السلام) کو جب یہ معلوم ہوا تو آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے۔ بدبخت قوم! آخر تجھ سے صبر نہ ہو سکا اب خدا کے عذاب کا انتظار کر تین روز کے بعد وہ نہ ٹلنے والا عذاب آئے گا اور تم سب کو ہمیشہ کے لئے تہس نہس کر جائے گا۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) تیری صداقت پر ایمان لے آئیں۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ نشان آنے کے بعد بھی انکار پر مُصر اور سرکشی پر قائم رہو۔ قوم کے ان سرداروں نے بتاکید وعدہ کیا کہ ہم فوراً ایمان لے آئیں گے۔ تب حضرت صالحؑ نے انہی سے دریافت کیا کہ وہ کس قسم کا نشان چاہتے ہیں، انھوں نے مطالبہ کیا کہ سامنے والے پہاڑ میں سے یا بستی کے اس پتھر میں سے جو کنارہ پر نصب ہے ایک ایسی اونٹنی ظاہر کر جو گابھن ہو اور فوراً بچہ دے۔ حضرت صالح (علیہ السلام) نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی اور اُسی وقت اُن سب کے سامنے پہاڑ، پتھر میں سے حاملہ اونٹنی ظاہر ہوئی اور اس نے بچہ دیا۔ یہ دیکھ کر ان سرداروں میں سے جندع بن عمرو تو اُسی وقت مشرف باسلام ہو گیا اور دوسرے سرداروں نے بھی جب اس کی پیروی میں اسلام لانے کا ارادہ کیا تو ان کے ہیکلوں اور مندروں کے مہنتوں ذؤاب بن عمرو اور حباب اور اُن کے کاہن رُباب بن صمعر نے اُن کو اس سے باز رکھا اور اسی طرح باقی دوسروں کو بھی اسلام لانے سے روکا۔

اب حضرتِ صالح (علیہ السلام) نے قوم کے تمام افراد کو تنبیہ کی کہ دیکھو یہ نشانی تمہاری طلب پر بھیجی گئی ہے، خدا کا فیصلہ ہے کہ پانی کی باری مقرر ہو، ایک دن اس ناقہ کا ہوگا اور ایک دن ساری قوم اور اس کے سارے چوپاؤں کا۔ اور خبردار اس کو کوئی اذیت نہ پہنچے، اگر اس کو آزار پہنچا تو پھر تمہاری بھی خیر نہیں ہے۔

قوم نے اگرچہ اس حیرت زا معجزہ کو دیکھ کر ایمان قبول نہ کیا لیکن دلوں کے اقرار نے اُس کو آزار پہنچانے سے باز رکھا، اور یہ دستور جاری رہا کہ پانی کی باری ایک روز ناقہ کی رہتی اور تمام قوم اس کے دودھ سے فائدہ اُٹھاتی اور دوسرے روز قوم کی باری ہوتی، اور ناقہ اور اُس کا بچہ بغیر روک ٹوک چراگاہوں میں چرتے اور آسودہ رہتے، مگر آہستہ آہستہ یہ بات بھی ان کو کھٹکنے لگی اور آپس میں صلاح و مشورے ہونے لگے کہ اس ناقہ کا خاتمہ کر دیا جائے تو اس باری والے قصے سے نجات ملے، کیونکہ ہمارے چوپاؤں کے لئے اور خود ہمارے اپنے لئے یہ قید ناقابلِ برداشت ہے۔ یہ باتیں اگرچہ ہوتی رہتی تھیں لیکن کسی کو (باقی صفحہ ۱۴۷ پر)

سید آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں تحریر فرماتے ہیں کہ ثمود پر عذاب آنے کی علامات اگلی صبح ہی سے شروع ہوگئیں یعنی پہلے روز اُن سب کے چہرے اس طرح زرد پڑ گئے جیسا کہ خوف کی ابتدائی حالت میں ہوجایا کرتا ہے اور دوسرے روز سب کے چہرے سُرخ تھے گویا خوف ودہشت کا یہ دوسرا درجہ تھا، اور تیسرے روز اُن سب کے چہرے سیاہ تھے اور تاریکی چھائی ہوئی تھی یہ خوف ودہشت کا وہ تیسرا مقام ہے جس کے بعد موت ہی کا درجہ باقی رہ جاتا ہے،

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اُس کے قتل کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، مگر ایک حسین وجمیل مالدار عورت صدوق نے خود کو ایک شخص مصدع کے سامنے اور ایک مالدار عورت عنیزہ نے اپنی ایک خوبصورت لڑکی کو قیدار کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اگر وہ دونوں ناقہ کو ہلاک کردیں تو یہ تمہاری ملک ہیں تم ان کو بیوی بنا کر عیش کرو۔ آخر قیدار ابن سالف اور مصدع کو اس کے لئے آمادہ کرلیا گیا۔ اور طے پایا کہ وہ راہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور ناقہ جب چراگاہ جانے لگے تو اس پر حملہ کردیں گے اور چند دوسرے آدمیوں نے بھی مدد کا وعدہ کیا۔

غرض ایسا ہی کیا گیا اور ناقہ کو اس طرح سازش کرکے قتل کرڈالا اور پھر آپس میں حلف کیا کہ رات ہونے پر سب صالحؑ اور اس کے اہل وعیال کو بھی قتل کردیں گے اور پھر اُس کے اولیاء کو قسمیں کھا کر یقین دلائیں گے کہ یہ کام ہمارا نہیں ہے۔

اور بچہ یہ دیکھ کر بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور چیختا اور بولتا ہوا پہاڑی میں غائب ہوگیا۔

صالح علیہ السلام کو جب یہ خبر ہوئی تو حسرت وافسوس کے ساتھ قوم سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا، اب خدا کے عذاب کا انتظار کرو جو تین دن کے بعد تم کو تباہ کردے گا، اور پھر بجلی کی چمک اور کڑک کا عذاب آیا اور اس نے رات میں سب کو تباہ کردیا، اور آنے والے انسانوں کے لئے تاریخی عبرت کا سبق دے گیا۔

اس واقعہ کے ساتھ ساتھ محدث ابن کثیر نے چند روایات حدیثی بھی بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً:۔

غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جب آپؐ کا گذر حجر پر ہوا تو صحابہ نے ثمود کے کنوئیں سے پانی بھرا اور آٹا گوندھ کر روٹیاں تیار کرنے لگے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو پانی گرا دینے اور ہانڈیاں اوندھی کردینے، اور آٹا بیکار کردینے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ وہ بستی ہے جس پر خدا کا عذاب ہوا، یہاں نہ قیام کرو اور نہ یہاں کی اشیاء سے فائدہ اٹھاؤ، آگے بڑھ کر پڑاؤ ڈالو ایسا نہ ہو کہ تم بھی کسی بلا میں مبتلا ہوجاؤ اور (باقی صفحہ ۱۳۸ پر)

[1] جلد ۸ ص ۱۳۵، ۱۳۶۔

تین دن کی ان علاماتِ عذاب نے اگرچہ اُن کے چہروں کو واقعی زرد، سُرخ اور تاریک بنا دیا تھا، لیکن ان رنگوں کی ترتیبی خصوصیت یہ صاف بتا رہی ہے کہ ان کے دلوں کو صالح (علیہ السلام) کے سچے ہونے کا یقین تھا اور صرف حسد و بغض سے انکار کرتے تھے، اب جبکہ خدا کے حکم کے خلاف جرم کر چکے اور اس کی پاداش میں صالح (علیہ السلام) سے عذاب کی ہولناک خبر سُنی تو ان پر خوف و دہشت کے وہ فطری رنگ اور نقوش نمایاں ہونے لگے جو موت کے یقین کے وقت خوف و دہشت سے مجرموں کے اندر پیدا ہوا کرتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ تم ان حِجر کی بستیوں میں خدا سے ڈرتے عجز و زاری کرتے اور روتے ہوئے داخل ہوا کرو، ورنہ ان میں داخل ہی نہ ہوا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اپنی غفلت کی وجہ سے عذاب کی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حِجر میں داخل ہوئے تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے نشانیاں طلب نہ کیا کرو (دیکھو صالح (علیہ السلام) کی قوم نے نشان طلب کیا تھا اور وہ ناقہ پہاڑ کی کھوہ سے نکلتی اور اپنی باری میں کھا پی کر وہیں واپس چلی جاتی اور جو اس کی باری کا دن تھا اس میں قومِ ثمود کو اپنے دودھ سے سیراب کرتی تھی، مگر ثمود نے آخر کار سرکشی کی اور ناقہ کی کونچیں کاٹ کر اس کو ہلاک کر دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے ان پر "صیحۃ کا عذاب" مسلط کر دیا، اور وہ اس عذاب سے گھروں کے اندر ہی مُردہ ہو کر رہ گئے، صرف ایک شخص ابورغال نامی باقی بچا جو حرم میں گیا ہوا تھا لیکن جب وہ حدودِ حرم سے باہر آیا تو فوراً اُسی عذاب کا شکار ہو گیا۔

حافظ ابن کثیر نے یہ تینوں روایات سند کے ساتھ مسندِ احمد سے نقل کرکے اِن کی توثیق کی ہے[1]

اِس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ عزیز سے یہ تو یقین کے ساتھ ثابت ہے کہ "ناقۃ اللہ" خدا کا ایک نشان تھی اور اپنے اندر ضرور کوئی ایسی خصوصیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسا نشان کہلا سکے جس کا ذکر قرآنِ عزیز اس اہمیت کے ساتھ کر رہا ہے "هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً" "یہ ناقۃ اللہ تمہارے لئے نشان ہے" اور پھر پانی کی باری جس طرح ناقہ اور قومِ ثمود کے درمیان تقسیم فرمائی وہ خود ایک مستقل دلیل ہے کہ یہ "ناقہ" ضرور اپنے اندر ایسی حیثیت رکھتی تھی جو نشانِ الٰہی کہلا سکے لیکن یہ بات کہ "ناقہ" کا وجود کس طرح ہوا اور کن وجوہ سے "نشانِ الٰہی" یا "معجزۂ نبی" قرار پائی قرآنِ عزیز اس سے ساکت ہے۔ البتہ مختلف صحیح اخبارِ آحاد سے اس واقعہ پر ضرور روشنی پڑتی ہے جس کی تفصیل ابن کثیر سے ابھی نقل ہو چکی مگر واقعہ کی تفصیلی صراحت و وضاحت وہاں بھی موجود نہیں ہے بلکہ (باقی صفحہ ۱۳۹ پر)

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۳۸-۱۳۹۔

بہرحال ان تین دن کے بعد وقتِ موعود آپہنچا اور رات کے وقت "ایک ہیبتناک آواز" نے ہر شخص کو اُسی حالت میں ہلاک کر دیا جس حالت میں وہ تھا، قرآنِ عزیز نے اس ہلاکت آفریں آواز کو کسی مقام پر صاعقہ (کڑاک دار بجلی) اور کسی جگہ رجفہ (زلزلہ ڈال دینے والی شے) اور بعض جگہ طاغیہ (دہشتناک) اور بعض جگہ صیحہ (چیخ) فرمایا۔ اس لئے کہ یہ تمام تعبیرات ایک ہی حقیقت کے مختلف اوصاف کے اعتبار سے کی گئی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ خدائے تعالیٰ کے اس عذاب کی ہولناکیاں کیسی گوناگوں تھیں، تم ایک ایسی کوندنے والی بجلی کا تصور کرو جو بار بار اضطراب کے ساتھ چمکتی، کڑکتی اور گرجتی ہو اور اس طرح کوندرہی ہو کہ کبھی مشرق میں ہے تو کبھی مغرب میں، اور جب ان تمام صفات کے ساتھ چمکتی کوندتی، گرجتی، لرزتی لرزاتی ہوئی کسی مقام پر ایک ہولناک چیخ کے ساتھ گرے تو اُس مقام اور اُس کے نواح کا کیا حال ہوگا؟ یہ ایک معمولی اندازہ ہے اُس عذاب کا جو ثمود پر نازل ہوا اور اُن کو اور اُن کی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے سرکشوں کی سرکشی اور مغروروں کے غرور کا انجام ظاہر کرنے کے لئے آنے والی نسلوں کے سامنے عبرت پیش کر گیا۔

ایک طرف ثمود پر یہ عذاب نازل ہوا اور دوسری جانب صالح علیہ السلام اور اُن کے پیرو مسلمانوں کو خدا نے اپنی حفاظت میں لے لیا اور اُن کو اس عذاب سے محفوظ رکھا۔

حضرتِ صالح (علیہ السلام) حزن و ملال کے ساتھ ہلاک شدگان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمانے لگے:۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کتبِ تفسیر میں اسرائیلیات سے منقول ہے یا ضعیف روایات سے اخذ کی گئی ہے، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ واقعہ کے اجمال و تفصیل میں فرقِ مراتب کا ضرور خیال رکھا جائے کہ جس قدر قرآنِ عزیز نے تصریح کی ہے وہ بغیر کسی تاویل کے واجب الاعتقاد ہے اور جس قدر صحیح روایات سے (اگرچہ وہ آحاد ہی کے درجہ کی ہیں) اس اجمال کی تفصیل کا پتہ ملتا ہے وہ اجمال کی تفصیل کی حیثیت سے قابلِ قبول ہیں، گو قرآنِ عزیز کی تصریحات کے درجہ کو نہ پہنچ سکیں اور ان سے زیادہ باقی تفصیلات کی حیثیت وہی ہے جو عام تاریخی وقائع اور اسرائیلیات کی حیثیت ہے۔

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ۔ اے قوم! بلاشبہ میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچایا اور تم کو نصیحت کی لیکن تم تو نصیحت کرنیوالوں کو دوست ہی نہ رکھتے تھے۔

ہلاک شدہ قوم کی جانب حضرت صالح (علیہ السلام) کا یہ خطاب اسی طرح کا خطاب تھا جس طرح بدر میں مشرکین مکہ کے سرداروں کی ہلاکت کے بعد مردہ نعشوں کے گڑھے پر کھڑے ہو کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:۔

يا فلان بن فلان وفلان بن فلان أيسركم أنكم أطعتم الله ورسوله فانا قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا فهل وجدتم ما وعد ربكم حقا[1] (الحديث)

اے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں کیا تم کو اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت پسند آئی؟ بلاشبہ ہم نے وہ سب کچھ پالیا جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا تھا، پس کیا تم نے بھی وہ پایا جو تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا؟

اس قسم کے خطاب کے بارہ میں علماء کی چند رائیں ہیں:۔

(۱) اس قسم کا خطاب انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات میں سے ہے اس لئے کہ اللہ تعالےٰ ان کے اس کلام کو بلاشبہ مُردوں کو سُنوا دیتا ہے اگرچہ وہ جواب دینے سے قاصر ہیں اس لئے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی لاشوں کو اس طرح مخاطب کیا تو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے تعجب سے پوچھا۔ کیا یہ سن رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا "ہاں" تم سے زیادہ مگر جواب سے عاجز ہیں۔"

(۲) یہ طریق خطاب حُزن وملال کے اظہار کے لئے ہے جیسا کہ ایک شخص نے کسی شخص کو متنبہ کیا کہ اس باغ میں نہ جانا سانپ بچھو کثرت سے ہیں ڈسے جانے کا خطرہ ہے، مگر وہ شخص باغ میں گیا اور ڈسا گیا تو جب یہ تنبیہہ کرنے والا اس کی نعش پر پہنچتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے، افسوس کیا میں نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ باغ میں نہ جانا ورنہ ڈسا جائے گا آخر وہی ہوا۔

(۳) اس قسم کے خطاب کے اصل مخاطب وہ زندہ انسان ہوتے ہیں جو ان مردہ نعشوں کو دیکھ رہے ہیں تاکہ ان کو عبرت حاصل ہو اور وہ اس قسم کی سرکشی کی جرأت نہ کر سکیں۔

[1] بخاری ج ۲ باب المغازی۔

قوم کی ہلاکت اور صالحؑ کا قیام	یہ ایک تاریخی سوال ہے کہ جب ثمود ہلاک و برباد ہو گئے تو صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے مسلمانوں نے کہاں سکونت اختیار کی؟

اس سوال کا جواب یقینی اور حتمی طور پر دینا تو قریب قریب ناممکن ہے البتہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ قوم کی ہلاکت کے بعد علاقہ فلسطین میں آکر آباد ہو گئے اس لئے کہ حجر کے قریب یہی مقام ایسا تھا جو سرسبز و شاداب اور مویشیوں کے پانی اور چارہ کے لئے بہترین تھا اور فلسطین کے علاقہ میں یہ جگہ نواحی رملہ ہو گی یا کوئی دوسرا مقام۔ علماء تفسیر اس کے جواب میں متعدد اقوال پیش فرماتے ہیں:-

(۱) وہ فلسطین کے علاقہ میں رملہ کے قریب آباد ہوئے۔ خازن نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

(۲) وہ حضرموت میں آکر آباد ہوئے اس لئے کہ اُن کا اصل وطن یہی تھا یا اس لئے کہ یہ احقاف ہی کا ایک حصہ ہے، یہاں ایک قبر ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ صالح علیہ السلام کی قبر ہے۔

(۳) وہ ثمود کی ہلاکت کے بعد اُن ہی بستیوں میں آباد رہے، یہ عام مورخین کی رائے ہے۔

(۴) وہ قوم کی ہلاکت کے بعد مکہ معظمہ تشریف لے آئے اور وہیں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال فرمایا، اور اُن کی قبر مبارک کعبہ سے غربی جانب حرم ہی میں ہے، سید آلوسی اسی کو راجح سمجھتے ہیں۔

سید آلوسی نے اپنی تفسیر میں ایک قول نقل کیا ہے جس میں بتایا ہے کہ صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والے جو مسلمان ان کے ساتھ عذاب سے محفوظ اور نجات یافتہ رہے ان کی تعداد تقریباً ایک سو بیس ۱۲۰ تھی اور ہلاک شدہ قریباً ڈیڑھ ہزار گھرانے تھے۔

اب اس تمام اینِ وآں کے بعد اس کلامِ بلاغت نظام "قرآنِ عزیز" کی آیات کا مطالعہ فرمایئے جو ان واقعات کا حقیقی سرچشمہ ہیں اور عبرت و موعظت کا بے نظیر سامان مہیا کرتی ہیں۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ	اور (اسی طرح) ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح کو بھیجا، اُس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے

مِّنْ رَّبِّكُمْ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ
اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ
اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ
خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي
الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا
قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ
فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي
الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ قَالَ
الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ
لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ
مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا
مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ
اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ
الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ
اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ فَعَقَرُوا
النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ
وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا
تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝
فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا
فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ فَتَوَلّٰى

ایک واضح دلیل تمہارے سامنے آچکی ہے، یہ خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی
اونٹنی تمہارے لئے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے، پس اسے کھلا چھوڑ دو
کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے، اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ
کہ (اس کی پاداش میں) عذابِ جانکاہ تمہیں آ پکڑے اور وہ وقت
یاد کرو کہ خدا نے تمہیں قومِ عاد کے بعد اس کا جانشین بنایا اور اس
سرزمین میں اس طرح بسا دیا کہ میدانوں سے محل بنانے کا کام لیتے ہو
اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا گھر بنا لیتے ہو (یہ اُس کا تم پر احسان
ہے) پس اللہ کی نعمتیں یاد کرو، اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے
خرابی نہ پھیلاؤ" قوم کے جن سربرآوردہ لوگوں کو (اپنی دولت و
طاقت کا) گھمنڈ تھا انھوں نے مومنوں سے کہا، اور یہ اُن لوگوں
میں سے تھے جنھیں (افلاس و بیچارگی کی وجہ سے) کمزور و حقیر سمجھتے
تھے: "کیا تم نے سچ مچ کو معلوم کر لیا ہے کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے؟
(ہمیں تو ایسی کوئی بات اس میں دکھائی دیتی نہیں) انھوں
نے کہا "ہاں! بیشک جس پیامِ حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے، ہم اس پر
پورا یقین رکھتے ہیں" اس پر گھمنڈ کرنیوالوں نے کہا "تمہیں جس بات
کا یقین ہے ہمیں اس سے انکار ہے، غرضکہ انھوں نے اونٹنی کو کاٹ
ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ انھوں نے کہا، اے
صالح!! اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو، تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ
جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا، پس ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی
ہولناکی نے اُنہیں آلیا۔ اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں
اوندھے منہ پڑے رہ گئے! پھر صالح ان سے کنارہ کش ہو گیا، اس نے

عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ	کہا' اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار
اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ	کا پیام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی، مگر افسوس
لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝	تم پر! تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں
(اعراف ع۱۰)	کرتے"!
(۲) وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ	اور ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے
قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ	صالح کو بھیجا، اُس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی
مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ	بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، وہی ہے جس نے
الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا	تمہیں زمین سے پیدا کیا اور پھر اسی میں تمہیں بسا دیا، پس چاہیے
فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ	کہ اس سے بخشش مانگو اور اس کی طرف رجوع ہو کر رہو۔ یقین کرو
اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۝ قَالُوْا	میرا پروردگار (ہر ایک کے) پاس ہے۔ اور (ہر ایک کی) دعاؤں کا
يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ	جواب دینے والا ہے! "لوگوں نے کہا اے صالح! پہلے تو تو ایک
هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ	ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی اُمیدیں تجھ سے وابستہ تھیں پھر کیا تو
اٰبَاۗؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ	ہمیں روکتا ہے کہ ان معبودوں کی پوجا نہ کریں جنھیں ہمارے باپ
اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ	دادا پوجتے چلے آئے ہیں؟ (یہ کیسی بات ہے؟) ہمیں تو اس
اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ	بات میں بڑا ہی شک ہے، جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے
وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ	دل میں اُترتی نہیں" صالح نے کہا اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے
مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۣ فَمَا	اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل
تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝ وَيٰقَوْمِ	روشن پر ہوں اور اُس نے اپنی رحمت مجھے عطا فرمائی ہو تو پھر کون ہے
هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً	جو اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کریگا اگر میں اس کے حکم سے سرتابی
فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ	کروں؟ تم (اپنی توقع کے مطابق دعوت کا رد کر) مجھے کوئی فائدہ
وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ	نہیں پہنچاتے تباہی کی طرف لیجانا چاہتے ہو" اور اے میری قوم

عَذَابٌ قَرِيبٌ ○ فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ أَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ ○ فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِينَ اٰمَنُوا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ○ وَاَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جٰثِمِينَ ○ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا اَلَآ اِنَّ ثَمُودَا كَفَرُوا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ ○ (ہود ع)

کے لوگو! دیکھو یہ اللہ کی اونٹنی (یعنی اُس کا نشان) تمہارے لئے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے، پس اسے چھوڑ دو، اللہ کی زمین میں چرتی رہے اُسے کسی طرح کی اذیت نہ پہنچانا، ورنہ فوراً عذاب تمہیں آپکڑے گا" لیکن لوگوں نے (اور زیادہ ضد میں آکر) اُسے ہلاک کرڈالا۔ تب صالح نے کہا (اب تمہیں صرف) تین دن کی مہلت ہے، اپنے گھروں میں کھاپی لو، یہ وعدہ ہے جھوٹا نکلے گا" پھر جب ہماری ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا تو ہم نے صالح کو اور اُن لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچالیا اور اُس دن کی رسوائی سے نجات دیدی (اے پیغمبر!) بلاشبہ تیرا پروردگار ہی ہے جو قوت والا اور سب پر غالب ہے! اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا اُن کا یہ حال ہوا کہ ایک ہولناک کڑک نے آلیا جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے (وہ اس طرح اچانک مر گئے) گویا اُن گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے! تو سن رکھو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کی ناشکری کی، اور ہاں سن رکھو کہ ثمود کے لئے محرومی ہوئی!

(۳) وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ○ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ○ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا اٰمِنِينَ ○ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ○ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○ (حجر ع)

اور دیکھو حجر کے لوگوں نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی، ہم نے اپنی نشانیاں اُنھیں دکھائیں، مگر وہ روگردانی ہی کرتے رہے، وہ پہاڑ تراش کر گھر بناتے تھے کہ محفوظ رہیں لیکن (یہ حفاظتیں کچھ بھی کام نہ آئیں) ایک دن صبح کو اُٹھے تو ایک ہولناک آواز نے آپکڑا تھا، اور جو کچھ انھوں نے اپنی سعی وعمل سے کمایا تھا وہ کچھ بھی ان کے کام نہ آیا۔

(۴) كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ○ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُونَ ○ اِنِّي لَكُمْ

جھٹلایا ثمود نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو ان کے بھائی صالح نے کیا تم ڈرتے نہیں، میں تمہارے

رَسُولٌ أَمِينٌ ۙ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۚ
وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا
عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۙ أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا
آمِنِينَ ۙ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۙ وَزُرُوعٍ
وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ۚ وَتَنْحِتُونَ مِنَ
الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَ
أَطِيعُونِ ۚ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۙ
الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۚ
قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۚ مَا أَنْتَ
إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا ۖ فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ
مِنَ الصَّادِقِينَ ۚ قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ لَهَا
شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَعْلُومٍ ۚ وَلَا
تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ
عَظِيمٍ ۚ فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ۙ
فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ
وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ
لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۚ

پاس پیغام لانیوالا ہوں معتبر، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا
مانو اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ بدلہ، میرا بدلہ ہے
اسی جہان کے پالنے والے پر، کیا چھوڑے رکھیں گے تم کو
یہاں کی چیزوں میں بے خوف، باغوں اور چشموں
میں اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کا خوشہ
نرم ہے اور تراشتے ہو پہاڑوں میں گھر تکلف کے، سو
ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور نہ مانو حکم بیباک لوگوں کا
جو خرابی کرتے ہیں ملک میں اور اصلاح نہیں کرتے،
بولے تجھ پر تو کسی نے جادو کیا ہے۔ تو بھی ایک آدمی ہے
جیسے ہم، سو لے آ کچھ نشانی اگر تو سچا ہے، کہا یہ اونٹنی
ہے اس کے لئے پانی پینے کی ایک باری اور تمہارے
لئے باری ایک دن مقرر، اور مت چھیڑیو اس کو بری
طرح سے پھر پکڑ لے تم کو آفت ایک بڑے دن کی،
پھر کونچیں کاٹیں اس اونٹنی کی پھر کل کو رہ گئے پچھتاتے
پھر آپکڑا اُن کو عذاب نے البتہ اس بات میں نشانی
ہے اور اُن میں بہت لوگ نہیں ماننے والے اور
تیرا رب وہی ہے زبردست رحم کرنے والا۔

(۵) وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ
صَالِحًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ فَإِذَا هُمْ فَرِيقَانِ
يَخْتَصِمُونَ ۚ قَالَ يَا قَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُونَ
بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۖ لَوْلَا

اور ہم نے بھیجا تھا ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح کو
کہ بندگی کرو اللہ کی پھر وہ تو دو فرقے ہو کر لگے جھگڑنے
کہا اے میری قوم کیوں جلدی مانگتے ہو برائی کو پہلے
بھلائی سے۔ کیوں نہیں گناہ بخشواتے

۱۰

تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ○ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ○ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○ (النمل ۴)

اللہ سے شاید تم پر رحم ہو جائے، بولے ہم نے منحوس قدم دیکھا تجھ کو اور تیرے ساتھ والوں کو، کہا تمہاری بری قسمت اللہ کے پاس ہے تمہارا کہنا کچھ نہیں بلکہ تم جانچے جاتے ہو اور تھے اس شہر میں نو شخص کہ خرابی کرتے ملک میں اور اصلاح نہ کرتے بولے کہ آپس میں قسم کھاؤ اللہ کی کہ البتہ رات کو جا پڑیں ہم اس پر اور اس کے گھر پر پھر کہہ دیں گے اس کے دعویٰ کرنے والے کو ہم نے نہیں دیکھا جب تباہ ہوا اس کا گھر اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں، اور انہوں نے بنائی ایک خفیہ تدبیر اور ہم نے بنائی ایک پوشیدہ تدبیر اور ان کو خبر نہ ہوئی پھر دیکھ لے کیسا ہوا انجام ان کے فریب کا کہ ہلاک کر ڈالا ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو سب کو سو یہ پڑے ہیں ان کے گھر ڈھے ہوئے بسبب ان کے انکار کے، البتہ اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں، اور بچا دیا ہم نے ان کو جو یقین لائے تھے اور بچتے رہے تھے۔

(۶) وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○ (فصلت)

اور جو ثمود تھے سو ہم نے ان کو راہ بتائی پھر ان کو پسند آیا اندھا رہنا راہ سوجھنے سے، پھر پکڑا ان کو کڑک نے ذلت کے عذاب کی، بدلہ اس کا جو کماتے تھے اور بچا دیا ہم نے ان لوگوں کو جو یقین لائے تھے اور بچ کر چلتے تھے (برائی سے)

(۷) وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى

اور نشانی ہے ثمود میں جب کہا ان کو فائدہ اٹھا لو

حِيْنٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ
الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا
مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝ (الذاریات)

ایک وقت تک۔ پھر شرارت کرنے لگے اپنے رب کے
حکم سے، پھر پکڑا ان کو کڑک نے اور وہ دیکھتے تھے پھر نہ
ہو سکا ان سے کہ اُٹھیں اور نہ ہوئے کہ بدلہ لیں۔

(۸) وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ۨ الْاُوْلٰى ۝ وَ
ثَمُوْدَ فَمَاۤ اَبْقٰى ۝ (النجم ع)

اور یہ کہ اُس نے غارت کیا عادِ اول کو، اور ثمود کو
پھر کسی کو باقی نہ چھوڑا۔

(۹) كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ فَقَالُوْۤا
اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِيْ
ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ
بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝ سَيَعْلَمُوْنَ
غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ۝ اِنَّا مُرْسِلُوا
النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَ
اصْطَبِرْ ۝ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ
بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۝ فَنَادَوْا
صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۝ فَكَيْفَ
كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ
الْمُحْتَظِرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ
لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ (القمر ع)

جھٹلایا ثمود نے ڈر سنانے والوں کو، پھر کہنے لگے کیا
ایک آدمی ہم میں کا اکیلا ہم اس کے کہے پر چلیں گے تو
تو ہم غلطی میں پڑے اور آگ میں جھکے کیا اُتری اسی پر نصیحت
ہم سب میں سے کوئی نہیں یہ جھوٹا ہے بڑائی مارتا ہے؟
اب جان لیں گے کہ کل کو کون ہے جھوٹا بڑائی مارنیوالا،
ہم بھیجتے ہیں اونٹنی ان کے جانچنے کے واسطے سو انتظار
کر اُن کا اور سہتا رہ اور سُنا دے ان کو کہ پانی کی تقسیم
ہے اُن میں ہر ایک (فریق) اپنی باری پر پہنچے پھر پکارا
انھوں نے اپنے رفیق کو پھر ہاتھ چلایا اور کاٹ ڈالا،
پھر کیسا رہا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ہم نے بھیجی اُن پر
ایک (خوفناک) چیخ، پھر رہ گئے جیسے روندی ہوئی
باڑ کانٹوں کی، اور ہم نے آسان کر دیا قرآن کو سمجھنے
کے لیے، پھر ہے کوئی سوچنے والا۔

(۱۰) كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝
فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝ (الحاقہ ع)

جھٹلایا ثمود اور عاد نے اس کھڑکھڑانے والی (بات) کو سو
جو ثمود تھے سو غارت کر دیئے گئے اچھال کر (سخت بھونچال سے)

(۱۱) كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَاۤ ۝ اِذِ

جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے جب اُٹھ کھڑا ہوا اُن میں کا

اِنْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝ (الشمس)	بدبخت، پھر کہا ان کو اللہ کے رسول نے خبردار رہو اللہ کی اونٹنی سے اور اس کے پانی پینے کی باری سے پھر انھوں نے اس کو جھٹلایا پھر پاؤں کاٹ ڈالے اُس کے پھر اُلٹ مارا اُن کے رب نے بسبب ان کے گناہوں کے پھر برابر کر دیا سب کو اور اللہ نہیں ڈرتا پیچھا کرنے سے۔

چند عبرتیں (۱) "ناقۃ اللہ" اگرچہ صالح علیہ السلام کی صداقتِ رسالت کا ایک نشان تھی، تاہم قرآنِ عزیز کی تصریح ہے کہ وہ ثمود کے لئے آزمائش اور ابتلاء اور نتیجہ و ثمرہ میں اُن کی ہلاکت کا نشان ثابت ہوئی۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝ (القمر)	بیشک ہم بھیجنے والے ہیں ناقہ کو اُن کی آزمائش اور امتحان کے لئے پس تو ان کے انتظار میں رہ اور صبر اختیار کر۔

(۲) سنت اللہ یہ رہی ہے کہ اگر وہ اپنے پیغمبر کو کسی قوم کی ہدایت کے لئے بھیجے اور قوم اُس کی ہدایت پر کان نہ دھرے تو ضروری نہیں کہ وہ قوم ہلاک ہی کر دی جائے لیکن جو قوم اپنے نبی سے اس وعدہ پر نشان طلب کرے کہ اگر ان کا مطلوبہ نشان ظاہر ہو گیا تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے اور پھر وہ ایمان نہ لائے تو اس قوم کی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے اور خدائے تعالیٰ اس کو معاف نہیں کرتا تا آنکہ وہ تائب ہو جائے اور خدا کے دین کو قبول کر لے یا عذابِ الٰہی سے صفحۂ ہستی سے مٹ کر دوسروں کے لئے عبرت کا سبب بن جائے۔

(۳) مگر اس سنت اللہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغامِ رسالت مستثنیٰ ہے۔ اس لئے کہ آپ نے تصریح فرمائی ہے کہ میں نے خدائے تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ میری امت (اُمتِ دعوت ہو یا اُمتِ اجابت) میں عذابِ عام مسلط نہ فرمائے اور اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمالی۔ اور قرآنِ عزیز میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس تصریح کی یہ کہہ کر تصدیق بھی فرمادی۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ۔ اے رسول اس حال میں کہ تو ان میں موجود ہے خدائے تعالیٰ (ان کافروں) پر عام عذاب مسلط نہ کریگا۔

(۴) یہ مہلک غلطی اور نفس کا دھوکا ہے کہ انسان، خوش عیشی، رفاہیت اور دُنیوی جاہ وجلال کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ جس قوم یا جس فرد کے پاس یہ سب کچھ موجود ہے وہ ضرور خدائے تعالےٰ کے سایہ میں ہے اور یہ کہ ان کی یہ خوش عیشی اس کی علامت ہے کہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی ان کے ساتھ ہے۔

یہ دھوکا اور غلطی اس لئے ہے کہ اس واقعہ میں جگہ جگہ یہ تصریح موجود ہے کہ بعض مرتبہ زیادہ سے زیادہ رفاہیت اور خوش عیشی زیادہ سے زیادہ عذاب وہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے، اگرچہ قوموں کے لئے اس کی مدت چند ماہ یا چند سال نہیں بلکہ گھبرا دینے والی مدت ہی کیوں نہ ہو مگر ہمہ قسم کی دُنیوی کامرانیوں اور خوش عیشیوں کے ساتھ ساتھ جب ظلم، سرکشی اور غرور کسی قوم کا مستقل شعار بن جائے تو سمجھو کہ اس کی تباہی وہلاکت کا وقت قریب آپہنچا۔

" اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ تیرے خدا کی پکڑ بہت سخت ہے "

البتہ ان تمام رفاہیتوں کے ساتھ اگر قوم کے اکثر افراد خدا کے شکر گذار ہوں، اُس کے بندوں کے ساتھ انصاف کرنے والے اور باہم حسنِ نیت اور خیر خواہی پر عامل ہوں تو بلاشبہ وہ مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہیں اور ان ہی کو دنیا وآخرت کی کامرانیوں کی بشارت ہے، اور اُن ہی کے لئے یہ دُنیوی عیش خدا کی بے غایت نعمتوں کی علامت ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ

اللہ نے اُن لوگوں سے وعدہ کرلیا جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کئے ہیں کہ ان کو زمین کی خلافت دے گا جیسا کہ اُن سے اگلوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے لئے اُنکا دین مضبوط کردے گا جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور اُن کے خوف کو امن سے بدل دے گا (جن کی شان یہ ہوگی کہ)

مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ — وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو (کسی
يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ۚ (نور ع) — حیثیت سے بھی) شریک نہ کریں گے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ — اور بلاشبہ ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا کہ زمین کی
اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ (انبیاءؑ) — وراثت میرے نیک بندوں کو حاصل ہوگی۔

یہ آیات صراحت کر رہی ہیں کہ حکومت و دولت کا وعدہ " وراثت " کی حیثیت سے صرف اُنہی کا حصہ ہے جو مومن بھی ہیں اور خدا کے احکام پر عامل بن کر صالحین (نکوکاروں) کی صف میں بھی شامل ہیں یعنی جن کی اجتماعی زندگی کا قالب ایک ساتھ ان دونوں صفات سے متصف ہے اُن کے لئے بلاشبہ یہ حکومت و دولت خدا کا انعام و اکرام ہے۔

اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر "حکومت و دولت" کے لئے مومن و کافر کی کوئی تخصیص نہیں، خدا کی حکمتوں اور مصلحتوں کے پیشِ نظر یہ دُنیوی اسباب کی شکل میں چلتی پھرتی چھاؤں ہے اور ایسی "حکومت و دولت" کے لئے ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے ساتھ خدا کی خوشنودی اور اس کا فضل و کرم بھی شاملِ حال ہو۔

حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام)

نسب ابراہیم، آزر کی تحقیق، مستشرقین کی ہرزہ سرائی کا جواب، قرآنِ عزیز میں حضرتِ ابراہیم کا تذکرہ، ابراہیم علیہ السلام کا بتوں کے ساتھ معاملہ، اسلام کے متعلق باپ سے مناظرہ، قوم سے مناظرہ اور محاکمہ، پادشاہِ وقت سے مناظرہ، سکونت وقیام، قوم کی ہدایت کے لئے اضطراب، مصر کی جانب سفر، ابراہیم و ہاجرہ، ولادتِ اسمٰعیل، سارہ و ہاجرہ (رضی اللہ عنہا) سنتِ ختنہ، ارضِ حجاز و ہاجرہ و اسمٰعیل، اسحٰق (علیہ السلام) بناءِ کعبہ، چند اہم نتائج،

نسب نامہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ توراۃ میں اس طرح مذکور ہے:۔

ابراہیم (خلیل اللہ) بن تارخ بن ناحور بن سروج، بن رعو، بن فالج، بن عابر، بن شالح بن ارفکشاذ، بن سام، بن نوح (علیہ السلام)

یہ تصریح تورات اور تاریخ کے مطابق ہے مگر قرآنِ عزیز نے ان کے والد کا نام آزر بتایا ہے،

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً (انعام)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا "کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟"

آزر کی تحقیق چونکہ تاریخ اور تورات دونوں ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام تارخ بتاتے ہیں اور قرآنِ عزیز آزر کہتا ہے اس لئے علماء اور مفسرین نے اس مسئلہ کی تحقیق میں دو راہیں اختیار کی ہیں:۔

(۱) ایسی صورت کی جائے کہ دونوں ناموں کے درمیان مطابقت ہو جائے اور یہ اختلاف جاتا رہے۔

لہ ابن کثیر جلد ۱ ص ۲۸۔

(۲) تحقیق کے بعد فیصلہ کُن بات کہی جائے کہ ان دونوں میں کون صحیح ہے اور کون غلط یا دونوں صحیح ہیں مگر دو جدا جدا ہستیوں کے نام ہیں۔

پہلے خیال کے علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں اور تارخ عَلَم اسمی (اسمی نام) ہے اور آزر۔ عَلَم وصفی (وصفی نام)

ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ آزر عبری زبان میں "محبِّ صنم" کو کہتے ہیں اور چونکہ تارخ میں بُت تراشی و بُت پرستی دونوں وصف موجود تھے اس لئے آزر کے لقب سے مشہور ہوا، اور بعض کا گمان ہے کہ آزر کے معنی اعوج (کم فہم) یا بے وقوف اور پیر فرتوت[1] کے ہیں، اور چونکہ تارخ میں یہ باتیں موجود تھیں اس لئے اس وصف سے موصوف کیا گیا۔

قرآنِ عزیز نے اُسی مشہور وصفی عَلَم کو بیان کیا ہے۔

سہیلی نے روض الانف میں اسی کو اختیار کیا ہے[2]۔

اور دوسرے خیال کے علماء کی تحقیق یہ ہے کہ آزر اُس بُت کا نام ہے تارخ جس کا پجاری اور مہنت تھا، چنانچہ مجاہد (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ قرآنِ عزیز کی مسطورۂ بالا آیت کا مطلب یہ ہے۔

اَتَتَّخِذُ اٰزَرَ اِلٰهًا اى اتتخذ اصناما الهة کیا تو آزر کو خدا مانتا ہے یعنی بتوں کو خدا مانتا ہے؟

اور صغانی کی رائے بھی اس کے قریب قریب ہے، صرف نحوی اعتبار سے تقدیر کلام میں وہ ایک دوسری راہ اختیار کرتے ہیں، غرض ان دونوں کے نزدیک "آزر" "ابیہ" کا بدل نہیں ہے بلکہ بُت کا نام ہے اور اس طرح قرآنِ عزیز میں اُن کے والد کا نام مذکور نہیں،

ایک مشہور قول یہ بھی ہے کہ حضرتِ ابراہیم کے والد کا نام تارخ تھا اور چچا کا آزر[3]، اور چونکہ آزر ہی نے اُن کی تربیت کی تھی اور بمنزلۂ اولاد کے پالا تھا اس لئے قرآنِ عزیز میں آزر کو باپ کہہ کر پکارا گیا جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے "العم صنو ابیہ"[4]

---

[1] تاج العروس ج ۳ ص ۱۲ [2] جلد ۱ [3] تاج العروس ج ۳ ص ۱۲ [4] قصص الانبیاء ص ۹۶

چچا باپ ہی کی طرح ہے۔

علامہ عبدالوہاب نجار کی رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں سے مجاہد کا قول قرین قیاس اور قابلِ قبول ہے اس لئے کہ مصریوں کے قدیم دیوتاؤں میں ایک نام ازوریس بھی آتا ہے جس کے معنی "خدائے قوی و معین" ہیں، اور اصنام پرست اقوام کا شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ قدیم دیوتاؤں کے نام ہی پر جدید دیوتاؤں کے نام رکھ لیا کرتے تھے، اس لئے اس بُت کا نام بھی قدیم مصری دیوتا کے نام پر آزر رکھا گیا ورنہ حضرتِ ابراہیم کے والد کا نام تارخ تھا،

ہمارے نزدیک یہ تمام تکلفات باردہ ہیں، اس لئے کہ قرآنِ عزیز نے جب صراحت کے ساتھ آزر کو ابِ ابراہیم (ابراہیمؑ کا باپ) کہا ہے تو پھر محض علماءِ انساب اور بائیبل کے تخمینی قیاسات سے متاثر ہو کر قرآنِ عزیز کی یقینی تعبیر کو مجاز کہنے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر خواہ مخواہ قرآنِ عزیز میں نحوی مقدرات ماننے پر کون سی شرعی اور حقیقی ضرورت مجبور کرتی ہے؛ بر سبیل تسلیم اگر آزر، عاشقِ صنم کو کہتے ہیں، یا بُت کا نام ہے تب بھی بغیر تقدیرِ کلام اور بغیر کسی تاویل کے یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ ان ہر دو وجہ سے آزر کا نام آزر رکھا گیا جیسا کہ اصنام پرست اقوام کا قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ کبھی اپنی اولاد کا نام بتوں کا غلام ظاہر کر کے رکھتے تھے، اور کبھی خود بُت ہی کے نام پر نام رکھ دیا کرتے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ "آدار" کالدی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں اور عربی میں یہی "آزر" کہلایا۔ تارخ چونکہ بت تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا۔ اس لئے "آزر" ہی کے نام سے مشہور ہو گیا، حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا اور جبکہ لقب نے نام کی جگہ لے لی تو قرآنِ عزیز نے بھی اسی نام سے پکارا۔

نیز جس مقدس انسان (ابراہیمؑ) کی اخلاقی بلندی کا یہ عالم ہو کہ جب بُت پرستی کی مذمت کے سلسلہ میں آزر سے مناظرہ ہو گیا اور آزر نے زچ ہو کر یہ کہا۔

اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ لَئِنْ — اے ابراہیم کیا تو میرے خداؤں سے بیزار ہے تو اگر اس

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا۔ حرکت سے باز نہ آیا میں ضرور تجھ کو سنگسار کروں گا اور جا میرے سامنے سے دُور ہو جا۔

تو اس سخت گیر اور دل آزار گفتگو کے موقعہ پر بھی اُس نے پدری رشتہ کی بزرگی کا احترام کیا، اور جواب میں صرف یہ فرمایا:۔

سَلَامٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا۔ (مریم) تجھ پر سلامتی ہو، میں عنقریب تیرے لئے اپنے پروردگار سے بخشش چاہوں گا بلاشبہ وہ میرے ساتھ بہت مہربان ہے،

اس ہستی سے یہ کیسے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے باپ آزر کو بے وقوف، پیر فرتوت اور اسی قسم کے تحقیر آمیز الفاظ کے ساتھ خطاب کرے ؟

پس بلاشبہ تارح کا تارح آزر ہی ہے اور وہ علم اسمی ہے نہ کہ علم وصفی اور تارح یا غلط نام ہے اور یا آزر کا ترجمہ ہے جو تورات کے دوسرے اعلام کی طرح ترجمہ نہ رہا بلکہ اصل بن گیا۔

مراکشی سترھویں صدی کا ایک عیسائی عالم ہے اُس نے قرآن عزیز کا ترجمہ کیا ہے اور قرآن عزیز پر نہایت رکیک اور متعصبانہ حملے کئے ہیں، اس نے اس موقعہ پر بھی عادت کے مطابق ایک مہمل اور لچر اعتراض کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یوزی بوس کی تاریخ کنیسہ کی ایک عبارت میں یہ لفظ آیا ہے جس کو غلط صیغہ کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن عزیز میں درج کر دیا۔

لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ مراکشی اپنے اس دعوے کے ثبوت میں نہ تاریخ کنیسہ کی وہ عبارت پیش کرتا ہے جس سے یہ لفظ ماخوذ بتایا گیا ہے اور نہ اس اصل لفظ ہی کا پتہ دیتا ہے کہ جس سے یہ غلط لفظ بنا لیا گیا اور نہ یہ بتلاتا ہے کہ آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نقل کی کیا ضرورت پیش آئی ؟ اس لئے یہ قطعاً بے دلیل اور بے سروپا بات ہے جو محض تعصب اور جہالت کی وجہ سے کہی گئی اور حق وہی ہے جو ہم نے ابھی واضح کیا۔

شجرۂ نسب حضرت ابراہیم تا حضرت نوح علیہم السلام | تورات اور تاریخ نے حضرت ابراہیمؑ سے

حضرتِ نوح (علیہما السلام) تک نسب کی جو کڑیاں شمار کرائی ہیں وہ درج ذیل ہیں، اس شجرۂ نسب کی صحت وعدمِ صحت کا معاملہ قیاسی اور تخمینی رائے سے زیادہ نہیں ہے اس لئے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب کے متعلق اس یقین کے باوجود کہ وہ حضرتِ ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں، عدنان سے اوپر کی کڑیوں کے متعلق خود ذاتِ اقدس کا یہ فیصلہ ہے کہ "کذب النسابون" علماءِ نسب نے ناموں کی تعیین میں غلط بیانی سے کام لیا ہے" تو حضرتِ ابراہیمؑ سے حضرتِ نوحؑ تک کا سلسلہ کس طرح اس کذب بیانی اور وضع سے پاک رہ سکتا ہے؟

نام	باپ کا نام	بیٹے کی پیدائش کے وقت باپ کی عمر
سام	نوحؑ	۵۰۰
اَرفکشاذ	سام	۱۰۰
شالح	ارفکشاذ	۳۵
عابِر	شالح	۳۰
فالج	عابر	۳۴
رعو	فالج	۳۰
سروج	رعو	۳۲
ناحور	سروج	۳۰
آزر (تارخ)	ناحور	۲۹
ابراہیمؑ	آزر (تارخ)	۷۰
		۸۹۰ مجموعی مدت

ان اعداد و شمار کے مطابق حضرتِ ابراہیمؑ کی ولادت سے حضرت نوحؑ تک آٹھ سو نوے سال ہوتے ہیں اور جبکہ حضرتِ نوحؑ کی کل عمر نو سو پچاس سال بتائی جاتی ہے تو اس کے یہ معنی

ہوتے کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے حضرتِ نوحؑ کی عمر کے ساٹھ سال پائے اور وہ دونوں اس مدت کے اندر معاصر رہے ہیں اور یہ بلاشبہ بے سروپا بات اور قطعاً غلط اور مہمل ہے اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ تورات کے یہ اعداد و شمار محض خود تراشیدہ کہانیوں اور حکایتوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قدیم زمانہ میں یہود کے یہاں تاریخ کا باب اِسی قسم کی حکایات و روایات پر قائم رہا ہے اور اس میں تاریخی حقائق اور زمانوں کے تضاد و اختلافات کا مطلق لحاظ و پاس نہیں رکھا گیا۔

مستشرقینِ یورپ کی ہرزہ سرائی | مستشرقینِ یورپ کی ایک جماعت اسلام دشمنی میں یدِطولیٰ رکھتی ہے اور بغض و عناد کی مشتعل آگ میں حقائق و واقعات تک کے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ اس قسم کے مواقع میں سے کہ جہاں قرآن عزیز کے خلاف بے دلیل ان کی تنقید کی تلوار چلتی رہتی ہے ایک موقعہ حضرتِ ابراہیمؑ کی شخصیت کا بھی ہے۔

دائرۃ المعارفِ الاسلامیہ[1] نے ونسنک[2] کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے اسپرنگر[3] نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرتِ ابراہیمؑ کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دینِ حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی البتہ عرصۂ دراز کے بعد انکی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ متصف ظاہر کیا گیا ہے، اور اُن کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے، چونکہ یہ دعویٰ اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنۂ تکمیل تھا اس لئے ایک طویل زمانہ کے بعد اسپرنگر کے اس دعوے کو سنوک ہیکر ونیہ نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا اور اپنے مزعومہ دلائل کے ذریعہ اس کو خاص آب و رنگ سے رنگین بنایا۔

اُس نے کہا:-

"قرآن پاک میں جس قدر مکی آیات اور سورتیں ہیں ان میں کسی ایک مقام پر بھی اسمٰعیل (علیہ السلام) کا ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا اور نہ ان کو اولِ مسلمین بتایا گیا ہے بلکہ وہ صرف ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت میں نظر آتے ہیں اُن کے تذکرہ کی ایک آیت بھی

[1] جلد ۱ ص ۲۷-۲۸ [2] WENSINCK [3] SPRENGER

بے ہودہ گوئی، یاوہ گوئی۔ ہرزہ = بے ہودہ، لغو، نامعقول

ایسی نہیں ملتی جوان کو موسس کعبہ، اسمٰعیل علیہ السلام کا باپ، عرب کا پیغمبر و ہادی' اور ملتِ حنیفی کا داعی' ظاہر کرتی ہو، سورۃ الذاریات، الحجر، الصافات، الانعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت جو سب کی سورتیں ہیں ہمارے اس دعوے کی شاہد ہیں۔ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے سرزمینِ عرب میں کوئی نبی نہیں آیا اور یہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

البتہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرتِ ابراہیمؑ کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں کی جاتی اور اہمیت کے ساتھ روشنی میں لائی جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ اختلاف کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے تمام امور میں یہود پر اعتماد رکھتے اور انھیں کے طریقوں کو پسند فرماتے تھے لہٰذا اس وقت تک ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو بھی انھوں نے اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے یہود دیکھتے تھے لیکن جب مدینہ پہنچکر انھوں نے یہود کو اپنے مشن "اسلام" کی دعوت دی تو انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فکر و تامل کیا اور خوب سوچا، آخر ان کی ذکاوت اور جودتِ طبع نے رہنمائی کی اور انھوں نے عرب کے لئے یہود کی یہودیت سے جدا ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جس کو یہودیتِ ابراہیمی کہنا چاہیے، لہٰذا اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے قرآن کی مدنی سورتوں میں ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ ملتِ حنیفی کے داعی، عرب کے پیغمبر، اسمٰعیلؑ کے والد، کعبہ کے موسس نظر آتے ہیں[۱]" انتہی۔

یہ ہے وہ دعویٰ اور اس کی دلیل جو اسپرنگر، سنوک اور وینسنک جیسے اسلام دشمن مستشرقین کی جانب سے محض اس لئے اختراع کئے گئے ہیں کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر سیت

[۱] Het Mekka nsch Feest ص ۲۰

کی برتری اور اسلام کی تحقیر کی عمارت تیار ہو سکے اور نیز یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ اُن کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی۔ لیکن جب ایک مؤرخ اور ایک نقاد مستشرقین کے اِس دعوے اور دعوے کے دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تب بھی اس کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے حقائق اور واقعات سے قصداً چشم پوشی کر کے محض عداوت اور بغض و عناد کی راہ سے بے دلیل کہا گیا ہے، اس لئے کہ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ مکی سورتوں میں حضرتِ ابراہیمؑ کے متعلق وہ اوصاف نظر نہیں آتے جو مدنی آیات میں پائے جاتے ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سرتاسر غلط بلکہ قصد وارادہ کے ساتھ علمی بددیانتی ہے کہ مکی سورتوں میں سے صرف اُنہی کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں حضرتِ ابراہیم کو فقط ایک پیغمبر کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے، لیکن وہ مکی سورت جو ابراہیمؑ کی شخصیت کو ہر حیثیت سے نمایاں کرنے کے لئے ان کے نام ہی سے معنون کر کے نازل کی گئی یعنی سورۂ ابراہیم اس کو نظر انداز کر دیا گیا تاکہ قرآنِ عزیز سے براہِ راست فائدہ نہ اٹھا سکنے والے حضرات کے سامنے جہالت کا پردہ پڑا رہے اور اُن کی کورانہ تقلید میں وہ ان کے غلط دعوے کو صحیح سمجھتے رہیں۔

سورۂ ابراہیم مکی ہے، اس کی آیات کا نزول ہجرت سے قبل مکہ ہی میں ہوا ہے اور وہ حسب ذیل حقائق کا اعلان کرتی ہے۔

(۱) حضرتِ ابراہیمؑ عرب (حجاز) کے اندر قیام پذیر ہیں اور خدا کے رسول کی حیثیت سے خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اُس مقام کو امنِ عالم کا مرکز بنانے کی دعا کر رہے ہیں۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ؕ (ابراہیم)	اے پروردگار اس شہر (مکہ) کو تو امن کا مرکز بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دُور رکھ۔
رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ	اے پروردگار بلاشبہ ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو

لَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (ابراہیم) گمراہ کردیا پس جو شخص میری پیروی کرے وہ میری جماعت میں سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے پس بلاشبہ تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے'

(۲) حضرت ابراہیمؑ اقرار کرتے ہیں کہ سرزمینِ حجاز (جو عرب کا قلب ہے) ان ہی کی اولاد سے آباد ہوئی اور انھوں نے ہی اس کو بسایا ہے اور وہی اس چٹیل میدان میں بیت الحرام (کعبہ) کے مؤسس ہیں۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ○ (ابراہیم)

اے ہمارے پروردگار جبکہ میں نے اپنی بعض ذریت اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے گھر (کعبہ) کے نزدیک آباد کیا ہے' اے ہمارے پروردگار یہ اسلئے تاکہ وہ نماز قائم کریں پس تو لوگوں میں سے کچھ کے دل اس طرف پھیر دے۔ وہ (اس کعبہ کی بدولت) ان کی جانب مائل ہوں اور ان کو پھلوں سے رزق عطا کر تاکہ یہ شکر گذار بنیں۔

(۳) حضرتِ ابراہیمؑ حضرتِ اسمٰعیل و حضرتِ اسحٰق (علیہم السلام) کے والدین اور یہی اسمٰعیلؑ اہلِ عرب کے باپ ہیں اور حضرتِ ابراہیمؑ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے ملتِ حنیفی کے شعار "صلوٰۃ" کی اقامت کی دعا کر رہے ہیں۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ○ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ○ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ○

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیلؑ اور اسحٰق بخشے بلاشبہ میرا پروردگار ضرور دعا کا سننے والا ہے، اے پروردگار مجھ کو اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا دے، اے ہمارے پروردگار ہماری دعا سُن، اے ہمارے پروردگار تو مجھ کو اور میرے والدین کو اور کل مومنوں کو قیامِ حساب (قیامت) کے روز بخش دے'

(۳۹ - ۴۰ - ۴۱) (ابراہیم ع ۶)

اِن آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کسی شخص کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ اِن لغو اور بے سر و پا دعووں کی تصدیق کرے جن کو مستشرقینِ یورپ نے اپنی جہالت یا ارادی جھوٹ کے ساتھ علمی تنقید کا عنوان دیا ہے، کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں، اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں مذکور ہے ؟

(۴) اسی طرح سورۂ ابراہیم کے علاوہ سورۂ انعام اور سورۃ النحل بھی مکی سورتیں ہیں ان میں بصراحت موجود ہے کہ حضرتِ ابراہیم شرک کے مقابلہ میں ملتِ حنیفی کے داعی ہیں اور ان کی شخصیت اِس دعوت میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ (الانعام)	بلاشبہ میں اپنے چہرہ کو اُسی ذات کی طرف جھکاتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں۔
قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ (انعام، ۱۶۱ ع)	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دو بلاشبہ مجھ کو میرے رب نے سیدھی راہ کی ہدایت کی ہے جو کج راہ سے الگ صاف اور سیدھا دین ہے ملت ہے ابراہیم کی جو تھے ایک خدا کی طرف جھکنے والے اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے۔
اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ۚ وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝	بیشک ابراہیم تمہارا راہ ڈالنے والا الحکم بردار صرف ایک خدا کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں سے،
ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (۱۲۳)	پھر وحی کی ہم نے تیری جانب (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات کی کہ تو پیروی کر اُس ابراہیم کی ملت کی جو صرف خدائے واحد کی جانب جھکنے والا ہے اور نہیں ہے مشرکوں میں سے

تو کیا اِن واضح آیات کے بعد بھی ان دلائل کو دلائل کہنا کوئی حقیقت رکھتا ہے جو اس سلسلہ میں سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے بیان کئے ہیں ؟ مکی سورتیں ہوں یا مدنی دونوں جگہ

ابراہیمؑ کی شخصیت ایک ہی طرح نمایاں نظر آتی ہے، وہ دونوں حالتوں میں ملتِ حنیفی کے داعی حضرت اسمٰعیلؑ اور عرب کے باپ، کعبہ کے موسِّس دبانی اور عرب کے ہادی ہیں، اور اس لئے مستشرقینِ یورپ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآنِ عزیز کی مکی اور مدنی آیات میں دو جدا جدا صورتوں میں نظر آتی ہے کذب اور صریح بہتان ہے نیز یہ بھی خلافِ واقعہ ہے کہ عرب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت سے قبل کوئی بھی پیغمبر نہیں گذرا، اس لئے کہ ابراہیم و اسمٰعیل اور ہود و صالح علیہم السلام اسی سرزمین کے ہادی و پیغمبر ہیں۔

ان مدعیانِ علم کو تعصب نے ایسا نادان بنا دیا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے وقت یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس قسم کے دعوے سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل (تورات) کی بھی تکذیب کر رہے ہیں، اس لئے کہ تورات میں تصریح ہے کہ اسمٰعیلؑ، ابراہیمؑ کے بیٹے ہیں اور اسمٰعیلؑ ہی عرب کے باپ ہیں اور ابراہیمؑ کی اِسی اولاد سے حجاز کی سرزمین آباد ہوئی اور یہ دونوں باپ بیٹے عرب کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔

نیز یہ الزام بھی قطعاً بے بنیاد اور لغو ہے کہ مکہ کی زندگی میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود اور اُن کے مذہبی امور کی تقلید کی اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہود کے انکار اور اُن کے مخالفانہ جذبہ کو دیکھا تو یہود سے الگ ایک نئی یہودیت کی بنیاد ڈالی اور اس کو ملتِ ابراہیمی کا لقب دیا اس لئے کہ مکہ کی زندگی میں تو یہود سے آپ کا سابقہ ہی نہیں پڑا تو پھر مخالفت و موافقت یا اتباع کا سوال ہی کیا، البتہ مدینہ میں آکر آپؐ نے مشرکین کے مقابلہ میں یہود کی جانب زیادہ توجہ فرمائی اور یہ اس لئے کہ وہ اسلام کے عقیدہ کے مطابق دینِ موسوی کے پیرو تھے اگرچہ اس میں تحریف ہو چکی تھی مگر وہ مشرکین کے خلاف توحید کے قائل تھے اور اُن کی محرّف کتابوں میں تحریف کے بعد بھی بہت سے جملے ایسے موجود تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالت کے شاہد اور گواہ ہیں اور اُن سے آپؐ کے حق میں بشارات نکلتی ہیں، نیز بہت سے وہ احکام بھی موجود تھے جو صحیح معنی میں وحیِ الٰہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دینِ

موسوی کی اساس و بنیاد رہے ہیں اس لئے آپ کو خیال تھا کہ یہ مشرکین کے مقابلہ میں جلد ہی ملتِ ابراہیمی یعنی اسلام قبول کرلیں گے، لیکن جب آپؐ نے ان کے انکار، بغض وحسد کا تجربہ کرلیا تو پھر اُن کے ساتھ بھی آپ کا معاملہ وہی ہوگیا جو مشرکین کے ساتھ تھا اور بمصداق "الکفر ملۃ واحدۃ" (کفر سب ایک ملت ہے) آپ نے اُن سب کو ایک ہی حیثیت میں رکھا۔

اسپرنگر، سنوک اور ان کے ہمنوا اتنی صاف بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں یا عمداً سمجھنا نہیں چاہتے کہ جبکہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام، اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کے دادا تھے اور یہود اپنے دین کی نسبت حضرتِ اسرائیل علیہ السلام کی جانب کرتے اور بنی اسرائیل ہونے کی حیثیت سے اس پر فخر کرتے تھے تو انکا یہ کہنا کہ ابراہیم بھی یہودی تھے کس قدر مضحکہ خیز تھا، کیا پوتے کے دین کے متعلق کسی طرح یہ کہنا درست ہوسکتا ہے کہ عرصۂ دراز کے گذرے ہوئے دادا کا دین پوتے کے دین کے تابع تھا۔

پس اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے قرآنِ عزیز نے یہ اعلان کیا:۔

مَاكَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا	ابراہیم نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی، البتہ وہ تھے
وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا ۝	ایک خدا کی جانب جھکنے والے مسلمان۔

مگر ان کور چشموں نے اس کے معنی یہ لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تو یہود کے دین پر تھے لیکن مدینہ جاکر جب یہود نے ان کو پیغمبر ماننے سے انکار کردیا تو یہود کے دین کے مقابلہ میں ذکاوتِ طبع سے یہودیتِ ابراہیمی ایجاد کرلی۔ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔

سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے اس دعوے کی دلیل میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں گذرا، قرآنِ عزیز کی اس آیت کو بھی پیش کیا ہے:۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتَاهُمْ مِّنْ	تاکہ تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ڈرائے ایسی قوم کو کہ
نَّذِيرٍ مِّنْ قَبْلِكَ۔	نہیں آیا اُن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ عرب کے پیغمبر ہوتے تو قرآنِ عزیز اُمت عربیہ کے متعلق

اِس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہ کرتا۔

مگر یہ بھی ایک سخت مغالطہ ہے جو قرآنِ عزیز کے طرزِ خطابت، اسلوبِ بیان، اور باطل پرستوں کی باطل پرستی کے خلاف دلائل کی ترتیب سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوا ہے یا گذشتہ اعتراضات کی طرح محض بغض و عناد کی خاطر اختیار کیا گیا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ عرب کا بہت بڑا حصہ بُت پرستی میں مبتلا تھا، اور اس سلسلہ میں انھوں نے عقائد اور دین کے نام سے کچھ احکام مرتب کر رکھے تھے، مثلاً دیوتاؤں کی نذر اور قربانی کے لئے سائبہ، بحیرہ اور وصیلہ کی ایجاد، اور مختلف بتوں کی پرستش کے مختلف قواعد وضوابط وغیرہ، اس لئے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دی اور شرک اور بُت پرستی سے روکا تو وہ کہنے لگے کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم بد دین ہیں اور ہمارا کوئی الہامی دین نہیں ہے، غلط ہے ہم تو خود مستقل دین رکھتے ہیں اور وہ ہمارے باپ دادا کا قدیمی دین ہے۔

قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا — مشرکین نے کہا۔ ہم نے اسی (بُت پرستی) پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔

تب قرآنِ عزیز نے ان کے باطل عقائد کی حقیقت کو ان پر واضح کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کو بتایا جائے کہ کسی دین کے خدائی دین ہونے کے لئے دو ہی قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں، یا حسی اور عقلی راہ سے یہ واضح ہو جائے کہ یہ خدا کا دین اور اُس کا مرغوب مذہب ہے، اور یا نقلی روایات اس کا قطعی، یقینی اور ناقابلِ انکار ثبوت پیش کرتی ہوں کہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت ہے، اور اگر یہ دونوں راہیں کسی دعوے کے لئے بند ہیں تو وہ دعوے باطل اور اُس کا مدعی کاذب ہے۔

لہٰذا قرآنِ عزیز نے مشرکین کے اس دعوے کی تردید کے لئے آیاتِ قرآنی کے تین حصے کر دیئے، ایک حصہ میں اُن کے اس دعوے کا انکار اور دعوے کی غیر معقولیت کا

اظہار کیا اور بتایا کہ مشرکین کا یہ کہنا کہ "اللہ امرنا بھا" (ہم کو خدا نے ایسا (شرک) کرنے ہی کا حکم دیا ہے) بالکل غلط اور سرتا سر باطل ہے اس لئے کہ :۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (اعراف) — بلاشبہ اللہ تعالیٰ بیہودہ خرافات کا حکم نہیں دیا کرتا (اے مشرکین) کیا تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

اور دوسرا حصہ اُن کے باطل دعوے پر حسی اور عقلی سند کے مطالبہ سے متعلق کیا اور بتایا کہ وہ عقل سے یہ فتویٰ صادر کریں کہ جو کچھ خدا کے ساتھ انھوں نے غلط نسبتیں قائم کر رکھی ہیں اور جن پر اُن کے مزعومہ دین کی بنیاد قائم ہے، وہ کس طرح صحیح اور اہل عقل کے نزدیک قابل تسلیم ہیں؟ وہ کہتا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ۝ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُم مِّنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ ۝ وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ (الصافات) — پس (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان سے دریافت کرو کیا تمہارے پروردگار کے لئے لڑکیاں ہیں اور ان کے لئے لڑکے، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں بنایا اور وہ اُس وقت موجود تھے، خبردار بلاشبہ یہ سب اُن کی بہتان طرازی ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے، بلاشبہ یہ قطعاً جھوٹے ہیں (یہ کہتے ہیں کہ خدا نے) اپنے لئے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کو پسند کر لیا ہے (اے مشرکین) تم کو کیا ہوا یہ تم کیسا (جھوٹا) حکم کرتے ہو، پس کیا تم نصیحت نہ حاصل کرو گے؟

اور تیسرا حصہ ان کے باطل عقیدوں کے متعلق نقلی سند کے مطالبہ سے وابستہ کیا، قرآن عزیز اُن سے سوال کرتا ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور اس کو خدا کا دین بتا رہے ہو تو کیا تمہارے پاس اس کے لئے خدا کی جانب سے کوئی حجت اور دلیل نازل ہوئی ہے یا اس کے پاس سے ان عقائد کی صداقت کے لئے کوئی کتاب بھیجی گئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو پیش کرو؟

أَمْ لَكُمْ سُلْطَانٌ مُّبِينٌ ۝ فَأْتُوا بِكِتَابِكُمْ — کیا تمہارے پاس کوئی ظاہر حجت اور صاف دلیل ہے۔ پس تم اپنی

إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (الصافات ۵) (خدائی جانب سے نازل شدہ) وہ کتاب لاؤ، اگر تم سچے ہو؟

اَب اگر اُن کے اپنے دعوے کی صداقت کے لئے اُن کے پاس نہ کوئی حسّی و عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی سند کے طور پر کوئی حجت و کتاب، تو پھر ان کا یہ دعویٰ کہ اُن کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سے خدا کا دین موجود ہے اور اُس کی منضبط شریعت بھی! بالکل غلط اور باطل دعویٰ ہے۔

اسی طرح مشرکین پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ تمہارے پاس اپنے دعواتِ باطل کے سلسلہ میں نہ عقلی سند ہے اور نہ نقلی اور اُن کو لاجواب بنانے کے لئے سورۂ احقاف میں بھی یہی طریقِ استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ	تم مجھے بتاؤ کہ اللہ کے ماسوا جن کو تم پوجتے ہو مجھے دکھلاؤ کہ انھوں نے
اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ	زمین سے کیا بنایا، یا کیا اُن کی آسمانوں میں (اللہ کے ساتھ) کوئی
الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي	شرکت ہے، اس سے پہلی کوئی کتاب اگر تمہارے پاس ہے (جو
السَّمٰوٰتِ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ	اس دعوے کی تصدیق کرتی ہو) تو وہ لے آؤ، یا علم (اولین میں سے کوئی
قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ (احقاف)	بقیہ علم تمہارے پاس ہو تو وہ پیش کرو۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک دوسرے پیرایہ میں قرآنِ عزیز کی اُن آیات میں بیان کیا گیا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکینِ عرب کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا، ان آیات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرزمینِ عرب (حجاز) ہمیشہ سے خدا کے نبی اور پیغمبر کے وجود سے محروم ہے اور اس ملک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سب سے پہلی آواز ہے، قرآنِ عزیز ایسی خلافِ حقیقت بات کس طرح کہہ سکتا تھا جبکہ سورۂ ابراہیم، الانعام اور النمل کی آیات میں حضرتِ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے عربی نبی ہونے کی صاف اور صریح شہادتیں موجود ہیں جو ابھی نقل کی جا چکی ہیں بلاشبہ قرآنِ عزیز اس قسم کے تضاد اور اختلاف سے قطعاً بری ہے، کہ ایک جگہ وہ ایک بات کا انکار کرے اور دوسری جگہ اسی بات

کا اقرار، اس لئے کہ وہ خدائے عالم الغیب والشہادۃ کا کلام ہے نہ کہ بھول چوک کرنے والے انسان کا کلام۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ	کیا انھوں نے قرآن پر غور نہیں کیا اور اگر وہ ہوتا اللہ کے
مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ	سوا کسی اور کا کلام تو ضرور پاتے اس میں بہت سا
اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔	اختلاف۔

لہٰذا قرآنِ عزیز کے خلاف سنوک، اسپرنگر اور وینسنک کے یہ تمام دعاوی اور ان کے دلائل تاریخی حقائق اور واقعات کی روشنی میں قطعاً باطل اور افترا ہیں اور ان کے طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے ناقدین قرآنِ عزیز پر علمی دیانت کے ساتھ تنقید نہیں کرتے اور نہ ان کی فہم اور سمجھ کا قصور ہے بلکہ اس کے برعکس وہ علمی بددیانتی سے کام لے کر قرآن کے خلاف زہر اُگلتے، غلط الزام قائم کرتے، اور صریح اور واضح مسائل میں اپنے پیشِ نظر مقاصد کے مطابق گنجلک پیدا کرکے ناواقف دنیا کو گمراہ کرتے ہیں، بلکہ اس قسم کے الزامات سے اُن کا صرف ایک ہی مقصد ہوسکتا ہے جس کو قرآنِ عزیز نے اس قسم کے معاندین کے لئے ایک مستقل قانون کی طرح واضح کردیا ہے۔

وَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ کَمَا	یہ (منکرینِ قرآن واسلام) یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کاش تم بھی
کَفَرُوْا فَتَکُوْنُوْنَ سَوَآءً۔	ان کی طرح منکر بن جاؤ تاکہ وہ اور تم سب یکساں ہوجائیں۔

اس لئے ان منکرین (کافروں) کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ہمیشہ ایک ہی جواب رہا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ	اے پروردگار ہمارے دلوں کو ہدایت یافتہ اور راہ یاب
اِذْ ھَدَیْتَنَا۔	کرنے کے بعد کجی کی جانب مت مائل کرنا۔

بہرحال قرآنِ حکیم کی مسطورہ بالا زیرِ بحث آیت کا مطلب صاف اور واضح ہے اور اُس کے درمیان اور الانعام، النحل اور ابراہیم جیسی سورتوں میں ابراہیم علیہ السّلام کے پیغمبرِ عرب ہونے کے درمیان قطعاً کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔

اس پیش کردہ تفصیل و تشریح کے علاوہ عام مفسّرین نے اس قسم کی آیات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ خطاب صرف اُن ہی لوگوں سے متعلق ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگیِ مبارک میں موجود تھے۔ اُن کے گذشتہ آباؤ اجداد اور گذشتہ تاریخِ عرب سے اس خطاب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرتِ ابراہیمؑ کا ذکر قرآن میں

قرآنِ عزیز کے رشد و ہدایت کا پیغام چونکہ ملّتِ ابراہیمی کا پیغام ہے اس لئے اُس نے جگہ جگہ حضرتِ ابراہیمؑ کا ذکر کیا ہے اور جیسا کہ گذشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے حضرتِ ابراہیم کا ذکر مکّی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں موجود ہے۔ مندرجہ ذیل جدول اُن تمام سورتوں اور آیتوں کو ظاہر کرتی ہے۔

سورۃ	شمار	آیات	سورۃ	شمار	آیات
البقرہ	۲	۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۳۰-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۵-۱۳۶-۱۴۰-۱۵۸-۱۶۰-	صٓ	۳۸	۴۵
			الزخرف	۴۳	۲۶
آلِ عمران	۳	۳۳-۳۵-۶۷-۶۸-۸۴-۹۵-۹۷-	النجم	۵۳	۳۷
النساء	۴	۵۴-۱۲۵-۱۶۳-	الممتحنہ	۶۰	۴
الانعام	۶	۷۴-۷۵-۸۳-۱۵۱	یوسف	۱۲	۶-۳۸
التوبہ	۹	۷۰-۱۱۴	الحجر	۱۵	۵۱
ہود	۱۱	۶۹-۷۴-۷۵-۷۶	مریم	۱۹	۴-۴۶-۵۸
ابراہیم	۱۴	۳۶	الحج	۲۲	۲۶-۴۳-۷۸
النحل	۱۶	۱۲۰-۱۲۳	العنکبوت	۲۹	۱۶-۳۱
الانبیاء	۲۱	۵۱-۶۰-۶۲-۶۹	الصّافّات	۳۷	۸۳-۱۰۴-۱۰۹
الشعراء	۲۶	۶۹	الشوریٰ	۴۲	۱۳
الاحزاب	۳۳	۷	الذاریات	۵۱	۲۴

سورة	شمار	آیات	سورة	شمار	آیات
الحدید	۵۷	۲۶	الاعلیٰ	۸۷	۱۹

مجموعہ ۲۵ سورت ۶۳ آیات

حضرتِ ابراہیمؑ کے واقعہ کے ساتھ دوسرے چند انبیاء علیہم السّلام کے واقعات بھی وابستہ ہیں مثلاً حضرتِ لوطؑ کا واقعہ اس۔ لئے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بھی ہیں اور اُن کے پیرو بھی۔ اِسی طرح اُن کے صاحبزادوں حضرتِ اسمٰعیل و حضرتِ اسحٰق علیہما السلام کے واقعات، اس لئے کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام کی عمر ستاسی سال[1] تھی اور حضرتِ اسحٰقؑ[2] کی ولادت کے وقت ان کی عمر پورے سو سال تھی اور حضرتِ ابراہیمؑ کی کُل عمر ایک سو پچھتر[3] سال ہوئی۔ لیکن ان تینوں پیغمبروں کے تفصیلی واقعات مستقل عنوان میں درج کئے جائیں گے اور یہاں صرف حضرتِ ابراہیم کے واقعہ کے ضمن میں کہیں کہیں ذکر آئے گا۔

حضرتِ ابراہیمؑ کی عظمت حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام کی اُس عظمتِ شان کے پیشِ نظر جو انبیاء و رسل کے درمیان اُن کو حاصل ہے قرآنِ عزیز نے اُن کے واقعات کو مختلف اسلوب کے ساتھ جگہ جگہ بیان کیا ہے، ایک مقام پر اگر اختصار کے ساتھ ذکر ہے تو دوسری جگہ تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے اور بعض جگہ مختلف شوؤن و اوصاف کے پیشِ نظر اُن کی شخصیت کو نمایاں کیا ہے اس لئے مناسب ترتیب کے ساتھ اُن کو پیش کیا جاتا ہے۔

توراة یہ بتاتی ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) عراق کے قصبہ اُور کے باشندے اور اہلِ فدان میں سے تھے اور اُن کی قوم بُت پرست تھی اور انجیل برنابا میں تصریح ہے کہ اُن کے والد نجاری کا پیشہ کرتے اور اپنی قوم کے مختلف قبائل کیلئے لکڑی کے بُت بناتے اور فروخت کیا کرتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ابراہیمؑ کو شروع ہی سے حق کی بصیرت اور رشد و ہدایت عطا

[1] توراة اصحاح ۱۶ تکوین ۱۶ [2] توراة آیت ۵ اصحاح ۲۱ تکوین [3] توراة آیت ۷ اصحاح ۲۵ تکوین

فرمائی تھی اور وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ بت نہ سُن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں، اور نہ نفع و نقصان کا اُن سے کوئی واسطہ، اور نہ لکڑی کے کھلونوں اور دوسری بنی ہوئی چیزوں کے اور ان کے درمیان کوئی فرق و امتیاز ہے، وہ صبح و شام آنکھ سے دیکھتے تھے کہ ان بے جان مورتیوں کو میرا باپ اپنے ہاتھوں سے بناتا اور گھڑتا رہتا ہے اور جس طرح اس کا جی چاہتا ہے، ناک، کان، آنکھیں اور جسم تراش لیتا اور پھر خریدنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو کیا یہ خدا ہو سکتے ہیں یا خدا کے مثیل و ہمسر کہے جا سکتے ہیں؟ حاشا و کلّا پس بعثت سے سرفراز ہو کر سب سے پہلے انھوں نے اِسی طرف توجّہ فرمائی۔

بعثت | قرآنِ عزیز حضرتِ ابراہیمؑ کی اس حقیقت بیں اور بصیرت افروز رشد و ہدایت کا اس طرح ذکر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۚ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۞ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۞ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۞ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۞ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۞ (الانبیاء ع ۵)	اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو اوّل ہی سے رشد و ہدایت عطا کی تھی، اور ہم اس کے (معاملہ کے) جاننے والے تھے جب اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا "یہ مجسّمے کیا ہیں جن کو تم لئے بیٹھے ہو" کہنے لگے "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان ہی کی پوجا کرتے پایا ہے" ابراہیم نے کہا "بلاشبہ تم اور تمہارے باپ دادا کھُلی گمراہی میں ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کیا تو ہمارے لئے کوئی حق لایا ہے یا یوں ہی مذاق کرنیوالوں کی طرح کہتا ہے، ابراہیمؑ نے کہا (یہ بت تمہارے رب نہیں ہیں) بلکہ تمہارا پروردگار زمینوں اور آسمانوں کا پروردگار ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور میں اسی بات کا قائل ہوں۔

اور جب کہ اس جلیل القدر ہستی پر اللہ تعالیٰ کے جود و کرم اور عطا و نوال کا فیضان بے غایت و بے نہایت سرعتِ رفتار کے ساتھ ہو رہا تھا تو اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کی صف میں نمایاں جگہ پائی اور اس کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز "دینِ حنیف" قرار پایا۔

اُس نے جب یہ دیکھا کہ قوم بت پرستی، ستارہ پرستی اور مظاہر پرستی میں اس قدر منہمک ہے کہ خدائے برتر کی قدرتِ مطلقہ اور اس کی احدیت و صمدیت کا تصور بھی اُن کے قلوب میں باقی نہیں رہا اور ان کے لئے خدا کی وحدانیت کے عقیدہ سے زیادہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہی، تب اس نے کمرِ ہمت چست کی اور ذاتِ واحد کے بھروسہ پر اُن کے سامنے دینِ حق کا پیغام رکھا اور اعلان کیا۔

اے قوم! یہ کیا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بُتوں کی پرستش میں مشغول ہو، کیا تم اس قدر خوابِ غفلت میں ہو کہ جس بیجان لکڑی کو اپنے آلات سے گھڑ کر مجسمے تیار کرتے ہو اور اگر وہ مرضی کے مطابق نہ بنے تو ان کو توڑ کر دوسرے بنا لیتے ہو، بنا لینے کے بعد پھر اُن ہی کو پوجنے اور نفع و ضرر کا مالک سمجھنے لگتے ہو، تم اس خرافات سے باز آؤ، خدا کی توحید کے نغمے گاؤ، اور اُسی ایک مالکِ حقیقی کے سامنے سرِ نیاز جھکاؤ جو میرا، تمہارا اور کُل کائنات کا خالق و مالک ہے۔

مگر قوم نے اُس کی آواز پر مطلق کان نہ دھرا اور چونکہ گوشِ حق نیوش اور نگاہِ حق بیں سے محروم تھی اس لئے اس نے جلیل القدر پیغمبر کی دعوتِ حق کا مذاق اُڑایا۔ اور زیادہ سے زیادہ تمرد و سرکشی کا مظاہرہ کیا۔

باپ کو دعوتِ اسلام اور باپ بیٹے کا مناظرہ

حضرتِ ابراہیم (علیہ السّلام) دیکھ رہے تھے کہ شرک کا سب سے بڑا مرکز خود اُن کے اپنے گھر میں قائم ہے اور آزر کی بُت سازی و بُت پرستی پوری قوم کے لئے مرجع و محور بنی ہوئی ہے اس لئے فطرت کا تقاضا ہے کہ دعوتِ حق اور پیغامِ صداقت کے اداءِ فرض کی ابتداء گھر ہی سے ہونی چاہئے اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

سب سے پہلے اپنے والد "آزر" ہی کو مخاطب کیا اور فرمایا: اے باپ! خدا پرستی اور معرفتِ الٰہی کے لئے جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے اور جس کو آباء و اجداد کا قدیم راستہ بتلاتا ہے یہ گمراہی اور باطل پرستی کی راہ ہے۔ اور صراطِ مستقیم اور راہِ حق صرف وہی ہے جس کی دعوت میں دے رہا ہوں، اے باپ! توحید ہی سرچشمۂ نجات ہے نہ کہ تیرے ہاتھ کے بنائے ہوئے ان بتوں کی پرستش و عبادت، اس راہ کو چھوڑ اور توحیدِ حق کی راہ کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کر تا کہ تجھ کو خدا کی رضا اور دنیا و آخرت کی سعادت حاصل ہو۔

مگر افسوس کہ آزر پر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی اس پند و نصیحت کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ قبولِ حق کی بجائے آزر نے بیٹے کو دھمکانا شروع کیا، کہنے لگا کہ ابراہیم! اگر تو بتوں کی برائی سے باز نہ آئے گا تو میں تجھ کو سنگسار کر دوں گا۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ اب حد سے آگے بڑھ گیا اور ایک جانب اگر باپ کے احترام کا مسئلہ ہے تو دوسری جانب ادائے فرض، حمایتِ حق اور اطاعت امرِ الٰہی کا سوال تو انھوں نے سوچا اور آخر وہی کیا جو ایسے برگزیدہ انسان اور اللہ کے جلیل المرتبت پیغمبر کے شایانِ شان تھا، انھوں نے باپ کی سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا، تحقیر و تذلیل کا رویّہ نہیں برتا بلکہ نرمی، ملاطفت، اور اخلاقِ کریمانہ کے ساتھ یہ جواب دیا، اے باپ! اگر میری بات کا یہی جواب ہے تو آج سے میرا تیرا اسلام ہے۔ میں خدا کے سچے دین اور اس کے پیغامِ حق کو نہیں چھوڑ سکتا، اور کسی حال بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا، میں آج سے تجھ سے جدا ہوتا ہوں، مگر غائبانہ تیرے لئے درگاہِ الٰہی میں بخشش طلب کرتا رہوں گا تا کہ تجھ کو ہدایت نصیب ہو اور تو خدا کے عذاب سے نجات پائے۔

سورۂ مریم میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۥ اِنَّهٗ	اور (اے پیغمبر!) الکتاب میں ابراہیم کا ذکر کر، یقیناً وہ مجسّم سچائی
كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ	تھا اور اللہ کا نبی تھا۔ اس وقت کا ذکر جب اُس نے اپنے باپ سے
لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ	کہا اے میرے باپ تو کیوں ایک ایسی چیز کی پوجا کرتا ہے جو نہ تو

وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ
شَيْئًا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ
مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ
اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ
لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ
كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ
اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ
مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ
وَلِيًّا ۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ
اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ
تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ
مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ
سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ
بِيْ حَفِيًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا
رَبِّيْ ڮ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ
رَبِّيْ شَقِيًّا ۝ (مریم)

سنتی ہے نہ دیکھتی ہے، نہ تیرے کسی کام آسکتی ہے؟ اے
میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں علم کی ایک روشنی مجھے
مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی، پس میرے پیچھے چل میں تجھے سیدھی
راہ دکھاؤں گا، اے میرے باپ! شیطان کی بندگی نہ کر،
شیطان تو خدائے رحمٰن سے نافرمان ہو چکا، اے
میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو، خدائے
رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب تجھے گھیرے، اور تو شیطان
کا ساتھی ہو جائے! باپ نے (یہ باتیں سُنکر) کہا
"ابراہیم کیا تو میرے معبود سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ اگر تو ایسی
باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑوں گا،
اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لے کر مجھ سے
الگ ہو جا" ابراہیم نے کہا "اچھا میرا سلام قبول ہو
(میں الگ ہو جاتا ہوں) اب میں اپنے پروردگار سے
تیری بخشش کی دعا کروں گا۔ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔
میں نے تم سب کو چھوڑا اور انہیں بھی جنہیں تم اللہ کے
سوا پکارا کرتے ہو، میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں۔
امید ہے اپنے پروردگار کو پکار کے میں محروم ثابت نہیں ہوں گا۔

اور سورۂ انعام میں آزر کو حضرت ابراہیمؑ کی نصیحت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ
اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّىْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ
فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (انعام ع)

اور (وہ وقت یاد کر) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے
کہا "کیا ٹھہراتا ہے تو بتوں کو خدا، میں تجھ کو اور تیری قوم کو
کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں"

قوم کو دعوتِ اسلام اور اس سے مناظرہ

باپ اور بیٹے کے درمیان جب اتفاق کی کوئی صورت نہ بنی اور آزر نے کسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی رشد و ہدایت کو قبول نہ کیا تو حضرت ابراہیمؑ نے آزر سے جدائی اختیار کر لی اور اپنی دعوتِ حق اور پیغامِ رسالت کو وسیع کر دیا اور اب صرف آزر ہی مخاطب نہ رہا بلکہ پوری قوم کو مخاطب بنا لیا۔ مگر قوم اپنے باپ دادا کے دین کو کب چھوڑنے والی تھی۔ اُس نے ابراہیم (علیہ السلام) کی ایک نہ سُنی اور دعوتِ حق کے سامنے اپنے باطل معبودوں کی طرح گونگے، اندھے اور بہرے بن گئے۔

اُن کے کان موجود تھے مگر حق کی آواز کے لئے بہرے تھے، پُتلیاں آنکھوں کے حلقوں میں زندہ انسان کی آنکھوں کی طرح حرکت ضرور کرتی تھیں مگر حق کی بصارت سے محروم تھیں، زبان گویا ضرور تھی لیکن کلمۂ حق کے اعتبار سے گنگ تھی۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (الاعراف)

ان کے دل ہیں پر سمجھتے نہیں، اُن کی آنکھیں ہیں پر دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں پر اُن سے سُنتے نہیں، یہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ بے راہ ہیں، یہی ہیں جو غفلت میں سرشار ہیں۔

اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے زیادہ زور دے کر پوچھا کہ یہ تو بتاؤ کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو یہ تم کو کسی قسم کا بھی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ تو کہنے لگے کہ ان باتوں کے جھگڑے میں ہم پڑنا نہیں چاہتے ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا یہی کرتے چلے آئے ہیں لہٰذا ہم بھی وہی کر رہے ہیں۔ تب حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) نے ایک خاص انداز سے خدائے واحد کی ہستی کی جانب توجہ دلائی، فرمانے لگے، میں تو تمہارے اُن سب بتوں کو اپنا دشمن جانتا ہوں یعنی میں اُن سے بے خوف و خطر ہو کر اُن سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں، کہ اگر یہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو اپنی حسرت نکال لیں۔

البتہ میں صرف اُس ہستی کو اپنا مالک سمجھتا ہوں جو تمام جہانوں کی پروردگار ہے جس نے

مجھ کو پیدا کیا اور راہِ راست دکھائی، جو مجھ کو کھلاتا پلاتا یعنی رزق دیتا ہے، اور جب میں مریض ہو جاتا ہوں تو جو مجھ کو شفا بخشتا ہے، اور جو میری زیست و موت دونوں کا مالک ہے اور اپنی خطا کاری کے وقت بس سے یہ طمع کرتا ہوں کہ وہ قیامت کے روز مجھ کو بخش دے اور میں اس کے حضور میں یہ دعا کرتا رہتا ہوں' اے میرے پروردگار تو مجھ کو صحیح فیصلہ کی قوت عطا کر اور مجھ کو نکوکاروں کی فہرست میں داخل کر اور مجھ کو زبان کی سچائی عطا کر اور جنتِ نعیم کے وارثوں میں شامل کر۔

نصیحت و موعظت کے اس مؤثر اندازِ خطابت کو جو حضرتِ ابراہیمؑ نے اپنے والد اور قوم کے سامنے پیش کیا، سورۂ شعراء میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرٰهِيمَ ۝ إِذْ قَالَ	اور سنادے ان کو خبر ابراہیم کی جب کہا اپنے باپ
لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا نَعْبُدُ	کو اور اپنی قوم کو تم کس کو پوجتے ہو، وہ بولے ہم پوجتے
أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِينَ ۝ قَالَ هَلْ	ہیں مورتیوں کو پھر سارے دن انہی کے پاس لگے
يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ۝ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ	بیٹھے رہتے ہیں، کہا کچھ سنتے ہیں تمہارا کہا جب تم
أَوْ يَضُرُّونَ ۝ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا	پکارتے ہو یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا برا، بولے نہیں،
كَذٰلِكَ يَفْعَلُونَ ۝ قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ	پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو یہی کام کرتے، کہا:
تَعْبُدُونَ ۝ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ ۝	بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو، تم اور تمہارے
فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِينَ ۝ الَّذِي	باپ دادے اگلے' سو وہ میرے دشمن ہیں مگر جہان
خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ۝ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي	کا رب جس نے مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے
وَيَسْقِينِ ۝ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۝	اور وہ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں
وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ۝ وَالَّذِي	بیمار ہوؤں تو وہی شفا دیتا ہے، اور وہ جو مجھ کو
أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ۝	ماریگا اور پھر جلائے گا، اور جس سے مجھ کو توقع ہے کہ
رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِينَ ۝	بخشے میری تقصیر انصاف کے دن، اے میرے رب!

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۙ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۙ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ۙ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۙ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۙ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۙ (شعراء ع۵)

دے مجھ کو حکم اور ملا مجھ کو نیکوں میں، اور رکھ میرا بول سچا پچھلوں میں، اور کر مجھ کو وارثوں میں نعمت کے باغ کے اور معاف کر میرے باپ کو وہ ہے راہ بھولے ہوؤں میں اور رسوا نہ کر مجھ کو جس دن سب جی کر اٹھیں۔ جس دن نہ کام آوے کوئی مال اور نہ بیٹے، مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لے کر بے روگ دل۔

مگر آزر اور قوم آزر کے دل کسی طرح قبولِ حق کے لئے نرم نہ ہوئے اور اُن کا انکار اور جحود حد سے گذرتا ہی رہا۔

گذشتہ سطور میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ کی قوم، بُت پرستی کے ساتھ ساتھ کواکب پرستی بھی کرتی تھی، اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانوں کی موت و حیات، ان کا رزق ان کا نفع و ضرر، خشک سالی اور قحط سالی، فتح و ظفر اور شکست و ہزیمت، غرض تمام کارخانۂ عالم کا نظم و نسق کواکب اور ان کی حرکات کی تاثیر پر چل رہا ہے، اور یہ تاثیر ان کے ذاتی اوصاف میں سے ہے اس لئے ان کی خوشنودی ضروری ہے اور یہ ان کی پرستش کے بغیر ممکن نہیں۔

اس لئے حضرتِ ابراہیمؑ نے جس طرح ان کو ان کے سفلی معبودانِ باطل کی حقیقت واشگاف کر کے راہِ حق کی طرف دعوت دی اسی طرح ضروری سمجھا کہ ان کے علوی معبودانِ باطل کی بے ثباتی اور فنا کے منظر کو پیش کر کے اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیں کہ تمہارا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ ان چمکتے ہوئے ستاروں، چاند اور سورج کو خدائی طاقت حاصل ہے ہرگز نہیں، یہ خیالِ خام اور باطل عقیدہ ہے، مگر یہ باطل پرست جبکہ اپنے خود ساختہ اصنام سے اس قدر خائف تھے کہ اُن کو بُرا کہنے والے کے لئے ہر آن یہ تصور کرتے تھے کہ وہ اُن کے غضب میں آ کر برباد و تباہ ہو جائے گا تو ایسے اوہام پرستوں کے دلوں میں بلند ستاروں کی پرستش کے خلاف جذبہ پیدا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس لئے (مجدد انبیاء)

ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کے دماغوں کے مناسب ایک عجیب اور دلچسپ پیرایۂ بیان اختیار فرمایا۔

تاروں بھری رات تھی، ایک ستارہ خوب روشن تھا، حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) نے اس کو دیکھ کر فرمایا "میرا رب یہ ہے؟" اس لئے کہ اگر ستارے ربوبیت کر سکتے ہیں تو یہ ان سب میں ممتاز اور روشن ہے لیکن جب وہ اپنے وقتِ مقررہ پر نظر سے اوجھل ہو گیا، اور اس کو یہ مجال نہ ہوئی کہ اپنے پرستاروں کے لئے ایک گھڑی اور رونمائی کرا سکتا اور نظامِ کائنات سے منحرف ہو کر اپنے پوجنے والوں کے لئے زیارت گاہ بنا رہتا۔ تب حضرتِ ابراہیمؑ نے فرمایا "میں چھپ جانے والے کو پسند نہیں کرتا" یعنی جس شے پر مجھ سے بھی زیادہ تغیرات کا اثر پڑتا ہو، اور جو جلد جلد ان اثرات کو قبول کر لیتا ہو وہ میرا معبود کیونکر ہو سکتا ہے' پھر نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ چاندؔ[1] آب و تاب کے ساتھ سامنے موجود ہے، اس کو دیکھ کر فرمایا "یہ میرا رب ہے"؟ اس لئے کہ یہ خوب روشن ہے اور اپنی خنک روشنی سے سارے عالم کو بقعۂ نور بنائے ہوئے ہے، پس اگر کواکب کو رب بنانا ہی ہے تو اسی کو کیوں نہ بنایا جائے کیونکہ یہی اس کا زیادہ مستحق نظر آتا ہے۔

اب سحر کا وقت ہونے لگا تو قمر کے بھی ماند پڑ جانے اور روپوش ہو جانے کا وقت آپہنچا اور جس قدر طلوعِ آفتاب کا وقت قریب ہوتا گیا چاند کا جسم دیکھنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا، تو یہ دیکھ کر ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسا جملہ فرمایا جس سے چاند کے رب ہونے کی نفی کے ساتھ ساتھ خدائے واحد کی ہستی کی جانب قوم کی توجہ اس خاموشی کے ساتھ پھیر دی جائے کہ قوم اس کا احساس بھی نہ کر سکے اور اس گفتگو کا جو مقصد وحید ہے "یعنی صرف خدائے واحد پر ایمان" وہ ان کے دلوں میں بغیر قصد و ارادے کے پیوست ہو جائے۔

---

[1] قرآنِ عزیز نے یہ تصریح نہیں کی کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ گفتگو متعدد راتوں کا نتیجہ ہے یا ایک ہی شب کا، اگر ایک ہی شب کا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی رات کا واقعہ ہے جبکہ چاند کچھ رات گئے نکلتا ہے۔

فرمایا" اگر میرا حقیقی پروردگار میری رہنمائی نہ کرتا تو میں بھی ضرور گمراہ قوم ہی میں سے ایک ہوتا"
پس اس قدر فرمایا اور خاموش ہو گئے اس لئے کہ ابھی اس سلسلہ کی ایک کڑی اور باقی ہے اور قوم کے پاس ابھی مقابلہ کے لئے ایک ہتھیار موجود ہے اس لئے اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں تھا۔

تاروں بھری رات ختم ہوئی چمکتے ستارے اور چاند سب نظر سے اوجھل ہو گئے کیوں؟ اس لئے کہ اب آفتابِ عالمتاب کا رُخِ روشن سامنے آرہا ہے دن نکل آیا اور وہ پوری آب و تاب سے چمکنے دمکنے لگا۔

ابراہیم علیہ السلام نے اُس کو دیکھ کر فرمایا" یہ ہے میرا رب کیونکہ یہ کواکب میں سب سے بڑا ہے اور نظامِ فلکی میں اس سے بڑا ستارہ ہمارے سامنے دوسرا نہیں ہے"۔ لیکن دن بھر چمکنے اور روشن رہنے اور تمام عالم کو روشن کرنے کے بعد وقتِ مقررہ پر اُس نے بھی عراق کی سرزمین سے پہلو بچانا شروع کر دیا اور شبِ دیجور آہستہ آہستہ سامنے آنے لگی اور آخر کار وہ نظروں سے غائب ہو گیا، تو اب وقت آپہنچا کہ ابراہیم علیہ السلام اصل حقیقت کا اعلان کر دیں اور قوم کو لاجواب بنا دیں کہ اُن کے عقیدہ کے مطابق اگر ان کواکب کو ربوبیت اور معبودیت حاصل ہے تو اس کی کیا وجہ کہ ہم سے بھی زیادہ ان میں تغیرات نمایاں ہیں اور یہ جلد جلد اُن۔ کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں اور اگر معبود ہیں تو ان میں "اُفولِ[۱]" کیوں ہے، جس طرح چمکتے نظر آتے تھے اسی طرح کیوں چمکتے نہ رہے، چھوٹے ستاروں کی روشنی کو ماہتاب نے کیوں ماند کر دیا اور ماہتاب کے رُخِ روشن کو آفتاب کے نور نے کس لئے بے نور بنا دیا۔

پس اے قوم! میں ان مشرکانہ عقائد سے بری ہوں اور شرک کی زندگی سے بیزار، بلاشبہ میں نے اپنا رُخ صرف اُسی ایک خدا کی جانب کر لیا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے۔ میں "حنیف" ہوں اور "مشرک" نہیں ہوں۔

[۱] چمک کر پھر ڈوب جانا۔

اب قوم مجھی کہ یہ کیا ہوا، ابراہیم (علیہ السلام) نے ہمارے تمام ہتھیار بیکار اور ہمارے تمام دلائل پامال کردئے، اب ہم ابراہیم (علیہ السلام) کے اس مضبوط و محکم برہان کا کس طرح رد کریں اور اس کی روشن دلیل کا کیا جواب دیں؟ وہ اس کے لئے بالکل عاجز و درماندہ تھے اور جب کوئی بس نہ چلا تو قائل ہونے اور صدائے حق کو قبول کرلینے کے بجائے ابراہیم سے جھگڑنے اور اپنے معبودانِ باطل سے ڈرانے لگے کہ وہ تیری توہین کا تجھ سے ضرور انتقام لیں گے اور تجھ کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم مجھ سے جھگڑتے اور اپنے بتوں سے مجھ کو ڈراتے ہو حالانکہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو صحیح راہ دکھا دی ہے اور تمہارے پاس گمراہی کے سوا کچھ نہیں، مجھے تمہارے بُتوں کی مطلق کوئی پروا نہیں جو کچھ میرا رب چاہے گا وہی ہوگا۔ تمہارے بُت کچھ بھی نہیں کرسکتے کیا تم کو ان باتوں سے کوئی نصیحت حاصل نہیں ہوتی؟ تم کو تو خدا کی نافرمانی کرنے اور اُس کے ساتھ بتوں کو شریک ٹھہرانے میں بھی کوئی خوف نہیں آتا جس کے لئے تمہارے پاس ایک دلیل بھی نہیں ہے اور مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ خدائے واحد کا ماننے والا اور امنِ عالم کا ذمہ دار ہو کر میں تمہارے بُتوں سے ڈر جاؤں گا، کاش کہ تم سمجھتے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح و امن پسند؟

صحیح امن کی زندگی اُسی شخص کو حاصل ہے جو خدائے واحد پر ایمان رکھتا اور شرک سے بیزار رہتا ہے، اور وہی راہ یاب ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کی یہ وہ عظیم الشان حجت تھی جو اُس نے ابراہیم (علیہ السلام) کی زبان سے بُت پرستی کے خلاف ہدایت و تبلیغ کے بعد کواکب پرستی کے رد میں ظاہر فرمائی اور اُن کی قوم کے مقابلہ میں ان کو روشن دلائل و براہین کے ساتھ سربلندی عطا فرمائی۔

اس سلسلہ میں سورۂ انعام کی یہ آیات شاہدِ عدل ہیں:۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ — اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت کے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ
مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ
الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ
فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ
الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ
بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ
اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ
لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝
فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ
هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ
اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ
مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ
وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَحَآجَّهٗ
قَوْمُهٗ ۭ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ
فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ۭ وَلَآ
اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ
اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ۭ
وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ
اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ وَكَيْفَ

جلوے دکھا دیئے تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے
پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا کہ اُس پر رات کی تاریکی چھا گئی، تو اس
نے (آسمان پر) ایک ستارہ (چمکتا ہوا) دیکھا۔ اس نے کہا "یہ
میرا پروردگار ہے" (کہ سب لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں) لیکن
جب وہ ڈوب گیا تو کہا "نہیں میں انہیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب
جانے والے ہیں" (یعنی طلوع و غروب ہوتے رہتے ہیں) پھر
جب ایسا ہوا کہ چاند چمکتا ہوا نکل آیا، تو ابراہیم نے کہا "یہ میرا
پروردگار ہے" لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا "اگر میرے پروردگار
نے مجھے راہ نہ دکھائی ہوتی تو میں ضرور اسی گروہ میں سے ہو جاتا
جو راہِ راست سے بھٹک گیا ہے"! پھر جب صبح ہوئی اور سورج
چمکتا ہوا طلوع ہوا تو ابراہیم نے کہا "یہ میرا پروردگار ہے کہ یہ سب سے
بڑا ہے" لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا، تو اس نے کہا "اے میری
قوم! تم جو کچھ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو، میں اس سے بیزار
ہوں، میں نے تو ہر طرف سے مُنہ موڑ کر صرف اُسی ہستی کی طرف
اپنا رُخ کر لیا ہے جو (کسی کی بنائی ہوئی نہیں، بلکہ) آسمان و زمین
کی بنانیوالی ہے (اور جس کے حکم و قانون پر تمام آسمانی اور ارضی
مخلوقات چل رہی ہیں) اور میں ان میں سے نہیں جو اس کے ساتھ
شریک ٹھہرانے والے ہیں"! اور (پھر) ابراہیم سے اس کی قوم نے
ردّ و کد کی، ابراہیم نے کہا "کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں
ردّ و کد کرتے ہو، حالانکہ اس نے مجھے راہِ حق دکھا دی ہے جنھیں
تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے، میں اُن سے نہیں ڈرتا۔ میں

أَخَافُ مَآ أَشْرَكْتُمْ وَلَا	جانتا ہوں کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، مگر یہ کہ میرا پروردگار ہی مجھے نقصان
تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ	پہنچانا چاہے، میرا پروردگار اپنے علم سے تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔
بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ	پھر کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے" اور (دیکھو) میں اُن ہستیوں سے کیونکر ڈر سکتا ہوں
عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ۚ فَاَيُّ	جنھیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ
الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ	خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراؤ جن کے لئے اس نے کوئی سند و
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۘ	دلیل تم پر نہیں اُتاری؟ بتلاؤ ہم دونوں فریقوں میں سے کس کی راہ امن
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا	کی راہ ہوئی، اگر علم و بصیرت رکھتے ہو" جن لوگوں نے خدا کو مانا اور اپنے
اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ	ماننے کو ظلم سے (یعنی شرک سے) آلودہ نہیں کیا تو انہی کے لئے امن ہے اور
لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ؏	وہی ٹھیک راستہ پر ہیں" اور (دیکھو) یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم
وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ	کو اس کی قوم پر دی تھی، ہم جس کے مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں اُسے علم
اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ	و دلیل کا عرفان دے کر بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا
دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۭ اِنَّ	پروردگار حکمت والا علم رکھنے والا ہے۔

رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○ ———— (الانعام ع ۹-۱۰)

آیات کی تفسیر میں قولِ فیصل اِس بارہ میں کلّی اتفاق کے باوجود کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے کبھی کواکب پرستی نہیں کی اور اُن کی تمام زندگی شرک کی تلویثات سے پاک ہے، سورۂ انعام کی مسطورۂ بالا آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، ان آیات کی تمہید میں جو کچھ لکھا گیا وہ اُن اقوال میں سے ایک قول کے مطابق ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ گفتگو قوم کی کواکب پرستی کی رد میں اُس کو لاجواب کرنے کے لئے تھی اس لئے کہ جب دو فریق کسی مسئلہ میں اختلاف کر بیٹھتے ہیں تو اِحقاقِ حق کے لئے مناظرانہ دلائل میں سے دلیل کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں صرف نظریوں تھیوریوں (THOREES) سے کام نہ لیا جائے بلکہ مشاہدہ اور معائنہ کی ایسی راہ اختیار کی جائے کہ مخالف اس کے دعوے

کے مقابلہ میں لاجواب ہوجائے اور اُس کی دلیل کے رد کرنے کی تمام راہیں اُس کے سامنے بند ہوجائیں، اب اگر اُس میں سلامت روی باقی ہے اور اس کے قلب میں قبولِ حق کی گنجائش ہے تو وہ اس کو قبول کرلیتا ہے ورنہ بے دلیل لڑنے اور جھگڑنے پر آمادہ ہوجاتا ہے تب اس طرح حق و باطل میں امتیاز ہوجاتا ہے اور اصلی اور حقیقی بات نکھر کر صاف ہوجاتی ہے۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر ہیں اس لئے ان کی تبلیغ کا مشن منطقی صغریٰ کبریٰ پر قائم نہ تھا بلکہ حقیقت کو فطری دلائل کی سادگی کے ساتھ واضح کرنا ہی ان کا طغرائے امتیاز تھا، اس لئے انھوں نے یہی راستہ اختیار کیا اور قوم پر واضح کردیا کہ ستارے خواہ شمس و قمر ہی کیوں نہ ہوں رب کہلانے کے قابل نہیں ہیں بلکہ ربوبیت صرف اُسی کو زیبا ہے جو رب العلمین ہے اور ارضی و سماوی، سفلی و علوی کل کائنات کا خالق و مالک ہے اور چونکہ قوم کے پاس اس بہترین دلیل کا کوئی جواب نہ تھا اس لئے وہ زچ ہوئی اور امرِ حق کو قبول کرنے کی بجائے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہوگئی، مگر اس کے ضمیر کو ماننا پڑا کہ یہ جو کچھ کہا گیا حق ہے اور ہمارے پاس اس کا کوئی صحیح جواب نہیں ہے، یہی حضرتِ ابراہیمؑ کا مقصد تھا اور ان کے ادائے فرض کی حد یہیں تک تھی، کیونکہ دل چیر کر حق کو اُس میں اُتار دینا اُن کی طاقت سے باہر تھا۔

اس تفسیر کے مطابق قرآنِ عزیز کی ان آیات میں نہ تاویل کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ مقدرات ماننے کی۔ نیز مشاہدۂ کواکب سے متعلق آیات کا سیاق و سباق بھی بے تکلف اسی کی تائید کرتا ہے، مثلاً اس سلسلہ کی پہلی دو آیات ہیں۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ	جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کیا تو بناتا ہے
اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ	بتوں کو خدا، میں تجھ کو اور تیری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ	دیکھتا ہوں، اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور

اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — زمینوں کی سلطنت کا مشاہدہ کرادیا اور تاکہ وہ یقین
وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ (الانعام ع ۹) — کرنے والوں میں سے ہوجائے۔

ان ہر دو آیات سے حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱) رویتِ کواکب کا یہ معاملہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایسے زمانہ میں پیش آیا ہے جبکہ وہ اپنے والد اور قوم کے ساتھ تبلیغ حق کے مناظرہ میں مصروف تھے، اس لئے کہ پہلی آیت کے بعد دوسری آیت کو وَكَذٰلِكَ کہہ کر شروع کرنا یہی معنی رکھتا ہے، پھر تیسری آیت کے شروع میں فلمّا کی ف یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ دوسری آیت سے وابستہ ہے، اور اس طرح اِن تینوں آیات کا سلسلہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جس طرح اصنام پرستی کے مقابلہ میں روشن دلائل عطا فرمائے تھے تاکہ وہ آزر اور قوم کو لاجواب کرسکیں اور راہِ ہدایت دکھائیں۔ اسی طرح کواکب پرستی کے مقابلہ میں بھی اُس نے حضرتِ ابراہیم کو آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت کا مشاہدہ کرادیا تاکہ وہ اُن سب مخلوق کی حقیقت سے آگاہ ہوجائیں اور اُن کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہوجائے، اور پھر وہ کواکب پرستی کے رد میں بھی بہترین دلائل دے سکیں اور اس سلسلہ میں بھی قوم کو حق کی راہ دکھلا کر ان کی غلط روش کے متعلق لاجواب بنا سکیں۔ یہ تو آیاتِ رویت کا سیاق تھا اور اب سیاق قابلِ توجہ ہے۔

جب حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے آخر میں آفتاب پر نظر فرمائی اور پھر وہ بھی نظروں سے غائب ہونے لگا تو اسی آیت میں یہ جملہ موجود نظر آتا ہے:۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ - ابراہیم نے کہا "اے قوم میں شرک کرنیوالوں سے بری ہوں"

اور ساتھ ہی یہ آیت مذکور ہے:۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ — بلاشبہ میں نے اپنا رُخ صرف اس خدا کی جانب پھیر دیا ہے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا — جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، اس حالت میں کہ

وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الانعام ع۹) حنیف ہوں اور مشرک نہیں ہوں۔

اور پھر اسی کے متصل آیت میں ہے :-

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اور ابراہیم کی قوم نے اُس سے جھگڑنا شروع کیا ابراہیم نے

اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ ۔ کہا، کیا تو مجھ سے اللہ کے بارہ میں جھگڑتی ہے۔

اور سب سے آخر آیت میں کہا گیا ہے :-

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے

قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ مقابلہ میں عطا کی، ہم جس کا درجہ بلند کرنا چاہتے ہیں کر دیا

اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ کرتے ہیں، بیشک تیرا رب دانا ہے جاننے والا۔

ان آیات سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں :-

(۱) رویتِ کواکب کا یہ معاملہ قوم سے ضرور وابستہ تھا تب ہی تیسری مرتبہ میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذات سے خطاب کرنے کے بجائے فوراً قوم سے خطاب شروع کر دیا۔

(۲) اور قوم نے بھی یہ سب کچھ سن کر دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی جگہ ابراہیم (علیہ السلام) سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کی اس گفتگو کو قوم کے مقابلہ میں اپنی جانب سے حجت قرار دیا اور بتایا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کا رتبۂ رسالت بہت بلند اور ارفع ہے، اور اس لئے قوم اُن کی رہنمائی کی سخت محتاج ہے، اور ان امور کے سوا یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے :-

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے ہدایت عطا کر دی

قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝ (انبیاء ع۵) تھی اور ہم ہی اس کے واقف کار ہیں۔

لہٰذا یہ معاملہ حضرتِ ابراہیمؑ کے نہ لڑکپن کا ہو سکتا ہے اور نہ اُن کے اپنے عقیدۂ اور ایمان کا اس تفصیل سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری بیان کردہ تفسیر ہی آیات کی صحیح

تفسیر ہے اور بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے قوم پر یہ زبردست حجت تھی کہ افرادِ قوم کا کواکب کی پرستش کرنا، ان کے لئے ہیکل بنانا، اپنے سفلی معبودوں کے نام ان کے نام پر رکھنا غرض ان کو معبود، رب، اور خدا سمجھنا قطعاً باطل اور گمراہی ہے، اس لئے کہ یہ سب ایک خاص نظام میں جکڑے ہوئے اور دن اور رات کے تغیر کے ساتھ تغیرات کو قبول کرنیوالے ہیں، اور اس پورے نظام کی مالک و خالق صرف وہی ہستی ہے جس کے یدِقدرت میں ان سب کی تسخیر ہے، اور وہ "اللہ" ہے۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ ۔ نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ قمر کو پاسکے اور نہ رات میں یہ قدرت کہ وہ دن کو پیچھے ہٹا کر اس کی جگہ خود لے لے۔

غرض ان تمام روشن دلائل و براہین کے بعد بھی جب قوم نے دعوتِ اسلام کو قبول نہ کیا اور اصنام پرستی و کواکب پرستی میں اُسی طرح مبتلا رہی تو حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) نے ایک دن جمہور کے سامنے اعلانِ جنگ کر دیا کہ میں تمہارے ان بتوں کے متعلق ایک ایسی چال چلوں گا جو تم کو زچ کر کے ہی چھوڑے گی۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۔ (انبیاء ع۵) اور اللہ کی قسم میں تمہاری عدم موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کے ساتھ خفیہ چال چلوں گا۔

اس معاملہ سے متعلق اصل صورتِ حال یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے آزر اور قوم کے جمہور کو ہر طرح بت پرستی کے معائب ظاہر کر کے اُس سے باز رکھنے کی سعی کر لی، اور ہر قسم کے پند و نصائح کے ذریعہ ان کو یہ باور کرانے میں قوت صرف کر دی کہ یہ بُت نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان اور یہ کہ تمہارے کاہنوں اور پیشواؤں نے اُن کے متعلق تمہارے دلوں میں غلط خوف بٹھا دیا ہے کہ اگر ان سے منکر ہو جاؤ گے تو یہ غضبناک ہو کر تم کو تباہ کر ڈالیں گے، یہ تو اپنی آئی ہوئی مصیبت کو بھی نہیں ٹال سکتے مگر آزر اور قوم کے دلوں پر مطلق اثر نہ ہوا اور وہ اپنے دیوتاؤں کی خدائی قوت کے عقیدہ سے کسی طرح باز نہ آئے بلکہ کاہنوں اور سرداروں نے

اُن کو اور زیادہ پختہ کر دیا اور ابراہیم علیہ السلام کی نصیحت پر کان دھرنے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا تب حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) نے سوچا کہ اب مجھ کو رشد و ہدایت کا ایسا پہلو اختیار کرنا چاہئے جس سے جمہور کو یہ مشاہدہ ہو جائے کہ واقعی ہمارے دیوتا صرف لکڑیوں اور پتھروں کی مورتیاں ہیں جو گونگی بھی ہیں، بہری بھی ہیں اور اندھی بھی، اور دلوں میں یہ یقین راسخ ہو جائے کہ اب تک ان کے متعلق ہمارے کاہنوں اور سرداروں نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل غلط اور بے سر و پا بات تھی اور ابراہیم ہی کی بات سچی ہے، اگر ایسی کوئی صورت بن آئی تو پھر میرے لئے تبلیغِ حق کے لئے آسان راہ نکل آئے گی، یہ سوچ کر انھوں نے ایک نظامِ عمل تیار کیا جس کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا، اور اس کی ابتداء اس طرح کی کہ باتوں باتوں میں اپنی قوم کے افراد سے یہ کہہ گذرے کہ "میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک خفیہ چال چلوں گا" گویا اس طرح ان کو متنبہ کرنا تھا کہ اگر تمہارے دیوتاؤں میں کچھ قدرت ہے جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو تو وہ میری چال کو باطل اور مجھ کو مجبور کر دیں کہ میں ایسا نہ کر سکوں" مگر چونکہ بات صاف نہ تھی اس لئے قوم نے اس جانب کچھ توجہ نہ کی، حسنِ اتفاق کہ قریب ہی زمانہ میں قوم کا ایک مذہبی میلہ پیش آگیا، جب سب اس کے لئے چلنے لگے تو کچھ لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام سے بھی اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلیں، حضرتِ ابراہیم نے اوّل انکار فرمایا اور جب اُس جانب سے اصرار بڑھنے لگا تو ستاروں کی جانب نگاہ اٹھائی اور فرمانے لگے "اِنِّىْ سَقِيْمٌ" میں آج کچھ علیل سا ہوں" چونکہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کو کواکب پرستی کی وجہ سے نجوم میں کمال بھی اور اعتقاد بھی تھا اس لئے اپنے عقیدہ کے لحاظ سے وہ یہ سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام کسی نحس ستارہ کے اثرِ بد میں مبتلا ہیں اور یہ سوچ کر بغیر کسی تشریحِ حال کے ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ کر میلہ میں چلے گئے۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِى النُّجُوْمِ ۙ فَقَالَ اِنِّىْ سَقِيْمٌ ۚ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ۚ (الصافات)	پس (ابراہیم نے) ایک نگاہ اٹھا کر ستاروں کی جانب دیکھا اور کہنے لگا میں کچھ علیل ہوں، پس وہ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔

اب جبکہ ساری قوم، بادشاہ، کاہن اور مذہبی پیشوا میلہ میں مصروف اور شراب کباب میں

مشغول تھے تو حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام نے سوچا کہ وقت آگیا ہے کہ اپنے نظامِ عمل کی تکمیل کردوں اور مشاہدہ کی صورت میں جمہور پر واضح کردوں کہ ان کے دیوتاؤں کی حقیقت کیا ہے؟ وہ اُٹھے اور سب سے بڑے دیوتا کے ہیکل (مندر) میں پہنچے، دیکھا تو وہاں دیوتاؤں کے سامنے قسم قسم کے حلووں، پھلوں، میووں اور مٹھائیوں کے چڑھاوے رکھے تھے، ابراہیم علیہ السّلام نے طنزیہ لہجہ میں چپکے چپکے ان مورتیوں سے خطاب کر کے کہا کہ یہ سب کچھ موجود ہے ان کو کھاتے کیوں نہیں؟ اور پھر کہنے لگے میں بات کر رہا ہوں کیا بات ہے کہ تم جواب نہیں دیتے؟ اور پھر اُن سب کو توڑ پھوڑ ڈالا اور سب سے بڑے بت کے کاندھے پر تبر رکھ کر واپس چلے گئے۔

فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۝ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًاۢ بِالْيَمِيْنِ ۝	پس چپکے سے جا گھسا اُن کے بتوں میں اور کہنے لگا (ابراہیم) ان کے دیوتاؤں سے، کیوں نہیں کھاتے، تم کو کیا ہو گیا کیوں نہیں بولتے؟ پھر اپنے داہنے ہاتھ سے اُن سب کو توڑ ڈالا۔
فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ۝ (انبیاء ع ۵)	پس کر دیا ان کو ٹکڑے ٹکڑے مگر اُن میں سے بڑے دیوتا کو چھوڑ دیا تاکہ (اپنے عقیدہ کے مطابق) وہ اُس کی طرف رجوع کریں (کہ یہ کیا ہو گیا)

جب لوگ میلے سے واپس آئے تو ہیکل (مندر) میں بتوں کا یہ حال پایا، سخت برہم ہوئے اور ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا ہوا اور کس نے کیا؟ ان میں وہ بھی تھے جن کے سامنے حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ[1] کہہ چکے تھے انھوں نے فوراً کہا کہ یہ اس شخص کا کام ہے جس کا نام ابراہیمؑ ہے، وہی ہمارے دیوتاؤں کا دشمن ہے۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ۝ (الانبیاء ع ۵)	وہ کہنے لگے یہ معاملہ ہمارے خداؤں کے ساتھ کس نے کیا ہے بلاشبہ وہ ضرور ظالم ہے (ان میں سے بعض) کہنے لگے ہم نے ایک جوان کی زبان سے ان بتوں کا (برائی کے ساتھ) ذکر سنا ہے اس کو ابراہیم کہا جاتا ہے (یعنی یہ اس کا کام ہے)

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ سورۂ انبیاء۔

کاہنوں اور سرداروں نے جب یہ سنا تو غم و غصہ سے سُرخ ہو گئے اور کہنے لگے اس کو مجمع کے سامنے پکڑ کر لاؤ تاکہ سب دیکھیں کہ مجرم کون شخص ہے۔

ابراہیم علیہ السلام سامنے لائے گئے تو بڑے رعب داب سے انھوں نے پوچھا، کیوں ابراہیم تو نے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے؟

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ۔ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ

انھوں نے کہا ابراہیم کو لوگوں کے سامنے لاؤ تاکہ وہ دیکھیں، وہ کہنے لگے کیا ابراہیم تو نے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ کیا ہے؟

ابراہیم علیہ السّلام نے دیکھا کہ اب وہ بہترین موقعہ آگیا ہے جس کے لئے میں نے یہ تدبیر اختیار کی، مجمع موجود ہے جمہور دیکھ رہے ہیں کہ ان کے دیوتاؤں کا کیا حشر ہو گیا، اس لئے اب کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کو جمہور کی موجودگی میں اُن کے باطل عقیدہ پر نادم کر دینے کا وقت ہے تاکہ عوام کو آنکھوں دیکھتے معلوم ہو جائے کہ آج تک ان دیوتاؤں کے متعلق جو کچھ ہم سے کاہنوں اور پجاریوں نے کہا تھا یہ سب ان کا مکر و فریب تھا، مجھے اُن سے کہنا چاہئے کہ یہ سب اس بڑے بُت کی کارروائی ہے، اس سے دریافت کرو؟ لامحالہ وہ یہی جواب دیں گے کہ کہیں بُت بھی بولتے اور بات کرتے ہیں، تب میرا مطلب حاصل ہے اور پھر میں اُن کے عقیدے کا پول جمہور کے سامنے کھول کر صحیح عقیدہ کی تلقین کر سکوں گا اور بتاؤں گا کہ کس طرح وہ باطل اور گمراہی میں مبتلا ہیں، اس وقت ان کاہنوں اور پجاریوں کے پاس ندامت کے سوائے کیا ہوگا، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا:۔

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝ (انبیاء ۶)

ابراہیم نے کہا بلکہ ان میں سے اس بڑے بُت نے یہ کیا ہے، پس اگر یہ (تمہارے دیوتا) بولتے ہوں تو ان سے دریافت کر لو؟

ابراہیم (علیہ السلام) کی اس یقینی حجت، اور دلیل کا کاہنوں اور پجاریوں کے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا، وہ ندامت میں غرق تھے۔ دلوں میں ذلیل و رسوا تھے، او سوچتے تھے کہ کیا جواب دیں؟

جمہور بھی آج سب کچھ سمجھ گئے اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھ لیا جس کیلئے وہ تیار نہ تھے اور بالآخر چھوٹے اور بڑے سب ہی کو دل میں اقرار کرنا پڑا کہ ابراہیمؑ ظالم نہیں ہے بلکہ ظالم ہم خود ہیں کہ ایسے بے دلیل اور باطل عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں تب نہایت شرمساری کیساتھ سرنگوں ہو کر کہنے لگے ابراہیمؑ تو خوب جانتا ہے کہ ان دیوتاؤں میں بولنے کی سکت نہیں ہے، یہ تو بے جان مورتیاں ہیں۔

فَرَجَعُوٓا اِلٰٓی اَنۡفُسِہِمۡ فَقَالُوٓا اِنَّکُمۡ اَنۡتُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۙ ثُمَّ نُکِسُوۡا عَلٰی رُءُوۡسِہِمۡ ۚ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا ہٰۤؤُلَآءِ یَنۡطِقُوۡنَ ۝ (انبیاء ع۵)

پس انھوں نے اپنے جی میں سوچا پھر کہنے لگے بیشک تم ہی ظالم ہو بعد ازاں اپنے سروں کو نیچے جھکا کر کہنے لگے (اے ابراہیم) تو خوب جانتا ہے کہ یہ بولنے والے نہیں ہیں۔

اس طرح حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی حجت و دلیل کامیاب ہوئی اور دشمنوں نے اعتراف کر لیا کہ ظالم ہم ہی ہیں اور ان کو جمہور کے سامنے زبان سے اقرار کرنا پڑا کہ ہمارے یہ دیوتا جواب دینے اور بولنے کی طاقت نہیں رکھتے، چہ جائیکہ نفع و نقصان کے مالک ہوں۔

تو اب ابراہیم علیہ السلام نے مختصر مگر جامع الفاظ میں ان کو نصیحت بھی کی اور ملامت بھی، اور بتایا کہ جب یہ دیوتا نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان تو پھر یہ خدا اور معبود کیسے ہو سکتے ہیں' افسوس تم اتنا بھی نہیں سمجھتے یا عقل سے کام نہیں لیتے؟ فرمانے لگے :۔

اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُکُمۡ شَیۡئًا وَّلَا یَضُرُّکُمۡ ۝ اُفٍّ لَّکُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝ (انبیاء ع۵)

کیا تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی پوجا کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان دے سکتے ہیں، تم پر افسوس ہے اور تمہارے ان معبودانِ باطل پر بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

فَاَقۡبَلُوۡۤا اِلَیۡہِ یَزِفُّوۡنَ ۝ قَالَ اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ ۝ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ (الصافات ع۳)

پس وہ سب حملہ کر کے ابراہیم کے گرد جمع ہو گئے، ابراہیم نے کہا کیا جن بتوں کو ہاتھ سے گھڑتے ہو انہی کو پھر پوجتے ہو، اور اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے اور انکو بھی جن کاموں کو تم کرتے ہو۔

حضرتِ ابراہیمؑ کی اس نصیحت و موعظت کا اثر یہ ہونا چاہیئے تھا کہ تمام قوم اپنے باطل عقیدہ سے تائب ہو کر ملتِ حنیفی کو اختیار کر لیتی اور کج روی چھوڑ کر راہِ مستقیم پر گامزن ہو جاتی لیکن دلوں کی کجی، نفوس کی سرکشی، متمردانہ ذہنیت اور باطنی خباثت و دناءت نے اس جانب نہ آنے دیا، اور اس کے برعکس ان سب نے ابراہیم (علیہ السلام) کی عداوت و دشمنی کا نعرہ بلند کر دیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اگر دیوتاؤں کی خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو اس گستاخی اور مجرمانہ حرکت پر سخت سزا دو اور دہکتی ہوئی آگ میں جلا ڈالو تاکہ اس کی تبلیغ و دعوت کا قصہ ہی پاک ہو جائے،

بادشاہ کو دعوتِ اسلام اور اس سے مناظرہ

ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ شدہ شدہ بادشاہِ وقت تک یہ باتیں پہنچ گئیں اُس زمانہ میں عراق کے بادشاہ کا لقب نمرود ہوتا تھا اور یہ رعایا کے صرف بادشاہ ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ خود کو اُن کا رب اور مالک جانتے تھے اور رعایا بھی دوسرے دیوتاؤں کی طرح اس کو اپنا خدا اور معبود مانتی اور اس کی بھی اسی طرح پرستش کرتی تھی، جس طرح دیوتاؤں کی، بلکہ ان سے بھی زیادہ پاس و ادب کے ساتھ پیش آتی تھی، اس لئے کہ وہ صاحبِ عقل و شعور بھی ہوتا تھا اور مالکِ تخت و تاج بھی۔

نمرود کو جب یہ معلوم ہوا تو آپے سے باہر ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اس شخص کی پیغمبرانہ تبلیغ و دعوت کی سرگرمیاں اگر اسی طرح جاری رہیں تو یہ میری ربوبیت، ملوکیت اور الوہیت سے بھی سب رعایا کو برگشتہ کر دے گا اور اس طرح باپ دادا کے مذہب کے ساتھ ساتھ میری یہ سلطنت بھی زوال میں آجائے گی، اس لئے اس قصہ کا ابتداہی میں خاتمہ کر دینا بہتر ہے، یہ سوچ کر اس نے حکم دیا کہ ابراہیم کو ہمارے دربار میں حاضر کرو، ابراہیم (علیہ السلام) جب نمرود کے دربار میں پہنچے تو نمرود نے گفتگو شروع کی اور ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ تو باپ دادا کے دین کی مخالفت کس لئے کرتا ہے اور مجھ کو رب ماننے سے تجھے کیوں انکار ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں خدائے واحد کا پرستار ہوں، اس کے علاوہ کسی کو اُس کا شریک نہیں مانتا، ساری کائنات اور تمام عالم اُسی کی مخلوق ہے اور وہی ان سب کا خالق و مالک ہے، تو بھی

اُسی طرح ایک انسان ہے جس طرح ہم سب انسان ہیں پھر تو کس طرح رب یا خدا ہو سکتا ہے، اور کس طرح یہ گونگے بہرے لکڑی کے بُت خدا ہو سکتے ہیں؟ میں صحیح راہ پر ہوں اور تم سب غلط راہ پر ہو، اس لئے میں تبلیغِ حق کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں اور تمہارے باپ دادا کے خود ساختہ دین کو کیسے اختیار کر سکتا ہوں؟

نمرود نے ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اگر میرے علاوہ تیرا کوئی رب ہے تو اسکا ایسا وصف بیان کر کہ جس کی قدرت مجھ میں نہ ہو، تب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ میرا رب وہ ہے جس کے قبضہ میں موت وحیات ہے' وہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے، کج فہم نمرود، موت وحیات کی حقیقت سے ناآشنا نمرود کہنے لگا۔ اس طرح موت وحیات تو میرے قبضہ میں بھی ہے، اور یہ کہہ کر اُسی وقت ایک بے قصور شخص کے متعلق جلاد کو حکم دیا کہ اس کی گردن مار دو اور موت کے گھاٹ اتار دو، جلاد نے فوراً حکم کی تعمیل کر دی اور ایک قتل کے سزا یافتہ مجرم کو جیل سے بُلا کر حکم دیا کہ جاؤ ہم نے تمہاری جان بخشی کی اور پھر ابراہیم علیہ السلام کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ دیکھا میں بھی کس طرح زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں، پھر تیرے خدا کی خصوصیت کیا رہی؟

ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ نمرود یا تو موت وحیات کی اصل حقیقت سے ناآشنا ہے اور یا جمہور اور رعایا کو مغالطہ دینا چاہتا ہے تاکہ وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکیں کہ زندگی بخشنا اس کا نام نہیں ہے بلکہ نیست سے ہست کرنے کا نام زندگی بخشنا ہے اور اسی طرح کسی کو قتل یا پھانسی سے بچا لینا موت کا مالک ہونا نہیں ہے۔ موت کا مالک وہی ہے جو روحِ انسانی کو اُس کے جسم سے نکال کر اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے، اس لئے بہت سے دار رسیدہ اور شمشیر چشیدہ انسان زندگی پا جاتے ہیں اور بہت سے قتل و دار سے بچائے ہوئے انسان لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور کوئی طاقت ان کو نہیں روک سکتی اور اگر ایسا ہو سکتا تو ابراہیم علیہ السلام سے گفتگو کرنے والا نمرود سریرآرائے سلطنت نہ ہوتا بلکہ اُس کے خاندان کا پہلا شخص ہی آج بھی اس تاج و تخت کا مالک نظر آتا، مگر

نہ معلوم کہ عراق کی اس سلطنت کے کتنے مدعی زیر زمین دفن ہو چکے اور ابھی کتنوں کی باری ہے۔
تاہم ابراہیم (علیہ السلام) نے سوچا کہ اگر میں نے اس موقع پر موت وحیات کے دقیق فلسفہ پر بحث شروع کر دی تو نمرود کا مقصد پورا ہو جائے گا اور وہ جمہور کو مغالطہ میں ڈال کر اصل معاملہ کو الجھا دے گا اور اس طرح میرا نیک مقصد پورا نہ ہو سکے گا اور تبلیغ حق کے سلسلہ میں سرِ محفل نمرود کو لاجواب کرنے کا موقعہ ہاتھ سے جاتا رہے گا، کیونکہ بحث ومباحثہ اور جدل ومناظرہ میرا اصل مقصد نہیں ہے بلکہ لوگوں کے دماغ وقلب میں خدائے واحد کا یقین پیدا کرنا میرا مقصدِ وحید ہے اس لئے انھوں نے اس دلیل کو نظر انداز کر کے سمجھانے کا ایک دوسرا پیرایہ اختیار کیا اور ایسی دلیل پیش کی جس کا صبح وشام ہر شخص آنکھوں سے مشاہدہ کرتا اور بغیر کسی منطقی دلیل کے روز وشب کی زندگی میں اس سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔
ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا میں اُس ہستی کو "اللہ" کہتا ہوں جو روزانہ سورج کو مشرق سے لاتا اور مغرب کی جانب لیجاتا ہے، پس اگر تو بھی اسی طرح خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کے خلاف سورج کو مغرب سے نکال اور مشرق میں چھپا۔ یہ سُن کر نمرود مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا۔ اس طرح ابراہیم (علیہ السلام) کی زبان سے نمرود پر خدا کی حجت پوری ہوئی۔
نمرود اس دلیل سے مبہوت کیوں ہوا اور اُس کے پاس اس کے مقابلہ میں مغالطہ کی گنجائش کیوں نہ رہی؟ یہ اس لئے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کی دلیل کا حاصل یہ تھا کہ میں ایک ایسی ہستی کو اللہ مانتا ہوں جس کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ ساری کائنات اور اس کا سارا نظام اُس ہی نے بنایا ہے اور اُس نے اس پورے نظام کو اپنی حکمت کے قانون سے ایسا مسخر کر دیا ہے کہ اُس کی کوئی شئے نہ وقت مقررہ سے پہلے اپنی جگہ سے ہٹ سکتی اور نہ اِدھر اُدھر ہو سکتی ہے، تم اس پورے نظام میں سے آفتاب ہی کو دیکھو کہ عالمِ ارضی اس سے کس قدر فائدے حاصل کرتا ہے۔ بایں ہمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے طلوع وغروب کا بھی ایک نظام مقرر کر دیا ہے۔ پس اگر آفتاب لاکھ بار بھی چاہے کہ وہ اس نظام سے باہر ہو جائے تو وہ اس

پر قادر نہیں ہے، کیونکہ اس کی باگ خدائے واحد کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اُسکو بیشک یہ قدرت ہے کہ جو چاہے کر گزرے لیکن وہ کرتا وہی ہے جو اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔

لہٰذا اب نمرود کے لئے تین ہی صورتیں جواب دینے کی ہوسکتی تھیں یا وہ یہ کہے کہ مجھے آفتاب پر پوری قدرت حاصل ہے اور میں نے ہی یہ سارا نظام بنایا ہے، مگر اُس نے یہ جواب اس لئے نہیں دیا کہ وہ خود اس کا قائل نہیں تھا کہ یہ ساری کائنات اُس نے بنائی ہے اور آفتاب کی حرکت اس کے قبضۂ قدرت میں ہے بلکہ وہ تو خود کو اپنی رعایا کا رب اور دیوتا کہلاتا تھا اور بس۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ کہتا "میں اس عالم کو کسی کی مخلوق نہیں مانتا اور آفتاب تو خود مستقل دیوتا ہے اُس کے اختیارات میں خود بہت کچھ ہے" مگر اُس نے یہ بھی اس لئے نہ کہا کہ اگر وہ ایسا کہتا تو ابراہیم علیہ السلام کا وہی اعتراض سامنے آجاتا، جو انھوں نے جمہور کے سامنے آفتاب کی ربوبیت کے خلاف اٹھایا تھا کہ اگر یہ "رب" ہے تو عابدوں اور پجاریوں سے زیادہ اس معبود اور دیوتا میں تغیرات اور فنا کے اثرات کیوں موجود ہیں "رب" کو فنا اور تغیر سے کیا علاقہ اور کیا اس کی قدرت میں یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو وقتِ مقررہ سے پہلے یا بعد طلوع یا غروب ہو جائے۔

تیسری صورت یہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کی تحدّی (چیلنج) کو قبول کر لیتا اور مغرب سے نکال کر دکھا دیتا، مگر نمرود چونکہ ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی جواب پر قادر نہ تھا اس لئے مبہوت اور لاجواب ہو جانے کے علاوہ اُس کے پاس دوسرا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا۔[1]

---

[1] عیسائی پادریوں اور ان کی اندھی تقلید میں آریہ سماجیوں نے ابراہیم علیہ السلام کے اس ذکر کردہ مناظرہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر نمرود یہ کہہ بیٹھتا کہ ابراہیم تو ہی اپنے خدا سے آفتاب کو مغرب سے طلوع کرا دے، تو ابراہیم کے پاس کیا جواب تھا؟ یہ اعتراض بہت ہی لچر اور سطحی ہے اس لئے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے مناظرہ کی جو تشریح بیان کی ہو اور جو حقیقتِ واقعہ ہے اس کے بعد یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ نمرود جانتا تھا کہ وہ ایسا اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ پہلے وہ خود اپنی عاجزی و درماندگی کا اقرار کرے اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرے کہ آفتاب ہمارا دیوتا بھی نہیں ہے (باقی ص ۱۹۳ پر)

قرآنِ عزیز نے (بقرہ) میں اس واقعہ کو مختصر مگر لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے :-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَاۤجَّ اِبْرٰهٖمَ
فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ
قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَ
يُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ
اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ
مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ
فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ (بقرہ ع ۳۵)

کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کے واقعہ، جس کو اللہ نے بادشاہت
بخشی تھی اُس نے کس طرح ابراہیم سے اس کے پروردگار کے
بارہ میں مناظرہ کیا؟ جب کہا ابراہیم نے میرا پروردگار تو زندگی
بخشتا ہے اور موت دیتا ہے، بادشاہ نے کہا میں بھی زندگی بخشتا
ہوں اور موت دیتا ہوں، ابراہیم نے کہا بلاشبہ اللہ تعالیٰ
سورج کو مشرق سے نکالتا ہے پس تو اس کو مغرب سے نکال کر
دکھلا، پس وہ کافر (بادشاہ) مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا
اور اللہ ظلم کرنے والوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے والد آزر کو اسلام کی تلقین کی، پیغامِ حق سُنایا اور راہِ مستقیم دکھائی، اس کے بعد عوام اور جمہور کے سامنے اس دعوت کو عام کیا اور سب کو امرِ حق تسلیم کرانے کے لئے فطرت کے بہترین اصول و دلائل کو پیش فرمایا، اور نرمی، شیریں کلامی مگر مضبوط و محکم اور روشن حجت و دلیل کے ساتھ ان پر حق کو واضح کیا اور سب

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :- اور نہ اس میں یہ قدرت کہ وہ ہماری اس استدعا کو ابراہیم کے مقابلہ میں منظور کر لے، بدیں وجہ اس نے خاموشی کو ترجیح دی، اور اگر وہ ایسا سوال کر ہی بیٹھتا تو ابراہیم علیہ السلام کو یہ یقین تھا کہ ایسے تحدی (چیلنج) کے وقت اللہ تعالیٰ اپنے سچے پیغمبر کو ذلیل نہیں کرے گا اور ابراہیم کی دعا پر وہ بلاشبہ آفتاب کو مغرب سے طلوع کر کے ابراہیم کی صداقت کو واضح کر دے گا۔ البتہ یہ مسئلہ مادیین اور خدا کی قدرت پر کنٹرول کرنے والوں کے لئے ضرور تعجب خیز ہو سکتا ہے لیکن جن کا عقیدہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام اگرچہ خاص قوانین کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے لیکن اس کا یہ شکنجہ ان اشیاء کے ذاتی خواص کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس شکنجہ میں کسنے والی ہستی اور ہے جو سب سے بالاتر ہے اور تمام اشیاء کی تاثیر اور ان کے خواص اسی کے ید قدرت میں ہیں لہٰذا وہ چاہے تو ان کے خواص و تاثیرات کو بدل بھی سکتا ہے اور فنا بھی کر سکتا ہے اور اسی قادرِ مطلق اور بے قید مالک و متصرف کا نام "اللہ" ہے تو ان کی سمجھ میں یہ تعجب انگیز بات نہیں ہے۔

آخر میں بادشاہِ نمرود سے مناظرہ کیا اور اس پر روشن کر دیا کہ ربوبیت والوہیت کا حق صرف خدائے واحد ہی کے لئے سزاوار ہے اور بڑے سے بڑے شاہنشاہ کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کی ہمسری کا دعویٰ کرے، کیونکہ وہ اور کل دنیا اُسی کی مخلوق ہے اور وجود و عدم کی قید و بند میں گرفتار، مگر اس کے باوجود کہ بادشاہ، آزر اور جمہور، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دلائل سے لاجواب تھے اور دلوں میں قائل، بلکہ بتوں کے واقعہ میں تو زبان سے بھی اقرار کرنا پڑا کہ ابراہیم جو کچھ کہتا ہے وہی حق ہے اور صحیح و درست تاہم ان میں سے کسی نے راہِ مستقیم کو اختیار نہ کیا اور قبولِ حق سے منحرف ہی رہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس اپنی ندامت و ذلت سے متاثر ہو کر بہت زیادہ غیظ و غضب میں آگئے اور بادشاہ سے رعایا تک سب نے متفقہ فیصلہ کر لیا کہ دیوتاؤں کی توہین اور باپ دادا کے دین کی مخالفت میں ابراہیم کو دہکتی آگ میں جلا دینا چاہئے کیونکہ ایسے سخت مجرم کی سزا یہی ہو سکتی ہے اور دیوتاؤں کی تحقیر کا انتقام اسی طرح لیا جا سکتا ہے۔

آگ کا سرد ہو جانا اس مرحلہ پر پہنچ کر ابراہیم علیہ السلام کی جد و جہد کا معاملہ ختم ہو گیا اور اب دلائل و براہین کی قوت کے مقابلہ میں مادی طاقت و سطوت نے مظاہرہ شروع کر دیا، باپ اس کا دشمن، جمہور اس کے مخالف، اور بادشاہِ وقت اس کے درپئے آزار، ایک ہستی اور چہار جانب سے مخالفت کی آواز، دشمنی کے نعرے، اور نفرت و حقارت کے ساتھ سخت انتقام اور خوفناک سزا کے ارادے، ایسے وقت میں اس کی مدد کون کرے، اور اس کی حمایت کا سامان کس طرح مہیا ہو؟

مگر ابراہیم علیہ السلام کو نہ اس کی پرواہ تھی اور نہ اُس کا خوف، وہ اُسی طرح بے خوف و خطر اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے بے نیاز اعلانِ حق میں سرشار، اور دعوت و رشد و ہدایت میں مشغول تھے، البتہ ایسے نازک وقت میں جب تمام مادی سہارے ختم، دنیوی اسباب ناپید، اور حمایت و نصرت کے ظاہری اسباب مفقود ہو چکے تھے، ابراہیم علیہ السلام کو اُس

وقت بھی ایک ایسا ٹرا زبردست سہارا حاصل تھا جو تمام سہاروں کا سہارا اور تمام نصرتوں کا ناصر کہا جاتا ہے اور وہ خدائے واحد کا سہارا تھا۔ اُس نے اپنے جلیل القدر پیغمبر، قوم کے عظیم المرتبت ہادی اور رہنما کو بے یار ومددگار نہ رہنے دیا اور دشمنوں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ ہوا یہ کہ نمرود اور قوم نے ابراہیم (علیہ السلام) کی سزا کے لئے ایک مخصوص جگہ بنوائی اور اس میں کئی روز مسلسل آگ دہکائی گئی، حتیٰ کہ اس کے شعلوں سے قرب وجوار کی اشیاء تک جھلسنے لگیں، جب اس طرح بادشاہ اور قوم کو کامل اطمینان ہوگیا کہ اب ابراہیمؑ کے اس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تب ایک گوپھن میں ابراہیمؑ کو بٹھا کر دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا۔

اس وقت آگ میں جلانے کی تاثیر بخشنے والے نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیمؑ پر اپنی سوزش کا اثر نہ کرے اور ناری عناصر کا مجموعہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے حق میں سلامتی کے ساتھ سرد پڑ جائے، آگ اُسی وقت حضرتِ ابراہیمؑ کے حق میں "بردوسلام" بن گئی اور دشمن ان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچا سکے۔ اور ابراہیم علیہ السلام دہکتی آگ سے سالم ومحفوظ دشمنوں کے نرغہ سے نکل گئے۔ ؎ "دشمن اگر قویست نگہباں قوی ترست"

اس مقام پر ایک مذہبی انسان کی طمانیتِ قلب اور سکونِ خاطر کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ آگ کے بردوسلام ہوجانے کو اس لئے صحیح اور مبنی برحقیقت سمجھے کہ اس نے اپنی عقل اور اپنے شعور سے اوّل اس امر کا امتحان کرلیا ہے کہ قرآنِ عزیز کی تعلیم وحیِ الٰہی کی تعلیم ہے اور اس کی لانے والی ہستی کی زندگی کا ہر پہلو پیغمبرانہ معصومیت کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ کہ وہ جن معجزانہ حقائق کی اطلاعات بہم پہنچاتا اور وحیِ الٰہی کے ذریعہ ہم کو سناتا ہے وہ عقل کے لئے اگرچہ حیران کن ہیں لیکن عقل کی نگاہ میں محال اور ناممکن نہیں اس لئے ایک مخبرِ صادق (کہ جس کی زندگی کی صداقت کا ہر پہلو سے امتحان کر کے اطمینان کرلیا گیا ہے) کی اس قسم کی خبریں بلاشبہ صحیح اور حق ہیں اور بقول قیصرِ رومِ ہرقلِ اعظم (ہرکلیوس) کہ جو شخص انسانوں کے ساتھ جھوٹ

نہیں بولتا اور ان سے دغا و فریب نہیں کرتا وہ ایک لمحہ کے لئے بھی خدا کی جانب کسی غلط بات کو منسوب نہیں کرسکتا اور کبھی اس پر جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کرسکتا" اور مذہبی زندگی میں صاف اور سیدھی راہ بھی یہی ہے کہ جس مذہب کی مکمل تعلیم کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر ہر طرح قابلِ اطمینان پالیا جائے اُس کے بتائے ہوئے چند ایسے امور پر جو عقل کے لئے صرف حیران کُن ہوں مگر اُس کے نزدیک محالِ ذاتی اور ناممکن کے مرادف نہ ہوں فلسفیانہ موشگافیوں کے بغیر ایمان لے آیا جائے اور صاحبِ وحی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس یقینی اور غیر مشکوک اطلاع کو آفتاب کی روشنی سے زیادہ روشن سمجھا جائے اور یقین رکھا جائے کہ تمام اشیاء میں خواص و تاثیرات پیدا کرنے والے خدا میں یہ بھی قدرت ہے کہ جب چاہے اُن کو دی ہوئی تاثیر اور خاصہ کو سلب کرلے اور جب چاہے دوسری کیفیت کے ساتھ بدل ڈالے لیکن مادیین کے لئے اگر یہ راہ باعثِ اطمینان نہ ہو اور فلسفہ کے شیدائی مذہب کے اس مسئلہ کو بھی فلسفیانہ موشگافیوں سے پاک نہ رہنے دینا چاہتے ہوں تو اُن کے لئے بھی اس معجزہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ آگ کا طبعی خاصہ جلا دینا ہے اور جو شے بھی اس میں پڑے گی جل جائے گی لیکن اس کی کیا وجہ کہ بعض وہ کپڑے اور وہ اشیاء جن کو "فائر پروف" کہا جاتا ہے، آگ کے شعلوں کے اندر کیوں محفوظ رہتی ہیں اور انکو آگ جلا کر کیوں خاکستر نہیں کردیتی۔

تم کہوگے کہ آگ بدستور جلانے کا خاصہ رکھتی ہے مگر کپڑے یا چیز پر ایک ایسا مسالہ لگا دیا گیا ہے جس پر آگ اپنا اثر نہیں کرسکتی یہ نہیں ہے کہ آگ نے جلانے کا خاصہ ترک کردیا ہے۔

تو ایک مذہبی انسان کے لئے اسی طرح آپ کے فلسفیانہ رنگ میں یہ جواب دینے کا کیوں حق نہیں ہے کہ نمرود اور اس کی قوم کی دہکتی آگ میں جلانے کا خاصہ بدستور اسی طرح باقی تھا جس طرح آگ کے عناصر میں موجود ہے، مگر وہ ابراہیمؑ کے جسم کے لئے بے اثر ثابت ہوا، فرق صرف اس قدر ہے کہ تمہارے "فائر پروف" میں انسانوں کی سوچی ہوئی تدابیر کا دخل ہے

اور اس لئے ہر سیکھنے والے کو ایک فن کی طرح سیکھ لینے کا موقع حاصل ہے اور ابراہیمؑ کے جسم کا آگ سے محفوظ ہو جانا بلا واسطہ خدائے برتر کی تدبیر کے زیر اثر تھا اور اس قسم کا عمل پیغمبر کی صداقت اور دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی برتری کے لئے کبھی کبھی بہ تقاضائے حکمت اس کی جانب سے سامنے آجاتا اور شریعت کی اصطلاح میں "معجزہ" شمار ہوتا ہے۔ بیشک وہ نہ فن ہوتا ہے اور نہ وسائل اسباب سے پیدا کردہ تدابیر کا محتاج، پس خدا کی مخلوق "انسان" کو اگر یہ قدرت حاصل ہے کہ کسی شے کے طبعی خاصہ کو بعض اشیاء پر مؤثر نہ ہونے دے تو اشیاء کے خواص کے خالق کو کیوں یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ کسی خاص موقع پر شے کی تاثیر کو عمل سے روک دے۔

اور اگر آج سائنس کی دریافت پر فضا میں ایسی گیسیں موجود ہیں جن کے بدن پر اثر کرنے سے آگ کی سوزش سے محفوظ رہا جا سکتا ہے تو گیسوں کے پیدا کرنے والے خالق کے لئے کون مانع ہے کہ نمرود کی دہکتی آگ میں ان کو ابراہیمؑ تک نہ پہنچا دے، اور اس طرح آگ کو بحق ابراہیم (علیہ السلام) بردو سلام نہ بنا دے۔

قرآنِ عزیز میں ابراہیم علیہ السلام کے اس پُر اعجاز واقعہ کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ۝ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ۝ (الانبیاء)	وہ سب کہنے لگے اس (ابراہیم) کو جلا ڈالو اور اپنے دیوتاؤں کی مدد کرو اگر تم کرنا چاہتے ہو، ہم نے حکم دیا، اے آگ! تو ابراہیم کے حق میں سرد اور سلامتی بن جا، اور انھوں نے ابراہیم کے ساتھ کا ارادہ کیا پس ہم نے انکو ان کے ارادہ میں ناکام بنا دیا۔
قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ۝ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ (الصافات ع)	انھوں نے کہا اس کے لئے ایک جگہ بناؤ اور اس کو دہکتی آگ میں ڈالو، پس انھوں نے اس کے ساتھ ارادہ بد کیا تو کر دیا ہم نے انکو (اس کے مقابلہ میں) پست و ذلیل اور کہا ابراہیمؑ نے میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار کے پاس قریب ہے وہ مجھے راہ یاب کریگا۔

حدیث بخاری | ابراہیم علیہ السلام کے واقعات میں قرآنِ عزیز نے اس موقعہ پر جبکہ ابراہیم (علیہ السلام)

اور قوم کے بعض افراد کے درمیان میلے کی شرکت کے لئے گفتگو ہو رہی تھی ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے " قَالَ اِنِّي سَقِيمٌ " (ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں بیمار ہوں) اور جب بتوں کی شکست و ریخت کے سلسلہ میں اُن سے دریافت کیا گیا تو ان کا جواب اس طرح منقول ہے

قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هٰذَا ابراہیم نے کہا بلکہ ان میں سے سب سے بڑے بت نے یہ کیا

فَسْئَلُوهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝ (انبیاء ع) ہے پس ان سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں ؟

ان دونوں جملوں کے متعلق ایک خالی الذہن انسان ایک لمحہ کے لئے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان میں جھوٹ کا بھی کوئی شائبہ ہو سکتا ہے ؟ " انی سقیم " میں علالتِ طبع کا ذکر ہے۔ جس کو ابراہیم علیہ السلام ہی خوب جان سکتے ہیں کہ وہ کیا بیمار ہیں " اس میں دوسرے کو خواہ مخواہ شک اور تردد کا کونسا موقع ہے، حتیٰ کہ اگر ایک شخص ظاہر بیں نگاہوں میں تندرست نظر آتا ہو تب بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ واقعی تندرست ہے، ہو سکتا ہے کہ اُس کا مزاج کسی وجہ سے حدِ اعتدال پر نہ ہو اور ایسی تکلیف میں مبتلا ہو جس کا اظہار کئے بغیر دوسرا اُسکو نہ سمجھ سکے۔ اسی طرح دوسری آیت کا معاملہ ہے اس لئے کہ دو مختلف الخیال انسانوں کے درمیان اگر مناظرہ اور تبادلۂ خیالات کی نوبت آجاتی ہے تو معمولی حرف شناس بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اپنے حریف کو اُس کی غلطی پر متنبہ کرنے اور لاجواب کر دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کے مسلمات میں سے کسی مسلّمہ عقیدہ کو صحیح فرض کر کے اس طرح اس کا استعمال کرے کہ اس کا ثمرہ اور نتیجہ حریف کے خلاف اور اپنے موافق ظاہر ہو۔

ابراہیم علیہ السلام نے یہی کیا، اُن کی قوم کا یہ عقیدہ تھا کہ اُن کے دیوتا سب کچھ سنتے اور ہماری مرادوں کو پورا کرتے ہیں، وہ اپنے پجاریوں اور معتقدوں سے خوش اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے سخت انتقام لیتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے جب ان دیوتاؤں کو توڑ پھوڑ ڈالا تو بڑے بُت کو چھوڑ دیا، آخر جب پوچھ گچھ کی نوبت آئی تو انھوں نے مناظرہ کا وہی بہترین اسلوب اختیار کیا جس کا تفصیلی ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے اور نتیجہ یہ

نکلا کہ کاہنوں، پجاریوں، اور ساری قوم کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ہم ہی غلطی پر ہیں اور تو خود حقیقت شناس ہے کہ ان میں گویائی کی طاقت نہیں ہے۔

لہٰذا ان دونوں جملوں میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس کو حقیقۃً یا صورۃً جھوٹ کہا جا سکے، یہ دو باتیں تو قرآنِ عزیز میں مذکور ہیں لیکن صحیح بخاری، صحیح مسلم اور بعض دوسری حدیث کی کتابوں میں مسطورہ بالا دونوں باتوں کے علاوہ ایک تیسری بات کا بھی ذکر ہے۔ یہ حدیث ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے:-

لم یکذب ابراھیم النبی علیہ السلام قط الا ثلث کذبات الخ[1]	نہیں جھوٹ بولا کبھی ہرگز ابراہیم نبی علیہ السلام نے مگر تین جھوٹ۔

اور پھر تفصیل کے ساتھ ان تینوں کو شمار کیا ہے، ان میں سے دو کا ذکر ابھی ہو چکا اور تیسری بات یہ مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا جب مصر سے گذر ہوا تو انھوں نے مصر پہنچنے سے پہلے اپنی زوجۂ مطہرہ حضرتِ سارہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرمایا کہ یہاں کا بادشاہ جابر و ظالم ہے، اگر کسی حسین عورت کو دیکھتا ہے تو اُس کو زبردستی چھین لیتا ہے اور اُس کے ساتھی مرد کو اگر وہ اس عورت کا شوہر ہے تو قتل کر ڈالتا ہے اور اگر کوئی دوسرا عزیز ہے تو اُس سے کوئی تعرض نہیں کرتا، تم چونکہ میری دینی بہن ہو اور اس سرزمین میں میرے اور تمہارے علاوہ دوسرا کوئی مسلمان نہیں ہے اس لئے تم اُس سے کہہ دینا کہ یہ میرا بھائی ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور جب شب میں اُس نے ارادۂ بد کیا تو اُس کا ہاتھ شل ہو کر رہ گیا اور وہ کسی طرح حضرتِ سارہ کو ہاتھ نہ لگا سکا، یہ دیکھ کر اُس نے سارہؑ سے کہا اپنے خدا سے دعا کر کہ میرا ہاتھ درست ہو جائے تو میں تجھ کو رہا کر دوں گا سارہ نے دعا کی مگر اُس نے پھر ارادۂ بد کیا، دوبارہ اُس کا ہاتھ شل ہو گیا، تیسری مرتبہ پھر یہی تمام قصہ پیش آیا تب اُس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ جن ہے انسان نہیں ہے اس کو میرے پاس سے جلد لیجاؤ اور ساتھ ہی ہاجرہؑ کو حوالہ کر کے کہا کہ اس کو بھی اپنے ساتھ لے جا میں نے تیرے حوالہ کیا۔ جب سارہؑ ہاجرہؑ کو ساتھ لے کر

[1] بخاری جلد ۲ ص ۳۰۱۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچیں تو انھوں نے حال دریافت کیا اور سارہؓ نے مُبارک باد دی اور کہا شکر ہے خدائے عزوجل کا کہ اس نے ہم کو اس فاسق و فاجر سے نجات دی اور آپ کے لئے ایک خادمہ اور ساتھ کر دی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ حدیث نقل کرکے فرمایا "اے شریف النسب اہلِ عرب یہ ہیں وہ ہاجرہ جو تم سب کی ماں ہیں"۔

یہ حدیث مختلف طریقوں سے کتبِ احادیث میں منقول ہے، اس کے علاوہ بخاری میں ایک اور طویل حدیث ہے جو حدیثِ شفاعت کے نام سے موسوم ہے اور متعدد ابوابِ بخاری مثلاً سورۂ بقرہ کی تفسیر کے باب میں کتاب الاستر قاق میں، اور کتاب التوحید میں مذکور ہے اس میں حضرتِ ابراہیم کا جو تذکرہ ہے اس کا حاصل یہ ہے :-

میدانِ حشر میں جب سب مخلوق آدم، نوح علیہما السلام اور دوسرے انبیاء سے شفاعت کے لئے کہہ چکی تو حضرتِ ابراہیم کے پاس پہنچی اور اُن سے کہا کہ آپ خلیل الرحمٰن ہیں آپ ہماری سفارش بارگاہِ الٰہی میں کیجئے کہ جلد فیصلہ ہو، تو انھوں نے فرمایا کہ مجھ کو شرم آتی ہے اس لئے کہ میں نے دنیا میں تین جھوٹ باتیں کہی تھیں، انی سقیم، بل فعلہ کبیرھم اور اپنی بیوی سے کہا تھا کہ انی اخوك۔

بخاری کے علاوہ یہ روایت مسلم، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، معجم طبرانی، مصنف ابن ابی شیبہ، ترمذی، اور مسند ابی عوانہ میں مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ یہ روایت کتبِ حدیث میں، اجمال و تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے روایت کی گئی ہے۔ بعض میں صرف اجمالی طور اسی قدر تذکرہ ہے کہ ہر نبی اس وقت اپنی لغزش کو بیان کرکے معذرت کریں گے کہ وہ شفاعت نہیں کر سکتے اور بعض میں ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں فقط "ثلث کذبات" ہی کا ذکر ہے اور بعض روایات میں اُن تینوں کی تفصیل ہے، اور ان ہی میں سے بعض روایات میں یہ تصریح بھی موجود ہے :-

ما منها کذبة رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:- ابراہیم علیہ السلام کے ان تینوں

الا ما حل بها عن دین الله — جھوٹ میں سے ہر ایک صرف اللہ تعالیٰ کے دین کی مدافعت و حمایت ہی کے لئے بولا گیا ہے۔

بہر حال یہ دونوں روایات صحیحین (بخاری و مسلم) کی روایات ہیں جو ہر قسم کے سُقمِ روایت سے پاک اور صاف ہیں، یہ روایات ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر اور مجدد انبیاء کی جانب "کذب" کی نسبت کر رہی ہیں اگرچہ انھی روایات کے بعض طرقِ روایت نے یہ صاف کر دیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر کذب سے مراد وہ عام معنی نہیں لئے جو اخلاقی بول چال میں نہایت شنیع اور گناہِ کبیرہ میں شمار ہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ واضح کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ تینوں باتیں نہ ذاتی غرض کے لئے کہی ہیں اور نہ دنیوی مصلحت کے پیشِ نظر بلکہ معاندینِ حق کے مقابلہ میں خالص اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت میں کہی ہیں اس کے باوجود جو بات دل میں کھٹکتی اور قلب پر ایک بھاری بوجھ محسوس ہوتی ہے وہ حدیث کی یہ تعبیر ہے۔

یہ تسلیم کہ روایت کی بعض تصریحات نے اس کو "کذب" کے عام معنی سے جدا کر دیا تاہم اول تو یہ زیادت "صحیحین میں مذکور نہیں اگرچہ صحیح روایت میں موجود ہے، دوسرے جبکہ "صدقِ لسانی" انبیاء علیہم السلام کی غیر منفک اور عصمتِ نبی کے لئے ایک ضروری صفت ہے نیز جبکہ خصوصیت کے ساتھ قرآنِ عزیز نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق حسب ذیل امتیازات کا صراحت کے ساتھ ذکر فرما دیا ہے تو پھر اُن کے ساتھ صورۃً بھی کذب کی نسبت کیسی؟

(۱) وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (مریم) — اور یاد کر کتاب میں ابراہیم کا ذکر بے شک تھا وہ صدیق (صادق النفس) نبی۔

"صدیق" مبالغہ کا صیغہ ہے اور اسی ہستی پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے "صدق" جس کی ذاتی اور نفسیاتی صفت ہو۔

(۲) اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ کَانَ اُمَّةً قَانِتًا ـ بیشک ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار خالص اللہ
لِّلّٰهِ حَنِیْفًا وَّلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ـ کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ مشرکوں میں سے،
شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اِجْتَبٰهُ وَهَدٰىهُ ـ خدا کی نعمتوں کا شکر گذار تھا خدا نے اس کو چن لیا تھا،
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (النحل) ـ اور سیدھی راہ کی اس کو ہدایت دی۔

مجتبیٰ اور مہدی ایسی صفات ہیں کہ جن کے ساتھ کذب نہ حقیقۃً جمع ہو سکتا ہے اور نہ صورۃً۔

(۳) ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پھر ہم نے تیری طرف وحی بھیجی کہ تو ملت
مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (النحل) ابراہیم کی پیروی کر جو ابراہیم کہ خالص خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔

یہ وہ ابراہیم ہیں جن کی ملت کی اقتدا اور پیروی کا حکم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اُمتِ مرحومہ کو دیا جا رہا ہے۔

(۴) وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ ـ اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو رشد و ہدایت شروع ہی سے
مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ (الانبیاء) ـ بخش دی تھی اور ہم ہی اُس کو جاننے والے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی آیات حضرتِ ابراہیم کی اُن خصوصی صفات کا ذکر کرتی اور نصوصِ قطعیہ پیش کرتی ہیں کہ جن کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی اس جیسی مقدس اور جلیل القدر ہستی کے متعلق "کذب" کا تصور نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ وقوع اور عمل "خواہ وہ کذب حقیقی معنیٰ میں ہو یا محض کذب کی صورت میں"۔

زیرِ بحث مسئلہ | اس مقام پر پہنچ کر ایک مرتبہ پھر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مسئلہ زیرِ بحث یہ نہیں ہے کہ "العیاذ باللہ" ابراہیمؑ نے واقعی جھوٹ بولا۔ کیونکہ قرآنِ عزیز کی قطعی نصوص اور زیرِ بحث روایات کے علاوہ احادیثی نصوص ابراہیم علیہ السلام کو نبی، پیغمبر اور رسول بتاتی اور اُن کی امتیازی صفات صدیق، مجتبیٰ، مہدی، نبی، حنیف اور رسول ثابت کرتی ہیں، نیز زیرِ بحث روایت میں بھی یہ واضح ہے کہ ان کے یہ کلمات خدا کے دین کی حمایت و مدافعت کے لئے تھے نہ کہ کسی دنیوی غرض و مصلحت سے۔ لہٰذا ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں تردد کی

گنجائش نہیں ہے کہ "کذب" اُن سے اسی طرح دُور ہے جس طرح دن سے رات اور روشنی سے تاریکی، اور بلاشبہ وہ ایک نبی معصوم ہیں اور ہر قسم کی معصیت و گناہ سے پاک۔

البتہ زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ ان دو صحیح روایات میں ان تینوں باتوں کے متعلق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جلیل القدر پیغمبر کے بارہ میں "کذب" کی تعبیر کیوں فرمائی جبکہ آپ کی ذاتِ اقدس ضروریاتِ دین اور عقائدِ اسلامی کے بارہ میں ابہام اور گنجلک کو دُور کرنے کا باعث ہے نہ کہ ابہام والتباس پیدا کرنے کا؟ خصوصاً جبکہ یہ تینوں باتیں خود اپنی جگہ کسی حال میں نہ صورت میں کذب ہیں اور نہ حقیقی معنی میں۔

بلاشبہ حضرتِ سارہ حضرتِ ابراہیم کی دینی بہن تھیں اور بیوی کے رشتہ سے اسلامی اخوت کا رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا، نیز ابنِ کثیر اور دوسرے مؤرخین کی تحقیق میں وہ اُن کے چچا حاران کی بیٹی تھیں، اس لئے چچازاد بہن بھی تھیں، اور بلاشبہ ان کا مزاج ناساز تھا گو سخت بیماری نہ سہی اس لئے "انی سقیم" ہر حیثیت سے صحیح ہے اور بلاشبہ انھوں نے مناظرانہ طرزِ خطابت میں دشمن کو لاجواب کرنے کے لئے فرمایا "بل فعلہ کبیرھم" اور یہ علمی دنیا میں کسی حیثیت سے بھی جھوٹ نہیں تھا، تو پھر ان ہر دو احادیث میں اس طرح کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی؟

اِس اشکال کے جواب میں علماءِ اسلام نے دو راہیں اختیار فرمائی ہیں۔

(۱) یہ اخبارِ آحاد ہیں اس لئے جرأت کے ساتھ یہ کہہ دینا چاہئے کہ اگرچہ یہ روایتیں صحیحین کی ہیں اور اس لئے مشہور کی حد تک پہنچ گئی ہیں مگر راوی کو ان روایات میں سخت مغالطہ ہوا ہے لہٰذا ہرگز قابلِ قبول نہیں ہیں اس لئے کہ ایک نبی کی جانب کذب کی نسبت کے مقابلہ میں راویوں کی غلطی کا اعتراف بدرجہا بہتر اور صحیح طریق کار ہے۔

امام رازی (رحمہ اللہ) کا رجحان اسی جانب ہے اور انھوں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

(۲) یہ قطعی اور یقینی عقیدہ ہے کہ نبی اور رسول کی جانب "کذب" کی نسبت کسی حال

میں درست نہیں ہے ایسی صورت میں اگر مستند اور صحیح روایات میں جو کہ حدِ شہرت و تواتر کو پہنچ چکی ہوں اس قسم کی کوئی نسبت موجود ہو جو نبی کی نبوت کے شان کے منافی ہو تو اُن روایات کو صحیح مانتے ہوئے ان خصوصی جملوں کی ایسی توجیہ کرنی چاہیے جس سے اصل مسئلہ پر بھی زد نہ پڑے اور صحیح روایات کا انکار بھی لازم نہ آئے پس چونکہ صحیحین کی یہ روایات "تلقی بالقبول" کی وجہ سے صحت اور شہرت کے اُس درجہ اور مرتبہ کو پہنچ چکی ہیں جو اخبار آحاد میں شمار نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ان روایات کو مردود قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ "ثلث کذبات" کے جملہ کی یہ توجیہ کرنی چاہیے کہ اس مقام پر "کذب" سے مراد یہ ہے کہ "ایسا کلام جو صحیح اور پاک مقصد کے لئے بولا گیا ہو لیکن مخاطب اُس کا وہ مطلب نہ سمجھے جو متکلم کی مراد ہے بلکہ ان الفاظ کو اپنی ذہنی مراد کے مطابق سمجھے" اور یہ معنی صرف ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے لئے ہی نہیں تراشے گئے بلکہ علم بدیع کی اصطلاح میں اس کو "معاریض" کی اقسام میں شمار کیا گیا ہے اور فصحاء و بلغاء کے کلام میں اکثر رائج ہے۔

اس طرح روایات کا انکار بھی لازم نہیں آئے گا اور صداقتِ نبی کا مسئلہ بھی اپنی جگہ بغیر کسی غل وغش کے صحیح رہے گا، چنانچہ حدیث شفاعت کے وہ الفاظ ما منها كذبة الا ماحل بها عن دين الله " ہماری اس توجیہ کی تائید کرتے ہیں جمہور علماء اسلام کی یہی رائے ہے اور وہ امام رازی اور ان کے ہمنوا علماء کی پہلی رائے کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔

مشہور مصری عالم عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں امام رازیؒ کی رائے کے ساتھ موافقت کی ہے اور مصری علماءِ عصر کی رائے کے خلاف (جو دراصل جمہور کی تائید میں نجار کی رائے پر تنقید کی شکل میں ظاہر کی گئی ہے) کافی شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے جس میں حضرتِ ابراہیمؑ و سارہ کے اس واقعہ سے انکار کیا ہے۔

مؤلف کی رائے | مگر ان ہر دو آراء سے الگ سادہ اور صاف راہ یہ ہے کہ صحیح حدیث کے انکار اور اس کے الفاظ کی رکیک تاویل کئے بغیر ہی مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا جائے کہ اصل

مسئلہ عصمتِ پیغمبرؐ پر بھی حرف نہ آنے پائے اور اس قسم کے مواقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں، اور احادیثِ نبوی کے ساتھ تمسخر اور مذاق کرنیوالوں کو بھی الحاد کی جرأت نہ ہو سکے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "عصمتِ پیغمبرؐ" کا مسئلہ بلاشبہ اصولِ دین اور مہماتِ عقائد میں سے ہے بلکہ دین و مذہب کی صداقت کی اساس و بنیاد صرف اسی ایک مسئلہ پر قائم ہے کیونکہ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ بعض حالات میں نبی اور پیغمبر بھی "کذب" کی کوئی نہ کوئی شکل و صورت اختیار کر سکتا ہے خواہ وہ حمایتِ حق ہی کے لئے کیوں نہ ہو اس کی لائی ہوئی تمام تعلیم سے یہ امتیاز اُٹھ جائے گا کہ اس میں سے کون سا جزء اپنی حقیقی مراد کے ساتھ وابستہ ہے اور کون سا "کذب" کے رنگ میں رنگا ہوا، اور اگر یہ مان لیا جائے تو پھر دین' دین نہیں رہ سکتا اور نہ مذہب، مذہب۔

اس لئے قرآنِ عزیز کا یہ منصوص عقیدہ "عصمتِ پیغمبرؐ" اپنی جگہ غیر متزلزل اور غیر متبدل عقیدہ ہے اور اس لئے بلاشبہ جو اس عقیدہ کی صداقت پر حرف گیری کا باعث ہے وہ خود اپنی جگہ یا قابلِ رد و انکار ہے اور یا اپنی صحتِ تعبیر کے لئے جوابدہ، پس اس محکم عقیدہ کو اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی بلکہ اُس سے معارض شے کو یا اُس کے مطابق ہونا پڑے گا ورنہ ٹوٹ جانا ہوگا۔

اسی طرح یہ امر بھی مُسلّم ہے کہ قرآنِ عزیز کی تفسیر و تشریح صرف لغتِ عرب سے ہی نہیں کی جا سکتی بلکہ جس طرح اُس کے مفہوم سمجھنے کے لئے "لغت" کی معرفت ضروری ہے اسی طرح بلکہ اُس سے کہیں زیادہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، اعمال اور احوال کی معرفت کی ضرورت ہے جو کلام اللہ کی صحیح توجیہ، تفسیر اور تشریح کے حامل ہیں۔

بلاشبہ یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ قرآنی احکام مثلاً "اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ" "اٰتُوا الزَّكٰوةَ" "اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ" "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" میں نماز، زکوٰۃ، حج اور روزہ کے مفہوم اور معنی کو ہم کسی طرح بھی لغتِ عربی کے ذریعہ متعین نہیں کر سکتے اور تنہا یہ لغوی معنی و مفہوم قرآنی احکام کا مصداق

نہیں بن سکتے بلکہ ان کی معرفت کے لئے ہم مجبور ہیں کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال و اعمال کی طرف رجوع کریں جو ان فرائض کی تفسیر و تشریح میں کہے گئے یا کئے گئے ہیں، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ صرف تعامل کے ذریعہ ہم ان فرائض کی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں اس لئے کہ اگر دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تعامل کا مبدأ بھی آخرکار قول و عمل رسول پر ہی جاکر منتہی ہوتا ہے، لہٰذا پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول و عمل کو بھی جزوِ دین سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے اور بغیر اس تسلیم و رضا کے آیت۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ — بلاشبہ خدا کے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس شخص کیلئے

لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ — عمدہ نمونہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر امید لگاتا ہو،

کے کوئی معنی نہیں بنتے، کیونکہ یہ "اسوۂ حسنہ" خود قرآنِ عزیز اور اُس کی آیات نہیں ہیں بلکہ اُس پیغمبر کا قول، عمل اور حال ہی اسوۂ حسنہ ہے اور جبکہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اقوال، اعمال اور احوال جزوِ دین ہیں تو ضروری تھا کہ ان کی حفاظت کا ایسا سامان مہیّا ہو جو خاتم النبیین کی اُمت کے لئے رہتی دنیا تک محفوظ طریقے سے پہنچ سکے اور اس جوہرِ خالص میں جب کبھی کھوٹ کی ملاوٹ کی جائے تو اُس کے محافظین اور فن کے ماہرین فوراً دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرکے کھرے کھوٹے کو الگ کر سکیں، پس اسی طریقۂ حفاظت کا نام "روایتِ حدیث اور نقد حدیث ہے" اور اسی فن کو "فنِ حدیث" کہتے ہیں، اور یہی وہ شریف اور مقدس خدمت ہے جس نے اپنوں سے نہیں بلکہ غیروں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا ہے اور اس خدمت کو اسلام کا امتیازی نشان تسلیم کرایا ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال و اعمال کی روایت کی حفاظت کے سلسلہ میں کھرے اور کھوٹے کے امتیاز کے لئے زمانۂ نبوت سے اب تک جو خدمت ہوتی آرہی ہے اُس کی اہمیت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ "روایتِ حدیث" کا فن تقریباً چودہ فنون اور شاخوں میں منقسم ہے، لہٰذا از بس ضروری ہے کہ ہم کسی ایک ایسی روایت یا روایت کے جملہ کو جو اپنی لفظی اور

ظاہری تعبیر میں مسلّمہ عقیدہ کے بارہ میں ایہام پیدا کرتا ہو صحیح اور مقبول، مشہور اور متواتر روایاتِ حدیثی کے انکار پر حجت و دلیل قائم نہ کرلیں اور اس کو انکارِ حدیث کا ذریعہ بنا کر قرآن عزیز کو ایک ایسی اجنبی کتاب نہ بنا دیں جس کی تعبیر کے لئے نہ کسی پیغمبر کے تفسیری اقوال ہیں اور نہ تشریحی اعمال بلکہ وہ کسی ویرانہ یا پہاڑ پر نازل ہوئی ہے اور صرف اپنی زبان کی لغت اور ڈکشنری سے حل کی جا سکتی ہے۔ البتہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ تمام احادیثِ رسول روایت باللفظ نہیں ہیں بلکہ بعض روایاتِ بالمعنی ہیں یعنی یہ نہیں ہے کہ رسولِ پاکؐ نے جو بھی الفاظ زبانِ مبارک سے فرمائے ہوں راوی نے ایک ایک لفظ اُسی طرح نقل کر دیا ہو، بلکہ معنی اور مفہوم کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اُس روایت کے الفاظ راوی کی اپنی تفسیر ہوتے ہیں،

پس ان اہم اور بنیادی اصولوں کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اب مسئلہ زیر بحث کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ بخاری کی احادیث کو بلاشبہ "تلقی بالقبول" حاصل ہے اور یہ بھی تسلیم کہ یہ کتاب جرح و نقد پر کسے جانے اور پرکھے جانے کے بعد اُمت میں شہرت و قبولیت کا وہ درجہ رکھتی ہے کہ کتاب اللہ کے بعد اس کو اصح الکتب کہا جاتا ہے، تاہم یہ ممکن ہے کہ روایت بالمعنی ہونے کی وجہ سے اس کی کسی روایت میں راوی سے لفظی تعبیر میں سقم پیدا ہو گیا ہو اور روایت اگرچہ اپنے سلسلۂ سند اور مجموعۂ متن کے اعتبار سے اصولاً قابلِ تسلیم ہو مگر اس جملہ کی تعبیر کو سقیم سمجھا جائے اور اصل روایت کو رد کرنے کی بجائے صرف اُس کے سقم کو ظاہر کر دیا جائے چنانچہ اس کی بہترین مثالیں بخاری کی حدیثِ معراج ہے۔

محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلم کی حدیث اَسریٰ عن انس (رضی اللہ عنہ) کے مقابلہ میں بخاری کی حدیث عن عبداللہ بن ابی نمرہ میں سقم ہے اور اُس کی ترتیب میں غلطیاں ہیں اور مسلم کی روایت ان اسقام و اغلاط سے پاک صاف ہے، حالانکہ یہ دونوں روایتیں روایت و درایت کے اعتبار سے صحیح اور قابلِ تسلیم ہیں۔

تب بغیر کسی شک اور تردد کے یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ حضرت ابراہیمؑ سے متعلق یہ دونوں

طویل روایات "روایت بالمعنیٰ" کی قسم میں داخل ہیں، اور یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ الفاظ اور جملوں کی یہ پوری نشست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حق ترجمان کے نکلے ہوئے الفاظ اور جملوں کی نشست ہے بلکہ آپ کے مفہوم اور معنیٰ کو ادا کرتی ہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ہر دو روایات میں بیان کردہ واقعات کی صحت کے باوجود زیرِ بحث الفاظ سلسلۂ سند کے کسی راوی کے اختلالِ لفظی کا نتیجہ ہوں اور اُس سے یہ تعبیری سقم پیدا ہو گیا ہو۔

خصوصاً جبکہ اس کے لئے یہ قرینہ بھی موجود ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ و سارہؑ اور شاہِ مصر کا یہ واقعہ توراۃ میں بھی مذکور ہے اور وہاں اس قسم کے غیر محتاط جملے بکثرت موجود ہیں لہٰذا یہ ممکن ہے کہ راوی سے اِس اسرائیلی روایت اور صحیح روایت کے درمیان تعبیر میں خلط ہو گیا ہو اور اس لئے اُس نے معاملہ کی تعبیر زیرِ بحث الفاظ سے کر دی ہو۔

ہدایتِ قوم کے لئے حضرتِ ابراہیمؑ کا اضطراب

گذشتہ سطور سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) اپنی قوم کی ہدایت کے لئے کس درجہ مضطرب اور بے چین تھے اور دلائل و براہین کی وہ کون سی صورت ہو سکتی ہے جو انھوں نے حق کے آشکارا کرنے میں صرف نہ کر دی ہو؟ سب سے پہلے اپنے باپ آزر کو سمجھایا پھر جمہور کے سامنے حق کی روشنی کو پیش کیا، اور آخر میں نمرود سے مناظرہ کر کے اُس کے سامنے بھی احقاقِ حق کو بہتر سے بہتر اسلوب کے ساتھ ادا کیا اور ہر لمحہ یہی سب کو تلقین کی کہ خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش جائز نہیں اور اصنام پرستی اور کواکب پرستی کا نتیجہ خسران اور ذلت کے سوائے دوسرا نہیں ہے اس لئے شرک سے باز آنا چاہیے اور ملتِ حنیفیہ ہی کو صراطِ مستقیم سمجھنا چاہیے جس کی اساس و بنیاد صرف "توحیدِ الٰہی" پر قائم ہے۔

مگر بدبخت قوم نے کچھ نہ سنا، اور کسی طرح رشد و ہدایت کو قبول نہ کیا اور ابراہیم (علیہ السلام) کی بیوی حضرتِ سارہ (رضی اللہ عنہا) اور ان کے برادر زادہ حضرتِ لوط (علیہ السلام) کے علاوہ کوئی ایک بھی ایمان نہیں لایا۔ اور تمام قوم نے حضرتِ ابراہیمؑ کو جلا دینے کا فیصلہ کر لیا

اور دہکتی آگ میں ڈال دیا۔

اور جب خدائے تعالیٰ نے دشمنوں کے ارادوں کو ذلیل و رسوا کر کے حضرت ابراہیمؑ کے حق میں آگ کو "بردو سلام" بنا دیا تو اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ کسی دوسری جگہ جاکر پیغامِ الٰہی سنائیں اور دعوتِ حق پہنچائیں اور یہ سوچ کر "فدانِ آرام"[1] سے ہجرت کا ارادہ کر لیا۔

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی	اور ابراہیم نے کہا "میں جانے والا ہوں اپنے
رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝	پروردگار کی طرف قریب ہی وہ میری رہنمائی کریگا"

یعنی اب مجھے کسی ایسی آبادی میں ہجرت کر کے چلا جانا چاہئے جہاں خدا کی آواز گوشِ حق نیوش سے سُنی جائے، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے یہ نہیں اور سہی میرا کام پہنچانا ہے، خدا اپنے دین کی اشاعت کا سامان خود پیدا کر دے گا۔

اور کلدانیین کی جانب ہجرت بہر حال حضرت ابراہیمؑ اپنے والد آزر اور قوم سے جُدا ہو کر فرات کے غربی کنارہ کے قریب ایک بستی میں چلے گئے جو اور کلدانیین کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا، اور حضرتِ لوط (علیہ السلام) اور حضرت سارہ (رضی اللہ عنہا) ہم سفر ہیں اور کچھ دنوں کے بعد یہاں سے حرّان یا حاران کی جانب روانہ ہو گئے اور وہاں "دینِ حنیف" کی تبلیغ شروع کر دی مگر اس عرصہ میں برابر اپنے والد آزر کے لئے بارگاہِ الٰہی میں استغفار کرتے، اور اُس کی ہدایت کے لئے دعا مانگتے رہے اور یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ وہ نہایت رقیق القلب رحیم اور بہت ہی نرم دل و بُردبار تھے اس لئے آزر کی جانب سے ہر قسم کی عداوت کے مظاہرں کے باوجود انھوں نے آزر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگرچہ میں تجھ سے جُدا ہو رہا ہوں اور افسوس کہ تو نے خدا کی رشد و ہدایت پر توجہ نہ کی تاہم میں برابر تیرے حق میں خدا سے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا آخر کار حضرتِ ابراہیمؑ کو وحی الٰہی نے مطلع کیا کہ آزر ایمان لانیوالا نہیں ہے اور یہ اُنہی اشخاص میں سے ہے جنھوں نے اپنی نیک استعداد کو فنا کر کے خود کو اس کا مصداق بنا لیا

[1] بابل کی حکومت مذکورہ میں ایک مشہور شہر تھا، یہ حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کا مولد ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرہ)
اللہ نے مہر لگادی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کو جب یہ معلوم ہوگیا تو آپ نے آزر سے اپنی براءت کا صاف صاف اعلان کردیا کہ جو امید موہوم میں نے لگا رکھی تھی وہ اب ختم ہوگئی اس لئے اب استغفار کا سلسلہ بے محل ہے، قرآنِ عزیز، سورۂ توبہ میں اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ○ (توبہ)
اور نہ تھا ابراہیم کا استغفار اپنے باپ کے لئے مگر اس وعدہ کے مطابق جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا، پھر جب اس پر یہ ظاہر ہوگیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے (یعنی اس کا آخری انجام یہی ہوگا) تو اس سے بیزاری کا اظہار کردیا، بے شک ابراہیمؑ بے حد رقیق القلب بردبار،

ہجرتِ فلسطین ابراہیم (علیہ السلام) اس طرح تبلیغ کرتے کرتے فلسطین پہنچے، اس سفر میں بھی ان کے ہمراہ حضرتِ ' . حضرتِ لوطؑ اور لوط علیہ السلام کی بیوی تھیں سورۂ عنکبوت میں ہے۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (عنکبوت)
پس لوط، ابراہیمؑ پر ایمان لے آیا اور کہنے لگا میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنیوالا ہوں بیشک وہ غالب ہے حکمت والا ہے

روایات میں آتا ہے کہ جب حضرتِ عثمان ذی النورین (رضی اللہ عنہ) اپنی زوجۂ مطہرہ حضرتِ رقیہ بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئے تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان عثمان اول مهاجر باهله بعد لوط (الحدیث)
بلاشبہ لوط علیہ السلام کے بعد عثمان پہلے مہاجر ہیں جنھوں نے اپنی بیوی سمیت ہجرت کی۔

حضرتِ ابراہیمؑ نے فلسطین کے غربی اطراف میں سکونت اختیار کی، اس زمانہ میں یہ علاقہ کنعانیوں کے زیرِ اقتدار تھا۔ پھر قریب ہی شکیم (نابلس) میں چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کیا،

اس کے بعد یہاں بھی زیادہ مدت قیام نہیں فرمایا اور غرب ہی کی جانب بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ مصر تک جا پہنچے۔

ہجرتِ مصر اور حضرتِ ہاجرہؓ

جب نابلس سے چل کر مصر پہنچے تو بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق مَلِک جبار کا وہ واقعہ پیش آیا جو گذشتہ سطور میں سپردِ قلم ہو چکا ہے اور توراۃ میں اس قصہ کو اس طرح نقل کیا گیا ہے:-

سو جب ابرام مصر پہنچا مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے اور فرعون کے امیروں نے بھی اُسے دیکھا اور فرعون کے حضور میں اُس کی تعریف کی اور اُس عورت کو فرعون کے گھر میں لے گئے اور اس نے اس کے سبب ابرام پر احسان کیا کہ اس کو بھیڑ بکری اور گائے بیل اور گدھے اور غلام اور لونڈیاں اور گدھیاں اور اونٹ ملے، پھر خداوند نے فرعون، اور اس کے خاندان کو ابرام کی جورو سری کے سبب بڑی مار ماری، تب فرعون نے ابرام کو بلا کر اس سے کہا کہ تو نے مجھ سے یہ کیا کیا؟ کیوں نہ جتایا کہ یہ میری جورو ہے، تو نے کیوں کہا کہ وہ میری بہن ہے؟ یہاں تک کہ میں نے اسے اپنی جورو بنانے کو لیا، دیکھ یہ تیری جورو حاضر ہے اس کو لے اور چلا جا، اور فرعون نے اس کے حق میں لوگوں کو حکم کیا تب انھوں نے اُسے اور اس کی جورو کو اور جو کچھ اُس کا تھا روانہ کیا۔[1]

صحیحین (بخاری و مسلم) کی روایت اور توراۃ کی اس روایت کے درمیان یہ اختلاف ہے، کہ صحیحین کی روایت میں حضرتِ سارہؓ کے بددعا والے واقعہ میں "مَلِک جبار" "فرعون" نے شیطان (جنّ) اثر سمجھ کر سارہ سے جان چھڑائی اور حضرتِ ہاجرہؓ کو ان کے حوالہ کر کے ابراہیمؑ کو مع ان کے رفقاء اور ساز و سامان کے مصر سے چلے جانے کی اجازت دی، فتح الباری میں ہے کہ مصری "جن" کی عظمت کے قائل تھے، اس لئے شیطان سے مراد یہاں جن ہے۔

اور توراۃ کی روایت یہ کہتی ہے کہ فرعونِ مصر نے سارہ کے واقعہ کو کرامت سمجھا اور حضرتِ ابراہیمؑ پر یہ عتاب کیا کہ انھوں نے شروع ہی سے یہ کیوں نہ بتا دیا کہ سارہ اُن کی بہن نہیں ہے

[1] پیدائش باب ۱۲ آیت ۱۴ - ۲۰ توراۃ۔

بلکہ بیوی ہے اور پھر بڑے انعام واکرام اور عزت کے ساتھ ان کو مصر سے رخصت کیا۔
توراۃ کی روایت کے مطابق اس وقت حضرتِ سارہ کی عمر ستر سال کی تھی۔
بہرحال صحیحین کی روایت ہو یا توراۃ کی، معنی اور مفہوم کے اعتبار سے دونوں روایات قریب قریب ہیں اور دونوں کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔

البتہ ان تمام روایات سے اس قدر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ اپنی بیوی سارہؓ اور اپنے برادر زادہ حضرتِ لوطؑ کے ساتھ مصر تشریف لے گئے اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مصر کی حکومت ایسے خاندان کے ہاتھ میں ہے جو سامی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ سے نسبی سلسلہ میں وابستہ تھا، یہاں پہنچکر ابراہیم علیہ السلام اور فرعونِ مصر کے درمیان ضرور کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس سے اس کو یقین ہو گیا کہ ابراہیمؑ اور اس کا خاندان خدا کا مقبول اور برگزیدہ خاندان ہے، یہ دیکھ کر اُس نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اور اُنکی بیوی حضرتِ سارہؓ کا بہت اعزاز کیا اور ان کو ہر قسم کے مال ومنال سے نوازا، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قدیم خاندانی رشتہ کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لئے اپنی بیٹی ہاجرہ کو بھی ان کی زوجیت میں دیدیا، جو اُس زمانہ کے رسم ورواج کے اعتبار سے پہلی اور بڑی بی بی کی خدمت گذار قرار پائیں، چنانچہ اس تاریخی قیاس کی سب سے بڑی شہادت خود یہود کے یہاں بھی موجود ہے۔

سِفر الیشار میں (جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے) مذکور ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ حضرت کا ہم وطن تھا۔[1]

اور اسی طرح یہود کی معتبر روایات سے یہ مسئلہ بھی صاف اور روشن ہو جاتا ہے کہ حضرتِ ہاجرہ "شاہِ مصر" فرعون کی بیٹی تھیں، لونڈی اور باندی نہیں تھیں، توراۃ کا ایک معتبر مفسر ربّی شلومواسحٰق کتاب پیدایش باب ۱۶ آیت ۱ کی تفسیر میں لکھتا ہے اَبَتْ بَرَعُہ ھَایِثا کِیشْرَ انسیم شِنِعشُوا سَارَہ اَمَرْ مُوتَاب شِتِّہا بَتی شِفْحَہ بَبَیْتَ زِہ وَلُوکِبِیرَہ بِبَیْتِ اَحِیْرِ جب اس نے (رقیوں شاہِ مصرنے)

[1] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۱۔

سارہ کی وجہ سے کرامات کو دیکھا تو کہا: میری بیٹی کا اس کے گھر میں لونڈی ہو کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے۔[1]

اِس تفسیر اور توراۃ کی آیت کو جمع کرنے سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہوجاتی ہے کہ توراۃ میں ہاجرہ کو صرف اسی لئے لونڈی کہا گیا کہ شاہِ مصر نے ان کو سارہ اور ابراہیمؑ کے سپرد کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ سارہ کی خدمت گذار رہے گی، یہ مطلب[2] نہ تھا کہ وہ لونڈی بمعنی "جاریہ" ہیں اس لئے کہ ربی شلومو تصریح کرتا ہے کہ ہاجرہ فرعونِ مصر کی بیٹی تھیں۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مَلِکِ جبار کی جو روایت مذکور ہے اُس میں بھی یہ جملہ موجود ہے اور ربی شلومو کی تفسیر کی تائید کرتا ہے۔

وَاَخْدَمَهَا هَاجَرَ[3] اور ہاجرہ کو سارہ کے حوالہ کر دیا کہ ان کی خدمت گذار رہے

اِس لئے بنی اسرائیل کا یہ طعن کہ بنی اسمٰعیل ہم سے اس لئے کمتر ہیں کہ وہ لونڈی سے ہیں اور ہم حضرتِ ابراہیمؑ کی بیوی سارہ سے صحیح نہیں ہے اور واقعہ اور تاریخ دونوں کے خلاف ہے اور جس طرح توراۃ کے دوسرے مضامین میں تحریف کی گئی ہے اسی طرح اس واقعہ میں بھی تحریف کی گئی ہے، اور واقعہ کی تمام تفصیلات کو حذف کر کے صرف "لونڈی" کا لفظ باقی رہنے دیا گیا ہے۔

ہاجرہ اصل میں عبرانی لفظ "ہاغار" ہے جس کے معنی بیگانہ اور اجنبی کے ہیں[4]، ان کا وطن چونکہ مصر تھا اس لئے یہ نام پڑ گیا لیکن اسی اصول کے پیشِ نظر زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ "ہاغار" کے معنی "جدا ہونے والے" کے ہیں اور عربی میں "ہاجر" کے معنی بھی یہی ہیں یہ چونکہ اپنے وطن مصر سے جدا ہو کر یا ہجرت کر کے حضرتِ ابراہیمؑ کی شریکِ حیات اور حضرتِ سارہ کی خدمت گذار بنیں اس لئے ہاجرہ کہلائیں۔

حضرتِ ابراہیمؑ اور دو اہم مقام | حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کے زیرِ عنوان بحث ختم کرنے سے

---

[1] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۱ [2] براہین باہرہ فی حریۃ ہاجرہ از مولانا غلام رسول چڑیا کوٹی۔
[3] بخاری، باب الانبیاء جلد ۶ ص ۳۰۱ [4] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۰۔

قبل دو ایسے اہم مقامات کا ذکر کر دینا ازبس ضروری ہے جن کے ساتھ حضرتِ ابراھیم (علیہ السلام) کا بہت گہرا تعلق ہے اور جو پیروانِ ملتِ ابراہیمی کے لئے "مقامِ بصیرت" کی حیثیت رکھتے اور مجددِ انبیاء حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کی پیغمبرانہ عظمت و جلال کو تابندہ تر بناتے ہیں۔

مقامِ اول | سورۂ ممتحنہ میں حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کی ایک خاص دعاء کا تذکرہ ہو رہا ہے، وہ بارگاہِ الٰہی میں دستِ طلب دراز کئے عجز و نیاز کے ساتھ یہ عرض کر رہے ہیں،

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً — اے ہمارے پروردگار! ہم کو ان لوگوں
لِّلَّذِينَ كَفَرُوا — کے لئے "فتنہ" نہ بنا جو کافر ہیں۔

فتنہ "فَتَنَ" سے ماخوذ ہے، جب سونے کو اس لئے آگ میں تپاتے ہیں کہ کھوٹ اور میل جل کر خالص سونا باقی رہ جائے تو اس کے لئے "فتن الذہب" بولتے ہیں، اب اصطلاح میں امتحان اور آزمائش اور پرکھ کو کہتے ہیں اور اس لئے حضرتِ انسان پر جو شدائد و مصائب آتے ہیں وہ اس مناسبت سے "فتنہ" کہلاتے ہیں، قرآنِ حکیم نے بھی مال، اولاد اور منصب و جاہ کو اسی معنی کے پیشِ نظر "فتنہ" کہا ہے اور صاف صاف اعلان کیا ہے کہ صادق و کاذب کی جانچ کے لئے "مومن" کو اس کسوٹی پر ضرور پرکھا جاتا ہے۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا — کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ جو لوگ دعویٰ ایمان کرتے
آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ٥ (عنکبوت) — ہیں وہ یوں ہی چھوڑ دیئے جائیں گے اور آزمائے نہ جائیں گے۔
وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ — اور اُن مشرکوں سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ مٹ جائے
وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (انفال) — اور دین سب کا سب خالص اللہ کے لئے رہ جائے۔

تو اب قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ اس دعاءِ ابراہیمی کی مراد کیا ہے؟ اور وہ کافروں کیلئے فتنہ نہ بننے سے متعلق کیا خواہش رکھتے ہیں؟

اختلافِ ذوق کے پیشِ نظر علماءِ حق نے اِس سوال کو تین طرح سے حل کیا ہے لیکن اِن

تینوں حقیقتوں پر غائر نظر ڈالنے کے بعد بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کی یہ دعاء اپنی وسعت اور دقیق تعبیر کے لحاظ سے بیک وقت تینوں باتوں پر حاوی ہے۔

(۱) حضرتِ ابراہیمؑ، درگاہِ رب العزت میں یہ دعاء کر رہے ہیں "پروردگارِ عالم! مجھ کو وہ زندگی بخش کہ میرا قول و عمل اور میری رفتار و گفتار" اسوۂ حسنہ" کی تعبیر ہو، میں اگر ہادی بنوں تو اسوۂ حسنہ کا اور مجھ کو قیادت نصیب ہو تو رشد و ہدایت کی اور پھر اس پر استقامت عطا فرما، ایسا نہ ہو کہ میں اسوۂ سیئہ کا رہنما اور قائد بن جاؤں اور فردائے قیامت میں اُمت کے گمراہ اور کافر تیرے حضور مجھ کو یہ کہہ کر شرمندہ کریں۔

رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا	اے ہمارے پروردگار! اس میں ذرا شک نہیں ہے
فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا	کہ ہم نے اپنے قائدین اور اپنے بڑوں کی پیروی اختیار
(احزاب)	کر لی تھی پس انھوں نے ہی ہم کو راہ سے بے راہ کیا۔

یعنی وہ خواہش رکھتے ہیں کہ اگر راہنمائی اور قیادت ان کا نصیب ہے تو پھر وہ اُسوہ اور قدوہ چھوڑ کر جائیں کہ کل کے دن "اولیاء الرحمٰن" کے زمرہ میں جگہ ملے اور ان کی زندگی کا راز "اولیاء الشیطان" کے ساتھ عداوت بن جائے، آیت کا سیاق و سباق اس معنیٰ کی پوری تائید کرتا ہے اس لئے کہ آیت سے قبل مشرکین کے مقابلہ میں حضرتِ ابراہیمؑ اور ان کی پاکباز امت کے اس اعلان کا تذکرہ ہے۔

وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ	اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے
وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا	عداوت و بغض کا آغاز ہو گیا ہے تاآنکہ تم خدائے
بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ ۝	واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔

اور زیرِ بحث آیت کے بعد پھر حضرتِ ابراہیمؑ اور ان کے پیرو "مومنین قانتین" کے اسوۂ حسنہ ذکرِ خیر ہے اور شروع سورۃ میں بھی ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کا ذکر موجود ہے۔

(۲) ابراہیم (علیہ السلام) اپنے ان جامع کلمات میں بارگاہِ حق سے اسکے طالب ہیں

کہ خدایا! تو ہم کو کافروں کے ہاتھوں آزمائش کے لئے نہ چھوڑ دینا کہ وہ ہم کو ایمان سے برگشتہ اور کفر کے قبول کرنے کے لئے طرح طرح کے مصائب و آلام کا شکار بنائیں اور جبر و ظلم کے ذریعہ راہ سے بے راہ بنانے پر آمادہ و دلیر ہو جائیں۔

اس معنی کا قرینہ یہ ہے کہ آیت زیرِ عنوان سے قبل یہ ذکر آچکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اُمتِ اجابت نے ذی اقتدار اور با اختیار کافر و مشرک جماعت کے سامنے جراٴتِ حق کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ ہم تمہارے معتقدات کے قطعاً منکر ہیں "كَفَرْنَا بِكُمْ" اور ہمارے اور تمہارے درمیان اسلام کے اقرار و انکار اور قبول و عدمِ قبول کے لئے کھلا چیلنج ہے، تو اِس صورتِ حال میں ازبس ضروری تھا کہ ایک باخدا انسان، جلیل القدر پیغمبر، عظیم المرتبہ ہادی، اپنی انسانی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہوئے درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہو کہ اے لازوال قدرت کے مالک! تو کسی طرح اور کسی حالت میں بھی کافروں کو ہم پر غلبہ عطا نہ فرما اور کافر کسی شکل میں بھی ہم پر ایسے قابو یافتہ نہ ہوسکیں کہ ایمان و کفر سے متعلق ہمارا یہ اعلانِ جنگ ہمارے لئے باعثِ امتحان و فتنہ بن جائے اور مشرک ہم کو کفر کی جانب واپس لانے کی جراٴت بے جا کر سکیں۔

(۳) حضرتِ ابراہیمؑ اس مقام پر فتنہ کہہ کر "عذاب" مراد لیتے ہیں اس لئے کہ فتنہ کی مختلف شکلوں میں سے ایک بھیانک شکل یہ بھی ہے اور عرض کرتے ہیں، پروردگار ہم کو ایسی حالت پر کبھی نہ پہنچانا کہ ہم کافروں اور مشرکوں کے ہاتھوں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں اور نتیجہ یہ نکلے کہ اپنی پستی، نکبت، ذلت و غلامی اور دشمنوں کی دنیوی عزت و جاہ عروج و ترقی، اور مالکانہ اقتدار کو دیکھ دیکھ کر یہ کہہ اٹھیں کہ اگر ہم حق پر ہوتے تو اس ذلت و خسران میں نہ ہوتے اور اگر شرک و کفر خدا کی نگاہ میں مبغوض ہوتا تو ان کافر اور مشرک جماعتوں کو یہ عزت و جاہ اور یہ فروغ حاصل نہ ہوتا یعنی ہم سے حق و باطل کا امتیاز ہی اُٹھ جائے پس ایسے فتنے سے ہمیشہ محفوظ رکھ۔

حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا کا یہ پہلو ہمارے لئے صد ہزار سامانِ عبرت و بصیرت رکھتا ہے اس لئے کہ گذشتہ ڈیڑھ صدی سے خصوصیت کے ساتھ اسلامی دنیا اپنی خود ساختہ غیر اسلامی روش کی بدولت جس طرح غیر اسلامی اقتدار، حاکمانہ جبر اور پنجۂ استبداد کے نیچے دبی ہوئی ہے اور ہر طرح بیچارہ و مجبور نظر آتی ہے اُس نے ہم کو اس درجہ حقیر و ذلیل بنا دیا ہے کہ ہم سے ہمارے قوائے فکر و عمل بھی مفقود ہو چکے ہیں اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر ہم بے خوف و خطر یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اسلام نہ خدا پرستی کا نام ہے اور نہ عقائد و اعمالِ صالحہ کی زندگی کا بلکہ صرف مادی قوت و شوکت (حکومت) اور اس کے ذریعہ حصولِ عیش و عشرت کا دوسرا نام "مذہب" یا "اسلام" ہے اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اس مادی قوت کے حصول کے لئے ڈسپلن اور ضبط و نظم کے لئے صرف ایک طریقِ کار ہیں نہ کہ مقصدِ حیاتِ ملی، اور صرف یہی حقیقت ہے اُس "جنت" کی جس کا وعدہ اربابِ حق کے لئے قرآن میں کیا گیا ہے پس اگر یہ حاصل نہیں تو پھر اس کا دوسرا نام "جہنم" ہے اور وعدۂ آخرت، بعثت و حشر اور جنت و جہنم سب محض فرضی تخیلات ہیں جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے (العیاذ باللہ)

اور یہ کہ جن قوموں کو دنیا میں اقتدار اور طاقت اور اُس کے ذریعہ عیش و عشرت حاصل ہے قرآن میں مذکور حقیقی مومن وہی ہیں اور وہی اس طغرائے امتیاز کا مستحق، نہ کہ وہ خدا پرست مسلمان جو اس دولت سے محروم اور مجبور ہیں، چنانچہ کتاب "تذکرہ"[1] اسی خیال کی صدائے بازگشت ہے اور دینِ حق (اسلام) کی تعلیم سے ناآشنا اور مادیت سے مرعوب اکثر نوجوانانِ قوم کے بیباک خیالات اور ملحدانہ جذبات اسی پست اور شکست خوردہ ذہنیت کے آئینہ دار ہیں یہی وہ خوفناک حقیقت ہے جس کے تصور نے مرکزِ وحدت "کعبہ" کے مؤسس، ملتِ ابراہیمی کے داعی، دینِ حق کے مبلغ اور خدا کے مقدس رسول، ابراہیم (علیہ السلام) کو لرزہ براندام کر دیا اور انھوں نے عجز و زاری کے ساتھ اس ناپاک زندگی سے محفوظ رہنے کے لئے حضرتِ حق کے سامنے دستِ طلب دراز کیا کہ ہم پر وہ وقت کبھی نہ آئے کہ کفر کی شوکت و طاقت

[1] مصنفہ علامہ مشرقی۔

اِس طرح کچل ڈالے کہ پرستارانِ توحید اس سخت اور کڑی آزمائش میں مبتلا ہو کر حق و باطل کے درمیان امتیاز بھی کھو بیٹھیں۔

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

مقامِ ثانی | سورۂ شعراء میں بہ سلسلۂ عبرت و بصیرت، انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ رشد و ہدایت کا جو ذکر ہو رہا ہے، اس میں حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کا بھی تذکرہ ہے، حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) اپنی قوم کو توحیدِ الٰہی کی تلقین، اور شرک و کفر سے بیزاری و نفرت کی ترغیب دلا رہے ہیں، اسی حالت میں وہ توحیدِ ذات و صفات کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے یک بیک خدائے واحد کی جانب دست بدعا ہو جاتے ہیں، گویا ایک دوسرے رنگ میں قوم کو اللہ رب العٰلمین کا پرستار بنانے کی سعی فرما رہے ہیں، حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) دعا کرتے کرتے درگاہِ ایزدی میں عرض کرتے ہیں "وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ" (پروردگار!) اور جس روز لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے تو اس دن مجھ کو رسوا نہ کرنا۔"

اِس آیت کے تحت امام بخاریؒ نے اپنی الجامع الصحیح میں حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے جو کتاب التفسیر میں مختصر اور کتاب الانبیاء میں تفصیل کے ساتھ منقول ہے، کتاب التفسیر میں منقول حدیث کا ترجمہ یہ ہے:-

"حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) قیامت کے دن اپنے والد کو پراگندہ حال اور رُو سیاہ دیکھیں گے تو فرمائیں گے "پروردگار! دنیا میں تو نے میری اس دعاء کو قبول فرمالیا تھا "وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ" (یعنی پھر یہ رسوائی کیسی کہ میدانِ حشر میں اپنے باپ کو اس حال میں دیکھ رہا ہوں) اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا، ابراہیمؑ! میں نے کافروں پر جنت کو حرام کر دیا ہے۔"

اور کتاب الانبیاء میں یہ روایت اِن اضافات کے ساتھ مذکور ہے۔

ا۔ مصنف علامہ مشرقی۔

"جب قیامت میں حضرتِ ابراہیمؑ اپنے والد کو پراگندہ حال اور روسیاہ دیکھیں گے تو باپ سے مخاطب ہوکر فرمائیں گے: "کیا میں نے بارہا تجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ میری راہِ ہدایت کی مخالفت نہ کر۔" آزر کہے گا: "جو ہوا سو ہوا آج کے دن سے میں تیری مخالفت نہیں کرونگا" تب حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) درگاہِ الٰہی میں عرض رسا ہوں گے: "پروردگار! تو نے میری اس دعا کو قبول فرمالیا تھا۔ "رَبِّ لَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ" مگر اس سے زیادہ رسوائی اور کیا ہوگی کہ میرا باپ (آزر) تیری رحمت سے انتہائی دور ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا "میں نے بلاشبہ کافروں پر جنت کو حرام کردیا ہے" پھر ہاتفِ غیبی آواز دے گا (اور بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی پکارے گا) ابراہیم! قدموں کے نیچے دیکھ کیا ہے؟ حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) دیکھیں گے کہ گندگی میں لتھڑا ہوا ایک بجو پیروں میں پڑا لوٹ رہا ہے، تب فرشتے ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں اس کو پھینک دیں گے۔"

مختصر حدیث میں قیامت کے دن آزر کی ہیئتِ کذائی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ ٹھیک ٹھیک قرآنِ عزیز سورۂ عبس کی اس آیت کی تفسیر ہے جس میں قیامت کے دن کافروں کی یہ حالت بیان کی گئی ہے۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ	اور کتنے (لوگوں کے) منہ اس دن (ایسے) ہوں گے کہ
تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ	ان پر گرد پڑی ہوگی اور اُن پر کلونس (کالک) چھا رہی ہوگی، یہی وہ
الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝	(وہ لوگ) ہیں جو (دنیا میں) کافر اور بدکار ہیں۔

اور سورۂ یونس میں مومنوں اور اصحابِ جنت کے لئے اسی حالت کی نفی کی گئی ہے۔

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ	جن لوگوں نے دنیا میں بھلائی کی اُن کے لئے (آخرت میں
وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ	بھی) بھلائی ہے اور کچھ بڑھ کر بھی اور گنہگاروں کی طرح
أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا	ان کے منہ پر نہ کلونس چھائی ہوئی ہوگی اور نہ ذلت،
خَالِدُونَ ۝	یہی ہیں جنتی گروہ، ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

طویل حدیث میں دو نئی باتیں کہی گئی ہیں، ایک یہ کہ حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) آزر کی یہ حالت دیکھ کر درگاہِ الٰہی میں مسطورہ بالا دعاء کا ذکر کریں گے جو انبیاء علیہم السّلام کی دعاؤں کی طرح شرفِ قبول حاصل کر چکی ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ باپ کی یہ رسوائی دراصل میری رسوائی ہے، دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آزر کو بجّو کی شکل میں مسخ کر دیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (رحمہ اللہ) اس حدیث کے اجزاء پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آزر کو اس لئے مسخ کر دے گا تاکہ حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کا وہ حزن و ملال جاتا رہے جو آزر کے بشکلِ انسان رہنے کی صورت میں ناری اور جہنمی ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا اور وہ اس کی اس ہیئتِ کذائی کو دیکھ کر متنفر ہو جائیں اور فطرتِ ابراہیمی اس سے بیزار ہو جائے۔

اور بجّو کی شکل میں مسخ ہو جانے کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ ماہرینِ علم الحیوانات کے نزدیک بجّو گندہ بھی ہے اور درندوں میں احمق بھی تو چونکہ آزر بھی بُت پرست ہونے کی وجہ سے نجاست میں ملوث تھا اور حضرتِ ابراہیمؑ کی پیش کردہ آیاتِ بیّنات اور توحیدِ الٰہی کے روشن دلائل و براہین کے نہ قبول کرنے کی بنا پر احمق بھی تھا اس لئے قانونِ الٰہی "پاداشِ عمل از جنسِ عمل" کے پیشِ نظر اسی کا مستحق تھا کہ ایک احمق اور نجس درندہ کی شکل میں مسخ کر دیا جائے،

مگر مشہور محدث اسمٰعیلی اس روایت ہی کو مجروح اور لائقِ طعن سمجھتے اور صحتِ سند کے اعتراف کے باوجود "سقمِ درایت" کی بنا پر اس کو قبول نہیں کرتے، وہ فرماتے ہیں:۔

"اس حدیث میں یہ سقم ہے کہ اس سے حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ العیاذ باللہ خدائے برتر کے متعلق "خلفِ وعد" کا شک کرتے تھے، تب ہی تو یہ سوال کیا؟

حالانکہ حضرتِ ابراہیمؑ اولو العزم انبیاء میں سے ہیں اور وہ بلاشبہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی ہرگز نہیں کرتا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ" لہٰذا ابراہیم علیہ السلام کی جانب ایسی بات کی نسبت کرنا قطعاً درست نہیں، وہ کسی طرح بھی آزر کی مشرکانہ زندگی و موت

کے علم ہوتے ہوئے ایسا سوال نہیں کر سکتے۔"

اسمٰعیلی کے علاوہ بعض دوسرے محدثین نے بھی اس تفصیلی روایت پر جرح کی ہے، وہ کہتے ہیں:-

یہ روایت بظاہر قرآن کے خلاف ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے:-

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيمَ	اور (وہ جو) ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعا
لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ	مانگی تھی سو (وہ) ایک وعدہ (کی وجہ) سے مانگی تھی جو ابراہیمؑ نے
وَّعَدَهَآ إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ	اپنے باپ سے کر لیا تھا، پھر ان کو جب معلوم ہو گیا کہ یہ دشمن خدا
لَهٗٓ أَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ	ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے، بیشک ابراہیمؑ
إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ	البتہ بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔

یہ آیت ناطق ہے کہ ابراہیمؑ (علیہ السلام) کو دنیا ہی میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اُن کا باپ آزر حیات کے آخری لمحہ تک خدا کا دشمن ہی رہا اور اُسی پر اُس کی موت ہوئی اس لئے انھوں نے دنیا ہی میں اس سے اپنی بیزاری اور بے تعلقی کا اعلان کر دیا تھا اور بتلا دیا تھا کہ خلیل الرحمٰن کو عدو الرحمٰن کے ساتھ کسی قسم کا واسطہ نہیں ہو سکتا۔

پس اِس صورتِ حال کے بعد روایت کا یہ مضمون کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

حافظ ابن حجر مسطورہ بالا دونوں جرح کو نقل کرنے کے بعد ان کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

"حضرتِ ابراہیمؑ کا اپنے باپ آزر سے اظہارِ بیزاری کس وقت پیش آیا؟ اس سلسلہ میں دو روایات منقول ہیں، ایک حضرتِ عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے ابن جریرؒ نے بسندِ صحیح اس طرح روایت کی ہے کہ جب آزر کا بحالتِ شرک و کفر انتقال ہو گیا تو حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کو یقین ہو گیا کہ وہ دشمنِ خدا ہو کر مرا لہٰذا انھوں نے آزر سے جو وعدۂ استغفار کیا تھا اب اس کو ترک کر دیا اور اُس سے اظہارِ بیزاری کر دیا۔"

اور دوسری روایت کہ وہ بھی ابن جریر ہی نے روایت کی ہے یہ۔

"ابراہیم (علیہ السلام) کی تبرّی" (آزر سے اظہارِ بیزاری) کا یہ معاملہ دنیا میں نہیں قیامت کے دن پیش آئے گا اور اسی طرح پیش آئے گا جیسا کہ مسطورہ بالا تفصیلی روایت میں مذکور ہے یعنی جب آزر مسخ کر دیا گیا تو ابراہیم (علیہ السلام) نے یقین کر لیا کہ اب استغفار کی قطعاً گنجائش باقی نہیں رہی۔

نقد و جرح کے اصول کو پیشِ نظر رکھ کر دونوں روایات کے درمیان تطبیق کی شکل یہ ہے کہ اگر حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) نے دنیا ہی میں آزر کی مشرکانہ موت کے پیشِ نظر اس سے اظہارِ بیزاری کر دیا تھا لیکن جب میدانِ حشر میں باپ کی زبوں حالت کو دیکھا تو صفتِ رافت و رحمت جوش میں آ گئی اور بہ تقاضائے فطرت انہوں نے پھر طلبِ مغفرت پر اقدام کیا مگر جب اللہ تعالیٰ نے آزر کو مسخ کر دیا تب ابراہیمؑ اسکے انجام سے مایوس ہو گئے اور سمجھ گئے کہ اسکی مغفرت کی قطعاً کوئی صورت نہیں ہے لہٰذا دوسری مرتبہ اُس دارِ دیگر کے دن بھی تبرّی کا اعلان فرمایا[1] (انتہیٰ)

حافظ ابنِ حجرؒ کے اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کی نمایاں خصوصیات میں سے اس صفت کا بھی اعلان کیا ہے "اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ" چنانچہ اس کے مختلف مظاہر میں سے ایک مظہر یہ بھی ہے کہ آزر کی شرک پر موت اور ابراہیم (علیہ السلام) کے دنیا ہی میں اُس سے اظہارِ تبرّی کے باوجود کہ جس کا ذکر قرآنِ عزیز کی سورۂ توبہ میں موجود ہے جب وہ فردائے قیامت میں آزر کو اس زبوں حال میں دیکھیں گے۔ "غَبَرَةٌ عَلَيْهَا قَتَرَةٌ" تو اُن کی رافت و رحمت جوش میں آجائے گی اور اولو العزم پیغمبر کی طرح حقیقتِ حال سے باخبر رہتے ہوئے بھی ان کی صفاتِ کریمانہ کا اس درجہ فطری غلبہ برسرِ کار آجائے گا کہ وہ آزر کے لئے طلبِ مغفرت پر آمادہ ہو جائیں گے اور یہ دیکھ کر کہ آزر کی مشرکانہ زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے کہ اُس کو حیلۂ شفاعت بنایا جا سکے ابراہیمؑ اپنی اُس دعاء کی پناہ لیں گے جو دنیا ہی میں قبولیت کا شرفِ دوام حاصل کر چکی تھی اور باپ کی رسوائی کو اپنی رسوائی ظاہر کر کے درگاہِ حق میں اُس وعدہ کا ذکر کریں گے، لیکن اللہ تعالیٰ

[1] جلد ۸ کتاب التفسیر

اس کے جواب میں یہ فرما کر "کافر پر میں نے جنت کو حرام کر دیا ہے" ابراہیم (علیہ السلام) کو اُس جانب توجہ دلائے گا کہ اپنی اس فطری رافت و رحمت کے باوجود تم کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ دنیائے عمل نہیں بلکہ روزِ جزا ہے اور آج "میزانِ عدل قائم ہے" جس کے لئے ہمارا یہ غیر متبدل قانون ابدیت کا شرف حاصل کر چکا ہے کہ کافر و مشرک کیلئے جنت میں کوئی جگہ نہیں اور یہ کہ "مشرک کی رسوائی" ہرگز "مومن کی رسوائی" کا باعث نہیں ہو سکتی خواہ ان دونوں کے درمیان علاقۂ دنیوی کے مضبوط رشتے ہی کیوں نہ قائم رہے ہوں اور ساتھ ہی حکمتِ الٰہی ایسی صورتِ حال پیدا کر دے گی کہ حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) پر حزن و ملال کا وہ اثر ہی باقی نہ رہے گا جس کی وجہ سے اُن کے فطری ملکات نے طلبِ مغفرت پر آمادہ کیا تھا چنانچہ آزر کو درندہ کی شکل میں مسخ کر دیا جائے گا جس کی وجہ سے حضرتِ ابراہیمؑ کی پاک اور سلیم فطرت اُس کو دیکھ کر نفرت و کراہت کرنے لگے گی۔

غرض حضرتِ ابراہیمؑ (علیہ السلام) کا یہ سوال اس لئے نہ تھا کہ وہ العیاذ باللہ اس صورتِ حال کو "خلفِ وعد" سمجھ رہے تھے بلکہ ایک فطری تقاضے کے پیشِ نظر تھا جو اگرچہ نتائج و ثمرات کو تو نہیں بدل سکتا مگر اُس شخصیت کے ملکاتِ حسنہ اور اوصافِ کریمانہ کے نمایاں کرنے کا باعث ضرور بن جاتا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کا یہ جواب اگرچہ اسمٰعیلی اور بعض دوسرے محدثین کے طعن و جرح کو بلا شبہ بڑی حد تک ہلکا کر دیتا ہے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرتِ ابوہریرہؓ سے منقول بخاری کی مختصر حدیث کے علاوہ طویل حدیث کے بعض اجزاء ضرور محلِ نظر ہیں تب ہی تو غالباً حافظِ حدیث عماد الدین ابن کثیر نے ان روایات کو اپنی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد مختصر حدیث کو قبول کرتے ہوئے بخاری کی کتاب الانبیاء والی طویل حدیث پر "تفرد" کا اور نسائی کی حدیث پر "غرابت و نکارت" کا حکم لگایا ہے، مشہور محدث کرمانی نے بھی اس مسئلہ کو سوال و جواب کی شکل میں پیش کر کے اس کے حل کرنے کی سعی فرمائی ہے جو اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے۔[1]

[1] فتح الباری جلد ۶ کتاب الانبیاء

حضرتِ اسمٰعیل (علیہ السلام)

اسمٰعیل (علیہ السلام) کی ولادت

حضرتِ ابراہیم ابھی تک اولاد سے محروم تھے اور ان کے گھر کا مالک ایک خانہ زاد الیعزر دمشقی تھا، ایک روز حضرتِ ابراہیم نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں فرزند کے لئے دعا کی، اور اللہ تعالیٰ نے انکی دعا کو قبول فرمالیا اور ان کو تسلی دی۔

ابرام نے کہا اے خداوند خدا تو مجھ کو کیا دے گا میں تو بے اولاد جاتا ہوں اور میرے گھر کا مختار الیعزر ہے پھر ابرام نے کہا کہ تو نے مجھے فرزند نہ دیا، اور دیکھ میرا خانہ زاد میرا وارث ہوگا، تب خداوند کا کلام اُس پر اترا اور اُس نے کہا کہ یہ تیرا وارث نہیں ہونے کا بلکہ جو تیری صلب سے پیدا ہو وہی تیرا وارث ہوگا۔[1]

اور یہ دُعا اس طرح قبول ہوئی کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی چھوٹی بی بی حضرتِ ہاجرہ حاملہ ہوئیں۔

اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی۔[2]

جب حضرتِ سارہ کو یہ پتہ چلا تو اُنھیں بہ تقاضاء بشریت ہاجرہ سے رشک پیدا ہوگیا اور اُنھوں نے حضرتِ ہاجرہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا، حضرتِ ہاجرہ مجبور ہو کر ان کے پاس سے چلی گئیں۔

اور خداوند کے فرشتے نے اسے میدان میں پانی کے ایک چشمہ کے پاس پایا یعنی اس چشمہ کے پاس جو صور کی راہ پر ہے اور اُس نے کہا کہ اے سری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی؟ اور کدھر جاتی ہے؟ وہ بولی کہ میں اپنی بی بی سری کے سامنے سے بھاگی ہوں، اور خداوند کے فرشتے نے اُسے کہا کہ تو اپنی بی بی کے پاس پھر جا اور اُس کے تابع رہ، پھر خداوند کے فرشتے نے اُسے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے اور خداوند کے فرشتے نے

[1] توراۃ پیدائش باب ۱۵ آیت ۲-۴۔ [2] ایضاً باب ۱۶ آیت ۴۔

اُسے کہا کہ تو حاملہ ہے، اور ایک بیٹا جنے گی، اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دُکھ سُن لیا اور وہ وحشی (بدوی) آدمی ہوگا، اس کا ہاتھ سب کے اور سب کے ہاتھ اس کے برخلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بودوباش کرے گا۔[1]

حضرتِ ہاجرہ جس مقام پر فرشتہ سے ہمکلام ہوئیں اس جگہ ایک کنواں تھا، ہاجرہ نے یادگار کے طور پر اُس کا نام "زندہ نظر آنے والے کا کنواں" رکھا، تھوڑے عرصہ کے بعد ہاجرہ کے بیٹا پیدا ہوا اور فرشتہ کی بشارت کے مطابق اُس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔

"اور ہاجرہ ابرام کے لئے بیٹا جنی اور ابرام نے اپنے اُس بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی اسمٰعیل رکھا اور جب ابرام کے لئے ہاجرہ سے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔[2]

اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیلؑ کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق کی بشارت دی جیسا کہ ابھی مفصل ذکر آئے گا، مگر ابراہیم علیہ السلام نے اس بشارت پر چنداں مسرّت کا اظہار نہیں کیا اور اس کی جگہ یہ دعا مانگی:۔

"اور ابرام نے خدا سے کہا کہ کاش اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔"[3]

اور اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ابراہیم کی اس دعاء کا یہ جواب دیا۔

"اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اُسے برکت دوں گا، اور اُسے برومند کروں گا، اور اُس کو بہت بڑھاؤں گا، اور اس کے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسکو بڑی قوم بناؤں گا۔[4]

اسمٰعیل "اسمع" اور "ایل" دو لفظوں سے مرکب ہے، عبرانی میں "ایل" اللہ کے مرادف ہے اور عربی کے اسمع اور عبرانی کے شماع کے معنی ہیں "سُن" چونکہ اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا سن لی اور ہاجرہ کو فرشتہ سے بشارت ملی اس لئے اُن کا یہ نام رکھا گیا، عبرانی میں اس کا تلفظ "شماع ایل" ہے،

وادیٔ غیر ذی زرع اور ہاجرہ و اسمٰعیل

حضرتِ ہاجرہ کے بطن سے اسمٰعیل کا پیدا ہو جانا حضرتِ سارہ پر بید شاق گذرا، حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اور بڑی بیوی، قدیم سے گھر کی مالکہ

[1] تورات پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲،۱۱ [2] ایضاً باب ۱۶ آیات ۱۶،۱۵ [3] ایضاً باب ۱۷ آیت ۱۸ [4] ایضاً باب ۱۷ آیت ۲۰

ہاجرہ چھوٹی بیوی اور اُن کی خدمت گذار، یہ سب باتیں تھیں جنہوں نے بشری تقاضے کے پیشِ نظر اسمٰعیل کی ولادت کو حضرتِ سارہؑ کے لئے سوہانِ روح بنا دیا تھا، اس لئے سارہؑ نے حضرتِ ابراہیمؑ سے اصرار کیا کہ ہاجرہ اور اس کا بچہ اسمٰعیل میری نگاہ کے سامنے نہ رہیں، ان کو علیحدہ کسی جگہ لے جاؤ۔

حضرتِ ابراہیمؑ کو یہ اصرار بیحد ناگوار گذرا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو مطلع کیا کہ ہاجرہ، اسمٰعیل اور تیرے لئے مصلحت اسی میں ہے کہ سارہ جو کچھ کہتی ہے اُس کو مان لے۔

اور سرہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو وہ ابراہیمؑ سے جنی تھی ٹھٹھے مارتا ہے تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحٰق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پھر اپنے بیٹے کی خاطر یہ بات ابراہیم کی نظر میں نہایت بُری معلوم ہوئی، خدا نے ابراہام سے کہا کہ وہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت تیری نظر میں بُری نہ معلوم ہو، ہر ایک بات کے حق میں جو سرہ نے تجھے کہی اس کی آواز پر کان رکھ، کیونکہ تیری نسل اضحاق سے کہلائے گی، اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا، اس لئے کہ وہ تیری نسل ہے[1]

تورات کی اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت حضرتِ اسحٰق پیدا ہو چکے تھے، اس لحاظ سے حضرتِ اسمٰعیلؑ سنِ رشد کو پہنچ چکے ہوں گے کیونکہ تورات ہی کی روایت کے مطابق حضرتِ اسمٰعیلؑ، حضرتِ اسحٰقؑ سے تیرہ سال بڑے ہیں۔

لیکن اسی واقعہ میں تورات کی دوسری آیات مسطورۂ بالا آیات کے خلاف یہ کہتی ہیں کہ حضرتِ اسمٰعیلؑ ابھی شیرخوار بچہ تھے۔

"تب ابراہام نے صبح سویرے اُٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو اس کے کاندھے پر دھر کر دی اور اس کے لڑکے کو بھی اور اُسے رخصت کیا، وہ روانہ ہوئی اور بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی، اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اُس نے اُس لڑکے کو ایک پہاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اسکے سامنے ایک پتھر کے ٹپے پر دُور جا بیٹھی کیونکہ اُس نے کہا کہ میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں[2]

[1] تورات پیدائش ۲۱ آیت ۷-۹-۱۳ [2] ایضاً پیدائش ۲۱ آیت ۱۴، ۱۶

اس لئے تورات کے ان مخالف و متضاد بیانات کے مقابلہ پر صحیح قول یہ ہے کہ ہاجرہ و اسمٰعیل کے خروج کے وقت اسمٰعیل شیرخوار بچہ تھے اور اسحٰق ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت منقول ہے وہ بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے، اس روایت کا مضمون یہ ہے:۔

ابراہیم (علیہ السلام) ہاجرہ اور اس کے شیرخوار بچہ اسمٰعیل کو لے کر چلے اور جہاں آج کعبہ ہے اس جگہ ایک بڑے درخت کے نیچے زمزم کے موجودہ مقام سے بالائی حصہ پر اُن کو چھوڑ گئے، وہ جگہ ویران اور غیر آباد تھی اور پانی کا بھی نام و نشان نہ تھا، اس لئے ابراہیم نے ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور بھی اُن کے پاس چھوڑ دیں اور پھر مُنہ پھیر کر روانہ ہو گئے، ہاجرہ اُن کے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی چلیں اے ابراہیم تم ہم کو ایسی وادی میں کہاں چھوڑ کر چل دیئے جہاں نہ آدمی ہے نہ آدم زاد اور نہ کوئی مونس و غمخوار، ہاجرہ برابر یہ کہتی جاتی تھیں مگر ابراہیم علیہ السلام خاموش چلے جا رہے تھے، آخر ہاجرہ نے دریافت کیا، کیا تیرے خدا نے تجھ کو یہ حکم دیا ہے؟ تب حضرتِ ابراہیم نے فرمایا "ہاں، یہ خدا کے حکم سے ہے" ہاجرہ نے جب یہ سُنا تو کہنے لگیں، اگر یہ خدا کا حکم ہے تو بلاشبہ وہ ہم کو ضائع اور برباد نہیں کرے گا، اور پھر واپس لوٹ آئیں، ابراہیم چلتے چلتے جب ایک ٹیلہ پر ایسی جگہ پہنچے کہ ان کے اہل و عیال نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو اُس جانب جہاں کعبہ ہے رُخ کیا اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی:۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ	اے ہم سب کے پروردگار! (تو دیکھ رہا ہے کہ) ایک ایسے
بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ	میدان میں جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں، میں نے اپنی بعض
بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا	اولاد تیرے محترم گھر کے پاس لا کر بسائی ہے کہ نماز قائم رکھیں
الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً	(تاکہ یہ محترم گھر عبادت گزارانِ توحید سے خالی نہ رہے) پس تو
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ	(اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ لوگوں کے دل اُن کی طرف مائل
وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ	ہو جائیں اور اُن کے لئے زمین کی پیداوار سے سامانِ رزق

لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ (ابراہیم) مہیا کردے تاکہ تیرے شکر گذار ہوں!

ہاجرہ چند روز تک مشکیزہ سے پانی اور خورجی سے کھجوریں کھاتی اور اسمٰعیل کو دودھ پلاتی رہیں لیکن وہ وقت بھی آگیا کہ پانی رہا نہ کھجوریں تب وہ سخت پریشان ہوئیں، چونکہ وہ بھوکی پیاسی تھیں اس لئے دودھ بھی نہ اُترتا تھا اور بچہ بھی بھوکا پیاسا رہا، جب حالت دگرگوں ہونے لگی اور بچہ بیتاب ہونے لگا تو ہاجرہ، اسمٰعیل کو چھوڑ کر دُور جا بیٹھیں تاکہ اس حالتِ زار میں اس کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں، کچھ سوچ کر قریب کی پہاڑی صفا پر چڑھیں کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ نظر آجائے یا پانی نظر آجائے مگر کچھ نظر نہ آیا، پھر بچہ کی محبت میں دوڑ کر وادی میں آگئیں، اس کے بعد دوسری جانب کی پہاڑی مروہ پر چڑھ گئیں، اور وہاں بھی جب کچھ نظر نہ آیا تو پھر تیزی سے لوٹ کر وادی میں بچہ کے پاس آگئیں، اور اس طرح سات مرتبہ کیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر پہنچ کر فرمایا کہ یہی وہ "سعی بین الصفا والمروہ" ہے جو حج میں لوگ کرتے ہیں، آخر میں جب وہ مروہ پر تھیں تو کانوں میں ایک آواز آئی، چونکیں اور دل میں کہنے لگیں کہ کوئی پکارتا ہے، کان لگایا تو پھر آواز آئی، ہاجرہ کہنے لگیں اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ تمہاری آواز سنی گئی، دیکھا تو خدا کا فرشتہ (جبرئیل) ہے، فرشتہ نے اپنا پیر (یا ایڑی) اس جگہ مارا جہاں زمزم ہے، اُس جگہ سے پانی اُبلنے لگا، ہاجرہ نے یہ دیکھا تو پانی کے چاروں طرف باڑ بنانے لگیں مگر پانی برابر اُبلتا رہا، اس جگہ پہنچ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اُم اسمٰعیل پر رحم کرے، اگر وہ زمزم کو اس طرح نہ روکتیں اور اُس کے چار جانب باڑھ نہ لگاتیں تو آج وہ زبردست چشمہ ہوتا۔

ہاجرہ نے پانی پیا اور پھر اسمٰعیل کو دودھ پلایا، فرشتہ نے ہاجرہ سے کہا خوف اور غم نہ کر اللہ تعالیٰ تجھ کو اور اس بچہ کو ضائع نہ کرے گا، یہ مقام "بیت اللہ" ہے جس کی تعمیر اس بچہ (اسمٰعیل) اور اس کے باپ ابراہیم کی قسمت میں مقدر ہو چکی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اس خاندان کو ہلاک نہیں کرے گا، بیت اللہ کی یہ جگہ قریب کی زمین سے نمایاں تھی مگر پانی کا سیلاب داہنے بائیں اس حصہ کو برابر کرتا جا رہا تھا، اسی دوران میں بنی جرہم کا ایک قبیلہ اس وادی کے قریب

آکر ٹھہرا، دیکھا تو تھوڑے سے فاصلہ پر پرند اُڑ رہے ہیں، جرہم نے کہا یہ پانی کی علامت ہے، وہاں ضرور پانی موجود ہے، جرہم نے بھی قیام کی اجازت مانگی، ہاجرہ نے فرمایا قیام کرسکتے ہو، لیکن پانی میں ملکیت کے حصہ دار نہیں ہوسکتے، جرہم نے یہ بات بخوشی منظور کرلی اور وہیں مقیم ہوگئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاجرہ خود بھی باہمی انس و رفاقت کے لئے یہ چاہتی تھیں کہ کوئی یہاں آکر مقیم ہو، اس لئے انھوں نے مسرت کے ساتھ بنی جرہم کو قیام کی اجازت دیدی۔ جرہم نے آدمی بھیج کر اپنے باقی ماندہ اہل خاندان کو بھی بلالیا اور یہاں مکانات بنا کر رہنے سہنے لگے، اُن ہی میں اسمٰعیل بھی رہتے اور کھیلتے اور اُن سے اُن کی زبان سیکھتے، جب اسمٰعیل بڑے ہوگئے تو اُن کا طرز و انداز اور اُن کی خوبصورتی بنی جرہم کو بہت بھائی اور انھوں نے اپنے خاندان کی لڑکی سے اُن کی شادی کردی، اس کے کچھ عرصہ کے بعد ہاجرہ کا انتقال ہوگیا، ابراہیم برابر اپنے اہل و عیال کو دیکھنے آتے رہتے تھے، ایک مرتبہ تشریف لائے تو اسمٰعیل گھر پر نہ تھے اُن کی اہلیہ سے دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ روزی کی تلاش میں باہر گئے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے دریافت کیا، گذران کی کیا حالت ہے؟ وہ کہنے لگی سخت مصیبت و پریشانی میں ہیں اور سخت دکھ اور تکلیف میں، ابراہیم علیہ السلام نے یہ سُن کر فرمایا، اسمٰعیل سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کردو، اسمٰعیل علیہ السلام واپس آئے تو ابراھیم علیہ السلام کے نورِ نبوت کے اثرات پائے پوچھا کوئی شخص یہاں آیا تھا، بی بی نے سارا قصہ سنایا اور پیغام بھی، اسمٰعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ میرے باپ ابراہیم تھے اور اُن کا یہ مشورہ ہے کہ میں تجھ کو طلاق دے دوں، لہٰذا میں تجھ کو جدا کرتا ہوں۔

اسمٰعیل نے پھر دوسری شادی کرلی، ایک مرتبہ ابراھیم علیہ السلام پھر اسمٰعیلؑ کی غیبت میں آئے اور اسی طرح اُن کی بی بی سے سوالات کئے، بی بی نے کہا خدا کا شکر و احسان ہے، اچھی طرح گذر رہی ہے، دریافت کیا کھانے کو کیا ملتا ہے؟ اسمٰعیل کی بی بی نے جواب دیا، گوشت، ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا اور پینے کو؟ اُس نے جواب دیا، پانی، تب حضرت

ابراہیمؑ نے دعا مانگی :-

اللھم بارک لھم فی اللحم والماء اللہ تعالیٰ ان کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما،

اور چلتے ہوئے پیغام دے گئے کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو محفوظ رکھنا حضرت اسمٰعیلؑ آئے

تو اُن کی بی بی نے تمام واقعہ دُہرایا اور پیغام بھی سُنایا، اسمٰعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میرے

باپ ابراہیمؑ تھے اور ان کا پیغام یہ ہے کہ تو میری زندگی بھر رفیقۂ حیات رہے، (الخ)

یہ طویل روایت بخاری کتاب الرؤیا اور کتاب الانبیاء میں دو جگہ منقول ہے اور دونوں

سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسمٰعیل (علیہ السلام) وادیٔ غیر ذی زرع (بن کھیتی کی سرزمین)

یعنی مکہ میں بحالتِ شیرخوارگی پہنچے تھے۔

مگر سید سلیمان ندوی، ارض القرآن میں تورات کی روایت کی تردید یا تصحیح کرتے ہوئے

یہ تحریر فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل (علیہ السلام) اُس وقت سِن رشد کو پہنچ چکے تھے، اور قرآن کی

اِن آیات سے استدلال کرتے ہیں :-

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِينَ ○	اے پروردگار! عطا کر مجھ کو نیک لڑکا، پس بشارت
فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيمٍ ○ فَلَمَّا بَلَغَ	دی ہم نے اس کو بردبار لڑکے کی، پھر جب پہنچا وہ
مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ إِنِّيٓ أَرٰى	اس سن کو کہ باپ کے ساتھ دوڑے، تو باپ نے
فِي الْمَنَامِ أَنِّيٓ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ	کہا، میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ
مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰٓأَبَتِ افْعَلْ مَا	میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ دیکھو تم کیا سمجھتے ہو بیٹے
تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيٓ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ	نے کہا میرے باپ جو حکم کیا گیا ہے کر گزرو، مجھے
الصّٰبِرِينَ ○ .... وَبَشَّرْنٰهُ	صابر پاؤ گے۔ .... اور ہم نے ابراہیم
بِإِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِينَ ○ وَبٰرَكْنَا	کو اسحٰق کی بشارت دی جو نبی ہوگا، اور نکوکاروں
عَلَيْهِ وَعَلٰٓى إِسْحٰقَ (صافات)	میں سے ہوگا اور اس پر اور اسحٰق پر برکت نازل کی۔
رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي	اے ہمارے پروردگار میں نے بسادیا ہے اپنی

بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ	اولاد میں سے بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے محترم
بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ (ابراہیم)	گھر کے پاس (اور آخر میں ہے)
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي وَهَبَ لِي	سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے بخشا
عَلَى الْكِبَرِ إِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ (ابراہیم)	مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق کو۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں "بلغ معہ السعی" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل (علیہ السلام) سنِ رُشد تک حضرتِ ابراہیمؑ کے ساتھ رہے اور آخر کی آیت بتاتی ہے کہ اسحٰق (علیہ السلام) اُس وقت پیدا ہو چکے تھے اور اسمٰعیل (علیہ السلام) اسحٰق (علیہ السلام) سے تیرہ سال بڑے تھے۔

اور سورۂ ابراہیم کی آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل جب مکہ میں لائے گئے ہیں تو وہ سنِ رُشد کو پہنچ چکے تھے تب ہی تو ابراہیم (علیہ السلام) نے دعا میں دونوں کا ذکر فرمایا ہے[1]۔

اِس استدلال کے بعد سید صاحب بخاری کی روایت کو ابنِ عباس (رضی اللہ عنہما) پر موقوف اور اسرائیلیات سے قرار دیتے ہیں، مگر سید صاحب کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، اور نہ اُن کی پیش کردہ آیات سے اس کی تائید نکلتی ہے۔

اوّل ۔ اس لئے کہ صافات میں "بلغ معہ السعی" کا یہ مطلب لینا کہ اسمٰعیل (علیہ السلام) حضرتِ ابراہیمؑ کے زیرِ سایہ فلسطین ہی میں پرورش پاتے رہے، تب صحیح ہو سکتا تھا کہ اس جملہ کے بعد آیت میں کوئی دوسرا جملہ حضرتِ اسمٰعیلؑ کے مکہ پہنچنے کے متعلق مذکور ہوتا تا کہ ذبحِ اسمٰعیل کے واقعہ کے ساتھ صحیح جوڑ لگ سکتا، کیونکہ اس پر تمام علماءِ اسلام کا اتفاق ہے اور سید صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ذبحِ اسمٰعیل کا واقعہ مکہ کی زندگی سے وابستہ ہے، اور آیت یہ کہتی ہے کہ "جب اسمٰعیل سنِ رشد کو پہنچے تو اُن کے باپ نے اُن سے اپنا خواب بیان کیا۔"

پس سید صاحب کی توجیہ کے مطابق اس آیت میں سخت ابہام ہے، حالانکہ قرآنِ عزیز

[1] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۳، ۴۴۔

کے طرزِ خطابت اور اصولِ بیان کے یہ قطعاً خلاف ہے کہ ایک آیت کے اندر اس طرح کا ابہام پیدا کردے جس سے دو اہم زندگیوں کے درمیان کوئی ربط قائم نہ رہ سکے۔

دوم۔ اس لئے کہ صافات میں اسمٰعیل (علیہ السلام) سے متعلق جس واقعہ کا ذکر ہے، وہ "ذبحِ عظیم" کا تذکرہ ہے نہ کہ مکہ پہنچنے کا اور وہ بلاشبہ اسمٰعیل (علیہ السلام) کے سِن رشد کا زمانہ ہے اور اسحٰق (علیہ السلام) اس وقت پیدا ہو چکے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) اگرچہ ہاجرہ اور اسمٰعیل کو مکہ کے بیابان وصحرا میں چھوڑ آئے تھے لیکن باپ تھے، نبی وپیغمبر تھے، اہلیہ اور بیٹے کو کیسے بھول سکتے، اور اُن کی نگہداشت سے کیسے بے پرواہ ہو سکتے تھے، وہ برابر اس بے آب وگیاہ صحرا میں آتے رہتے اور اپنے خاندان کی نگرانی کرتے رہتے تھے اور آیت "بلغ معه السعی" سے یہی مراد ہے لہٰذا اسحٰق (علیہ السلام) کی بشارت کا ذکر بالکل برمحل ہے، خود سید صاحب تورات کے ایک فقرہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"تورات میں یہ مذکور نہیں کہ حضرتِ ابراہیم بھی ساتھ آئے تھے لیکن کون شقی ہوگا جو اپنے فرزندِ اکبر کی پیدائش کی اُس نے خود دعا کی ہو جس کے لئے زندگی اُس نے خدا سے مانگی ہو اُس کو تنہا بے آب وگیاہ مقام میں ہمیشہ کے لئے جانے دے۔"[1]

اسی طرح سورۂ ابراہیمؑ کی آیت میں "عند بيتك المحرم" کے بعد یہ جملہ ہے۔

رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ	اے ہمارے پروردگار (میں نے کعبہ کے پاس ان کو
أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي	اس لئے بسایا تاکہ یہ نماز کو قائم کریں پس تو لوگوں کو
إِلَيْهِمْ (ابراہیم)	ان کی طرف پھیر دے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کی یہ دعا بیت اللہ کی تعمیر کے بعد سے متعلق ہے اور آیت کا سیاق وسباق صاف صاف اسی پر دلالت کرتا ہے، اس میں قیامِ صلوٰۃ کا ذکر ہے، اس میں حج کی طرف اشارہ ہے اور اس میں یہاں کے بسنے والوں کیلئے

[1] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۰۔

رزق کی وسعت کی تمنا جھلکتی ہے اور یہ سب باتیں جب ہی موزوں ہو سکتی ہیں کہ بیت اللہ اپنی تعمیر کے ساتھ موجود ہو البتہ ابنِ عباسؓ کی روایت میں بھی اس دعا کا ذکر آتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کو یہاں چھوڑتے وقت حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) نے جو دعا مانگی تھی وہ اسی کے قریب قریب تھی، اس لئے ابنِ عباس (رضی اللہ عنہ) کی روایت میں اس آیت کو بطورِ استشہاد نقل کر دیا گیا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ بعینہٖ یہی وہ دعا ہے جو اُس وقت انھوں نے مانگی تھی اور اس میں اسحٰقؑ کا بھی ذکر تھا، جب ابنِ عباس (رضی اللہ عنہ) خود روایت کر رہے ہیں کہ یہ واقعہ اسمٰعیلؑ کی شیرخوارگی کا ہے تو وہ کس طرح یہ کہہ سکتے تھے کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اُس وقت ایسی دعا مانگی کہ جس کے آخر میں اسمٰعیلؑ کے ساتھ اسحٰقؑ کی ولادت کا بھی ذکر تھا۔

سوم - اس بن کھیتی کی سرزمین (مکہ) کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں شور پانی کے سوائے شیریں پانی کا نام و نشان نہیں ہے اور آج بھی آلاتِ جدیدہ کی اعانت کے باوجود اُس زمین سے شیریں پانی کا اخراج ناممکن بنا ہوا ہے تو "زمزم" کا وجود یہاں کیسے ہوا؟ یہ مذہبی اور تاریخی دونوں حیثیت سے اہم سوال ہے، سو اِس کے متعلق اگرچہ آیاتِ قرآنی کوئی تصریح نہیں کرتیں، مگر بخاری کی یہی ابن عباسؓ والی ہر دو روایات اس کے وجود کی تاریخ بیان کرتی ہیں جس میں حضرتِ اسمٰعیلؑ کو شیرخوار ظاہر کیا گیا ہے، اور توراۃ میں بھی جس طرح اس کا ذکر ہے وہ اُن ہی آیات میں ہے جو اسمٰعیلؑ کو شیرخوار ظاہر کرتی ہیں۔

بہرحال اگرچہ قرآنِ عزیز کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسمٰعیل (علیہ السلام) اس سرزمین (مکہ) میں کس سن میں پہنچائے گئے، مگر بخاری کی روایات کہتی ہیں کہ یہ زمانہ اسمٰعیلؑ کی شیرخوارگی کا تھا۔ اور یہی صحیح ہے، پس ابنِ عباسؓ کی یہ روایت اسرائیلیات میں سے نہیں ہے بلکہ زبانِ وحی ترجمان کے بیان کردہ تفصیلات کی صحیح ترجمانی ہے۔

قرآنِ عزیز نے حضرتِ اسمٰعیلؑ کی ولادت کے متعلق ان کا نام لے کر صاف کوئی

ذکر نہیں کیا، البتہ بغیر نام لئے ہوئے اُن کی ولادت کی بشارت کا تذکرہ موجود ہے۔

ابراہیم (علیہ السلام) ابھی تک اولاد سے محروم ہیں اس لئے درگاہِ الٰہی میں ایک نیک اور صالح فرزند کے لئے دعا مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشتا، اور ولادتِ فرزند کی بشارت دیتا ہے۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ اے پروردگار مجھ کو ایک نکوکار لڑکا عطا کر، پس ہم نے
فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ○ (الصافات) اُس کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔

یہ "غلامِ حلیم" کون ہے؟ وہی اسمٰعیل جو ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوا، اس لئے کہ قرآن عزیز کی اس آیت سے دوسری آیت کے بعد حضرت اسحٰق کی بشارت کا ذکر ہے۔

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ اور بشارت دی ہم نے ابراہیم کو اسحٰق کی جو نکوکاروں میں سے
وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ (الصافات) ہوگا نبی ہوگا اور برکت دی ہم نے اُس پر اور اسحٰق پر،

پس جبکہ حضرتِ ابراہیمؑ کے ابھی دو بیٹے تھے اسمٰعیل اور اسحٰق اور تورات و تاریخ کی متفقہ نقول کے پیشِ نظر اسمٰعیل بڑے ہیں اور اسحٰق چھوٹے تو صاف ظاہر ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں جس لڑکے کی بشارت مذکور ہے اس سے حضرتِ اسمٰعیلؑ کے علاوہ دوسرا کون مراد ہو سکتا ہے؟

اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے ہاجرہ و اسمٰعیل کو مکہ میں آباد کیا تھا تو اُن کے لئے دعا کرتے ہوئے اس طرح اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ تمام تعریف اُس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھ کو
عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ۔ (ابراہیم) بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق عطا کئے۔

یہ آیت بھی اسی بات کی تصدیق کرتی ہے کہ الصافات کی آیت میں جس بشارت کا ذکر ہے اس سے حضرتِ اسمٰعیلؑ ہی مراد ہیں۔

ختنہ | جب حضرتِ ابراہیمؑ کی عمر ننانوے سال ہوئی اور حضرتِ اسمٰعیلؑ کی تیرہ سال تو

اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ ختنہ کرو، ابراہیم (علیہ السلام) نے تعمیلِ حکم میں پہلے اپنی ختنہ کیں، اور اس کے بعد اسمٰعیل (علیہ السلام) اور تمام خانہ زادوں اور غلاموں کی ختنہ کرائیں۔

تب ابراہام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل اور سب خانہ زادوں اور اپنے سب زر خریدوں کو یعنی ابراہام کے گھر کے لوگوں میں جتنے مرد تھے سب کو لیا، اور اسی روز اُن کا ختنہ کیا جس طرح خدا نے اُس کو فرمایا تھا جس وقت ابراہام کا ختنہ ہوا وہ ننانوے برس کا تھا اور جب اس کے بیٹے اسمٰعیل کا ختنہ ہوا وہ تیرہ برس کا تھا۔[1]

یہی رسمِ ختنہ آج بھی "ملتِ ابراہیمی" کا شعار ہے اور سنتِ ابراہیمی کے نام سے مشہور ہے۔

ذبحِ عظیم مقربین بارگاہِ الٰہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ وہ نہیں ہوتا جو عام انسانوں کے ساتھ ہے، اُن کو امتحان و آزمائش کی سخت سے سخت منزلوں سے گذرنا پڑتا، اور قدم قدم پر جاں سپاری اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم گروہِ انبیاء اپنے مراتب کے اعتبار سے امتحان کی صعوبتوں میں ڈالے جاتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام بھی چونکہ جلیل القدر نبی اور پیغمبر تھے اس لئے اُن کو بھی مختلف آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا، اور اپنی جلالتِ قدر کے لحاظ سے ہر دفعہ امتحان میں کامل و مکمل ثابت ہوئے، جب اُن کو آگ میں ڈالا گیا تو اُس وقت جس صبر اور رضا بہ قضاءِ الٰہی کا انھوں نے ثبوت دیا۔ اور جس عزم و استقامت کو پیش کیا وہ انہی کا حصہ تھا، اس کے بعد جب اسمٰعیل اور ہاجرہ کو فاران کے بیابان میں چھوڑ آنے کا حکم ملا تو وہ بھی معمولی امتحان نہ تھا، آزمائش اور سخت آزمائش کا وقت تھا۔ بڑھاپے اور پیری کی تمناؤں کے مرکز، راتوں اور دنوں کی دعاؤں کے ثمر اور گھر کے چشم و چراغ اسمٰعیل کو صرف حکمِ الٰہی کی تعمیل و امتثال میں ایک بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑتے ہیں اور پیچھے پھر کر بھی اُس کی طرف نہیں دیکھتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شفقتِ پدری جوش میں آجائے اور امتثالِ امرِ الٰہی میں کوئی لغزش ہو جائے۔

[1] پیدائش باب ۱۷ آیات ۲۳، ۲۵

ان دونوں کٹھن منزلوں کو عبور کرنے کے بعد اب ایک تیسرے امتحان کی تیاری ہے، جو پہلے دونوں سے بھی زیادہ زہرہ گداز اور جاں گسل امتحان ہے، یہی حضرتِ ابراہیمؑ تین شب مسلسل خواب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے ابراہیم! تو ہماری راہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے۔

انبیاء (علیہم السلام) کا خواب "رویاءِ صادقہ" اور وحیِ الٰہی ہوتا ہے اس لئے ابراہیم (علیہ السلام) رضاء و تسلیم کا پیکر بن کر تیار ہو گئے کہ خدا کے حکم کی جلد سے جلد تعمیل کریں، مگر چونکہ یہ معاملہ تنہا اپنی ذات سے وابستہ نہ تھا بلکہ اس آزمائش کا دوسرا جزو وہ "بیٹا" تھا جس کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس لئے باپ نے بیٹے کو اپنا خواب اور خدا کا حکم سنایا، بیٹا ابراہیم جیسے مجدد انبیاء و رسل کا بیٹا تھا فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا اور کہنے لگا کہ اگر خدا کی یہی مرضی ہے تو انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر پائیں گے، اس گفتگو کے بعد باپ بیٹے اپنی قربانی پیش کرنے کے لئے جنگل روانہ ہو گئے۔ باپ نے بیٹے کی مرضی پاکر مذبوح جانور کی طرح ہاتھ پیر باندھے، چھری کو تیز کیا اور بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ کر ذبح کرنے لگے، فوراً خدا کی وحی ابراہیمؑ پر نازل ہوئی، اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھلایا، بیشک یہ بہت سخت اور کٹھن آزمائش تھی، اب لڑکے کو چھوڑ اور تیرے پاس جو یہ مینڈھا کھڑا ہے اُس کو بیٹے کے بدلے میں ذبح کر، ہم نکوکاروں کو اسی طرح نوازا کرتے ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جھاڑی کے قریب ایک مینڈھا کھڑا ہے، حضرتِ ابراہیمؑ نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس مینڈھے کو ذبح کیا۔

یہی وہ "قربانی" ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی مقبول ہوئی کہ بطور یادگار کے ہمیشہ کے لئے ملتِ ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج بھی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام دنیاءِ اسلام میں یہ "شعار" اسی طرح منایا جاتا ہے۔

مگر اس پورے واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے "ذبیح" کون ہے۔ اسمٰعیل (علیہ السلام) یا اسحٰق (علیہ السلام)؟

قرآنِ عزیز نے اگرچہ "ذبیح" کا نام نہیں لیا مگر جس طرح اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اُس سے بغیر کسی کنج دکاؤ کے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصِ قرآنی اسمٰعیل کو ذبیح بتاتی ہے اور یہی واقعہ اور حقیقت ہے، والصافات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝	اے پروردگار! مجھ کو ایک نکوکار لڑکا عطا کر، پس بشارت دی ہم نے
فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا	اُن کو بردبار لڑکے کی، پھر جب وہ اس سن کو پہنچا کر باپ کے ساتھ
بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ	دوڑنے لگے، ابراہیم نے کہا اے میرے بیٹے میں نے
اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ	خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس تو دیکھ
مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ	کیا سمجھتا ہے؟ کہا" اے میرے باپ! جس بات کا تجھے حکم
مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ	کیا گیا ہے وہ کر، اگر اللہ نے چاہا تو مجھ کو صبر کرنے والوں میں
مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا	سے پائے گا۔ پس جب ان دونوں نے رضا و تسلیم کو اختیار
وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ	کرلیا اور پیشانی کے بل اُس (بیٹے) کو پچھاڑ دیا، ہم نے
يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ	اُس کو پکارا، اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا، بیشک
اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝	ہم اسی طرح نکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، بلاشبہ یہ کھلی ہوئی
اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗـؤُا الْمُبِيْنُ ۝	آزمائش ہے، اور بدلہ دیا ہم نے اُس کو بڑے ذبح (مینڈھے)
وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا	کے ساتھ، اور ہم نے آنے والی نسلوں میں اُس کے متعلق
عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓي	یہ باتی چھوڑا کہ ابراہیم پر سلام ہو، اس طرح ہم نکوکاروں کو
اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝	بدلہ دیا کرتے ہیں، بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝	ہے۔ اور بشارت دی ہم نے اس کو اسحٰق کی جو نبی ہوگا اور
وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝	نکوکاروں میں سے ہوگا، اور برکت دی ہم نے اس پر
وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓي اِسْحٰقَ ۭ (الصافات)	اور اسحٰق پر۔

اِن آیات میں ابراہیم (علیہ السلام) کے دو صاحبزادوں کی بشارت کا ذکر ہے پہلے لڑکے کا

نام نہیں لیا اور "غلامِ حلیم" کہہ کر اُس کے ذبحِ عظیم کے واقعہ کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد دوسرے لڑکے کی بشارت کا ذکر نام لے کر کیا "بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ" اور یہ طے شدہ امر ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے دونوں صاحبزادوں اسمٰعیل و اسحٰق میں سے اسمٰعیل بڑے ہیں اور اسحٰق چھوٹے پس جبکہ چھوٹے لڑکے کا ذکر بعد کی آیت میں نام لے کر کر دیا گیا تو پہلی آیت میں اسمٰعیل کے علاوہ اور کس کا ذکر ہو سکتا ہے؟ بلاشبہ وہ اسمٰعیل (علیہ السلام) ہی ہیں جنہوں نے "سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ" کہہ کر اور "وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ" کا مظاہرہ کر کے "وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ" کا اعزاز حاصل کیا، علاوہ ازیں صرف قرآنِ عزیز ہی اسمٰعیلؑ کو ذبیح نہیں کہتا بلکہ تورات کی عبارت کو اگر غور سے مطالعہ کیجئے تو وہ بھی یہی بتاتی ہے کہ اسمٰعیلؑ اور صرف اسمٰعیلؑ ہی ذبیح ہیں'

"اِن باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اُسے کہا کہ تو اپنے بیٹے ہاں اپنے اکلوتے بیٹے کو جس کو تو پیار کرتا ہے " اضحٰق کو لے " اور زمین موریاہ میں جا اور اُسے وہاں پہاڑوں میں سے ایک جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے لئے چڑھا۔[1]

تب خداوند کے فرشتے نے دوبارہ آسمان پر سے ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے اس لئے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا " اپنا اکلوتا ہی بیٹا" دریغ نہ رکھا میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا۔[2]

تورات کی ان ہر دو عبارات کے نشان زدہ فقروں "اپنے اکلوتے بیٹے" اور "اپنا اکلوتا ہی بیٹا" کو دیکھئے اور پھر تورات کی اُن گذشتہ آیات کو پڑھیے کہ جس میں اسمٰعیل (علیہ السلام) کو حضرت ابراہیم کا اکلوتا بیٹا بتایا گیا ہے کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام جب چودہ برس کے ہو چکے ہیں تب اسحٰق (علیہ السلام) کی ولادت ہوئی ہے، کیا ان سے یہ صاف طور سے واضح نہیں ہوتا کہ ذبیح جیسے اعزاز کو بنی اسرائیل کے ساتھ وابستہ کرنے کی یہ غلط حرص تھی جس نے یہود کو اس تحریف پر آمادہ کیا کہ انھوں نے اس عبارت میں " اکلوتے بیٹے" کے فقرے کے ساتھ "اسحٰق" کا نام بے محل جوڑ دیا؟ پس یہ اضافہ تورات کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اور نصِ قرآنی کے بھی اور واقعہ

[1] تورات پیدائش باب ۲۲ آیت ۱-۲- [2] ایضاً باب ۲۲- آیت ۱۵-۱۶-

وحقیقت کے بھی قطعاً خلاف ہے۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ "ذبیح اللہ" کا عظیم الشان شرف اسمٰعیل (علیہ السلام) ہی کے لئے مقسوم تھا۔

وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو وہ چاہے اس کو دے

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

سخت تعجب ہے کہ چند علماءِ اسلام بھی اس غلطی میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ "ذبیح" اسمٰعیلؑ نہ تھے، اسحٰقؑ تھے اور جو دلائل انھوں نے اس سلسلہ میں بیان کئے ہیں افسوس کہ ہم اُن سے متفق نہیں ہو سکتے، کیوں کہ ان کی بنیاد و اساس محض وہم وظن پر قائم ہے نہ کہ یقین کی روشنی پر۔ مثلاً اُن کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ "والصافات" کی مسطورۂ بالا آیات میں سے پہلی آیت "بَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ" میں کوئی نام مذکور نہیں ہے اور اس کے بعد کی آیات میں اُس کے ذبح سے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرمایا "بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ" تو کیا "غلامِ حلیم" بھی یہی "اسحٰق" نہیں ہیں؟ مگر آپ خود اندازہ کیجئے کہ یہ کس قدر غلط استدلال ہے، اوّل ان آیات کے سیاق وسباق کا مطالعہ کیجئے اور پھر غور کیجئے کہ "وَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ" کے بعد "وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ" کو عطف کے ذریعہ جس طرح جُدا کیا گیا ہے عربی اصولِ نحو کے مطابق کون سی گنجائش ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی شخصیت قرار دیا جائے خصوصاً جب کہ دونوں کی بشارت کے ذکر کے ساتھ ساتھ جُدا جُدا اُن کے اوصاف بھی بیان کئے گئے ہیں،

صاحب قصص الانبیاء عبد الوہاب نجار نے اس موقعہ پر آیت "وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ" میں علیہ کی ضمیر "ذبیح" کی جانب راجع کی ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے "ہم نے برکت نازل کی اس "ذبیح" پر اور اسحٰق پر اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ پورا قصہ بیان کرنے کے بعد اسحٰق (علیہ السلام) کی بشارت کا ذکر اس بات کے لئے "نص" ہے کہ صاحب قصہ ذبح کا اسحٰق کے علاوہ ہے اور وہ صرف اسمٰعیلؑ ہی ہو سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ واقعہ مکّہ کے قریب منیٰ میں پیش آیا ہے اور تورات کا جملہ "اکلوتا بیٹا" اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ ابھی تک حضرتِ اسحٰقؑ کی ولادت بھی نہیں ہوئی لہٰذا تورات کا اس واقعہ کو موریا کے قریب بتانا اسی قسم کی تحریف ہے جس سے تورات کا کوئی باب خالی نہیں اور جس کا انکار بداہت کا انکار ہے۔[1]

یہ مسئلہ اگرچہ بہت زیادہ تفصیل طلب ہے لیکن ہم نے صرف ضروری امور کے بیان کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔[2]

بناءِ کعبہ حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) اگرچہ فلسطین میں مقیم تھے مگر برابر مکّہ میں ہاجرہ و اسمٰعیل کو دیکھنے آتے رہتے تھے، اسی اثناء میں ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ کعبۃ اللہ کی تعمیر کرو، حضرتِ ابراہیمؑ نے حضرتِ اسمٰعیلؑ سے تذکرہ کیا اور دونوں باپ بیٹوں نے بیت اللہ کی تعمیر شروع کر دی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں[3] ایک روایت نقل کی ہے، جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی اساس حضرتِ آدم (علیہ السلام) کے ہاتھوں رکھی گئی — اور ملائکۃ اللہ نے اُن کو وہ مقام بتا دیا تھا جہاں کعبہ کی تعمیر ہونی تھی، مگر ہزاروں سال کے حوادث نے عرصہ ہوا اُس کو بے نشان کر دیا، البتہ اب بھی وہ ایک ٹیلہ یا اُبھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا، یہی وہ مقام ہے جس کو وحیِ الٰہی نے ابراہیم (علیہ السلام) کو بتایا اور انھوں نے اسمٰعیل (علیہ السلام) کی مدد سے اُس کو کھودنا شروع کیا تو سابق تعمیر کی بنیادیں نظر آنے لگیں، انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر کی گئی، مگر قرآنِ عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ حضرتِ ابراہیمؑ ہی سے شروع کیا ہے اور اس سے پہلی حالت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

---

[1] تحریف کیلئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہٗ کی کتاب "اظہار الحق" قابلِ مطالعہ ہے،

[2] اس مسئلہ پر مولانا عبد الحمید صاحب فراہی مرحوم کا رسالہ "الرای الصحیح فی من ھو الذبیح" بہترین معلومات کا حامل ہے۔ [3] جلد ۶ ص ۲۸۰

حاصل یہ کہ اس واقعہ سے قبل تمام کائنات اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں بتوں اور ستاروں کی پرستش کے لئے ہیکل اور مندر موجود تھے اور اُن ہی کے ناموں پر بڑی بڑی تعمیرات کی جاتی تھیں۔

مصریوں کے یہاں سورج دیوتا، ازدریس، ایزیس، حوریس اور بعل دیوتا سب ہی کے نام پر ہیکل اور مندر تھے، اشوریوں نے بعل دیوتا کا ہیکل بنایا اور ابوالہول کا مجسمہ بنا کر اُس کی جسمانی عظمت کا مظاہرہ کرایا۔ کنعانیوں نے مشہور قلعہ بعلبک میں اسی بعل کا مشہور ہیکل بنایا تھا جو آج تک یادگار چلا آتا ہے، غزہ کے باشندے "داجون" مچھلی دیبی کے مندر پر چڑھاوے چڑھاتے تھے، جس کی شکل انسان کی اور جسم مچھلی کا بنایا گیا تھا، عمونیوں نے سورج دیوتا کے ساتھ عشتارون (قمر) کو دیبی بنا کر پوجا اور اس کے لئے عظیم الشان ہیکل تیار کئے، فارس نے آگ کی تقدیس کا اعلان کر کے آتشکدے تیار کئے، رومیوں نے مسیح اور کنواری مریم کے بُت بنا کر کلیساؤں کو زینت دی اور ہندیوں نے مہاتما بدھ، شری رامچندر، شری مہادیر اور مہادیو کو دیوتا اور اوتار مان کر اور کالی دیوی، سیتلا دیوی، سیتا دیوی اور پاربتی دیوی ناموں سے ہزاروں بُتوں کی پرستش کے لئے کیسے کیسے عظیم الشان منادر تیار کئے، ہردوار، پریاگ، کاشی پوری، ٹیکسلا، سانچی اور بودھ گیا جیسے مذہبی مقامات اس کی زندہ شہادتیں ہیں۔

مگر ان سب کے برعکس صرف خدائے واحد کی پرستش اور اس کی یکتائی کے اقرار میں سرِ نیاز جھکانے کے لئے یا یوں کہئے کہ توحید الٰہی کی سربلندی کے اظہار کے لئے دنیا کے بتکدوں میں پہلا گھر جو خدا کا گھر کہلایا وہ یہی "بیت اللہ" ہے۔

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا ❊ خلیل ایک معمار تھا جس بِنا کا

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	بیشک سب سے پہلا وہ گھر جو لوگوں کے لئے (خدا کی یاد کیلئے) بنایا
لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی	گیا البتہ وہ ہے جو مکہ میں ہے وہ سراپا برکت ہے اور جہان والوں
لِّلْعٰلَمِیْنَ (آلِ عمران)	کے لئے ہدایات (کا سرچشمہ)

اسی تعمیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ ابراہیمؑ جیسا جلیل القدر پیغمبر اُس کا معمار ہے اور اسمٰعیلؑ جیسا نبی و ذبیح اُس کا مزدور، باپ بیٹے برابر اُس کی تعمیر میں مصروف ہیں اور جب اُسکی دیواریں اوپر اُٹھتی ہیں اور بزرگ باپ کا ہاتھ اوپر تعمیر سے معذور ہو جاتا ہے تو قدرت کی ہدایت کے مطابق ایک پتھر کو باڑ بنایا جاتا ہے جس کو اسمٰعیل علیہ السلام اپنے ہاتھ سے سہارا دیتے' اور ابراہیم علیہ السلام اُس پر چڑھ کر تعمیر کرتے جاتے ہیں، یہی وہ یادگار ہے جو آج مقامِ ابراہیم کے نام سے موسوم ہے، جب تعمیر اس حد پر پہونچی جہاں آج حجرِ اسود نصب ہے تو جبرئیل امین نے ان کی راہنمائی کی اور حجرِ اسود کو اُن کے سامنے ایک پہاڑی سے محفوظ نکال کر دیا جس کو جنت کا لایا ہوا پتھر کہا جاتا ہے تاکہ وہ نصب کر دیا جائے۔

بیت اللہ تعمیر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو بتایا کہ یہ ملتِ ابراہیمی کے لئے (قبلہ) اور ہمارے سامنے جھکنے کا نشان ہے، اس لئے یہ توحید کا مرکز قرار دیا جاتا ہے، تب ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اور اُن کی ذرّیت کو اقامتِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کی ہدایت دے اور استقامت بخشے اور ان کے لئے پھلوں' میووں' اور رزق میں برکت عطا فرمائے اور تمام اقطاعِ عالم کے بسنے والوں میں سے ہدایت یافتہ گروہ کو اس طرف متوجہ کرے کہ وہ دور دور سے آئیں اور مناسکِ حج ادا کریں اور ہدایت و رشد کے اس مرکز میں جمع ہو کر اپنی زندگی کی سعادتوں سے دامن بھریں'

قرآن عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر' تعمیر کے وقت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی مناجات، اقامتِ صلوٰۃ اور مناسکِ حج کی ادا کے لئے شوق و تمنا کے اظہار' اور بیت اللہ کے مرکزِ توحید ہونے کے اعلان کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے اور نئے نئے اسلوب و طرزِ ادا سے اُس کی عظمت اور جلالت و جبروت کو ان آیات میں واضح فرمایا ہے:۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ	بلاشبہ پہلا گھر جو انسان کے لئے (خدا پرستی کا معبد و مرکز) بنایا گیا ہے، وہ وہی
لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا	(عبادت گاہ) ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا، اور تمام انسانوں کے لئے
وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ فِيْهِ	سرچشمۂ ہدایت' اس میں (دینِ حق کی) روشن نشانیاں ہیں، از انجملہ

اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ	مقامِ ابراہیم ہے (یعنی ابراہیم کے کھڑے ہونے اور عبادت کرنے کی جگہ، جو اُس وقت
اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَ مَنْ دَخَلَهٗ	سے لیکر آج تک بغیر کسی شک و شبہ کے مشہور و معین رہی ہے) اور (از انجملہ یہ بات
كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى	ہے کہ) جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن و حفاظت میں آگیا، اور
النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ	(از انجملہ یہ کہ) اللہ کی طرف سے لوگوں کے لئے یہ بات ضروری ہوگئی کہ اگر اس
اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ	تک پہنچنے کی استطاعت پائیں تو اس گھر کا حج کریں، بایں ہمہ جو کوئی (اس
وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ	حقیقت سے) انکار کرے (اور اس مقام کی پاکی و فضیلت کا اعتراف نہ کرے)
عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝	تو یاد رکھو اللہ کی ذات تمام دنیا سے بے نیاز ہے (وہ اپنے کاموں کے لئے
(ع آلِ عمران)	کسی فرد اور قوم کا محتاج نہیں!)
وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ	اور (پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (مکہ کے) اس گھر کو (یعنی خانۂ کعبہ کو)
مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ	انسانوں کی گرد آوری کا مرکز اور امن و حرکت کا مقام ٹھہرا دیا اور حکم دیا کہ ابراہیم
وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ	کے کھڑے ہونے کی جگہ (ہمیشہ کے لئے) نماز کی جگہ بنائی جائے، اور ہم نے
مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ	ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا تھا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے اُسے طواف
وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ	کرنے والوں، عبادت کے لئے ٹھہرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے
لِلطَّآئِفِیْنَ وَ الْعٰكِفِیْنَ	لئے (ہمیشہ) پاک رکھنا (اور ظلم و معصیت کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرنا!) اور
وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَ اِذْ قَالَ	پھر جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے خدا کے حضور دعا مانگی تھی: "اے پروردگار!
اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا	اس جگہ کو (جو دنیا کی آباد سرزمینوں سے دور اور سرسبزی و شادابی سے یک قلم
بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ	محروم ہے) امن و امان کا ایک آباد شہر بنا دے، اور اپنے فضل و کرم سے ایسا
مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ	کر کہ یہاں کے بسنے والوں میں جو لوگ تجھ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں
مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ	ان کے رزق کیلئے ہر طرح کی پیداوار مہیا ہو جائے"! اس پر ارشادِ الٰہی ہوا تھا کہ
قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ	(تمہاری دعا قبول کی گئی اور یہاں کے باشندوں میں سے) جو کوئی کفر کا شیوہ
قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى	اختیار کرے گا، سو اُسے بھی ہم (سروسامان رزق سے) فائدہ اٹھانے دیں گے

عَذَابِ النَّارِ ۚ وَبِئْسَ	البتہ یہ فائدہ اٹھانا بہت تھوڑا ہوگا، کیوں کہ بالآخر اُسے (پاداشِ عمل میں) چار و
الْمَصِيرُ ۝ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ	ناچار دوزخ میں جانا ہے، اور (جو بدبخت نعمت کی راہ چھوڑ کر عذاب کی راہ اختیار کرلے
الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ	تو کیا ہی بُری اس کی راہ ہے اور) کیا ہی بُرا اُس کا ٹھکانا ہے! اور (پھر دیکھو وہ کیسا
وَإِسْمَاعِيلُ ۖ رَبَّنَا تَقَبَّلْ	عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا) جب ابراہیم خانۂ کعبہ کی بنیاد چُن رہا تھا،
مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ	اور اسمٰعیل بھی اُس کے ساتھ شریک تھا (اُن کے ہاتھ تو پتھر چُن رہے تھے،
الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا	اور دل و زبان پر یہ دعا طاری تھی!) "اے پروردگار! (ہم تیرے دو عاجز بندے
مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا	تیرے مقدس نام پر اس گھر کی بنیاد رکھ رہے ہیں) ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول
أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا	ہو! بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور (مصالح عالم کا) جاننے والا ہے۔
مَنَاسِكَنَا وَتُبْ	اے پروردگار! (اپنے فضل و کرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم
عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ	(یعنی تیرے حکموں کے فرمانبردار) ہو جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی
التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا	امت پیدا کردے جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو! خدایا ہماری عبادت کے (سچے)
وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا	طور طریقے بتا دے، اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر، بلاشبہ تیری ہی ذات ہے
مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ	جو رحمت سے درگزر کرنے والی ہے اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں! اور
آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ	خدایا! (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول
وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ	مبعوث ہو جو انہی میں سے ہو، وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے، کتاب اور
إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ	حکمت کی اُنھیں تعلیم دے اور (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) ان کے دلوں کو مانجھ دے،
الْحَكِيمُ ۝ (البقرة)	اے پروردگار! بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی اور سب پر غالب ہے:
وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ	اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیم کیلئے خانۂ کعبہ کی جگہ مقرر کردی،
الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا	(اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کر، اور میرا یہ گھر اُن لوگوں
وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ	کے لئے پاک رکھ جو طواف کرنے والے ہوں، عبادت میں سرگرم رہنے والے
وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ وَأَذِّنْ فِي	ہوں، رکوع و سجود میں جھکنے والے ہوں! اور (حکم دیا کہ) "لوگوں میں

النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا	حج کا اعلان پکار دے، لوگ تیرے پاس دنیا کی تمام دور دراز راہوں
وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ	سے آیا کریں گے پاپیادہ اور ہر طرح کی سواریوں پر جو (مشقتِ سفر سے)
فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ	تھکی ہوئی ہوں گی، وہ اس لئے آئیں گے کہ اپنے فائدہ پانے کی جگہ میں
وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ	حاضر ہو جائیں اور ہم نے جو پالتو جانور پائے ان کے لئے مہیا کر دیئے ہیں،
مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ	ان کی قربانی کرتے ہوئے مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں، پس قربانی کا
بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا	گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیروں کو بھی کھلاؤ، پھر قربانی کے بعد وہ
وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۝ ثُمَّ	اپنے جسم و لباس کا میل کچیل دور کر دیں (یعنی احرام اتار دیں) نیز اپنی
لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ	نذریں پوری کریں اور اس خانۂ قدیم (یعنی خانۂ کعبہ) کے گرد پھیرے
وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝	پھر لیں۔ تو دیکھو (حج کی) بات یوں ہوئی اور جو کوئی اللہ کی ٹھہرائی
ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ	ہوئی حرمتوں کی عظمت مانے، تو اس کے لئے اس کے پروردگار کے
فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَ	حضور بڑی ہی بہتری ہے، اور (یہ بات بھی یاد رکھو کہ) ان جانوروں
اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى	کو چھوڑ کر جن کا حکم قرآن میں سنا دیا گیا ہے تمام چارپائے تمہارے لئے
عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ	حلال کیے گئے ہیں، پس چاہیئے کہ بتوں کی ناپاکی سے بچتے رہو،
الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝	نیز جھوٹ بولنے سے۔ صرف اللہ ہی کے ہو کر رہو، اس کے ساتھ کسی
حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۗ	کو شریک نہ کرو، جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، تو
وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ	اس کا حال ایسا سمجھو جیسے بلندی سے اچانک نیچے گر پڑا، جو چیز
مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ	اس طرح گرے گی، اسے یا تو کوئی پرندا اچک لے گا یا ہوا کا جھونکا کسی
اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ	دور دراز گوشہ میں لے جا کر پھینک دے گا! (حقیقت حال) یہ ہے،
سَحِيْقٍ ۝ ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ	پس (یاد رکھو) جس کسی نے اللہ کی نشانیوں کی عظمت مانی، تو اس
شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى	نے ایسی بات مانی جو فی الحقیقت دلوں کی پرہیزگاری کی باتوں میں
الْقُلُوْبِ ۝ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى	سے ہے، ان (چارپایوں) میں ایک مقررہ وقت تک تمہارے لئے

أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ	طرح طرح کے) فائدے ہیں۔ پھر (اس خانۂ قدیم تک پہنچاکر
إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝ (الحج ع)	اُن کی قربانی کرنی ہے)
وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن	اور (دیکھو) قربانی کے یہ اونٹ (جنھیں دور دور سے حج کے موقع پر
شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ	لا یا جاتا ہے، تو ہم نے اُسے اُن چیزوں میں سے ٹھہرادیا ہے جو تمہارے
فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا	لئے اللہ کی (عبادت کی) نشانیوں میں سے ہیں، اس میں تمہارے
صَوَآفَّ فَإِذَا وَجَبَتْ	لئے بہتری کی بات ہے، پس چاہیئے کہ اُنھیں قطار در قطار ذبح کرتے
جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا	ہوئے اللہ کا نام یاد کرو، پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں (یعنی ذبح ہو جائیں)
الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذَٰلِكَ	تو ان کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور فقیروں اور زائروں کو بھی
سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ	کھلاؤ، اس طرح ہم نے اُن جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا تاکہ
لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا	(احسانِ الٰہی کے) شکر گذار ہو، یاد رکھو اللہ تک ان قربانیوں کا نہ تو
دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ	گوشت پہنچتا ہے نہ خون، اس کے حضور جو کچھ پہنچ سکتا ہے وہ تو صرف
التَّقْوَىٰ مِنكُمْ كَذَٰلِكَ	تمہارا تقویٰ ہے (یعنی تمہارے دل کی نیکی ہے) ان جانوروں کو اس
سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ	طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ اللہ کی رہنمائی پر اس کے شکر گذار رہو
عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَبَشِّرِ	اور اس کے نام کی بڑائی کا آوازہ بلند کرو، اور نیک کرداروں کیلئے
الْمُحْسِنِينَ ۝ (الحج ع)	(قبولیتِ حق کی) خوشخبری ہے۔

اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کا ذکر قرآن عزیز یا احادیثِ نبوی میں تفصیل کے ساتھ نہیں آیا، البتہ توراۃ نے ان کے ناموں کا علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

توراۃ کے قول کے مطابق اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے جو بارہ سردار کہلائے اور عرب کے مستقل قبائل کے جدِ قبیلہ بنے اور ایک لڑکی تھی جس کا نام بشامہ یا محلاۃ تھا۔

اور ابراہام کے بیٹے اسمٰعیل کا جسے سرہ کی لونڈی مصری ہاجرہ ابراہیم کے لئے جنی تھی یہ نسب نامہ ہے اور یہ اسمٰعیل کے بیٹوں کے نام ہیں مطابق اُن کے ناموں اور نسبوں کی فہرست کے

اسمٰعیل کا پہلوٹھا نبایوت، قیدار، ادبئیل، مبشام، مشماع، دومہ، مسّا، حدار، تیما، یطور، نافیش، قیدما، یہ اسمٰعیل کے بیٹے ہیں، اور اُن کے نام اُن کی بستیوں اور قلعوں میں یہ ہیں اور یہ اپنی اُمتوں کے بارہ رئیس تھے۔[1]

ان میں دو بڑے بیٹے نابت یا نبایوت اور قیدار بہت مشہور ہیں اور ان کا ذکر تورات میں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے اور عرب مورخین بھی ان کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہیں، یہی وہ نابت ہیں جن کی نسل، اصحاب الحجر کہلائی اور قیدار کی نسل اصحاب الرس کے نام سے مشہور ہوئی ان کے علاوہ دوسرے بھائیوں اور ان کے خاندانوں کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔

قرآن عزیز میں حضرت اسمٰعیل کا تذکرہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں متعدد بار ہوا ہے، ان میں سے ایک جگہ صرف اوصاف مذکور ہیں، یہ "ذبح عظیم" والی آیت ہے اور دو مقام پر اُس بشارت کے موقع پر ذکر آیا ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام کی پسری اولاد کی بشارت دی گئی ہے۔ اور سورۂ مریم میں اُن کا نام لے کر اُن کے اوصاف جمیلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ	اور یاد کر کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر تھا وہ وعدہ کا سچا
الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۚ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ	اور تھا رسول نبی اور حکم کرتا تھا اپنے اہل کو نماز کا اور
بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (مریم)	زکوٰۃ کا اور تھا وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ۔

حضرت اسمٰعیل کی وفات حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر جب ایک سو سینتیس سال کی ہوئی تو اُن کا انتقال ہو گیا، اُس وقت ان کے سامنے ان کی اولاد اور نسل کا سلسلہ بہت پھیل گیا تھا جو حجاز، شام، عراق، فلسطین اور مصر تک پھیلی۔

تورات ایک موقع پر اشارہ کرتی ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی قبر فلسطین ہی میں ہے[2] اور یہیں ان کی وفات ہوئی اور عرب مورخین کہتے ہیں کہ وہ اور اُن کی والدہ ہاجرہ بیت اللہ کے قریب حرم کے اندر مدفون ہیں۔[3]

---

[1] ۲۵ - آیت ۱۲ - ۱۶ پیدائش [2] پیدائش باب ۲۵ [3] تاریخ طبری جلد ۱

حضرتِ اسحٰق علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کی عمر سو سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بشارت سنائی کہ سارہ کے بطن سے بھی تیرے ایک بیٹا ہو گا اس کا نام اسحٰق رکھنا۔

اور خدا نے ابراہام سے کہا کہ تیری جورو سری جو ہے اُس کو سری مت کہا کر بلکہ اُس کا نام سرہ ہے اور میں اُسے برکت دوں گا، اور اُس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا یقیناً میں اُسے برکت ... گا کہ وہ قوموں کی ماں ہوگی، اور ملکوں کے بادشاہ اُس سے پیدا ہوں گے، تب ابراہام منہ کے بل گرا اور ہنس کے دل میں کہا کہ کیا سو برس کے مرد کو بیٹا پیدا ہو گا اور کیا سارہ جو نوّے برس کی ہے بیٹا جنے گی؟ اور ابراہیم نے خدا سے کہا کہ کاش کہ اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے تب خدا نے کہا کہ بیشک تیری جورو سرہ تیرے لئے بیٹا جنے گی تو اُس کا نام اضحٰق رکھنا۔[۱]

اور قرآنِ عزیز میں ہے:۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۖ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ فَلَمَّا رَآ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۚ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ

اور بلاشبہ ہمارے ایلچی (فرشتے) ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے، انھوں نے ابراہیم کو سلام کیا اور ابراہیم نے سلام کہا، تھوڑی دیر کے بعد ابراہیم بچھڑے کا بھنا گوشت لایا اور جب اُس نے دیکھا کہ اُن کے ہاتھ اُس کی طرف نہیں بڑھتے تو اُن کو اجنبی محسوس کیا اور اُن سے خوف کھایا وہ کہنے لگے خوف نہ کرو، ہم لوط کی قوم پر (عذاب کے لئے) بھیجے گئے ہیں، اور ابراہیم کی بیوی (سارہ) کھڑی ہوئی ہنس رہی تھی، پس ہم نے اس کو اسحٰق کی اور اس کے

[۱] ۱۷ باب : آیت ۱۵ تا ۱۹۔

فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ
اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ یٰوَیْلَتٰٓی
ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّھٰذَا بَعْلِیْ
شَیْخًا ؕ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ۝
قَالُوْٓا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ
اللّٰهِ وَبَرَکٰتُهٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ ؕ
اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝ (ع ہود)

بعد (اس کے بیٹے) یعقوب کی بشارت دی، سارہ
کہنے لگی، کیا میں نگوڑی بڑھیا جنوں گی اور جب کہ
یہ ابراہیم میرا شوہر بھی بوڑھا ہے، واقعی یہ تو بہت
عجیب بات ہے، فرشتوں نے کہا، کیا تو خدا کے حکم
پر تعجب کرتی ہے، اے اہلِ بیت تم پر خدا کی رحمت
و برکت ہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر طرح قابلِ حمد ہے
اور بہت بزرگ۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ
وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ ۝ فَاَقْبَلَتِ
امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ فَصَکَّتْ وَجْهَهَا
وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ ۝ قَالُوْا کَذٰلِکِ ۙ
قَالَ رَبُّکِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَکِیْمُ
الْعَلِیْمُ ۝ (ع الذاریات)

پس محسوس کیا (ابراہیم نے) ان سے خوف، وہ (فرشتے)
کہنے لگے خوف نہ کھا اور بشارت دی اس کو ایک سمجھ دار
لڑکے کی، پس آئی بی بی (سارہ) ابراہیم کی سخت بے چینی
کا اظہار کرتی ہوئی پھر پیٹ لیا اُس نے اپنا منہ اور کہنے لگی
بانجھ بڑھیا (اور بچہ) فرشتوں نے کہا تیرے پروردگار نے
یہی کہا ہے، ایسا ہی ہوگا، وہ دانا ہے حکمت والا۔

قَالَ اِنَّا مِنْکُمْ وَجِلُوْنَ ۝ قَالُوْا
لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ ۝
قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰٓی اَنْ
مَّسَّنِیَ الْکِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ۝
قَالُوْا بَشَّرْنٰکَ بِالْحَقِّ فَلَا تَکُنْ
مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ ۝ قَالَ وَمَنْ
یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا
الضَّآلُّوْنَ ۝ (الحجر ع)

ابراہیم نے کہا بیشک مجھ کو تم سے خوف معلوم ہوتا ہے،
فرشتوں نے کہا ہم سے نہ ڈر بلاشبہ ہم تجھ کو ایک سمجھ دار لڑکے
کی بشارت دینے آئے ہیں، ابراہیم نے کہا کیا تم مجھ کو اس
بڑھاپا آجانے پر بھی بشارت دیتے ہو، یہ کیسی بشارت دے
رہے ہو؟ فرشتوں نے کہا ہم تجھ کو حق بات کی بشارت
دے رہے ہیں پس تو نا اُمید ہونے والوں میں سے نہ ہو
ابراہیم نے کہا اور نہیں نا امید ہوتے اپنے پروردگار کی
رحمت سے مگر گمراہ۔

ختنہ | جب حضرتِ اسحٰق آٹھ دن کے ہوئے تو حضرتِ ابراہیمؑ نے ان کی ختنہ کرادی۔

"اور ابرہام نے جیسا کہ خدا نے اُسے حکم دیا تھا اپنے بیٹے اضحاق کا جب وہ آٹھ دن کا ہوا ختنہ کیا"[1]

اسحٰق اصل تلفظ کے اعتبار سے "یسحق" ہے، یہ عبرانی لفظ ہے جس کا عربی ترجمہ "یضحک" (ہنستا ہے) ہوتا ہے۔

خدا کے فرشتوں نے جب حضرتِ ابراہیمؑ کو سو برس اور حضرتِ سارہ کو نوّے سال کے سن میں بیٹا ہونے کی بشارت دی تھی تو حضرتِ ابراہیمؑ نے اچنبھا سمجھا تھا اور حضرتِ سارہ کو بھی یہ سُن کر ہنسی آگئی تھی اس لئے اُن کا یہ نام تجویز ہوا، یا اس لئے یہ نام رکھا گیا کہ ان کی پیدائش حضرتِ سارہ کی مسرت و شادمانی کا باعث ہوئی۔

عربی قاعدہ سے "یضحک" مضارع کا صیغہ ہے، اہلِ عرب کا ہمیشہ سے ہی یہ دستور رہا ہے کہ وہ مضارع کے صیغوں کو بھی بطور نام کے استعمال کرتے ہیں، چنانچہ یعرب، یملک جیسے نام عرب میں معروف و مشہور ہیں۔

اسحٰق علیہ السلام کی شادی | قرآنِ عزیز میں اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ توراۃ میں اس سلسلہ میں ایک طویل قصہ مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی سے فرمایا کہ میں یہ طے کرچکا ہوں کہ اسحٰق کی شادی فلسطین کے ان کنعانی خاندانوں میں ہرگز نہ کروں گا بلکہ میری یہ خواہش ہے کہ اپنے خاندان اور باپ دادا کی نسل میں اس کا رشتہ کروں اس لئے تو سازو سامان لے کر جا اور فدان آرام میں میرے بھتیجے بتوئیل بن ناحور کو یہ پیغام دے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اسحٰق سے کردے، اگر وہ راضی ہوجائے تو اُس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں اسحٰق کو اپنے پاس سے جدا کرنا نہیں چاہتا لہٰذا لڑکی کو تیرے ساتھ رخصت کردے، الیعزر حضرتِ ابراہیمؑ کے حکم کے مطابق فوراً آرام کو روانہ ہوگیا جب آبادی کے قریب پہنچا تو اپنے اونٹ کو بٹھایا تاکہ حالات معلوم کرے، الیعزر نے جس جگہ اونٹ بٹھایا تھا، اُسی کے قریب حضرتِ ابراہیمؑ کے بھائی بتوئیل کا خاندان آباد تھا۔ ابھی یہ

[1] توراۃ باب ۲۱ آیت ۴

اس میں مشغول تھا کہ سامنے ایک حسین لڑکی نظر آئی جو پانی کا گھڑا بھر کر مکان کو لئے جارہی تھی۔ الیعزر نے اُس سے پانی مانگا، لڑکی نے اس کو بھی پانی پلایا اور اس کے اونٹ کو بھی اور پھر حال دریافت کیا، الیعزر نے بتوئیل کا پتہ دریافت کیا، لڑکی نے کہا کہ وہ میرے باپ ہیں اور الیعزر کو مہمان بناکر لے گئی، مکان پر پہنچ کر اپنے بھائی لابان کو اطلاع دی، لابان نے الیعزر کی بیحد مدارات کی اور آمد کی وجہ دریافت کی، الیعزر نے حضرتِ ابراہیمؑ کا پیغام سُنایا۔ لابان کو اس پیغام سے بیحد مسرت ہوئی اور اُس نے بہت سا ساز و سامان دے کر اپنی بہن رفقہ کو الیعزر کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

حضرتِ اسحٰق کی اولاد رفقہ سے حضرتِ اسحٰقؑ کے توأم دو لڑکے علی الترتیب عیسو اور یعقوب پیدا ہوئے اس وقت حضرتِ اسحٰقؑ کی عمر ساٹھ سال کی تھی، اسحٰق علیہ السلام عیسو کو زیادہ چاہتے تھے اور رفقہ یعقوب سے زیادہ پیار رکھتی تھیں، عیسو شکاری تھا اور بوڑھے ماں باپ کو شکار کا گوشت لاکر دیتا تھا اور یعقوب خیمہ ہی میں رہتا تھا۔

ایک روز عیسو تھکا ماندہ آیا اور یعقوب سے کہنے لگا میں ماندہ ہوں اور آج شکار بھی ہاتھ نہ آیا تو اپنے کھانے مسور اور لپسی میں سے مجھے بھی کچھ دے، یعقوب نے کہا کہ فلسطینیوں کا یہ دستور ہے کہ میراث بڑے لڑکے کو ملتی ہے اس لئے باپ کا وارث تو ہوگا اگر تو اس حق سے دست بردار ہو جائے تو میں تجھ کو کھانا کھلاؤں گا، عیسو نے کہا مجھے اس میراث کی کوئی پرواہ نہیں تو ہی وارث ہو جانا، تب یعقوب نے عیسو کو کھانا کھلایا۔

ایک مرتبہ حضرتِ اسحٰقؑ نے (جبکہ بہت بوڑھے اور ضعیف البصر ہوگئے تھے) یہ چاہا کہ عیسو کو برکت دیں، اور اس سے کہا کہ جا شکار کرکے لا اور عمدہ کھانا پکا کر میرے سامنے پیش کر، رفقہ نے یہ سُنا تو دل سے چاہا کہ یہ برکت یعقوب کو ملے۔ فوراً یعقوب کو بُلا کر کہا کہ جلدی عمدہ کھانا تیار کرکے باپ کے سامنے لیجا اور دعاءِ برکت کا طالب ہو، یعقوب نے نام بتائے بغیر ایسا ہی کیا اور اسحٰق سے دعاءِ برکت حاصل کرلی، جب عیسو آیا اور اُس نے سب قصہ سُنا تو

انتہائی ناگواری محسوس کی اور یعقوب سے کینہ رکھنے لگا۔ تب رفقہ نے یعقوب کو رائے دی کہ وہ یہاں سے، اپنے ماموں لابان کے پاس کچھ دنوں کے لئے چلا جائے۔ یعقوب ماموں کے یہاں پہنچا اور وہیں کچھ مدت گذاری اور یکے بعد دیگرے، لابان کی دونوں لڑکیوں لئیہ اور راحیل سے شادی کرلی۔[1]

یہ روایت اگرچہ اپنے مضامین کے اعتبار سے بہت زیادہ ناقابلِ اعتماد ہے اور اس میں جو اخلاقی زندگی پیش کی گئی ہے وہ توراۃ کی دوسری محرف روایات کی طرح انبیاء علیہم السلام اور اُن کے خاندان کے شایانِ شان بھی نہیں ہے، مگر اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی شادی اُن کے ماموں کے یہاں ہوئی اور وہ ایک عرصہ تک اُنکے پاس رہے،

اور عیسو بھاگ کر اپنے چچا اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس چلے گئے اور وہاں اُنکی صاجزادی بشامہ یا باسمہ یا محلاۃ (جو بھی نام صحیح ہو) سے شادی کرلی، اور ان کے علاوہ بھی شادیاں کیں، اور اپنے خاندان کو لے کر سعیر (یا ساعیر) کو اپنا وطن بنالیا، اور یہاں ادوم کے نام سے مشہور ہوئے اور اس لئے اُن کی نسل بنی ادوم کے نام سے مشہور ہوئی۔

حضرتِ ابراہیمؑ اور حق الیقین کی طلب

گذشتہ سطور میں چونکہ حضرتِ اسمٰعیل اور حضرتِ اسحٰق (علیہما السلام) کا ذکر آگیا تھا اس لئے اُن سے متعلق واقعات کو تفصیل سے بیان کردینا مناسب سمجھا گیا تاکہ واقعات کے تسلسل میں انتشار پیدا نہ ہو، نیز یہ واقعات بھی درحقیقت حضرت ابراہیمؑ ہی کی زندگی سے متعلق ہیں اس۔ لئے اُن کا تذکرہ بے محل نہیں ہے، اب حضرتِ ابراہیمؑ کے باقی حالات قابلِ توجہ ہیں۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو حقائقِ اشیاء کی جستجو اور طلب کا طبعی ذوق تھا، اور وہ ہر شے کی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کو اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتے تھے تاکہ اُن کے ذریعہ ذاتِ واحد (اللہ جل جلالہٗ) کی ہستی، اُس کی وحدانیت، اور اس کی قدرتِ کاملہ کے متعلق علم الیقین کے بعد حق الیقین حاصل کرسکیں۔

آزر، جمہور، اور نمرود کے ساتھ مناظروں میں اُن کے اس طبعی ذوق کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

[1] پیدائش باب ۲۷، آیت ۱-۴۵۔

اس لئے حضرتِ ابراہیمؑ نے "حیات بعد الممات" یعنی مرجانے کے بعد جی اُٹھنے کے متعلق خدائے تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ کس طرح ایسا کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا، اے ابراہیم! کیا تم اس مسئلہ پر یقین وایمان نہیں رکھتے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فوراً جواب دیا، کیوں نہیں! میں بلاتوقف اُس پر ایمان رکھتا ہوں، لیکن میرا یہ سوال ایمان ویقین کے خلاف اس لئے نہیں ہے کہ میں علم الیقین کے ساتھ ساتھ عین الیقین اور حق الیقین[1] کا خواستگار ہوں، میری تمنا یہ ہے کہ تو مجھ کو آنکھوں سے مشاہدہ کرادے کہ "حیات بعد الممات" کی شکل کیا ہوگی، تب اللہ تعالیٰ

---

[1] یقین: مضبوط اعتقاد اور اذعانِ محکم کو کہتے ہیں جو کسی بھی حالت میں شک وشبہ کی راہ سے متزلزل نہ ہوسکے واسطے یہ (یقین) ایمان بالحق کے لئے اساس وبنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ اعتقادِ جازم کے باوجود مراتب ودرجات کے لحاظ سے اُس میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے جس کو علمی اصطلاح میں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کہا جاتا ہے۔ اگر کسی مسئلہ میں جہل ونادانی کے خلاف دلیل وبرہان کے ذریعہ علم ودانش اس حد تک حاصل ہوجائے کہ تردد اور تذبذب کی راہیں مسدود ہوکر رہ جائیں تو اس کا نام علم الیقین ہے، اور اگر یہ علم، دلیل وبرہان سے آگے مشاہدہ ومحسوس کی حد میں داخل ہوجائے اور دلیل کے ساتھ پوری پوری مطابقت نظر آجائے تو پھر اس حاصل شدہ یقین کو عین الیقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علم الیقین اور عین الیقین تک رسائی کے باوجود فطرتِ انسانی ابھی مزید یقین کی طالب ہوتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ جس شے کو محکم دلیل کی روشنی میں سمجھا اور جو آئینہ مشاہدہ وحس کے ذریعہ اُس کو مزید تقویت بھی مل گیا اچھا ہو کہ اُس کا کیف وکم سب ہی سامنے آجائے اور حقیقتِ حال تک پہنچنے کی راہ نکل آئے پس جب فطرتِ انسانی یقین کے اس درجہ پر قابو پالیتی ہے تو اس کو حق الیقین کہا جاتا ہے — مثلاً سیب ایک بہترین پھل ہے اُس کے جاننے اور معلوم کرنے کا پہلا درجہ یہ ہے کہ عوام وخواص اور ثقہ اور غیر ثقہ سے تواتر اور شہرت کی اس حد تک اُس کے وجود اور اس کی تعریف کو سنا جس کے انکار کے لئے کوئی تردد، تذبذب اور شک وشبہ باقی نہیں رہا تو سیب کے متعلق اس یقین کا نام علم الیقین ہے، اور حسنِ اتفاق سے کشمیر جاکر آنکھوں سے اُس کو دیکھ لیا تو یقین کا یہ درجہ عین الیقین کے نام سے موسوم ہے اور اگر آنکھ سے رنگ وروپ کا مشاہدہ کیا، ناک سے اُس کی خوشبو کو پہچانا اور زبان پر رکھ کر ذائقہ کی مدد سے اُس کی لذت، خشکی، شیرینی غرض اس کی حقیقت کے تمام اوصاف کو حاصل کرلیا تو یہ حق الیقین ہے، اور یقین کا یہ وہ آخری درجہ ہے جو فطرتِ انسانی کے تقاضائے تشنگی کی سیرابی کے لئے کافی ووافی ہوتا اور حضرتِ انسان کی دسترس کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ مختلف انسانوں کی صلاحیت واستعداد اور خود شے مطلوب کی حقیقت وکنہ کے پیشِ نظر حق الیقین کے بھی مختلف مراتب ودرجات ہیں جن کی تشریح وتوضیح کا یہ مقام نہیں ہے۔

نے فرمایا کہ اچھا اگر تم کو اس کے مشاہدہ کی طلب ہے تو چند پرند لو، اور اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سامنے والے پہاڑ پر ڈال دو، اور پھر فاصلہ پر کھڑے ہو کر اُن کو پکارو، حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) نے ایسا ہی کیا جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اُن کو آواز دی تو اُن سب کے اجزاء علیحدہ علیحدہ ہو کر فوراً اپنی اپنی شکل پر آگئے اور زندہ ہو کر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے پاس اُڑتے ہوئے چلے آئے۔

سورۂ بقرہ میں اس واقعہ کو اس معجزانہ بلاغت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ	(یاد کر) جب ابراہیم نے کہا، اے میرے پروردگار! مجھے
الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى	دکھلا تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرے گا، کہا، کیا تو ایمان نہیں
وَلٰـكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً	رکھتا؟ کہا، کیوں نہیں، لیکن دلی اطمینان چاہتا ہوں،
مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ	کہا، پس چار پرندے لے پھر ان کو اپنے ساتھ مانوس کر پھر رکھ دے
عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ	ہر ہر پہاڑ پر ان کے جزء جزء ڈال کر، پھر اُن کو بلا وہ آئیں گے
ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا وَاعْلَمْ	تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور تو جان بیشک اللہ تعالیٰ
اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (ع البقرہ)	غالب ہے حکمت والا۔

سلفِ صالحین سے ان آیات کی تفسیر یہی ثابت ہے اور بعض روایاتِ حدیثی بھی اس کی تائید کرتی ہیں، اس لئے جن حضرات نے اس مسئلہ کی غرابت کے پیشِ نظر ان آیات میں طرح طرح کی تاویلات کر کے دُور از کار باتیں بیان کی ہیں وہ ناقابلِ التفات ہیں، ہم اس سے قبل واضح کر چکے ہیں کہ جس طرح یہ راہ غلط ہے کہ ہر موقعہ پر اچنبھوں اور عجوبہ کاریوں کی داستاں سرائی ہو اور رطب و یابس روایات کے اعتماد پر بے اصل باتوں پر یقین کیا جائے اسی طرح یہ بھی گمراہی کی راہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے متعلق جن خوارقِ عادات (معجزات) کا ذکر نصوصِ قرآنی اور صحیح روایات سے معلوم ہو جائے اُن کا بھی اس لئے انکار کیا جائے یا باطل تاویلات گھڑی جائیں کہ مدعیانِ عقل و فلسفہ (مادیین) ہمارے اس یقین و علم پر ٹھٹھا

کریں گے اور اس کا مذاق اُڑائیں گے۔

بنی قطورہ | حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے حضرتِ سارہ اور حضرتِ ہاجرہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ ایک اور شادی کی تھی ان بی بی کا نام قطورہ تھا، ان کے بطن سے ابراہیم علیہ السلام کے چھ بیٹے پیدا ہوئے،

اور ابراہیم نے ایک اور جورو کی جس کا نام قتورہ تھا، اور اس سے زمران، یقسان مدان، مدیان، یشباق، اور شوحا پیدا ہوئے اور یقسان سے صبا اور دُدان پیدا ہوئے، اور ان کے فرزند اسوری اور لطوسی اور لومی تھے اور مدیان کے فرزند عیفہ، عفر، خنوک، ابیداع اور اِلدعا تھے، یہ سب بنی قطورہ تھے[1]

مدین یا مدیان کی نسل نے اپنی آبادی اپنے باپ کے نام پر مدین کے نام سے بسائی اور یہ اصحابِ مدین کہلائے، اور حضرتِ ابراہیمؑ کے پوتے دُدان کی نسل اصحاب الایکہ کے نام سے مشہور ہوئی یہی اصحابِ مدین اور اصحاب الایکہ دو قومیں ہیں جن میں ہدایت وسعادت کی پیغامبری کے لئے حضرتِ شعیب علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ یہ قتادہ کی روایت اور بعض مورخینِ حاضر کی تحقیق ہے، اس کے خلاف حافظ ابن کثیر اصحابِ مدین والایکہ کو ایک ہی تسلیم کرتے ہیں اور یہی تحقیق راجح ہے، تفصیل حضرت شعیبؑ کے واقعہ میں آئے گی۔

---

[1] پیدائش ۲۵- آیت ۱-۴-

حضرتِ لُوط علیہ السلام

لوط وابراہیمؑ | صفحاتِ گذشتہ میں ذکر آچکا ہے کہ حضرتِ لوط علیہ السلام حضرتِ ابراہیمؑ کے برادر زادہ ہیں، ان کے والد کا نام ہاران تھا، حضرتِ لوط کا بچپن حضرتِ ابراہیمؑ ہی کے زیرِ سایہ گذرا اور اُن کی نشوونما حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کی ہی آغوشِ تربیت کی رہینِ منت تھی۔

اسی لئے وہ اور حضرتِ سارہ "ملتِ ابراہیمی" کے پہلے مسلم اور "السابقون الاولون" میں داخل ہیں:-

فَاٰمَنَ لَہٗ لُوْطٌ وَقَالَ اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ۔ | پس ایمان لایا لوط ابراہیم (کے دین) پر اور کہا میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی جانب۔

یہ اور ان کی بی بی حضرتِ ابراہیمؑ کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور جب حضرتِ ابراہیمؑ مصر میں تھے تو اُس وقت بھی یہ ہم سفر تھے۔

توراۃ میں ہے کہ مصر کے قیام میں چونکہ دونوں کے پاس کافی ساز و سامان تھا اور مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ تھے اس لئے اُن کے چرواہوں اور محافظوں کے درمیان بہت زیادہ کشمکش رہتی تھی۔ حضرتِ ابراہیمؑ کے چرواہے چاہتے تھے کہ اس چراگاہ اور سبزہ زار سے پہلے ہمارے ریوڑ فائدہ اٹھائیں اور حضرتِ لوطؑ کے چرواہوں کی خواہش ہوتی کہ اوّل ہمارا حق سمجھا جائے، حضرتِ ابراہیمؑ نے اس صورتِ حال کا اندازہ کر کے حضرتِ لوطؑ سے مشورہ کیا،

لہ آیۃ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ میں وطنی اور روحانی دونوں قسم کی ہجرتیں مراد ہیں، حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ خدا کے دین کی خاطر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا وطنی ہجرت ہے اور باپ دادا کے قدیم مذہب (مظاہر پرستی) کو چھوڑ کر ملتِ حنیفی کو اختیار کر لینا روحانی ہجرت ہے۔

اور دونوں کی صلاح سے یہ طے پایا کہ باہمی تعلقات کی خوشگواری اور دائمی محبت و الفت کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ حضرت لوطؑ مصر سے ہجرت کر کے شرق اردن کے علاقہ سدوم اور عامورہ چلے جائیں اور وہاں رہ کر دینِ حنیف کی تبلیغ کرتے اور حضرت ابراہیمؑ کی رسالت کا پیغامِ حق سُناتے رہیں اور حضرت ابراہیمؑ پھر واپس فلسطین چلے جائیں اور وہاں رہ کر اسلام کی تعلیم و تبلیغ کو سربلند کریں۔

سدوم اردن کی وہ جانب جہاں آج بحرِ میّت یا بحرِ لوط واقع ہے، یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں، اس کے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانہ میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے، سدوم و عامورہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں۔ یہ مقام شروع سے سمندر نہیں تھا بلکہ جب قومِ لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی اُبھر آیا، اسی لئے اُس کا نام بحرِ میّت اور بحرِ لوط ہے[1]

یہ صحیح ہو یا غلط بہرحال یہ مسئلہ حقیقت رکھتا ہے کہ اسی بحرِ میّت کے ساحل پر وہ حادثہ رونما ہوا جو قومِ لوط کے عذاب سے موسوم ہے اور جو گذشتہ دو سال کی اثری تحقیق نے بحرِ میّت کے ساحل پر لوطؑ کی بستیوں کے بعض تباہ شدہ آثار ہویدا کر کے اُس علم و یقین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے جس کا اعلان ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآنِ عزیز نے کر دیا تھا۔

قومِ لوط لوط علیہ السلام نے جب سدوم میں آکر قیام کیا تو دیکھا کہ یہاں کے باشندے فواحش اور معصیتوں میں اس قدر مبتلا ہیں کہ الاماں، الحفیظ، دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جو ان میں موجود نہ ہو اور کوئی خوبی ایسی نہیں تھی جو ان میں پائی جاتی ہو، دنیا کی سرکش، متمرد، اور بداخلاق و بداطوار اقوام کے دوسرے عیوب و فواحش کے علاوہ یہ قوم ایک خبیث عمل کی موجد تھی، یعنی اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وہ عورتوں کی بجائے اَمرد لڑکوں سے اختلاط رکھتے تھے، دنیا کی قوموں میں اس عمل کا اُس وقت تک قطعاً کوئی رواج نہ تھا، یہی بدبخت قوم ہے

[1] بستانی جلد ۹ ص ۵۲۰۔

جس نے اِس ناپاک عمل کی ایجاد کی، اس عمل کا نام "لواطت" مشہور ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ شرارت، خباثت اور بے حیائی یہ تھی کہ وہ اپنی اس بدکرداری کو عیب نہیں سمجھتے تھے، اور علی الاعلان فخر و مباہات کے ساتھ اس کو کرتے رہتے تھے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ (اعراف)

اور (یاد کرو) لوط کا واقعہ، جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسے فحش کام میں مشغول ہو، جس کو دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا، یہ کہ بلاشبہ تم عورتوں کی بجائے اپنی شہوت کو مردوں سے پوری کرتے ہو، یقیناً تم حد سے گذرنے والے ہو۔

عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ میں نے عبرانی ادب کی ایک کتاب میں ان کی بعض بد اعمالیوں کا حال پڑھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ سدوم کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ باہر سے آنیوالے تاجروں اور سوداگروں کے مال کو ایک نئے اور اچھوتے انداز سے لوٹ لیا کرتے تھے، چنانچہ ان کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی سوداگر باہر سے آکر سدوم میں مقیم ہوتا تو اس کے مال کو دیکھنے کے بہانے سے ہر شخص تھوڑی تھوڑی چیزیں اٹھاتا اور لے کر چل دیتا اور تاجر بیچارہ حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا، اب اگر اُس نے اپنے ضیاعِ مال کا شکوہ کیا اور رونے دھونے لگا تو اِن لُٹیروں میں سے ایک آتا اور لُوٹی ہوئی دو ایک چیزیں دکھلا کر کہنے لگتا کہ بھائی میں تو یہ لے گیا تھا، لو تمہاری یہ چیز موجود ہے، وہ رنجیدہ آواز میں کہتا کہ میں اس کو لے کر کیا کروں گا، جہاں میرا سارا مال لُٹ گیا وہاں یہ بھی سہی، جا تو ہی اپنے پاس رکھ، جب یہ معاملہ ختم ہو جاتا تو اب دوسرا آتا اور وہ بھی اسی طرح کوئی معمولی سی چیز دکھا کر وہی کہتا جو پہلے نے کہا تھا اور سوداگر رنج و غم اور غصہ میں اس سے بھی پہلی بات لوٹا کر کہہ دیتا۔ اسی طرح سب اُس کا مال ہضم کر جاتے اور سوداگر کو لوٹ کھسوٹ کر بھگا دیتے۔

اُسی کتاب میں یہ عجیب قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور سارہ (رضی اللہ عنہا) نے ایک مرتبہ حضرت لوطؑ کی عافیت و خیر معلوم کرنے کیلئے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی کو سدوم

بھیجا، یہ جب بستی کے قریب پہنچا تو اجنبی سمجھ کر ایک سدومی نے اس کے سر پر پتھر کھینچ مارا، الیعزر کے سر سے خون جاری ہو گیا، تب آگے بڑھ کر سدومی کہنے لگا کہ میرے پتھر کی وجہ سے یہ تیرا سر سرخ ہوا ہے لہٰذا مجھے اس کا معاوضہ ادا کر، اور اس مطالبہ کے لئے کھینچتا ہوا سدوم کی عدالت میں لے گیا، حاکمِ سدوم نے مدعی کا بیان سُن کر کہا کہ بیشک الیعزر کو سدومی کے پتھر مارنے کی اُجرت دینی چاہیئے، الیعزر یہ سُن کر غصہ میں آ گیا اور ایک پتھر اٹھا کر حاکم کے سر پہ دے مارا اور کہنے لگا کہ میرے پتھر مارنے کی جو اُجرت ہے وہ تو اس سدومی کو دیدینا اور یہ کہہ کر وہاں سے بھاگ گیا۔[1]

یہ واقعات صحیح ہوں یا غلط لیکن ان سے یہ روشنی ضرور پڑتی ہے کہ اہلِ سدوم اس قدر ظلم، فحش، بے حیائی، بداخلاقی اور فسق و فجور میں مبتلا تھے کہ اُس زمانہ کی قوموں میں اُن کی جانب اس قسم کے واقعات عام طور پر منسوب کئے جاتے تھے۔

حضرتِ لوط اور تبلیغِ حق

ان حالات میں حضرتِ لوطؑ نے ان کو ان کی بے حیائیوں اور خباثتوں پر ملامت کی اور شرافت و طہارت کی زندگی کی رغبت دلائی، اور حُسنِ خطابت، لطافت اور نرمی کے ساتھ جو ممکن طریقے سمجھانے کے ہو سکتے تھے اُن کو سمجھایا اور موعظت و نصیحت کی اور گذشتہ اقوام کی بداعمالیوں کے نتائج و ثمرات بتا کر عبرت دلائی، مگر ان بدبختوں پر مطلق اثر نہ پڑا، بلکہ اس کا یہ اُلٹا اثر ہوا کہ کہنے لگے:۔

مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ○ (اعراف ع)	لوط کی قوم کا جواب اس کے سوائے کچھ نہ تھا کہ کہنے لگے ان (لوط اور اس کے خاندان) کو اپنے شہر سے نکال دو، یہ بیشک بہت ہی پاک لوگ ہیں۔

"بیشک یہ پاک لوگ ہیں" قومِ لوط کا یہ مذاقیہ فقرہ تھا، گویا حضرتِ لوطؑ اور ان کے خاندان پر طنز کرتے اور اُن کا ٹھٹھا اڑاتے تھے کہ بڑے پاکباز ہیں ان کا ہماری بستی میں کیا کام، یا ناصحِ مشفق کی مربیانہ نصیحت سے غیظ و غضب میں آ کر کہتے تھے کہ اگر ہم ناپاک اور

بے حیا ہیں اور وہ بڑے پاکباز ہیں تو ان کا ہماری بستی سے کیا واسطہ ان کو یہاں سے نکالو،

حضرت لوط ؑ نے پھر ایک مرتبہ بھری محفل میں اُن کو نصیحت کی اور فرمایا: تم کو اتنا بھی احساس نہیں رہا ہے کہ یہ سمجھ سکو کہ مردوں کے ساتھ بے حیائی کا تعلق، لُوٹ مار، اور اسی قسم کی بداخلاقیاں بہت بُرے اعمال ہیں، تم یہ سب کچھ کرتے ہو اور بھری محفلوں اور مجلسوں میں کرتے ہو اور شرمندہ ہونے کے بجائے بعد میں اُن کا ذکر اس طرح سُناتے ہو کہ گویا یہ کارِ نمایاں ہیں جو تم نے انجام دیئے ہیں۔

أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ (عنکبوت ع) کیا تم ہی وہ نہیں ہو کہ تم مردوں سے بدفعلی کرتے، لوگوں کی راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں اور اہل و عیال کے روبرو فواحش کرتے ہو،

قوم نے اس نصیحت کو سُنا تو غم و غصہ سے تلملا اُٹھی اور کہنے لگی: لوط! بس یہ نصیحتیں اور عبرتیں ختم کر، اور اگر ہمارے ان اعمال سے تیرا خدا ناراض ہے تو وہ عذاب لا کر دکھا جس کا ذکر کر کے بار بار ہم کو ڈراتا ہے اور اگر تو واقعی اپنے قول میں سچا ہے تو ہمارا تیرا فیصلہ ہو جانا ہی اب ضروری ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللَّهِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ (عنکبوت ع) پس اُس (لوط) کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ کہنے لگے تو ہمارے پاس اللہ کا عذاب لے آ، اگر تو سچا ہے۔

حضرت ابراہیم اور ملائکۃ اللہ

اِدھر یہ ہو رہا تھا اور دوسری جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جنگل میں سیر کر رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ تین اشخاص سامنے کھڑے ہیں، حضرت ابراہیم ؑ نہایت متواضع اور مہمان نواز تھے اور ہمیشہ اُن کا دسترخوان مہمانوں کے لئے وسیع تھا، اس لئے ان تینوں کو دیکھ کر وہ بیحد مسرور ہوئے اور ان کو اپنے گھر لے گئے اور بچھڑا ذبح کر کے تکّے بنائے اور بھون کر مہمانوں کے سامنے پیش کئے، مگر انھوں نے کھانے سے انکار کیا، یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم ؑ نے سمجھا کہ یہ کوئی

دشمن ہیں جو حسبِ دستور کھانے سے انکار کر رہے ہیں اور کچھ خائف ہوئے کہ آخر یہ کون ہیں؟

مہمانوں نے جب حضرتِ ابراہیمؑ کا اضطراب دیکھا تو اُن سے ہنس کر کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں ہم خدا کے فرشتے ہیں اور قومِ لوطؑ کی تباہی کے لئے بھیجے گئے ہیں، اس لئے سدوم جا رہے ہیں۔

جب حضرتِ ابراہیمؑ کو اطمینان ہو گیا کہ یہ دشمن نہیں ہیں بلکہ ملائکۃ اللہ ہیں تو اب اُن کی رقتِ قلب، جذبۂ ہمدردی اور محبت و شفقت کی فراوانی غالب آئی اور انھوں نے قومِ لوطؑ کی جانب سے جھگڑنا شروع کر دیا اور فرمانے لگے کہ تم اس قوم کو کیسے برباد کرنے جا رہے ہو جس میں لوطؑ جیسا خدا کا برگزیدہ نبی موجود ہے اور وہ میرا برادر زادہ بھی ہے، اور ملتِ حنیف کا پیرو بھی، فرشتوں نے کہا: ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں مگر خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ قومِ لوطؑ اپنی سرکشی، بدعملی، بے حیائی اور فواحش پر اصرار کی وجہ سے ضرور ہلاک کی جائے گی، اور لوطؑ اور اُس کا خاندان اِس عذاب سے محفوظ رہے گا، البتہ لوطؑ کی بیوی قوم کی حمایت اور ان کی بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں میں شرکت کی وجہ سے قومِ لوطؑ ہی کے ساتھ عذاب پائے گی۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ
الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ
لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ يٰاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ
هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ
اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝ (ع ہود)

پھر جب ابراہیم سے خوف جاتا رہا اور اس کو ہماری بشارت (ولادت اسحٰق) کی پہنچ گئی تو وہ ہم سے قومِ لوط کے متعلق جھگڑنے لگا، بیشک ابراہیم بردبار، غمخوار رحیم ہے! اے ابراہیم اس معاملہ میں نہ پڑ بلاشبہ تیرے رب کا حکم آچکا ہے اور بلاشبہ ان پر عذاب آنے والا ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا
اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ لِنُرْسِلَ
عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝ مُّسَوَّمَةً
عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝ (ع الذاریات)

ابراہیم نے کہا اے خدا کے بھیجے ہوئے فرشتو تم کس لئے آئے ہو؟ انھوں نے کہا "ہم مجرم قوم کی جانب بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم ان پر پتھروں کی بارش کریں یہ نشان کر دیا گیا ہے تیرے رب کی جانب سے حد سے گزرنے والوں کیلئے

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ

اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر

بِالْبُشْرٰى قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ	آئے کہنے لگے بیشک ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس
هٰذِهِ الْقَرْيَةِ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا	(سدوم) قریہ کے بسنے والوں کو بلاشبہ اسکے باشندے
ظٰلِمِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا قَالُوْا	ظالم ہیں' ابراہیم نے کہا کہ اس بستی میں تو لوط ہے فرشتوں
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا لَنُنَجِّيَنَّهٗ	نے کہا ہمیں خوب معلوم ہے جو اس بستی میں آباد ہیں، ہم
وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ	البتہ لوط کو اور اس کے خاندان کو نجات دینگے مگر اسکی بی بی
الْغٰبِرِيْنَ ۝ (ع عنکبوت)	کو نہیں کہ وہ بھی بستی میں رہ جانے والوں کے ساتھ ہے،

غرض حضرت لوطؑ کے ابلاغ حق، امر بالمعروف، اور نہی عن المنکر کا قوم پر مطلق کچھ اثر نہ ہوا اور وہ اپنی بداخلاقیوں پر اُسی طرح قائم رہی، حضرت لوطؑ نے یہاں تک غیرت دلائی کہ تم اس بات کو نہیں سوچتے کہ میں رات دن جو اسلام اور صراط مستقیم کی دعوت و پیغام کیلئے تمہارے ساتھ حیران و سرگرداں ہوں کیا کبھی میں نے تم سے اس سعی و کوشش کا کوئی ثمرہ طلب کیا، کیا کوئی اجرت مانگی، کسی نذر و نیاز کا طالب ہوا؟ میرے پیش نظر تو تمہاری دینی و دنیوی سعادت و فلاح کے سوائے اور کچھ بھی نہیں ہے، مگر تم ہو کہ مطلق توجہ نہیں کرتے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ	جھٹلایا قوم لوط نے پیغمبروں کو جب کہ کہا اُن کے بھائی
لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ	لوط نے کیا تم نہیں ڈرتے بیشک میں تمہارے لئے پیغامبر
رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝	ہوں امانت والا، پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو
وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ	اور میں تم سے (اس نصیحت پر) اُجرت نہیں مانگتا، میرا
اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الشعراء ع)	اجر اللہ رب العٰلمین کے سوائے کسی کے پاس نہیں ہے۔

مگر اُن کے تاریک دلوں پر اُس کہنے کا بھی مطلق کچھ اثر نہ ہوا - اور وہ حضرت لوطؑ کو اخراج" اور سنگساری کی دھمکیاں دیتے رہے، جب نوبت یہاں تک پہنچی اور انکی سیہ بختی نے کسی طرح اخلاقی زندگی پر آمادہ نہ ہونے دیا، تب ان کو بھی وہی پیش آیا جو خدا کے بنائے ہوئے قانون جزا کا یقینی اور حتمی فیصلہ ہے، یعنی بدکرداریوں پر اصرار کی سزا بربادی و ہلاکت،

غرض ملائکۃ اللہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس سے روانہ ہو کر سدوم پہنچے اور لوط علیہ السلام کے یہاں مہمان ہوئے، یہ اپنی شکل و صورت میں حسین و خوبصورت اور عمر میں نوجوان لڑکوں کی شکل و صورت میں تھے، حضرت لوطؑ نے ان مہمانوں کو دیکھا تو گھبرا گئے اور ڈرے کہ بدبخت قوم میرے ان مہمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرے گی، کیونکہ ابھی تک ان کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ خدا کے پاک فرشتے ہیں۔

ابھی حضرت لوطؑ اسی حیص وبیص میں تھے کہ قوم کو خبر لگ گئی اور لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ آئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ تم ان کو ہمارے حوالہ کرو، حضرت لوطؑ نے بہت سمجھایا، اور کہا کیا تم میں کوئی بھی سلیم فطرت انسان "رجل رشید" نہیں ہے کہ وہ انسانیت کو برتے اور حق کو سمجھے؟ تم کیوں اس لعنت میں گرفتار ہو، اور خواہشات نفس کے ایفاء کیلئے فطری طریق عمل کو چھوڑ کر اور حلال طریقہ سے عورتوں کو رفیقۂ حیات بنانے کی جگہ اس ملعون بے حیائی کے درپے ہو، اے کاش میں "رکن شدید" کی زبردست حمایت حاصل کر سکتا۔

حضرت لوطؑ کی اس پریشانی کو دیکھ کر فرشتوں نے کہا، آپ ہماری ظاہری صورتوں کو دیکھ کر گھبرائیے نہیں ہم ملائکہ عذاب ہیں اور خدا کے قانون "جزائے اعمال" کا فیصلہ ان کے حق میں اٹل ہے، وہ اب ان کے سر سے ٹلنے والا نہیں، آپ اور آپ کا خاندان عذاب سے محفوظ رہے گا، مگر آپ کی بیوی ان ہی بے حیاؤں کی رفاقت میں رہے گی اور تمہارا ساتھ نہ دے گی۔

آخر عذاب الٰہی کا وقت آپہنچا ابتداء شب ہوئی تو ملائکہ کے اشارہ پر حضرت لوطؑ اپنے خاندان سمیت دوسری جانب سے نکل کر سدوم سے رخصت ہو گئے اور ان کی بیوی نے ان کی رفاقت سے انکار کر دیا اور راستہ ہی سے لوٹ کر سدوم واپس آگئی، آخر شب ہوئی تو اول ایک ہیبت ناک چیخ (دھماکے) نے اہل سدوم کو تہ و بالا کر دیا اور پھر آبادی کا تختہ اوپر اٹھا کر الٹ دیا گیا اور اوپر سے پتھروں کی بارش نے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا اور وہی ہوا جو

گذشتہ قوم کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہو چکا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ۣالْمُرْسَلُوْنَ ۝
قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ قَالُوْا
بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝
وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝
فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ
الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا
يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا
حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ۝ وَقَضَيْنَآ
اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ
هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ۝
وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ
يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّ
هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۝
قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ
الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ
بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝
لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ
يَعْمَهُوْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ
الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ۝ فَجَعَلْنَا

اور پھر جب ایسا ہوا کہ بھیجے ہوئے (فرشتے) خاندانِ لوطؑ کے پاس
پہنچے تو انھوں نے کہا تم لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہو" انھوں نے کہا نہیں
یہ بات نہیں ہے بلکہ ہم تمہارے پاس وہ بات لے کر آئے ہیں جس میں
لوگ شک کیا کرتے تھے (یعنی ہلاکت کے ظہور کی خبر جس کا لوگوں کو
یقین نہ تھا) ہمارا آنا ایک امرِ حق کے لئے ہے، اور ہم اپنے بیان
میں سچے ہیں، پس چاہئے کہ کچھ رات رہے اپنے گھروں کے لوگوں
کو لے کر نکل جاؤ اور اُن کے پیچھے قدم اٹھاؤ" اور اس بات کا
خیال رکھو کہ کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے، جہاں جانے کا حکم دیا گیا ہے
(اُسی طرف رُخ کر کے چلے جائیں) غرضکہ ہم نے لوطؑ پر حقیقت حال
واضح کر دی کہ ہلاکت کا ظہور ہونے والا ہے اور باشندگانِ شہر کی
بیخ و بنیاد صبح ہوتے ہوتے اکھڑ جانے والی ہے اور اس (اثنا میں ایسا
ہوا کہ) شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے آ پہنچے، لوطؑ نے کہا دیکھو
یہ (نئے آدمی) میرے مہمان ہیں تم میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو،
تم میری رسوائی کے کیوں درپے ہو گئے ہو؟ انھوں نے کہا "کیا ہم نے
تجھے اس بات سے نہیں روک دیا تھا کہ کسی قوم کا آدمی ہو، لیکن
اپنے یہاں نہ ٹھہراؤ" لوطؑ نے کہا اگر ایسا ہی ہے تو دیکھو یہ میری بیٹیاں
(گھر میں) ہیں (یعنی باشندگانِ شہر کی بیویاں جن کی طرف وہ ملتفت
نہیں ہوتے تھے) ان کی طرف ملتفت ہو" تب فرشتوں نے لوطؑ
سے کہا "تمہاری زندگی کی قسم یہ لوگ تو اپنی بدمستیوں میں کھوئے
گئے ہیں (تمہاری باتیں ماننے والے نہیں) غرضکہ سورج نکلتے نکلتے

عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ۝ (الحجر)

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۝ وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ وَمِن قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ قَالَ يَا قَوْمِ هَٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ فِي ضَيْفِي ۖ أَلَيْسَ مِنكُمْ رَجُلٌ رَّشِيدٌ ۝ قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ۝ قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ۝ قَالُوا يَا لُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَن يَصِلُوا إِلَيْكَ ۖ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتَكَ ۖ إِنَّهُ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ ۚ إِنَّ

ایک ہولناک آواز نے اُنہیں آلیا، پس ہم نے وہ بستی زیر و زبر کر ڈالی اور پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی اُن پر بارش کی بلاشبہ اس واقعہ میں اُن لوگوں کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو (حقیقت کی) پہچان رکھنے والے ہیں۔

اور پھر جب ایسا ہوا کہ ہمارے فرستادے لوطؑ کے پاس پہنچے، تو وہ اُنکے آنے سے خوش نہ ہوا اور اُن کی موجودگی نے اُسے پریشان کر دیا، وہ بولا آج کا دن تو بڑی مصیبت کا دن ہے! اور اس کی قوم کے لوگ (اجنبیوں کے آنے کی خبر سُن کر) دوڑتے ہوئے آئے، وہ پہلے سے بُرے کاموں کے عادی ہو رہے تھے، لوطؑ نے ان سے کہا "لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں (یعنی بستی کی عورتیں جنہیں وہ اپنی بیٹیوں کی جگہ سمجھتا تھا، اور جنہیں لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا) یہ تمہارے لئے جائز اور پاک ہیں، پس (اُن کی طرف ملتفت ہو، دوسری بات کا قصد نہ کرو اور) اللہ سے ڈرو، میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟ ان لوگوں نے کہا تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تیری ان بیٹیوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اور تو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم کیا کیا چاہتے ہیں۔ لوطؑ نے کہا "کاش تمہارے مقابلہ کی مجھے طاقت ہوتی یا کوئی اور سہارا ہوتا جس کا آسرا پکڑ سکتا" (تب) مہمانوں نے کہا "اے لوطؑ! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں (گھبرانے کی کوئی بات نہیں) یہ لوگ کبھی تجھ پر قابو نہ پا سکیں گے تو یوں کر کہ جب رات کا ایک حصہ گذر جائے تو اپنے گھر کے آدمیوں کو ساتھ لیکر نکل چل، اور تم میں سے کوئی اِدھر اُدھر نہ دیکھے (یعنی کسی بات کی فکر نہ کرے) مگر ہاں تیری بیوی (ساتھ دینے والی نہیں، وہ پیچھے رہ جائے گی.

مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اَلَيْسَ — اور) جو کچھ ان لوگوں پر گذرتا ہے وہ اس پر بھی گذرے گا، ان لوگوں کے
الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۝ فَلَمَّا — لئے عذاب کا مقررہ وقت صبح کا ہے، اور صبح کے آنے میں کچھ دیر نہیں۔ پھر
جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا — جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا تو (اے پیغمبر!) ہم نے اس
سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا — (بستی) کی تمام بلندیاں پستی میں بدل دیں (یعنی بستی کو اُلٹ دیا) اور زمین
حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ — کی برابر کر دیا) اور اس پر آگ میں پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے تاکہ تیرے پروردگار
مَّنْضُوْدٍ ۙ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ — کے حضور (اس غرض سے) نشانی کئے ہوئے تھے، یہ (بستی) ان ظالموں
رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ — سے (یعنی اشرار مکہ سے) کچھ دور نہیں ہے۔ (یہ اپنی سیر و سیاحت میں
بِبَعِيْدٍ ۝ (ہود ع) — وہاں سے گزرتے رہتے ہیں، اور اگر چاہیں تو اس سے عبرت پکڑ سکتے ہیں)

فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا عَجُوْزًا — پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو سب کو مگر
فِي الْغٰبِرِيْنَ ۚ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۚ — ایک بڑھیا رہ گئی رہنے والوں میں، پھر اٹھا مارا ہم نے
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ — ان دوسروں کو اور برسایا ان پر ایک برساؤ، سو کیا
الْمُنْذَرِيْنَ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا — برا برساؤ تھا ان ڈرائے ہوؤں کا، البتہ اس بات میں
كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ — نشانی ہے، اور ان میں بہت لوگ نہیں تھے ماننے والے
لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (ع الشعراء) — اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا — اللہ نے بتلائی ایک مثال منکروں کے واسطے عورت
امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا — نوح کی اور عورت لوط کی، گھر میں تھیں دونوں دو نیک
تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ — بندوں کے ہمارے نیک بندوں میں سے، پھر انہوں
فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ — نے ان سے خیانت کی پھر وہ کام نہ آئے ان کے اللہ
شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ — کے ہاتھ سے کچھ بھی اور حکم ہوا کہ چلی جاؤ دوزخ میں جانے
الدّٰخِلِيْنَ ۝ (ع التحریم) — والوں کے ساتھ۔

مسائل | (۱) مسطورۂ بالا آیات میں حضرت لوطؑ کے یہ مقولے مذکور ہیں: هٰٓؤُلَاۗءِ بَنٰتِيْ هُنَّ

اَطۡهَرُ لَكُمۡ" هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيٓ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ" یعنی حضرتِ لوطؑ نے قوم کی مزاحمت اور مہمانوں سے متعلق مطالبہ سے تنگ آکر یہ فرمایا کہ "تم ان مہمانوں سے تعرض نہ کرو اگر نفس کی فطری خواہش پوری کرنا چاہتے ہو تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لئے پاک ہیں" اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک باعصمت وباعزت انسان اور پھر وہ بھی نبی معصوم، کس طرح یہ گوارا کرسکتا ہے کہ وہ اپنی باعصمت لڑکیوں کو ایسے بے حیا اور خبیث انسانوں کے سامنے پیش کرے؟ اس سوال کے حل میں علماءِ محققین نے مختلف جواب دیئے ہیں۔

(ا) حضرتِ لوطؑ نبی ہیں اور ہر ایک نبی اپنی قوم کا روحانی باپ ہوتا ہے، قوم مسلمان ہوکر اس کی اطاعت گذار ثابت ہو، یا انکار کرکے متمرد و منحرف، دونوں صورتوں میں وہ اسکی "اُمت" میں داخل ہے، اگرچہ پہلی اُمت "امتِ اجابت" ہے اور دوسری "اُمتِ دعوت" اور اس لئے تمام امت اس کی اولاد ہوتی ہے اور نبی اور رسول اس کا روحانی باپ۔

لہٰذا حضرتِ لوطؑ کا مطلب یہ تھا کہ بدبختو تمہارے گھروں میں یہ سب میری بیٹیاں تمہاری رفیقۂ حیات ہیں اور تمہارے لئے حلال، پھر تم ان کو چھوڑ کر اس ملعون اور خبیث کام پر اصرار کرتے ہو ایسا نہ کرو "العیاذ باللہ" یہ مقصد نہ تھا کہ وہ اپنی صلبی لڑکیاں اُن کو پیش فرما رہے تھے،

(ب) تورات اور دیگر روایات سے یہ معلوم ہوچکا ہے کہ فرشتے جو حضرتِ ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ کی بشارت دے کر قومِ لوط کو ہلاک کرنے آئے۔ تھے تین تھے، اس لئے یہ ناممکن تھا کہ تین افراد کے لئے پوری بستی خواہش مند ہو جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ اس قوم میں دو سردار تھے اور انھوں نے ہی لوط علیہ السلام کے مہمانوں کا مطالبہ کیا تھا، باقی قوم اپنی اس عام بدکرداری کی وجہ سے اُن کی حمایت میں جمع ہوگئی تھی اور چونکہ حضرتِ لوطؑ کی دو بیٹیاں کنواری موجود تھیں اس لئے انھوں نے ان دونوں سرداروں کو سمجھایا کہ تم اپنے اس خبیث و شنیع مطالبہ سے باز آجاؤ، اور میں اس کے لئے تیار ہوں کہ اپنی دونوں لڑکیوں کا نکاح تم سے کردوں مگر انھوں نے صاف انکار کردیا اور کہنے لگے، لوطؑ! تجھے

معلوم ہے کہ ہم عورتوں کی جانب رغبت نہیں رکھتے۔

(ج) حضرتِ لوطؑ نے بیشک اپنی بیٹیوں ہی کے متعلق یہ جملہ فرمایا تھا مگر اس کی حیثیت اُس بزرگ کے مقولہ کی طرح ہے جو کسی کو ناحق پٹتا ہوا دیکھ کر ظالم مارنے والے سے یہ کہے کہ اس کو نہ مار اس کے عوض مجھ کو مار لے، حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کبھی ایسی جرأت نہیں کرسکے گا کیوں کہ وہ اس کا چھوٹا ہے یا ماتحت۔

پس جس طرح اس شخص کا مقصد مارنے والے کو عار اور شرم دلانا ہوتا ہے، اسی طرح حضرت لوطؑ نے اُن کو شرم اور عار دلانے اور اس قبیح فعل پر ذلیل اور نادم کرنے کے لئے یہ جملہ فرمایا اور اُن کو یہ یقین تھا کہ نہ یہ بدبخت اس طرف راغب ہوں گے اور نہ وہ عملاً ایسا کریں گے،

امام رازی، اصفہانی، اور ابوالسعود اسی توجیہ کو پسند فرماتے ہیں اور عبدالوہاب نجار مصری کی بھی یہی رائے ہے، مگر میرے نزدیک پہلی توجیہ زیادہ صحیح اور قابلِ قبول ہے اور علامہ عبدالوہاب کا اس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "یہ قول اس لئے کمزور ہے کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ حضرتِ لوطؑ ان کافر عورتوں کے باپ تسلیم کئے جائیں" اس لئے کہ ہم شروع جواب ہی میں تصریح کرچکے ہیں کہ "نبی معصوم" اپنی اُس تمام اُمت کا روحانی باپ ہوتا ہے جس کی جانب اُس کو مبعوث کیا گیا ہے، یہ جُدا بات ہے کہ اُمتِ اجابت اُس کی عطا کردہ سعادت و فلاح سے مستفید ہوتی ہے اور اُمتِ دعوت اُس سے محروم رہتی ہے، نیز آج بھی یہ دستور ہے کہ کافر و مسلم کے امتیاز کے بغیر بڑے بوڑھے بستی کی لڑکیوں کو اپنی بیٹیاں کہا کرتے ہیں۔

(۲) حضرتِ لوطؑ نے جب یہ دیکھا کہ قوم اُن کے مہمانوں کے ساتھ بداخلاقی پر تُلی ہوئی ہے اور کسی طرح اُن پر عار دلانے کا اثر ہوتا ہے نہ حیا، مروت اور اخلاق وانسانیت کے نام پر اپیل کا، تب پریشانِ خاطر ہو کر فرمایا۔

لَوْ اَنَّ لِىْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِىْۤ	کاش میرے لئے تم سے (مقابلہ کی) طاقت ہوتی یا پناہ
اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝	ملتی کسی زبردست، قوت پناہ کے ساتھ۔

اِس "رکنِ شدید" سے کیا مُراد ہے، کیا حضرت لوطؑ العیاذ باللہ خدا کی قدرت پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے جو کسی "رکنِ شدید" کی پناہ کے طالب تھے؟

اِس مُشکل کا حل بخاری کی روایت نے بخوبی کر دیا ہے اُس روایت میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:-

یغفر اللّٰہ للوط ان کان لیأوی الی رکن شدید، وھو ربہ وخالقہ[1] (الحدیث)

اللہ تعالیٰ لوط کی بخشش کرے (کہ وہ اس درجہ پریشان کیے گئے) کہ رکنِ شدید کی پناہ کے طالب ہوئے اور ان کے لئے رکنِ شدید اُن کا پروردگار اور اُن کا خالق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرتِ لوطؑ خدا کو بھول کر کسی اور قوت کی پناہ کے طالب نہ تھے بلکہ وہ اس درجہ قابلِ رحم حالت میں تھے کہ اُس وقت اُن کی یہ تمنا ہوئی، کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی قوت عطا کرتا کہ میں اُسی وقت ان سب بدبختوں کو ان کی خباثت کا مزہ چکھا سکتا، اور "رکنِ شدید" یعنی اُس کے پروردگار نے آخر اُن کی مدد کی اور اُن پر فرشتوں نے اپنا راز ظاہر کر دیا اور اُن کو تسلّی اور اطمینان بخشا کہ آپ پریشان نہ ہوں تھوڑا ہی وقت گذرتا ہے کہ یہ اپنی بدکرداری کے عبرتناک انجام کو پہنچ جائیں گے۔

(۳) بعض مفسرین نے "بکم قوۃ" میں "کم" کا مخاطب فرشتوں کو سمجھا ہے، اور مراد یہ لیتے ہیں کہ حضرتِ لوطؑ نے فرمایا کاش تم اس کثرت سے ہوتے کہ اُن کے مقابلہ میں مجھ کو تم سے قوت پہنچتی یا خدا کوئی ایسی صورت پیدا کر دیتا کہ میں اُن کو سزا دے سکتا، اسی لئے حضرتِ لوطؑ کے اس قول کو سُن کر فرشتوں نے کہا۔

[1] تفسیر کی بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ "رکنِ شدید" میں رکن سے مراد خاندان ہے، حضرتِ لوط علیہ السلام نے سدوم کے باشندوں کی بے مروّتی اور وحشت کو محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشریت فرمایا کاش کہ میں خاندان والوں سے وابستہ ہوتا تو یہ پریشانی نہ ہوتی، چنانچہ اس کے بعد حق تعالیٰ نے انبیاء و رسل کو ان کے اپنے خاندان اور برادری ہی میں مبعوث کیا، مگر یہ توجیہ مضبوط نہیں ہے اور اپنے اندر کافی سقم رکھتی ہے اس لئے صحیح توجیہ وہی ہے جو صحیح بخاری میں خود ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ (ہود)

فرشتوں نے کہا، اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں (مجبور انسان نہیں ہیں) یہ تجھ کو ہرگز گزند نہیں پہنچا سکتے۔

توراۃ میں ہے کہ حضرتِ لوطؑ مع اپنے خاندان کے سدوم سے ہجرت کر کے ضوغر یا ضغر کی بستی میں چلے گئے، جو سدوم سے قریب ہی آباد تھی۔[۱] آفتاب نکلنے کے بعد جب انھوں نے سدوم کی جانب دیکھا تو وہاں ہلاکت و بربادی کے نشانات کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ حضرتِ لوطؑ نے پھر ضغر کو بھی چھوڑ دیا، اور اس کے قریب ایک پہاڑی پر جا آباد ہوئے، اور امن و امان سے رہنے سہنے لگے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

حضرتِ ابراہیمؑ مجددِ انبیاء

اِن مسلسل واقعات سے بہت سے بصائر و عبر حاصل ہونے کے علاوہ ایک سب سے اہم بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ کی شخصیت منصبِ نبوت و رسالت میں بھی خاص امتیازی شان رکھتی ہے، یوں تو خدا کا ہر ایک پیغمبر توحید کا داعی اور شرک کا دشمن ہے اور اس لئے تمام انبیاء علیہم السّلام کی تعلیمات میں یہ دو باتیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، بلکہ روحانی دعوت و ارشاد کی اساس و بنیاد صرف انہی دو مسئلوں پر قائم ہے مگر یہ خصوصیت حضرتِ ابراہیمؑ ہی کے حصہ میں آئی تھی کہ اس دنیا میں وہ پہلی ہستی ہیں جنھیں اس راہِ عزیمت میں سخت سے سخت آزمائشوں اور کڑی سے کڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہ ان مصائب کے مقابلے میں کامران و کامیاب ثابت ہوئے۔

(۱) غور کیجئے، بڑھاپے اور یاس کی عمر میں ہزاروں دعاؤں اور لاکھوں آرزوؤں کے بعد ایک بچہ پیدا ہوا تھا اور ابھی بچہ شیر خوار ہے کہ خدائے تعالیٰ کا حکم آتا ہے "ابراہیم: اس کو اور اُس کی والدہ کو اپنے گھر سے جدا کرو، اور ایک لق و دق بیابان اور بن کھیتی کی زمین میں "جہاں نہ پانی ہے نہ سبزہ" ان دونوں کو چھوڑ آؤ، پھر کیا ہوا؟ کیا ابراہیم علیہ السّلام نے ایک لمحہ بھی تامل کیا؟ اور تعمیلِ ارشاد میں کسی قسم کا کوئی عذر سامنے آیا؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ بے چون و چرا ان دونوں کو مکہ کی سرزمین پر چھوڑ آئے۔

[۱] پیدائش باب ۱۹ آیت ۲۲۔

اور اس کے بعد جب وہ سنِ رشد کو پہنچتا اور ماں باپ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنتا ہے تو اب پھر ابراہیم (علیہ السلام) کو خدا کا حکم ملتا ہے کہ اس کو ہمارے نام پر قربان کر دو اور اپنی فداکاری و اطاعت شعاری کا ثبوت دو۔

اس نازک وقت میں ایک مطیع سے مطیع اور فرمانبردار سے فرمانبردار ہستی کے ایمان و یقین کی کشتی کس طرح بھنور میں آجاتی ہے اس کا اندازہ خود کرو، اور پھر ابراہیم علیہ السلام کی جانب دیکھو کہ نہ خدا کی وحی کی جو "خواب اور رویا کی شکل میں" دکھائی گئی تھی، انھوں نے کوئی تاویل کی، نہ اس کے لئے حیلہ بہانہ سوچا، اور نہ اس کو ٹالنے کے لئے کوئی فکر و تردد کیا، صبح اٹھے اور اپنے لختِ جگر کو لیا اور تعمیلِ ارشادِ الٰہی میں وہ سب کچھ کیا جو اُن کے انسانی ہاتھ کر سکتے تھے اور اس طرح اپنی محیر العقول وفاکیشی کا ثبوت دیا۔

اور تیسری سخت آزمائش کا وہ وقت تھا کہ جب باپ، قوم، اور بادشاہِ وقت سب نے متفق ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ابراہیمؑ یا اپنے پیغامِ حق سے باز آجائے ورنہ تو اس کو دہکتی آگ میں ڈال کر خاکستر کر دیا جائے، تب ظالموں کا یہ فیصلہ اور اتحاد کیا ابراہیمؑ کے قدم ڈگمگا سکا! نہیں! بلکہ وہ ایک عزم کا پہاڑ بن کر اسی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا، اور پیغامِ حق اور خدا کی رشد و ہدایت کو اسی عزم و ثبات کے ساتھ سناتا رہا جس طرح شروع سے کرتا رہا، پھر دشمنوں نے جو کچھ کہا تھا آخر کر دکھایا اور اس کو دہکتی آگ میں جھونک دیا، مگر ابراہیمؑ کے سکون و اطمینان میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا، البتہ دشمنوں کی دشمنی اور ان کے تمام مکر و فریب کو ابراہیمؑ کے خدا نے پادر ہوا کر دیا اور خاک میں ملا دیا، اور آگ کے شعلے اس کے لئے "برد و سلام" بن گئے، اور اس طرح ابراہیمؑ اپنے قوی تر نگہبان کے زیرِ سایہ سعادت و ہدایت کے فیضان سے بندگانِ خدا کو برابر منور و روشن کرتا رہا اور اس کی جرأتِ حق اور دعوت الی اللہ تیز تر ہو گئی۔

ان تمام سخت امتحانوں اور آزمائشوں اور پھر اُن میں ثبات قدمی اور استقامت کے علاوہ ابراہیم (علیہ السلام) کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے شرک اور توحید کی

متضاد زندگی کے لئے ایک ایسا امتیاز قائم کردیا جو انہی جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایانِ شان تھا یعنی انھوں۔ نے اصنام پرستی اور کواکب پرستی کی تردید و تذلیل اور ان کی شناعت کا اظہار کرتے ہوئے یہ تصریح فرمائی :-

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ	بلاشبہ میں نے اپنا رُخ اُسی ذات کی طرف جھکا دیا ہے جو آسمانوں
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا	اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے، خالص اس کا ہو کر اور میں
وَّمَآ اَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ (انعام)	شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

ابراہیم علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے تصور کی دو راہیں ہیں ایک صحیح اور دوسری غلط، غلط راہ یہ ہے کہ یہ عقیدہ قائم کرلیا جائے کہ خدا کو راضی کرنے، اس کو خوش رکھنے اور اس کی عبادت و پرستش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بتوں اور ستاروں کی پوجا کی جائے، کیونکہ جب یہ ارواح ہم سے خوش ہو جائیں گی تو یہ خدا کو ہم سے راضی کردیں گی، اس عقیدہ کا نام شرک اور صابئیت ہے، کیونکہ اس عقیدہ کے مطابق عبودیت و پرستش کے تمام وہ خصوصی امتیازات جو صرف "ذاتِ واحد" کے لئے مخصوص رہنے چاہئے تھے دوسروں کے لئے بھی مشترک ہو جاتے ہیں، اور یہی شرک کی حقیقت ہے۔

اس کے مقابلہ میں صحیح راہ یہ ہے کہ اس علم و یقین کو عقیدہ بنایا جائے کہ خدائے تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا طریقہ اس کے علاوہ دوسرا نہیں ہے کہ خود اُسی کی پرستش کی جائے اُسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، نفع و ضرر، صحت و مرض، افلاس و تموّل، رزق کا قبض و بسط اور موت و زیست غرض تمام امور میں اُسی کو اور صرف اُسی کو مالک و مختارِ مطلق تسلیم کیا جائے اور اُس کی رضاء و عدمِ رضاء کی معرفت کے لئے اُس کے بھیجے ہوئے سچے پیغمبروں اور رسولوں کی ہی ہدایت و رشد پر عمل کیا جائے، گویا دوسرے الفاظ میں یُوں کہہ دیا جائے کہ خدا کو راضی رکھنے اور اس سے قربت حاصل کرنے کے لئے دیوی دیوتاؤں کو ذریعہ بنانے کی حاجت نہیں بلکہ صرف اُس ذاتِ احدیت کی عبودیت و بندگی کو سرمایۂ حیات

بنایا جائے، اسی عقیدہ کا نام "اسلام" اور "حنیفیت" ہے۔

اس لئے یہ پہلا دن تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی راہ کو "شرک و صابئیت" اور دوسری راہ کو اسلام و حنیفیت کا نام دے کر دونوں راہوں کے درمیان مستقل امتیاز قائم کر دیا اور یہ امتیاز ایسا مقبول ہوا کہ آنے والی تمام پیغمبرانہ تعلیم و دعوت کی بنیاد و اساس اسی نام سے موسوم کی گئیں حتیٰ کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ و بارک وسلم کے آخری پیغام کا نام بھی "ملتِ حنیف" اور اس کے پیرو کا نام "مسلم" قرار پایا۔

وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (بقرہ) اور پیروی کرو ملتِ ابراہیم کی جو حنیف تھا۔

هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن اس ابراہیم نے تمہارا نام پہلے ہی سے مسلمان رکھا ہے

قَبْلُ وَفِي هَٰذَا۔ (حج) اور اس قرآن میں بھی (یہی نام پسند رہا)

یہی وجہ ہے کہ سورۂ "ابراہیم" کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں انبیاء علیہم السلام کے ظہور اور ان کے حالات و تشخصات اور نتائج کو مجموعی طور پر پیش کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کی دعوتِ رشد و ہدایت کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور یہ کہ خیر و شر، طاعت و بغاوت اور تسلیم و انکار میں کیا غیر اللہ کی خوشنودی کو بھی کوئی مقام حاصل ہے یا صرف رضاء و عدمِ رضاءِ الٰہی ہی اصل ایمان ہے؟

پس ان مجموعی خصوصیاتِ ابراہیمی کے پیشِ نظر بلا شبہ یہ کہنا صحیح ہے کہ نبیوں اور رسولوں کی مقدس زندگی میں ابراہیم (علیہ السلام) کا مقام "مجددِ انبیاء و رسل" کا مقام ہے۔

واقعاتِ زیرِ بحث سے متعلق چند عبرتیں

(۱) جب انسان کسی عقیدہ کو علم و یقین کی روشنی میں قائم کر لیتا ہے، اور وہ اُس کے قلب میں جاگزیں، اُس کی روح میں پیوست، اور اس کے سینہ میں نقش کالحجر ہو جاتا ہے تو اس کا فکر و خیال، اُس کا سوچ بچار، اور اس کا استغراق اس بارہ میں اس درجہ زبردست اور ثابت و راسخ ہو جاتا ہے کہ کائنات کا کوئی حادثہ اور دنیا کی کوئی سخت سے سخت مصیبت بھی اُس کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی، وہ اس کیلئے آگ میں

بے خطر کود پڑتا، سمندر میں بے جھجک چھلانگ مار دیتا اور سُولی کے تختہ پر بے خوف جان دے دیتا ہے، حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے عزم و ثبات کی مثال اس کے لئے ایک زندہ اور روشن مثال ہے۔

(۲) حمایتِ حق کے لئے ایسے دلائل و براہین پیش کرنے چاہئیں جو دشمن اور باطل پرست کے تہِ قلب میں اُتر جائیں اور وہ زبان سے خواہ اقرارِ حق نہ کرے لیکن اُس کا ضمیر اور اس کا قلب حق کے اقرار پر مجبور ہو جائے بلکہ بعض مرتبہ زبان بھی بے اختیار اعلانِ حق سے باز نہ رہ سکے آیتِ قرآن وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ اِسی حقیقت کا اعلان کرتی ہے۔

(۳) پیغمبروں اور رسولوں کی راہ یہی ہے وہ جدل و مخاصمت کی منطقیانہ راہوں پر نہیں چلتے، ان کے دلائل و براہین کی بنیاد محسوسات و مشاہدات پر ہوتی ہے یا سادہ وجدانیات و عقلیات پر، حضرتِ ابراہیمؑ کا اصنام پرستی و کواکب پرستی کے متعلق جمہور سے مناظرہ اور مناظرۂ نمرود، اس کی واضح اور روشن مثال ہے۔

(۴) کسی امرِ حق کو ثابت کرنے کے لئے دلیل میں مخالفت کے باطل عقیدہ کو فرضی طور پر تسلیم کر لینا جھوٹ یا اس باطل عقیدہ کا اقرار نہیں ہے بلکہ اس کو "فرضِ لباطل مع الخصم" یا "معاریض" کہا جاتا ہے اور یہ طریقۂ استدلال مخالف کو اپنی غلطی کے اعتراف پر مجبور کر دیتا ہے۔

حضرتِ ابراہیمؑ نے جمہور کے ساتھ مناظرہ میں دلیل کا یہی پہلو اختیار کیا تھا جس نے صنم پرستوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اقرار کر لیں کہ بیشک بُت کسی حال میں بھی نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔

(۵) اگر ایک مسلم کے والدین مشرک ہوں اور کسی طرح شرک سے باز نہ آتے ہوں تو ان کی مشرکانہ زندگی سے بیزار اور علیحدہ رہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ دنیوی معاملات اور آخرت کی پند و نصائح میں عزت و نرمت کا معاملہ کرنا چاہیئے اور سختی اور درشتی کو کام میں لانا چاہیئے، حضرتِ ابراہیمؑ کا طرزِ عمل آزر کے ساتھ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ عمل

ابو طالب کے ساتھ اس مسئلہ کے لئے قطعی اور یقینی شہادت ہے۔

(۶) اگر قلبِ مومن صحیح عقائد پر اطمینانِ قلب اور زبان و قلب کی مطابقت کے ساتھ ایمان رکھتا ہے، مگر عینی اور حقیقی مشاہدہ و محسوس کے لئے یا اس کو حق الیقین کے درجہ تک حاصل کرنے کے لئے کسی ایمانی یا اعتقادی مسئلہ میں بھی سوال و جستجو کی راہ اختیار کرتا اور طمانیتِ قلب کا طالب ہوتا ہے تو یہ جستجو ریب و کفر نہیں ہے بلکہ عین ایمان ہے، حضرتِ ابراہیمؑ کے جواب "وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ" سے اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

(۷) دسترخوان کی وسعت اگر ریاء و نمود سے پاک ہو اور فطری تقاضے کے پیشِ نظر مہمان نوازی میں وسعتِ قلب اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہو تو اخلاقِ کریمانہ میں بہت فضیلت شمار ہوتی ہے اور "سخاءِ نفس" اور "کرم" کے نام سے موسوم ہے۔

یہ وصفِ گرامی حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کی حقیقتِ نفس بن چکا تھا اور فطری تھا۔ مہمان نوازی، دسترخوان کی وسعت، آنے والوں کا احترام ایسے اوصاف تھے جو ابراہیم (علیہ السلام) میں "مثلِ اعلیٰ" کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔

بعض کتابوں میں حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کی مہمان نوازی کے سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ منقول ہے، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حسبِ دستور حضرتِ ابراہیمؑ کسی مہمان کے انتظار میں جنگل میں کھڑے تھے، کیوں کہ بغیر مہمان کے نہ اُن کا دسترخوان بچھتا تھا اور نہ وہ کھانا کھاتے تھے، سامنے سے ایک بہت بوڑھا آدمی نظر پڑا جس کی کمر بھی کج ہو گئی تھی اور لکڑی کے سہارے بمشکل چل رہا تھا، ابراہیم (علیہ السلام) آگے بڑھے اور مسرت کے ساتھ اس کو سہارا دیتے ہوئے گھر لائے، دسترخوان بچھا، اور کھانا چنا گیا، جب سب فارغ ہو گئے تو حضرتِ ابراہیمؑ نے فرمایا، اُس خدائے یکتا کا شکر ادا کر جس نے ہم سب کو یہ نعمتیں عطا فرمائیں، بوڑھے نے خشمناک ہو کر کہا میں نہیں جانتا کہ تیرا خدائے واحد کون ہے، میں تو اپنے معبود (بُت) کا شکر ادا کرتا ہوں جو میرے گھر میں رکھا ہے، یہ جواب ابراہیم (علیہ السلام) کو بہت شاق گذرا، اور اس کو فوراً گھر سے رخصت کر دیا،

لیکن کچھ وقفہ نہ گذرا تھا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے دل پر اپنے اس طرزِ عمل سے تکدّر ہوا، انھوں نے سوچا کہ جس خدائے واحد کا شکر میں اس سے کرانا چاہتا تھا اُس کی شان تو یہ ہے کہ اس بوڑھے کی اس طویل عمر میں وہ برابر اپنی نعمتوں سے اُس کو نوازتا رہا اور اُس کی بُت پرستی، کفر، اور شرک سے ناراض ہو کر ایک وقت بھی اُس پر رزق کا دروازہ بند نہیں کیا پھر تجھ کو کیا حق تھا کہ اگر اس نے تیری بات نہ مانی اور حق کے کلمہ کو قبول نہ کیا تو خفا ہو کر اس کو گھر سے نکال دیا۔

یہ واقعہ اپنی تاریخی حیثیت میں قابلِ قبول ہو یا ناقابلِ قبول لیکن اس حقیقت کا ضرور اعلان کرتا ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ کے اخلاقِ کریمانہ کی وہ بلندی جو "حقیقی مَثَلِ اعلیٰ" تک پہنچی ہوئی تھی ضرب المثل اور زبان زدِ خلائق تھی، اور بلاشبہ ان کا یہ فکر، پیغامِ حق اور دعوتِ اسلام کے لئے بہترین اُسوہ ہے۔

(۸) اللہ تعالیٰ جن ہستیوں کو اپنے ابلاغِ حق کے لیے چُن لیتا ہے اُن کے قلب و دماغ کو اپنے نور سے اس درجہ روشن کر دیتا ہے کہ اُن کے سامنے عشقِ حق و صداقت کے سوائے دوسری کوئی چیز باقی ہی نہیں رہتی اور اسلئے اُن میں شروع ہی سے یہ استعداد ودیعت ہوتی ہے کہ وہ عہدِ طفولیت ہی سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور نمایاں نظر آنے لگتے اور راہِ حق میں ابتلاء و امتحان کو خوشی سے سہتے اور صبر و رضاء کا اُسوۂ حسنہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ حضرتِ اسمٰعیل (علیہ السلام) کا واقعہ اس کی شہادت کے لئے شاہدِ عدل اور باعثِ صد ہزار عبرت و عظمت ہے۔

(۹) حضرتِ لوطؑ اگرچہ حضرتِ ابراہیمؑ کے برادر زادہ اور ان کے پیرو تھے مگر شرفِ نبوت سے بھی سرفراز ہو چکے تھے اور خدا کے ایلچی بنا دیئے گئے تھے اس لئے سدوم اور عامورہ میں ہر قسم کے مصائب اور وطن سے دُور دشمنوں کے نرغہ کی تکالیف کے باوجود انھوں نے صبر و استقامت سے کام لیا اور اپنے بزرگ چچا اور خاندان کی مدد کی طلب کی بجائے صرف خدائے عزّ وجل ہی پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کے احکام کے سامنے رضا و تسلیم کا ثبوت دیا۔ یہ مقام "مقربین و انبیاء" کا مقام ہے۔

حضرتِ یعقوب علیہ السلام

نسب نامہ، قرآنِ عزیز میں ذکرِ یعقوبؑ، اولادِ یعقوبؑ، ولادتِ یوسفؑ

نسب نامہ حضرتِ یعقوبؑ، حضرتِ اسحٰقؑ کے بیٹے اور حضرتِ ابراہیمؑ کے پوتے ہیں، اور حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کے بھتیجے بتوئیل کے نواسہ، ان کی والدہ کا نام رفقہ یا ربقہ تھا، یہ اپنی والدہ کے چہیتے اور پیارے تھے اور ان کا حقیقی بھائی عیسو والد کا محبوب اور پیارا، اور دونوں حقیقی بھائی تھے۔

توراۃ سے ان دونوں بھائیوں کی باہم ناراضی کا واقعہ گذشتہ سطور میں نقل کیا جا چکا ہے، حضرتِ یعقوبؑ اپنی والدہ کے اشارہ پر جب فدان آرام چلے گئے تو ان کے ماموں لابان نے اُن سے یہ عہد لیا کہ وہ دس سال اُن کے یہاں رہ کر اُن کی بکریاں چرائیں تو وہ اس مدت کو مہر قرار دے کر اپنی لڑکی سے شادی کر دیں گے۔ جب یعقوب (علیہ السلام) نے اس مدت کو پورا کر دیا تو لابان نے اپنی بڑی لڑکی لَیّہ سے اُن کا نکاح کرنا چاہا مگر حضرتِ یعقوبؑ نے اپنا رجحانِ طبع چھوٹی لڑکی راحیل کی جانب ظاہر کیا، لابان نے یہ عذر کیا کہ یہاں کے دستور کے مطابق بڑی لڑکی کے نکاح سے قبل چھوٹی لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا، اسلئے تم اس رشتہ کو منظور کرو، اور اپنے قیام کو دس سال اور طویل کر دو اور میری خدمت میں رہو تو راحیل بھی تمہارے نکاح میں دی جاسکے گی (کیونکہ اس زمانہ میں دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع ہونا شرعاً ممنوع نہ تھا) چنانچہ یعقوب (علیہ السلام) نے اُس مدت کو بھی پورا کر دیا، اور راحیل سے شادی کر لی، ان دونوں کے علاوہ لَیّہ کی خانہ زاد زلفا اور راحیل کی خانہ زاد بلہا بھی ان کی زوجیت کے رشتہ میں منسلک ہو گئیں اور ان سب سے اولاد بھی ہوئی۔

اور بنیامین کے علاوہ یعقوب (علیہ السلام) کی تمام اولاد اپنے ماموں کے ہی یہاں پیدا ہوئی اور جب یعقوب (علیہ السلام) وطن واپس آ گئے تو یہاں بنیامین پیدا ہوئے لابان نے یعقوب (علیہ السلام) کو بیسؔ سال اپنے پاس رکھنے کے بعد بہت سامان و متاع اور ریوڑ دے کر رخصت کیا اور یہ پھر اپنے دادا کے دار الہجرت فلسطین میں آکر مقیم ہو گئے۔

یعقوبؑ جس زمانہ میں فدان آرام چلے گئے تھے، اُس زمانہ میں عیسو ناراض ہو کر اپنے چچا اسمٰعیل (علیہ السلام) کے پاس آ بسے تھے اور اُن کی بیٹی سے شادی کر کے قریب ہی آباد ہو گئے تھے، یہ تاریخ میں ادوم کے نام سے مشہور ہیں، اس عرصہ میں دونوں بھائیوں کے درمیان جو چپلقش تھی وہ بھی دُور ہو گئی اور دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ پھر استوار ہو گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو تحائف بھیجنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

یہ تمام واقعات تورات کی کہانی اور داستان ہے، قرآنِ عزیز ان تفصیلات کے حق میں قطعاً خاموش ہے اور صرف حضرتِ یعقوبؑ کے جلیل القدر نبی، صاحبِ صبر و عزیمت، اور یوسف (علیہ السلام) کے برگزیدہ باپ ہونے کا ذکر کرتا ہے اور اسی ضمن میں نام لئے بغیر یوسفؑ کے دوسرے بھائیوں کا بھی ذکر آجاتا ہے۔

ذکرِ یعقوبؑ قرآن مجید میں

قرآنِ عزیز میں حضرتِ یعقوبؑ کا نام دسؔ جگہ آتا ہے اور اگرچہ سورۂ یوسف میں جگہ جگہ ضمائر اور اوصاف کے لحاظ سے اور بعض دوسری سورتوں مثلاً "مومنون" میں اوصاف کے اعتبار سے اُن کا تذکرہ موجود ہے، مگر نام کے ساتھ صرف دؔہی جگہ ان کا ذکر کیا گیا ہے، مسطورۂ ذیل جدول اس کی وضاحت کرتی ہے۔

سورۃ	آیت	شمار	سورۃ	آیت	شمار
بقرہ	۱۳۲، ۱۳۳، ۱۴۰	۳	انبیاء	۷۲	۱
انعام	۸۵	۱	نساء	۱۶۳	۱
مریم	۶	۱	یوسف	۶، ۳۸	۲
			ص	۴۵	۱

اسرائیل حضرتِ یعقوبؑ کا نام عبرانی میں اسرائیل ہے، یہ اِسرا (عبد) اور ایل (اللہ) دو لفظوں سے مرکب ہے، اور عربی میں اس کا ترجمہ "عبداللہ" کیا جاتا ہے، حضرتِ ابراہیمؑ کا وہ اسحاقی خاندان جو اِن کی نسل سے ہے اسی لئے "بنی اسرائیل" کہلاتا ہے اور آج بھی یہود ونصاریٰ کے قدیم خاندان اُسی نسبت کے ساتھ منسوب ہیں۔

اولادِ یعقوب یعقوب (علیہ السلام) کے بارہ لڑکے تھے اور گذشتہ سطور میں واضح ہو چکا ہے کہ بنیامین کے علاوہ اُن کی تمام اولاد فدان آرام ہی میں پیدا ہو چکی تھی صرف بن یمین فلسطین (ارضِ کنعان) میں پیدا ہوئے، حضرتِ یعقوبؑ کی یہ اولاد چونکہ چند بیبیوں سے ہے اس لئے ان کی تفصیل یہ ہے:-

لیئہ یا لیا بنت لابان سے (۱) رادبین (۲) شمعون (۳) لاوی (۴) یہودا (۵) ویساکر (۶) زبولون پیدا ہوئے۔

راحیل بنت لابان سے (۷) یوسف (۸) بن یمین پیدا ہوئے۔

بلہا جاریہ راحیل سے (۹) دان (۱۰) نفتالی۔

اور زلفا جاریہ لیئہ سے (۱۱) جاد اور (۱۲) آشیر پیدا ہوئے[1]۔

پیغمبری حضرتِ یعقوبؑ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور کنعانیوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے انھوں نے برسوں اس خدمتِ حق کو انجام دیا، قرآنِ عزیز میں چونکہ اُن کا ذکر بیشتر حضرتِ یوسفؑ کے ساتھ کیا گیا ہے، اس لئے وہیں قابلِ مراجعت ہے۔

---

[1] تورات پیدائش باب ۳۵ آیات ۲۱-۲۶۔

حضرتِ یوسف علیہ السلام

یوسف (علیہ السلام) کا نسب نامہ، یوسفؑ کا ذکر قرآن حکیم میں، سورۂ یوسف کا نزول
برادرانِ یوسفؑ، یوسفؑ کا خواب، برادرانِ یوسفؑ کی سازش، یوسفؑ آزمائشوں میں،
چاہِ کنعان، یوسفؑ بحالتِ غلامی، عزیزِ مصر اور یوسفؑ، عزیزِ مصر کی بی بی اور یوسفؑ
یوسفؑ اور آیت "ولقد ھمت بہ" شاہی خاندان کی عورتیں اور یوسفؑ، قید خانہ،
قید خانہ میں دعوت و تبلیغ، تعبیرِ خواب، شاہِ مصر اور یوسفؑ، یوسفؑ تختِ شاہی پر،
برادرانِ یوسفؑ کا قافلہ، حضرتِ یوسفؑ کا حُسنِ سلوک، عذر خواہی اور معافی، حضرتِ
یعقوبؑ کی مصر میں آمد اور لختِ جگر سے ملاقات، یوسف (علیہ السلام) کی وفات،
آخری وصیت، حضرتِ موسیٰؑ کے زمانہ میں وصیت پر عمل۔

نسب نامہ یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (علیہم السلام) حضرتِ ابراہیمؑ کے پڑپوتے ہیں اور ان کی والدہ کا نام راحیل بنتِ لابان ہے، حضرتِ یعقوبؑ کو ان کے ساتھ بے حد محبت تھی بلکہ عشق تھا، اور اس لئے کسی وقت بھی اُن کی جدائی گوارا نہ کرتے تھے۔

یہ بھی (اپنے والد، دادا، اور پردادا کی طرح سنِ رشد کو پہنچ کر خدائے برتر کے جلیل القدر پیغمبر بنے اور ملتِ ابراہیمی کی دعوت و تبلیغ کی خدمت سرانجام دی، یہی وجہ ہے کہ ابتدائے زندگی ہی سے اُن کی دماغی اور فطری استعداد دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں بالکل جدا اور نمایاں تھی، یعقوب علیہ السلام کے عشق و محبت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ یوسفؑ کی پیشانی کا چمکتا ہوا نورِ نبوت پہچانتے، اور وحیِ الٰہی کے ذریعہ اس کی اطلاع پا چکے تھے۔

قرآن عزیز میں حضرتِ یوسفؑ کا ذکر حضرتِ یوسفؑ کا نام قرآنِ عزیز نے چھبیس ۲۶ مرتبہ ذکر کیا ہے جن میں سے

چوبیس^۲۴ جگہ صرف سورۂ یوسف میں اور ایک جگہ سورۂ انعام میں اور ایک جگہ سورۂ غافر میں ذکر آیا ہے اور ان کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ پر دادا ابراہیم (علیہ السلام) کی طرح ان کے نام پر بھی قرآنِ عزیز کی ایک سورت (سورۂ یوسف) نازل ہوئی ہے جو حضرتِ یوسف علیہ السلام کے واقعات سے متعلق عبرت و موعظت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔

سورۃ	آیت	شمار
انعام	۸۴	۱
یوسف	۴، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۷، ۲۱، ۲۹، ۴۶، ۵۱، ۵۶، ۶۱، ۶۹، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۸۵، ۸۷، ۸۹، ۹۴، ۹۹	۲۴
غافر	۳۴	۱/۲۶

سورۂ یوسف قرآنِ عزیز نے یوسف (علیہ السلام) کے واقعہ کو "احسن قصص" کہا ہے اسلئے کہ اس ایک واقعہ میں جس قدر عبرتیں، حکمتیں اور مواعظ و نصائح ودیعت ہیں دوسرے کسی واقعہ میں یکجا میسر نہیں ہیں، درحقیقت یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب دل کش اور زمانہ کے عروج و زوال کی زندہ یادگار ہے، یہ ایک فرد کے ذریعہ قوموں کے بننے اور بگڑنے، گرنے اور اُبھرنے کی ایسی بولتی ہوئی تصویر ہے جو کسی تشریح و توضیح کی محتاج نہیں رہتی، یہ بدوی اور خانہ بدوش قبیلہ کے ایک ایسے فرد یگانہ اور انمول موتی کی حیرت زا تاریخ ہے جس کو خدائے تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے اعجاز نے اُس زمانہ کی بڑی سے بڑی متمدن قوم کی رہنمائی اور اُن پر حاکمانہ اقتدار کے لئے چن لیا تھا اور شرفِ نبوت سے نوازا تھا۔

قرآنِ عزیز تورات کی طرح داستان گوئی یا محض اشخاص و اقوام کے تاریخی حالات کا مرقع نہیں ہے بلکہ وہ جن واقعاتِ تاریخی کو بیان کرتا ہے اُس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ عبرت و موعظت اور تذکیر و پند کا مقصدِ وحید ہے۔

پس جبکہ یوسف (علیہ السلام) کے واقعہ میں بے نظیر عبرتیں اور بصیرتیں پنہاں تھیں مثلاً رشد و ہدایت کی اہمیت، ابتلاء اور آزمائشوں پر صبر و استقامت، رضا و تسلیم کے مظاہرے افراد و اقوام کے عروج و اقبال کے وقائع، خدائے تعالیٰ کے عدل و رحم کی کرشمہ سازیاں انسانی اور بشری لغزشیں اور اُن کے انجام و مآل، عصمت اور ضبطِ نفس کی عجوبہ کاریاں، تو بلاشبہ وہ "احسن قصص" ہے، اور کتابِ ماضی کا وہ حسین ورق جو اپنی شانِ زیبائی میں یکتا اور فرد کہلانے کا مستحق ہے۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ (یوسف ع ۱)

الٓر۔ یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں، ہم نے اس قرآن کو عربی میں نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو، اے پیغمبر! ہم اس قرآن کے ذریعہ سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے ایک نہایت اچھا قصہ (واقعہ) سُناتے ہیں اور تم اس سے پہلے بے خبر تھے۔

سورۂ یوسف کے شانِ نزول کے بارہ میں حدیثی روایات اور مفسرین کے اقوال کا حاصل یہ ہے کہ کفارِ مکہ نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق "یہود" سے گفتگو کی اور اپنی درماندگی اور پریشانی کا اظہار کیا اس پر یہود نے اُن سے کہا کہ اس مدعی نبوت کو زچ کرنے اور جھوٹا بنانے کے لئے تم ان سے یہ سوال کرو کہ یعقوبؑ کی اولاد شام سے مصر کیوں منتقل ہوئی اور یوسفؑ سے متعلق جو واقعات ہیں ان کی تفصیل کیا ہے؟ اگر یہ نبی نہیں ہے تو ہرگز نہ بتا سکے گا۔

کفارِ مکہ نے یہود کی ہدایت کے مطابق ذاتِ اقدس ؐ سے یہ دونوں سوال کئے اور آپؐ نے وحیِ الٰہی کے ذریعہ وہ سب کچھ اُن کو سنا دیا جو سورۂ یوسف میں موجود ہے۔

یوسف کا خواب اور برادرانِ یوسفؑ

ان واقعات کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ حضرتِ یعقوبؑ اپنی تمام اولاد میں حضرتِ یوسفؑ سے بے حد محبت رکھتے تھے تو حضرتِ یعقوبؑ کا حضرتِ یوسفؑ کے ساتھ

والہانہ عشق و محبت برادرانِ یوسف (علیہ السلام) کے لئے بیحد شاق اور ناقابلِ برداشت تھا، اور وہ ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ یا حضرتِ یعقوبؑ کے قلب سے اس محبت کو نکال ڈالیں اور یا پھر یوسفؑ ہی کو اپنے راستہ سے ہٹا دیں تاکہ قصہ پاک ہو جائے۔

ان بھائیوں کے حاسدانہ تخیل پر مزید تازیانہ یہ ہوا کہ یوسف (علیہ السلام) نے ایک خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر اُن کے سامنے سجدہ ریز ہیں، حضرتِ یعقوبؑ نے چہیتے بیٹے کا یہ خواب سُنا تو سختی کے ساتھ اُن کو منع کر دیا کہ اپنا یہ خواب کسی کے سامنے نہ دُہرانا ایسا نہ ہو کہ اُس کو سُن کر تیرے بھائی بُرے پیش آئیں، کیوں کہ شیطان انسان کے پیچھے لگا ہے اور تیرا خواب اپنی تعبیر میں بہت صاف اور واضح ہے۔

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝ قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِن قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

(یوسف)

جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا: اے باپ! میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے، دیکھتا کیا ہوں کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں، (باپ نے) کہا: اے میرے بیٹے! تو اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کو نہ سنانا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے ساتھ کوئی چال چل جائیں، بلاشبہ شیطان انسان کیلئے کھلا دشمن ہے اور اس طرح تیرا پروردگار تجھ کو برگزیدہ کریگا اور سکھائیگا تاویلِ احادیث، اور اپنی نعمت کو تجھ پر اور اولادِ یعقوب پر تمام کریگا جس طرح کہ اس نعمت (نبوت) کو پورا کیا تیرے اجداد پر پہلے سے (یعنی) ابراہیم و اسحٰق پر بیشک تیرا پروردگار جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس مقام پر تورات اور قرآنِ عزیز کے بیانات میں تفاوت و اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۱) قرآنِ عزیز بیان کرتا ہے کہ یوسف (علیہ السلام) نے جب اپنا خواب حضرتِ یعقوب (علیہ السلام) کو سُنایا تو دوسرے بھائی وہاں موجود نہ تھے، اور تورات کہتی ہے کہ یہ خواب بھائیوں

کی موجودگی میں پیش آیا۔

(۲) قرآنِ عزیز سناتا ہے کہ حضرتِ یعقوبؑ اس خواب سے بحق یوسف (علیہ السلام) بے حد مسرور ہوئے، اور اُن کو نبوت وعلومِ الٰہیہ کی بشارت سُنائی مگر تورات کہتی ہے کہ یعقوب (علیہ السلام) خواب سُن کر بہت خفا ہوئے اور فرمانے لگے کہ شاید اس سے تیرا منشا یہ ہے کہ میں، تیری والدہ، اور تیرے سب بھائی تیرے سامنے سجدہ ریز ہوں گے؟

واقعات کی اُس ترتیب کے اعتبار سے جو آگے چل کر قرآنِ عزیز اور تورات میں مشترک ہے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ عزیز ہی کا بیان صحیح اور درست ہے، نیز تقاضائے فطرت اسی کا داعی ہے کہ یوسف (علیہ السلام) اپنے اس خواب کو بھائیوں سے الگ ہو کر بیان کریں اور یعقوب (علیہ السلام) بیٹے کے اس خواب کو سُن کر مسرور ہوں کہ ہر ایک باپ اپنی اولاد کی ترقی درجات اور بلندیٔ مناصب کا خواہش مند ہوتا ہے۔ خصوصاً جبکہ یعقوب (علیہ السلام) نبی ہونے کی وجہ سے خواب کی تعبیر میں یوسفؑ کے لئے جو بلندی دیکھ رہے تھے وہ موجب صد ہزار مسرت تھی نہ کہ باعثِ رنج والم۔

آخر کار حسد کی بھڑکتی ہوئی آگ نے ایک روز برادرانِ یوسفؑ کو یوسفؑ کے خلاف سازش کرنے پر مجبور کر ہی دیا۔

اِذْ قَالُوْا لَیُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى	جبکہ وہ کہنے لگے البتہ یوسف اور اس کا بھائی
اَبِیْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا	(بن یمین) ہمارے باپ کو زیادہ پیارا ہے اور ہم
لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِۚۖ ۝ اقْتُلُوْا یُوْسُفَ	ان سے زیادہ قوت والے ہیں، بلاشبہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے۔
اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ	یوسف کو مار ڈالو یا کسی ملک میں پھینک دو تاکہ تمہارے
وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ ۝	باپ کی توجہ تمہاری طرف سمٹ آئے اور ہو رہنا بعد
قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ	میں نیک قوم، ان میں سے ایک نے کہا یوسف
وَاَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ	کو قتل نہ کرو اور اس کو گمنام کنوئیں میں ڈال دو کہ

اَلسَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ (۱۲ یوسف) اُٹھا لے جائے اُس کو کوئی مسافر اگر تم کو کرنا ہی ہے۔

اس مشورہ کے بعد سب جمع ہو کر حضرتِ یعقوب (علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ یوسفؑ کو ہمارے ساتھ سیر کرنے کس لئے نہیں بھیجتے، کیا آپ کو ہم پر اعتماد نہیں ہے، ہم سے زیادہ اُس کا محافظ دوسرا کون ہو سکتا ہے؟

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۲ یوسف)

(اے باپ) کیا بات ہے کہ تجھ کو یوسفؑ کے بارہ میں ہم پر اعتماد نہیں ہے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں، کل اس کو ہمارے ساتھ بھیج کہ وہ کھائے پئے اور کھیلے کودے اور بلاشبہ ہم اس کے نگہبان ہیں۔

حضرتِ یعقوبؑ سمجھ گئے کہ ان کے دلوں میں کھوٹ ہے اور یہ یوسفؑ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، مگر صاف لفظوں میں اس بات کو ظاہر نہیں فرمایا تاکہ بگڑ کر وہ علانیہ دشمنی پر آمادہ نہ ہو جائیں اور یہ بھی خیال کیا کہ اشارہ کنایہ سے ممکن ہے وہ اپنی ظالمانہ سازش سے باز رہیں اس لئے اشارہ اشارہ میں اُن پر حقیقتِ حال واضح کر دی کہ واقعی مجھ کو یوسفؑ کے بارہ میں تم سے اندیشہ ہے۔

قَالَ اِنِّىْ لَيَحْزُنُنِىْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝ (یوسفؑ)

یعقوبؑ نے کہا مجھے اس سے رنج اور دکھ پہنچتا ہے کہ تم اس کو (اپنے ساتھ) لیجاؤ، اور مجھے یہ خوف ہے کہ اسکو بھیڑیا کھا جائے اور تم غافل رہو۔

برادرانِ یوسفؑ نے یہ سُن کر بہ یک زبان کہا:۔

لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ (یوسفؑ)

اگر کھا گیا اس کو بھیڑیا جبکہ ہم سب طاقتور ہیں تو بلاشبہ ایسی صورت میں تو ہم نے سب کچھ گنوا دیا۔

اس جگہ تورات کا بیان یہ ہے کہ حضرتِ یعقوبؑ نے خود اپنے حکم سے یوسفؑ کو اُس کے بھائیوں کے ساتھ جنگل میں کھیلنے کودنے کے لئے بھیجا[1] تھا، مگر آگے کے واقعات خود تورات کے بیان کی تغلیط کرتے ہیں۔

[1] پیدائش باب ۳۷ آیات ۱۳-۱۴۔

چاہِ کنعان | غرض برادرانِ یوسفؑ یوسفؑ کو جنگل کی سیر کرانے کے بہانے لے گئے اور مشورہ کے مطابق ایک ایسے کنوئیں میں اُس کو ڈال دیا جس میں پانی نہ تھا، اور عرصہ سے خشک پڑا تھا اور واپسی میں اس کے قمیص کو کسی جانور کے خون میں تر کرکے روتے ہوئے حضرتِ یعقوبؑ کے پاس آئے اور کہنے لگے: اے باپ! اگرچہ ہم اپنی صداقت کا کتنا ہی یقین دلائیں مگر تجھ کو ہرگز یقین نہ آئے گا کہ ہم دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مشغول تھے کہ اچانک یوسفؑ کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا۔

حضرتِ یعقوبؑ نے پیراہنِ یوسفؑ کو دیکھا تو خون آلود تھا مگر کسی ایک جگہ سے بھی پھٹا ہوا نہ تھا اور نہ چاک داماں تھا، فوراً حقیقتِ حال سمجھ گئے، مگر جھڑکنے، طعن و تشنیع کرنے اور نفرت و حقارت کا طرزِ عمل اختیار کرنے کی بجائے پیغمبرانہ علم و فراست اور علم و سماحت کے ساتھ یہ بتا دیا کہ باوجود حقیقتِ حال کو چھپانے کی سعی کے تم اسے چھپا نہ سکے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ	(حضرتِ یعقوبؑ نے) کہا یہ ہرگز نہیں بلکہ بنا دی ہے تمہارے نفسوں
أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ	نے تمہارے لئے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے، اور جو بات
عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ○ (یوسف ع۲)	تم ظاہر کرتے ہو اُس پر اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔

یوسفؑ اور غلامی | یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور یوسفؑ کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ حجازی اسمٰعیلیوں (مدیانیوں) کا ایک قافلہ شام سے مصر کو نورات، بلساں اور مسالہ لاد کر لئے جا رہا تھا، کنواں دیکھ کر اُنھوں نے پانی کے لئے ڈول ڈالا، یوسفؑ سمجھے کہ شاید بھائیوں کو رحم آگیا ڈول پکڑ کر لٹک گئے، تاجر نے ڈول نکالا تو یوسفؑ کو دیکھ کر جوش سے شور مچایا۔

يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ	بشارت ہو ایک غلام ہاتھ آیا۔

توراۃ میں ہے کہ برادرانِ یوسفؑ نے جب اسمٰعیلی قافلہ کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ یوسفؑ کو کنوئیں سے نکال کر اس قافلہ کے ہاتھ فروخت کر دو مگر اس سے پہلے ہی مدیانیوں (اسمٰعیلیوں) نے اُن کو نکال کر غلام بنا لیا اور سب سے بڑا بھائی رُاوبین جب کنوئیں پر پہنچا

اور دیکھا کہ یوسفؑ وہاں نہیں ہے تو روتا ہوا واپس آگیا، راؤبین کو یہ رائے یہودا نے دی تھی اور راؤبین شروع ہی سے اس فکر میں تھا کہ یوسفؑ کو کنوئیں سے نکال کر خاموشی سے باپ کے سپرد کر آئے اسی لئے اُس نے قتلِ یوسفؑ کی سخت مخالفت کی تھی

اس مقام پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسفؑ کو خود برادرانِ یوسفؑ نے ہی کنوئیں سے نکال کر اسمٰعیلیوں کے قافلہ میں فروخت کر دیا تھا، مگر مفسرین کے اس قول کی نہ تورات موافقت کرتی ہے اور نہ قرآنِ عزیز، بلکہ دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ والوں نے ہی یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالا اور اپنا غلام بنالیا۔

اسی طرح صاحبِ قصص الانبیاء کو تورات کے بیان سے قافلہ کے متعلق غلط فہمی ہوگئی ہے، اور وہ یہ کہ انھوں نے اسمٰعیلی اور مدیانی کو دو جُدا جُدا قافلے سمجھا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ شام سے مصر جانے والا یہ قافلہ ایک ہی قافلہ تھا جو نسلی اعتبار سے اسمٰعیلی اور ملکی اعتبار سے مدیانی[1] (حجازی) تھا۔

غرض اس طرح حضرتِ یوسفؑ کو اسمٰعیلی تاجروں کے قافلہ نے اپنا غلام بنالیا اور مالِ تجارت کے ساتھ اُن کو بھی مصر لے گئے۔

حضرتِ یوسفؑ کی زندگی کا یہ پہلو اپنے اندر کیسی عظمتیں پنہاں رکھتا ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو چشمِ بصیرت رکھتا ہو، چھوٹی سی عمر ہے، والدہ کا انتقال ہو چکا ہے، باپ کی آغوشِ محبت تھی وہ بھی چھوٹی، وطن چھوٹا، بھائیوں نے بے وفائی کی، آزادی کی جگہ غلامی نصیب ہوئی مگر ان تمام باتوں کے باوجود نہ شور و شیون ہے، نہ واویلا، نہ جزع و فزع ہے اور نہ الحاح و زاری، قسمت پر شاکر، مصائب پر صابر اور خدا کے فیصلہ پر راضی بہ رضا، سرِ نیاز خم کئے، مصر کے بازار میں فروخت ہونے جا رہے ہیں، سچ ہے۔ نزدیکاں را بیش بود حیرانی۔

---

[1] جدید نسلی و جغرافی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس مقام کو توراۃ میں مدین یا مدیان کہا ہے اس سے وہ علاقہ مراد ہے جو سائیر (سراۃ) سے بحر احمر کے کنارے شام سے یمن تک چلا گیا ہے، اس کو حضرت موسیٰ کے زمانہ سے بنی اسرائیل مدین اور اسمٰعیلی شروع سے ہی حجاز کہتے تھے، اس لئے ایک ہی مقام کے یہ دو نام ہیں۔ (ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۹،۴۳)

یوسف مصر میں | تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح "مصر" تمدن و تہذیب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، یہاں کے حکمراں عمالقہ (ہیکسوس) تھے جبکہ حضرتِ یوسف کنعان سے ایک بدوی غلام کی حیثیت میں مصر میں داخل ہوئے، مصر کا دار السلطنت اس زمانہ میں رعمسیس تھا، یہ غالباً اُس مقام پر واقع تھا جہاں آج صان کی بستی آباد ہے۔ جغرافی حیثیت سے اس کا جائے وقوع مشرق کی جانب دریائے نیل کے قریب بتایا جاتا ہے، مصری افواج کا افسر، شاہی خاندان کا ایک رئیس فوطیفار تھا، یہ سیر کے لئے مصر کے بازار سے گذر رہا تھا کہ یوسف پر نظر پڑی اور اس نے معمولی قیمت دے کر ان کو خرید لیا۔

ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ اُس زمانہ میں مصری خود کو دُنیا کی بہترین مہذب اور متمدن قوم سمجھتے تھے اور بدوی اور صحرائی قبائل کو نہایت ذلت و حقارت سے دیکھتے اور اپنے شہروں میں اُن کے ساتھ اچھوت کی طرح معاملہ کرتے تھے، انہی قبائل میں سے ایک قبیلہ نسلِ ابراہیمی کی یادگار کنعان میں آباد تھا، یہاں مدنیت و حضارت کا نام و نشان تک نہ تھا، شکار پر اُن کے رزق کا مدار تھا اور خس پوش جھونپڑیاں اور بکریوں کے گلے اُن کا دھن دولت تھے۔

ان حالات میں یوسف کے متعلق خدائے تعالیٰ کی کارسازی اور معجزنمائی دیکھئے کہ ایک بدوی اور وہ بھی غلام، ایک متمدن اور صاحبِ شوکت و حشمت رئیس کے یہاں جب پہنچتا ہے تو اپنی عصمت آب زندگی، حلم و وقار اور امانت و سلیقہ مندی کے پاک اوصاف کی بدولت اُس کی آنکھوں کا تارا اور دل کا مالک بن جاتا ہے اور وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا [۱] (یوسف)

(دیکھو) اس کو عزت سے رکھو کچھ عجب نہیں کہ یہ ہم کو فائدہ بخشے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں۔

اور یہ کس لئے ہوا، اور یوسف میں یہ پسندیدہ اطوار و اخلاق کہاں سے پیدا ہو گئے، ایک بدوی نے کس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، اور ایک غلام نے کس مربی سے اس پاک طینت کو پایا؟ اس کے متعلق قرآن عزیز جواب دیتا ہے:-

[۱] قصص الانبیاء (نجار)۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (یوسف) اور جب وہ سنِ رشد کو پہنچ گیا تو ہم نے اس کو فیصلہ کی قوت اور علم عطا کئے، اور ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزا دیا کرتے ہیں،

بہر حال قوطیفار نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ غلاموں کا سا معاملہ نہیں کیا، بلکہ اپنی اولاد کی طرح عزت و احترام کے ساتھ رکھا اور اپنی ریاست، دولت و ثروت اور گھریلو زندگی کی تمام ذمہ داریاں اُن کے سپرد کر دیں اور ان سب کا امین بنا دیا، گویا کنعان کے گلہ بان کو عنقریب جو جہانداری و جہاں بانی سپرد ہونے والی تھی یہ اُس کی تمہید تھی اسی لئے ارشاد ہوا

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ؗ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰـكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کو اس ملک میں اور اس واسطے کہ اس کو سکھائیں باتوں کا نتیجہ (اور مطلب نکالنا) اور اللہ طاقتور رہتا ہے اپنے کام میں، لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔

عزیزِ مصر کی بیوی اور یوسف (علیہ السلام)

ایک مشہور صوفی ابن عطاء اللہ السکندری کا قول ہے رُبَّمَا كَمُنَتِ الْمِنَنُ فِى الْمِحَنِ (خدا کے اکثر احسانات و کرم مصائب کے اندر مستور ہوتے ہیں) حضرت یوسفؑ کی ساری زندگی اسی مقولہ کا ہو بہو مصداق ہے۔

بچپن کی پہلی مصیبت یا آزمائش نے کنعان کی بدوی زندگی سے نکال کر تہذیب و تمدن کے گہوارہ مصر کے ایک بہت بڑے گھرانے کا مالک بنا دیا، غلامی میں آقائی اِسی کو کہتے ہیں، اب وقت کی دوسری اور کٹھن آزمائش شروع ہوئی، وہ یہ کہ حضرت یوسفؑ کا جوانی کا عالم تھا، حُسن و خوبروئی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو اُن کے اندر موجود نہ ہو، جمال و رعنائی کا پیکرِ مجسّم، رُخ روشن شمس و قمر کی طرح منور، عصمت و حیا کی فراوانی سونے پر سہاگہ اور پھر ہر وقت کا ساتھ، عزیزِ مصر کی بیوی دل پر قابو نہ پا سکی اور یوسفؑ پر پروانہ وار نثار ہونے لگی، مگر ابراہیم (علیہ السلام) کا پوتا، اسحاق و یعقوبؑ کا نورِ دیدہ، خانوادۂ نبوت کا چشم و چراغ اور منصبِ نبوت کے لئے منتخب بھلا اس سے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ناپاکی اور فحش میں مبتلا ہو اور عزیز کی

بیوی کے ناپاک عزائم کو پورا کرے۔

لیکن مصر کی اس آزاد عورت نے جب اس طرح جادو چلتے نہ دیکھا تو ایک روز بے قابو ہو کر مکان کا دروازہ بند کر دیا اور اصرار کرنے لگی کہ مجھے شادکام کر، حضرت یوسفؑ کیلئے یہ وقت سخت آزمائش کا وقت تھا، شاہی خاندان کی نوجوان عورت، شعلۂ حسن سے لالہ رو، محبوب نہیں بلکہ عاشق، آرائشِ حسن و زینت کی بے پناہ نمائش، عشوہ طرازیوں کی بارش، اِدھر یوسفؑ خود نوجوان حسین اور حُسن کی خوبی سے آشنا، دروازے بند، رقیب کا خوف نہ ڈر، مالکہ خود ذمہ دار، مگر ان تمام سازگار حالات نے کیا یوسفؑ کے دل میں ایک لمحہ کیلئے بھی عزیزِ مصر کی بیوی کی حوصلہ افزائی کی، کیا اس کے دل نے قرار چھوڑ کر بے قراری اختیار کی کیا نفس نے جہانِ قلب کو ایک لمحہ کے لئے بھی متزلزل کیا؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ اس کے برعکس اُس پیکرِ عصمت، امینِ نبوّت، مہبطِ وحیِ الٰہی نے دو ایسے دلکش اور محکم دلائل سے "مصری عورت" کو سمجھایا جو ایک ایسی ہستی سے ہی ممکن تھے جس کی تربیت براہِ راست آغوشِ الٰہی میں ہوئی ہو۔ فرمایا "یہ ناممکن ہے" "پناہ بخدا" میں اور اس کی نافرمانی کروں جس کا اسمِ جلالت "اللہ" ہے، اور وہ تمام کائنات کا مالک، اور کیا میں اپنے اُس مربّی "عزیزِ مصر" کی امانت میں خیانت کروں جس نے غلام رہنے کی بجائے یہ حرمت و عزت عطا کی؟ اگر میں ایسا کروں تو ظالم ٹھہروں گا اور ظالموں کے لئے انجام و مآل کے اعتبار سے کبھی فلاح نہیں ہے۔

مگر عزیزِ مصر کی بیوی پر اس نصیحت کا مطلق اثر نہ ہوا اور اُس نے اپنے ارادہ کو عملی شکل دینے پر اصرار کیا تب یوسفؑ نے اپنے اُس بُرہانِ رب کے پیشِ نظر جس کا ذکر وہ کر چکا تھا صاف انکار کر دیا۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ	اور پھسلایا یوسفؑ کو اس عورت نے جس کے گھر میں وہ رہتے تھے اس کے نفس کے معاملہ میں اور دروازے بند کر دیئے

هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ	اور کہنے لگی آ میرے پاس آ، یوسف نے کہا، پناہ بخدا!
اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ	بلاشبہ وہ (عزیز مصر) میرا مربی ہے جس نے مجھ کو عزت سے رکھا،
الظّٰلِمُوْنَ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ	بلاشبہ ظالم فلاح نہیں پاتے، اور البتہ اُس عورت نے یوسف
بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ	سے ارادہ بد کیا اور وہ بھی ارادہ کرتے اگر اپنے پروردگار کے
لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ	بُرہان کو نہ دیکھ لیتے، اسی طرح ہوا تاکہ ہٹائیں ہم اس سے
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۲۴)	برائی اور بے حیائی کو، بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے،

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا کی تفسیر

مفسرین نے آیت وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا کی مختلف تفسیریں کی ہیں لیکن ہم نے جو معنی بیان کئے ہیں وہی زیادہ موزوں اور مناسب مقام ہیں قرآنِ عزیز نے اول سے آخر تک اس واقعہ میں عزیزِ مصر کی بیوی کی شناعتِ کار اور حضرتِ یوسفؑ کی عصمت وجلالتِ قدر کا تذکرہ فرمایا ہے، اس لئے یوسفؑ کے "مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ" فرمانے کے بعد یہی معنی برمحل ہو سکتے ہیں کہ یوسفؑ کی زبان سے بُرہانِ رب کو سُن لینے کے بعد بھی جب عورت اپنی ہٹ سے باز نہ آئی اور اپنے ارادہ پر مُصر رہی تو یوسفؑ نے اس کے ارادہ کو قطعاً رد کر دیا اور "برہانِ رب" کے سامنے اُس کے "هَمّ" کی مطلق پروانہ کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ یوسفؑ اس سے بچنے کے لئے دروازہ کی طرف بھاگے اور عزیزِ مصر کی بیوی نے اُن کا پیچھا کیا۔

بعض مفسرین نے اس تفسیر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عربی گرامر کا تقاضا ہے کہ "لولا" کلام کے شروع میں استعمال ہو اس لئے کہ وسطِ کلام میں اس کا استعمال نحوی قاعدہ کے خلاف ہے مگر اس تفسیر کے مطابق "لولا" وسطِ کلام میں استعمال ہوگا اور تعبیر یہ ہوگی:۔

"وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ" اور یوسفؑ بھی گناہ کا قصد کر لیتا اگر اپنے رب کے برہان کو نہ دیکھ لیتا"

مگر یہ اعتراض اس لئے درست نہیں کہ اس مقام پر بھی "لولا" کا استعمال شروع کلام ہی میں ہوا ہے اور نحوی قاعدہ کے مطابق دال علی الجواب مقدم ہے اور "لولا" کا جواب جو

بعد میں مذکور ہوتا اس دال علی الجواب کی وجہ سے مقدر و محذوف ہے۔ اور یہ اس لئے صحیح ہے کہ فصاحت و بلاغت کا تقاضا ہے کہ ایک جانب مناسبتِ کلام کو قائم رکھا جائے یعنی دونوں کے ارادہ و عدم ارادہ کا ایک ہی جگہ ذکر ہو اور دوسری جانب نحوی قاعدہ کے پیشِ نظر لولا کا جواب اُس کے بعد میں آئے اور یہ دونوں باتیں جب ہی ہوسکتی ہیں کہ "ھمّ بھا" کو دال علی الجواب بنا کر "ھمّت بہ" کے ساتھ ذکر کیا جائے اور "لولا" کا جواب "فھمّ بھا" کو مقدر تسلیم کیا جائے۔

لہٰذا مسطورہ بالا تفسیر ہی شک و شبہ سے بالاتر حقیقتِ حال کو واضح اور ظاہر کرتی ہے۔ کلام مجید میں اس کی نظیر موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کے تذکرہ سے متعلق یہ آیت ہے،

اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِىْ بِهٖ لَوْلَآ — قریب تھا کہ وہ (والدۂ موسیٰ) اس کو ظاہر کردے

اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا — اگر ہم اُس کے دل کو مضبوط نہ بنادیتے

یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل کو مضبوط کردیا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے راز کو ظاہر نہ کرسکیں اور اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ظاہر کردیتیں۔

دیکھئے یہاں بھی "لولا" سے دال علی الجواب مقدم ہے اور "لولا" کا جواب "لَتُبْدِىْ بِهٖ" مقدر و محذوف ہے، اسی طرح اس مقام پر یہ معنی ہیں کہ اگر یوسفؑ کو بُرہانِ رب حاصل نہ ہوتا تو وہ بھی ارادۂ بد کرلیتے لیکن اُنھوں نے ارادۂ بد نہیں کیا کیونکہ وہ برہانِ رب دیکھ چکے تھے۔

اِس جگہ یہ بھی ایک سوال ہے کہ وہ "برہانِ رب" کیا تھا جس کا قرآنِ عزیز یہاں ذکر کررہا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے اپنی بلیغانہ اور معجزانہ خطابت میں خود ہی اس کو اس طرح ادا کردیا ہے کہ سوال کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، دروازہ بند ہوجانے پر عزیز کی بیوی کو حضرتِ یوسف علیہ السلام نے جو جواب دیا اپنے مقام کے لحاظ سے اس سے بہتر جواب کیا ہوسکتا تھا سو یہی وہ "برہانِ رب" تھا جو یوسف (علیہ السلام) کو عطا ہوا

اور جس نے عصمتِ یوسفؑ کو بے داغ رکھا، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے بڑے شد و مد سے اس کے بعد یہ بیان کیا "کَذٰلِكَ (یونہی ہوا) لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ" تاکہ ہٹائیں ہم اُس سے برائی اور بے حیائی، اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے) یعنی حضرتِ یوسفؑ کا دامن اس قسم کے "ھَمّ" سے اس لئے پاک رہا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی عصمت و پاکی کا فیصلہ شروع ہی سے کر دیا تھا، پھر کیسے ممکن تھا کہ اُس کی عصمت و حفاظت کے بعد اس کے خلاف کوئی شائبہ بھی اُن میں پایا جاتا؟

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حضرتِ یعقوبؑ کی صورت نظر آنا اور ان کا اشارہ سے منع کرنا یا فرشتہ کا ظاہر ہو کر اُن کو اس سے روکنا، یا عزیزِ مصر کا گھر میں رکھے ہوئے صنم پر اُس کی بیوی کا پردہ ڈالنا اور حضرتِ یوسفؑ کا اُس سے عبرت حاصل کرنا، یہ اور اس قسم کے تمام اقوال کے مقابلہ میں "برہانِ رب" کی تفسیر وہی بہتر تفسیر ہے جو خود قرآنِ عزیز کی نظم و ترتیب سے ثابت ہے یعنی (۱) ایمان باللہ کا حقیقی تصور (۲) اور مربیِ مجازی کے احسان کی احسان شناسی اور وصفِ امانت، عزیزِ مصر نے یوسفؑ کے متعلق اپنی بیوی سے کہا تھا اَکْرِمِیْ مَثْوٰهُ (اس (یوسف) کو عزت سے رکھنا) یوسف علیہ السلام نے اسی کو پیشِ نظر رکھ کر فرمایا اَحْسَنَ مَثْوَایَ (اُس (عزیزِ مصر) نے مجھ کو عزت دی) تب یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں خیانت کرکے اُس کو بے عزت کروں۔

بہر حال حضرتِ یوسفؑ جب دروازہ کی جانب بھاگے تو عزیز کی بیوی نے پیچھا کیا، دروازہ کسی طرح کھُل گیا، سامنے عزیزِ مصر اور عورت کا چچا زاد بھائی کھڑے نظر آئے، عورت کا عشق ابھی خام تھا اس لئے وہ صحیح حال کہنے پر قادر نہ ہوئی اور اصل حقیقت کو چھپانے کے لئے غیظ و غضب میں آکر کہنے لگی کہ ایسے شخص کی سزا قیدخانہ یا دردناک عذاب کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے جو تیرے اہل کے ساتھ ارادۂ بد رکھتا ہو؟ حضرتِ یوسفؑ نے اس کے مکر و فریب کو سُنا تو فرمایا کہ یہ اس کا بہتان ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ خود اس نے میرے ساتھ ارادۂ بد کیا تھا مگر میں نے کسی طرح نہ مانا اور بھاگ کر باہر نکل جانا چاہتا تھا کہ

اُس نے پیچھا کیا اور سامنے آپ نظر آ گئے تو اس نے یہ جھوٹ گھڑ لیا۔

عزیز کی بیوی کا چچا زاد بھائی ذکی، فطین اور بہت ہوشیار تھا اُس نے کہا کہ یوسفؑ کا پیراہن دیکھنا چاہئے اگر وہ سامنے سے چاک ہے تو عورت راستباز ہے، اور اگر پیچھے سے چاک ہے تو یوسفؑ صادق القول ہے اور عورت جھوٹی ہے، دیکھا تو پیراہنِ یوسفؑ پیچھے سے چاک تھا، عزیزِ مصر نے اصل حالت کو بھانپ لیا مگر اپنی عزت و ناموس کی خاطر معاملہ کو ختم کرتے ہوئے کہا، یوسفؑ سچے تم ہی ہو، اور اس عورت کے معاملہ سے درگزر دو، اور اُس کو یہیں ختم کر دو، اور پھر بیوی سے کہا یہ سب تیرا مکر و فریب ہے اور تم عورتوں کا مکر و فریب بہت ہی بڑا ہوتا ہے، بلاشبہ تو ہی خطا کار ہے لہٰذا اپنی اِس حرکتِ بد کے لئے استغفار کر اور معافی مانگ۔

قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا
اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ قَالَ
هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ
شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ
قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ
الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ
قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ
قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ
اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۝ يُوْسُفُ اَعْرِضْ
عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ښ
اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ۝ (یوسف)

کہنے لگی اُس شخص کی کیا سزا ہے جو تیرے اہل کے ساتھ برائی کا ارادہ رکھتا ہو مگر یہ کہ قید کر دیا جائے یا دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے، یوسفؑ نے کہا اسی نے مجھ کو میرے نفس کے بارہ میں پھسلایا تھا، اور فیصلہ کیا عورت ہی کے گھرانے کے ایک شخص نے کہ اگر پیراہن یوسفؑ سامنے سے چاک ہے تو عورت سچی ہے اور یوسفؑ جھوٹا، اور اگر پیچھے سے چاک ہے تو عورت کاذب ہے اور یوسفؑ صادق، پس جب اُس کی قمیص کو دیکھا تو پیچھے سے چاک تھا، کہا بیشک اے عورت یہ تیرے مکر و فریب سے ہے، بلاشبہ تمہارا مکر بہت بڑا ہے، یوسفؑ تو اس معاملہ سے درگزر، اور اے عورت تو اپنے گناہ کی معافی مانگ! تو بلاشبہ خطا کار ہے۔

عزیز مصر نے اگرچہ فضیحت ورسوائی سے بچنے کے لئے اس معاملہ کو یہیں پر ختم کر دیا مگر بات پوشیدہ نہ رہ سکی اور شدہ شدہ شاہی خاندان کی عورتوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ عزیز مصر کی بیوی کس قدر بے حیا ہے کہ اپنے غلام پر ریجھ گئی، اتنے بڑے مرتبہ کی عورت اور غلام سے اختلاط کا ارادہ؟ آہستہ آہستہ یہ خبر عزیز کی بیوی تک بھی پہنچ گئی، اس کو یہ طعن بیحد شاق گذرا اور اس نے چاہا کہ اس کا انتقام لے، اور ایسا انتقام لے کہ جس بات پر وہ مجھ پر طعن کرتی ہیں اُسی میں اُن کو بھی مبتلا کیا جائے، یہ سوچ کر ایک روز اُس نے شاہی خاندان اور عمائدین شہر کی عورتوں کو دعوت دی، جب سب دسترخوان پر بیٹھ گئیں اور سب نے کھانا کھانے کے لئے چھریاں ہاتھ میں لے لیں تاکہ اُس سے گوشت یا ترنج جیسی چیزوں کو کاٹیں، تب عزیز کی بیوی نے حضرتِ یوسفؑ کو حکم دیا کہ وہ باہر آئیں، حضرتِ یوسفؑ مالکہ کے حکم سے باہر نکلے تو تمام عورتیں جمالِ یوسفؑ کو دیکھ کر حیران رہ گئیں، اور رُخِ انور کی تجلی وتابانی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ چیزیں کاٹنے کی بجائے چھریوں سے ہاتھ کاٹ لئے، اور بے ساختہ کہنے لگیں کہ کون کہتا ہے یہ انسان ہے، بخدا یہ تو نور کا پُتلا اور بزرگ فرشتہ ہے، یہ دیکھ کر عزیز کی بیوی بیحد محظوظ ہوئی اور اپنی کامیابی اور اُن کی شکست پر فخر کرتے ہوئے کہنے لگی یہی تو وہ غلام ہے جس کے عشق ومحبت کے بارہ میں تم نے مجھ کو مطعون کر رکھا ہے اور تیرِ ملامت کا نشانہ بنایا ہوا ہے، اب اس کو دیکھ کر یہ تمہارا حال کیا ہے؟ بتاؤ میرا یہ عشق بیجا ہے یا بجا، اور تمہاری ملامت بے محل ہے یا برمحل؟

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ	اور (جب اس معاملہ کا چرچا پھیلا) تو شہر کی بعض عورتیں
الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ	کہنے لگیں دیکھو عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی
شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ	کہ اسے رجھالے، وہ اُس کی چاہت میں دل ہار گئی، ہمارے
مُّبِيْنٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ	خیال میں تو وہ صریح بدچلنی میں پڑ گئی، پس جب عزیز کی
اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ	بیوی نے ان عورتوں کے مکر کو سُنا تو ان کو بُلا بھیجا اور ن

مُتَّكَأً وَّاٰتَتۡ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنۡهُنَّ	کے لئے مسندیں آراستہ کیں اور (دستور کے موافق)
سِكِّيۡنًا وَّقَالَتِ اخۡرُجۡ عَلَيۡهِنَّ ۚ	ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کردی، پھر یوسفؑ سے کہا
فَلَمَّا رَاَيۡنَهٗۤ اَكۡبَرۡنَهٗ وَقَطَّعۡنَ	ان سب کے سامنے نکل آؤ، جب یوسفؑ کو اُن عورتوں
اَيۡدِيَهُنَّ وَقُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا	نے دیکھا تو اُس کی بڑائی کی قائل ہوگئیں، انھوں نے اپنے
بَشَرًا ؕ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيۡمٌ ۝	ہاتھ کاٹ لئے اور (بے اختیار) پکار اٹھیں یہ تو انسان
قَالَتۡ فَذٰلِكُنَّ الَّذِىۡ لُمۡتُنَّنِىۡ	نہیں ہے ضرور ایک فرشتہ ہے بڑے مرتبہ والا فرشتہ
فِيۡهِ ؕ (یوسف ع ۴)	(عزیز کی بیوی) بولی تم نے دیکھا، یہ ہے وہ آدمی جس کے بارہ میں تم نے مجھے طعنے دیئے۔

عزیز کی بیوی نے یہ بھی کہا کہ بیشک میں نے اس کا دل اپنے قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا، مگر میں یہ کہے دیتی ہوں کہ اگر اُس نے میرا کہا نہ مانا تو یہ ہو کر رہے گا کہ وہ قید کیا جائے اور بے عزتی میں پڑے۔

حضرت یوسفؑ نے جب یہ سنا اور پھر عزیز کی بیوی کے علاوہ اور سب عورتوں کے چلتر اپنے بارہ میں دیکھے تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں دست بدعا ہوئے اور کہنے لگے، خدایا! جس بات کی جانب یہ عورتیں بُلا رہی ہیں اس کے مقابلہ میں مجھے قید میں رہنا کہیں زیادہ پسند ہے، اگر تو نے میری مدد نہ کی اور مجھ کو ان مکاریوں سے نہ بچایا تو عجب نہیں کہ میں اُن کی جانب مائل ہو جاؤں اور نادانوں میں سے بن جاؤں، یوسفؑ کی دعا درگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اُن عورتوں کے سب مکر و فریب دفع کر دیئے، اور کامیابی کا سہرا یوسف (علیہ السلام) ہی کے سر رہا۔

قَالَ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَىَّ مِمَّا	یوسفؑ نے کہا اے میرے پروردگار جس بات کی طرف
يَدۡعُوۡنَنِىۡۤ اِلَيۡهِ ۚ وَاِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّىۡ	یہ مجھ کو بلاتی ہیں مجھے اس کے مقابلہ میں قیدخانہ زیادہ پسند ہے۔
كَيۡدَهُنَّ اَصۡبُ اِلَيۡهِنَّ وَاَكُنۡ مِّنَ	اور اگر تو نے ان کے مکر کو مجھ سے نہ ہٹادیا اور میری مدد نہ کی

الْجٰهِلِيْنَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (یوسف ع ۴)
تو میں کہیں اُن کی جانب جھک نہ جاؤں اور نادانوں سے نہ ہو جاؤں، پس اس کے ربّ نے اسکی دعاء قبول کی اور اس سے اُن کا مکر ہٹا دیا بیشک وہ سُننے والا جاننے والا ہے۔

اس واقعہ میں مذکور ہے "قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ" (اُن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے) عام طور پر مفسرین اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ جمالِ یوسفؑ سے مدہوش ہو کر واقعی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اُن کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا اور کاٹنے والی چیز کی بجائے ہاتھوں کو کاٹ لیا۔ مگر بعض مفسرین عصر[1] نے اس تفسیر کو صحیح نہیں سمجھا، اُن کے نزدیک مصری عورتوں کا یہ بھی تریا چرتر تھا اور وہ یوسفؑ کو اپنی جانب مائل کرنے کے لئے یہ بتانا چاہتی تھیں کہ ہم تیرے حسن کے اس قدر متوالے ہیں کہ تیری صورت دیکھ کر ہوش و حواس بھی جاتے رہے اور ہاتھوں کو زخمی کر لیا" اور اپنی اس تفسیر کی تائید میں اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ" یعنی یوسف علیہ السلام نے اُن کی اس حالت کو "کید" (مکر) سے تعبیر کیا ہے، اگر یہ اضطراری حالت ہوتی تو پھر وہ بے قصور تھیں، ایسی حالت میں اُن کے اس طرز عمل کو "کید" کہنے کے کیا معنی؟ نیز جب یوسف علیہ السلام کو شاہِ مصر نے زندان سے نکالنے کا حکم دیا ہے تو اس وقت بھی حضرتِ یوسف علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ :-

فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝ (یوسف ع ۶)
پس تو بادشاہ سے جا کر دریافت کر کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، بلاشبہ میرا رب ان کے مکر سے خوب واقف ہے۔

بہرحال عزیز پر چونکہ حضرتِ یوسفؑ کی صداقت ظاہر ہو چکی تھی اس لئے اس نے نہ چاہا کہ یوسفؑ کو کسی قسم کی گزند پہنچائے لیکن اس کی بیوی پر عشق کا بھوت بُری طرح سوار تھا سو جب اُس نے خوشامد، چاپلوسی، مکر و حیلہ، کسی طرح سے مطلب براری نہ دیکھی تو دھمکیوں سے کام لینا شروع کیا اور جب کوہِ استقامت کو اس کے باوجود بھی مطلق حرکت نہ ہوئی تو

[1] مولانا آزاد (ترجمان القرآن، سورۂ یوسف)

اب عزیز نے یوسفؑ کی صداقتوں کی تمام نشانیاں دیکھنے اور سمجھ لینے کے باوجود اپنی بیوی کی فضیحت و رسوائی ہوتی دیکھ کر یہ طے کر ہی لیا کہ یوسفؑ کو ایک مدت کے لئے زندان میں بند کر دیا جائے تاکہ یہ معاملہ لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے اور یہ چرچے بند ہو جائیں اس طرح حضرت یوسفؑ کو زندان جانا پڑا۔

اس موقعہ پر حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (رحمہ اللہ) نے تحریر فرمایا ہے[1] کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی دعاء کے ساتھ چونکہ یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے ان کی بے حیائی کی دعوت کے مقابلہ میں زندان زیادہ پسند ہے تو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مکر سے تو اُن کو بچالیا مگر قید اُن کی قسمت میں مقدر کر دی، ان کو چاہیے تھا کہ وہ یہ جملہ نہ کہتے اور بلاء و امتحان کو دعوت نہ دیتے، اور حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے اس لطیفہ کو قوی بنانے کیلئے ایک دوسرے محقق مفسر نے ایک حدیث کا حوالہ بھی دیدیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص خدا سے دعاء مانگ رہا تھا۔

"اللھم انی اسئلك الصبر" (اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو فرمایا تو بلاء و مصیبت کیوں مانگتا ہے، اُس سے عافیت کا طالب کیوں نہیں ہوتا۔

ہمیں ان دونوں بزرگوں کی جلالتِ قدر کے پیش نظر اگرچہ جرأتِ گویائی نہیں ہے لیکن یوسف علیہ السلام جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کی زندگی کے اس عدیم النظیر کارنامہ کو ایک لطیفہ کی نذر ہوتے دیکھ کر رہا نہیں جاتا، اور بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرتِ یوسفؑ کا یہ جملہ "اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ" ان کے علوِ شان، تقرب الی اللہ، استقامت فی الدین، عزیمت فی الحق اور رضا و تسلیم کا وہ بے نظیر مظاہرہ ہے جو ان جیسے اولو العزم پیغمبروں کا ہی حصہ ہے۔

غور کیجئے، عزیز کی بیوی اور گھر کی مالکہ نے خوشامد و چاپلوسی کی کون سی راہ اختیار نہیں

[1] موضح القرآن۔

کی جس سے یوسف کو رام کیا جا سکے، پھر اس میں ناکامی کے بعد دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی اور انھوں نے اپنے ممکن داؤں گھات یوسفؑ پر استعمال کئے مگر پھر بھی ناکامی رہی، اب آخری درجہ یہ تھا کہ اس نے دھمکی دی کہ یا یوسفؑ اس کو شادکام کرے ورنہ قیدخانہ میں ڈالا جائے گا۔ ایسی حالت میں ایک باخدا انسان، صاحبِ عزیمت و استقامت ہستی، اور خوفِ خدا کو تمام کائنات کے غیظ و غضب پر غالب رکھنے والا انسان، اس سے بہتر اور کیا جواب دے سکتا تھا کہ خدایا میں اس عملِ بد کے مقابلہ میں زندان کو ترجیح دیتا ہوں، مجھے قید و بند سب کچھ منظور ہے مگر تیری نافرمانی منظور نہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قید کی طلب ہے، زندان کے شوق کا اظہار ہے، بلاء و مصیبت کو دعوت ہے، ہرگز نہیں بلکہ یہاں تو لطیف پیرایہ میں وہ کہا جا رہا ہے جو اعلانِ حق اور خدارسی کا صحیح درجہ ہے، یوسفؑ نے یہ بھی گوارہ نہیں کیا کہ عزیز کی بیوی کو مخاطب کرے یا مہمان عورتوں کو اپنی گفتگو میں تخاطب کا موقع دے بلکہ اس نے اپنے خدا کو پکارا، مگر اُن گمراہ اور بدقماش عورتوں پر یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھا کہ جس طرح ان کے تمام مکر و فریب، خوشامد اور چاپلوسی ناکام رہیں، اسی طرح ان کی دھمکی اور ان کا عذاب بھی میرے ارادۂ حق، اور خدارسی کو باطل نہیں کر سکتا، یہ کہتی ہے کہ یوسفؑ یا مجھ کو شادکام کرے ورنہ جیل خانہ جائے۔ تو میں جیل خانہ کو اس کے ارادۂ بد کے مقابلہ میں لاکھ بار ترجیح دوں گا۔ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ۔

اب فرمائیے کہ اس اعلانِ حق اور اظہارِ استقامت کا اس دُعا سے کیا تعلق جو ایک شخص خواہ مخواہ اپنے لئے "صبر" مانگ کر خود کو آزمائش میں پڑنے کی دعوت دے رہا تھا، وہاں نہ آزمائش تھی نہ امتحان، بلکہ مفت میں بلاء و مصیبت کا داعی بن رہا تھا اور یہاں امتحان سر پر ہے، آزمائش موجود ہے، مصیبت کی دھمکی دی جا رہی ہے، بلا نازل کرنے کا خوف دلایا جا رہا ہے کیا ایسے نازک موقع پر صرف یہ جواب کافی ہوتا کہ یوسف علیہ السلام

گڑگڑا کر جنابِ باری میں امراۃ عزیز سے چھٹکارا پالینے کی دعا کرتے اور بس، اگر ایسا ہوتا، تو امتحان، آزمائش اور بلاء و مصیبت کے وقت استقامت، اعلانِ حق، بے خوفی اور تمام دنیوی رعونتوں کے مقابلہ میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کا سبق کون سکھاتا، عزیمت کی زندگی کون بتاتا باطل سے بے خوفی کی تعلیم کس سے ملتی اور حق و باطل میں امتیاز کی شان کون پیدا کرتا؟

یوسفؑ زندان میں | بہرحال یوسف علیہ السلام کو قید خانہ بھیج دیا گیا اور ایک بے خطا کو خطاکار اور معصوم کو مجرم بنا دیا گیا تاکہ عزیز کی بیوی فضیحت سے بچ جائے اور مجرم کو کوئی مجرم نہ کہہ سکے۔

توراۃ میں ہے کہ یوسفؑ کے علمی اور عملی جوہر قید خانہ میں بھی نہ چھپ سکے اور قید خانہ کا داروغہ اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگیا اور جیل کا تمام انتظام و انصرام اس کے سپرد کر دیا، وہ قید خانہ کا بالکل مختار ہوگیا اور خداوند نے وہاں بھی اُسے اس کے تمام کاموں میں اقبال[۱] مند کیا۔

قرآنِ عزیز سے بھی اس کی تائید نکلتی ہے اس لئے کہ اس زمانے کے قید خانوں کے حالات کے پیشِ نظر یوسف علیہ السلام کے پاس قیدیوں کا اس طرح آنا جانا اور پھر اُن کی عظمت و نیک نفسی کا اعتراف، اس کو واضح کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے پاک اوصاف کی قید خانہ میں کافی شہرت تھی۔

دعوت و تبلیغ | حسنِ اتفاق کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو نوجوان اور قید خانہ میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک شاہی ساقی تھا اور دوسرا شاہی باورچی خانہ کا داروغہ[۲]، ایک روز دونوں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اُن میں سے ساقی کہنے لگا میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لئے انگور نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا میں نے یہ دیکھا ہے کہ میرے سر پر روٹیوں کا خوان ہے اور پرند اس سے کھا رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نبی زادہ تھے، اسلام کی تبلیغ کا ذوق اُن کے ریشہ ریشہ میں

[۱] پیدائش باب ۳۹ آیت ۲۳   [۲] پیدائش باب ۴۰ آیت ۱۔

پیوست تھا، پھر خدا نے اُن کو بھی نبوت کے لئے چُن لیا تھا اس لئے دینِ حق کی اشاعت اُن کی زندگی کا نصب العین تھا، گو قید میں تھے مگر مقصدِ حیات کو کیسے بھول جاتے اور اگرچہ مصیبت و محن میں تھے لیکن اعلاءِ کلمۃ اللہ کو فراموش کر دیں یہ کیسے ممکن تھا، موقعہ کو غنیمت جانا اور ان سے نرمی اور محبت سے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے جو باتیں مجھے تعلیم فرمائی ہیں منجملہ اُن کے یہ علم بھی اُس نے عطا فرمایا ہے، میں اس سے پہلے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم تک پہنچے تمہارے خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا مگر میں تم سے ایک بات کہتا ہوں ذرا اس پر بھی غور کرو اور سمجھو بوجھو۔

"میں نے اُن لوگوں کی ملت کو اختیار نہیں کیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں، میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیمؑ، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کی ملت کی پیروی کی ہے ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک ٹھہرائیں، یہ اللہ کا ایک فضل ہے جو اُس نے ہم پر اور لوگوں پر کیا ہے لیکن اکثر لوگ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے۔"

"اے دوستو! تم نے اس پر بھی غور کیا جُدا جُدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یکتا اور سب پر غالب ہے؟ تم اُس کے علاوہ جن کی عبادت بھی کرتے ہو اُن کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جن کو تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے ہرگز کوئی سند نہیں اُتاری، حکومت تو صرف اللہ کے ہی لئے ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی نہیں جانتے۔"

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ	"اے یارانِ مجلس، (تم نے اس پر بھی غور کیا کہ) جدا جدا معبودوں
خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ	کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے؟ تم اس کے سوا
مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ	جن ہستیوں کی بندگی کرتے ہو ان کی حقیقت اس سے زیادہ کیا
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا	ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں

مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ	اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نہیں اتاری، حکومت تو اللہ ہی
اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ	کے لئے ہے، اُس کا فرمان یہ ہے کہ صرف اُس کی بندگی کرو
الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ	اور کسی کی نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی ایسے
لَا يَعْلَمُوْنَ ؀ (یوسف ع۵)	ہیں جو نہیں جانتے۔

رشد وہدایت کے اس پیغام کے بعد حضرتِ یوسف ؑ اُن کے خوابوں کی تعبیر کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے۔

دوستو! جس نے یہ دیکھا ہے کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے وہ پھر آزاد ہو کر بادشاہ کے ساقی کی خدمت انجام دے گا اور جس نے روٹیوں والا خواب دیکھا ہے اس کو سولی دی جائے گی، اور پرند اُس کے سر کو نوچ نوچ کھائیں گے، جن باتوں کے بارہ میں تم نے سوال کیا تھا وہ فیصل ہو چکی، اور فیصلہ یہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ساقی اور داروغۂ باورچی خانہ پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے بادشاہ کے کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملایا، جب تحقیقات ختم ہو گئی تو داروغہ پر یہ جرم ثابت ہو گیا اور ساقی کو بَری کر دیا گیا۔

حضرتِ یوسف علیہ السلام جب تعبیرِ خواب سے فارغ ہو گئے تو ساقی سے یہ سمجھ کر کہ وہ نجات پا جائے گا، فرمانے لگے "اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ" اپنے بادشاہ سے میرا ذکر کرنا، ساقی جب رہا ہو گیا تو اس کو اپنی مشغولیتوں میں کچھ بھی یاد نہیں رہا کہ زندان میں کیا وعدہ کر آیا تھا، اور شیطان نے اس کے دماغ سے یہ سب بھلا دیا اور اس طرح چند سال تک یوسف علیہ السلام کو قید خانہ ہی میں رہنا پڑا۔

اس مقام پر اکثر مفسرین کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ سے یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ بادشاہ سے کہنا کہ ایک بے قصور اور بے گناہ انسان اس طرح مجرم بنا کر زندان میں ڈال دیا گیا ہے اور اس تفسیر کے بعد وہ یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ اگرچہ مصائب اور ضرورت

کے موقعہ پر انسان کا انسانوں سے مدد لینا اور استعانت طلب کرنا حق کوشی اور خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے تاہم بمصداق حسنات الابرار سیئات المقربین "نیکوں کی بعض بھلائیاں مقربین بارگاہِ الٰہی کے شایانِ شان نہیں ہوتیں) حضرتِ یوسف جیسی ہستی کیلئے یہ موزوں نہ تھا کہ وہ خدا پر بھروسہ کے ساتھ ساتھ دنیوی اسباب پر بھروسہ کریں، اور بادشاہ سے اپنی مظلومیت کے دفاع کے طالب ہوں، اس لئے خدا کا فیصلہ یہ ٹھہرا کہ اُن کو ابھی چند سال اور قید خانہ میں رکھے اور ساقی کو شیطان نے ایسا بھلایا کہ وہ یوسف کا کچھ بھی ذکر نہ کر سکا۔ اور ابنِ جریر اور بغوی نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ "فانساہ" کی ضمیر کو یوسف کی جانب پھیرتے، اور یہ معنی کرتے ہیں کہ شیطان نے یوسف کو بھلا دیا کہ ان کا بادشاہ کی مدد کے لئے ساقی سے کہنا ناموزوں ہے، مگر ابنِ کثیر نے اس کو سختی کے ساتھ رد کر دیا اور اس تفسیر کو غلط ثابت کیا ہے، آئندہ سطور میں توراۃ سے اس سلسلہ میں جو نقل کیا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کی بنیاد اُس پر رکھی گئی ہے۔

اس تفسیر کے برعکس بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف نے فرمایا کہ بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا کہ ایسا ایک شخص ہم کو اس طرح دینِ حق کی تلقین کرتا ہے، اور وہ اپنی ملت کو ہماری ملت سے جدا بتاتا، اور اس پر بہترین دلائل دیتا ہے۔

اور اس تفسیر کی صحت کے لئے قرینہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر قرآنِ عزیز میں یوسف علیہ السلام اور ان دو شخصوں کے درمیان صرف دو ہی باتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے ایک دعوت و تبلیغِ اسلام کا اور دوسرے خواب اور اس کی تعبیر کا، تیسری کسی بات کا اشارہ تک نہیں، یعنی کسی اشارہ اور کنایہ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرتِ یوسف نے ان ہر دو اشخاص کے سامنے اپنا قصہ بیان کیا ہو، اور اُن کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہو، پھر بغیر ذکرِ سابق کے اس طرح "اذکرنی عند ربک" میں اجمال کے کیا معنی؟ علاوہ ازیں اگر حضرتِ یوسف کے زندان سے باہر آنے کی طلب و جستجو کا یہ حال تھا تو جب ساقی کے

یاد آنے، اور بادشاہ کے خواب کی تعبیر دینے کے بعد بادشاہ نے اُن کی رہائی کا حکم دیدیا تو کیوں فوراً باہر نہ نکل آئے اور تفتیشِ حال کا مطالبہ کیوں کیا، یہ تو رہائی کے بعد بھی ہو سکتی تھی، اور عصمت، اور بے گناہی کا فیصلہ باہر آکر بھی کیا جا سکتا تھا۔

آیات کی ترتیب و انسجام کے پیشِ نظر یہی تفسیر قابلِ ترجیح ہے۔

تورات میں اس واقعہ کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

تب یوسف بولا اس کی تعبیر یہ ہے کہ یہ تین ڈالیاں تین دن ہیں اور فرعون اب سے تین دن میں تیری روبکاری کرے گا، اور تجھے تیرا منصب پھیر دے گا اور آگے کی طرح جب تو فرعون کا ساقی تھا اس کے ہاتھ میں پھر جام دے گا، لیکن جب تو خوش حال ہو تو مجھے یاد کیجیو اور مجھے اس گھر سے مخلصی دلوائیو کہ وہ عبرانیوں کی ولایت سے مجھے چرا لائے، اور یہاں بھی میں نے ایسا کام نہیں کیا کہ وہ مجھے اس قید میں رکھیں[1]

فرعون کا خواب حضرتِ یوسفؑ کا یہ واقعہ "فراعنۂ مصر" کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے، یہ خاندانِ شاہی نسلی اعتبار سے "عمالقہ" میں سے تھا، مصر کی تاریخ میں ان کو "ہکسوس" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کی اصلیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ چرواہوں کی ایک قوم تھی، جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قوم عرب سے آئی تھی اور دراصل یہ "عربِ عاربہ" ہی کی ایک شاخ تھی، نیز قدیم قبطی اور عربی زبانوں کی باہمی مشابہت ان کے عرب ہونے کی مزید دلیل ہے[2] اور مصر کے مذہبی تخیل کی بنا پر ان کا لقب "فاراع"[3] (فرعون) تھا، اس لئے کہ مصری دیوتاؤں میں سب سے بڑا اور مقدس دیوتا آمن راع (سورج دیوتا) تھا اور بادشاہِ وقت

---

[1] پیدائش باب ۴۰، آیت ۱۲-۱۵ [2] ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۲۶۶ [3] مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور ان سب سے بلند تر "آمن راع" تھا، یعنی سورج دیوتا نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشوونما پا چکا تھا اور تاجدارانِ مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی اُن کا لقب فاراع اسی لئے ہوا کہ وہ راع یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۲۶۲) پھر یہی فاراع عربی میں جا کر فرعون بن گیا۔

اُس کا اوتار اور "فاراع" کہلاتا تھا، یہی فاراع عبرانی میں فارعن اور عربی میں فرعون کہلایا اور اُس زمانہ کے فرعون کا نام عرب مؤرخوں نے ریّان بتایا۔ ہے اور مصری آثار میں آپوپی کے نام سے موسوم ہے۔

بہرحال حضرتِ یوسفؑ ابھی زندان ہی میں تھے کہ وقت کے فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دُبلی اور دُبلی گائیں موٹی کو نگل گئیں، اور سات سرسبز و شاداب بالیں ہیں اور سات خشک اور خشک بالوں نے سرسبز کو کھالیا، بادشاہ صبح اُٹھا تو پریشان خاطر تھا اور اس عجیب و غریب خواب سے حیران، فوراً دربار کے مشیروں سے اپنا خواب کہا اور خواب کی تعبیر چاہی درباری بھی اس کو سُن کر فکر و تردّد میں پڑ گئے اور جب حل نہ کر سکے تو اپنی درماندگی و بیچارگی کو چھپانے کے لئے کہنے لگے، بادشاہ! یہ خواب نہیں ہے بلکہ پریشان خیالات ہیں جن کا کوئی خاص مطلب نہیں ہے، ہم سچّے خواب کی تعبیر تو دے سکتے ہیں لیکن پریشان خیالات حل نہیں کر سکتے۔

بادشاہ کو درباریوں کے اس جواب سے اطمینان نہ ہوا، کہ اس اثناء میں ساقی کو اپنا خواب اور یوسفؑ کی تعبیر کا واقعہ یاد آگیا، اُس نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ اگر کچھ مہلت دیجئے تو میں اس کی تعبیر لا سکتا ہوں، مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دیجئے۔ بادشاہ کی اجازت سے وہ اُسی وقت قید خانہ پہنچا اور حضرتِ یوسفؑ کو بادشاہ کا خواب سُنایا اور کہا کہ آپ اس کو حل کیجئے کیوں کہ آپ سچائی اور تقدس کے پیکر ہیں، آپ ہی اس کو حل کر سکتے ہیں، اور کیا عجب ہے کہ جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے جب میں صحیح تعبیر لے کر اُن کے پاس واپس جاؤں تو وہ آپ کی حقیقی قدر و منزلت معلوم کریں۔

حضرتِ یوسفؑ کا کمال صبر و استقلال، اور جلالتِ قدر کا اندازہ کیجئے، ساقی کو نہ ملامت کی اور نہ برسوں تک بھولے رہنے پر جھڑکا، اور نہ عطاءِ علم میں بخل سے کام لیا اور نہ یہ سوچا کہ جن ظالموں نے مجھ کو بے قصور زندان میں ڈالا ہے وہ اگر تباہ ہو جائیں اور اس

خواب کا حل نہ پاکر برباد ہو جائیں تو اچھا ہے، ان کی یہی سزا ہے، نہیں ایسا کچھ بھی نہیں کیا بلکہ اسی وقت خواب کی تعبیر دی اور اپنی جانب سے اس سلسلہ میں صحیح تدبیر بھی بتلادی اور ساقی کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ فرمایا:۔

اس خواب کی تعبیر، اور اس کی بنا پر جو کچھ تم کو کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ تم سات برس تک لگاتار کھیتی کرتے رہو گے اور یہ تمہاری خوش حالی کے سال ہوں گے، جب کھیتی کے کٹنے کا وقت آئے تو جس قدر مقدار تمہارے سال بھر کھانے کے لئے ضروری ہو اس کو الگ کر لو اور باقی غلہ کو اُن کی بالوں ہی میں رہنے دو تا کہ محفوظ رہے اور گلنے سڑنے نہیں۔ اس کے بعد سات برس بہت سخت مصیبت کے آئیں گے وہ تمہارا جمع کیا ہوا تمام ذخیرہ ختم کر دیں گے، اس کے بعد پھر ایک برس ایسا آئے گا کہ خوب پانی برسے گا، کھیتیاں ہری بھری ہوں گی اور لوگ پھلوں اور دانوں سے عرق اور تیل بہتات کے ساتھ نکالیں گے، یعنی موٹی گائیں اور بالیں خوش حالی کے سال ہیں اور دُبلی گائیں اور بالیں خشک سالی کے برس جو خوش حالی کی پیداوار کو کھا جائیں گے۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝	کہا تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر سو جو کاٹو اُسکو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ، پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائیں گے جو رکھا تم نے اُن کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے، پھر آئے گا، ایک برس اس کے پیچھے اس میں مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے۔

یہ قرآنِ عزیز کی بلاغتِ کلام کا اعجاز ہے کہ اُس نے حضرتِ یوسفؑ کی تعبیرِ خواب اور اس سے متعلق تدبیر کو ایک ہی جملہ میں ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے، تا کہ کلام میں تکرار اور دُہرانے کی ضرورت باقی نہ رہے،

ساقی نے یہ سب معاملہ بادشاہ کے سامنے جا سُنایا، بادشاہ نے ساقی کی زبان سے پہلے کچھ جملے یوسفؑ کی تعریف میں سُنے تھے، تعبیرِ خواب کا معاملہ دیکھ کر اُن کے علم و دانش، اور جلالتِ قدر کا قائل ہوگیا اور نادیدہ مشتاق بن کر کہنے لگا کہ ایسے شخص کو میرے پاس لاؤ۔

جب بادشاہ کا پیامبر یوسفؑ کے پاس پہنچا اور بادشاہ کے طلب و اشتیاق کا حال سُنایا تو حضرتِ یوسفؑ نے قید خانے سے باہر آنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس طرح تو میں جانے کو تیار نہیں ہوں، تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ وہ یہ تحقیق کرے کہ اُن عورتوں کا معاملہ کیا تھا، جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے؟ پہلے یہ بات صاف ہو جائے کہ انھوں نے کیسی کچھ مکاریاں کی تھیں اور میرا پروردگار تو اُن کی مکاریوں سے خوب واقف ہے۔

حضرتِ یوسف (علیہ السلام) بے قصور اور بے خطا برسوں سے قید خانہ میں بند تھے اور بلا وجہ اُن کو زندانی بنایا ہوا تھا۔ اب جبکہ بادشاہ نے مہربان ہوکر رہائی کا مژدہ سنایا تو چاہیے تھا کہ وہ مسرت و خوشی کے ساتھ زندان سے باہر نکل آتے، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا، اور گذشتہ معاملہ کی تحقیق کا مطالبہ شروع کر دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرتِ یوسفؑ خانوادۂ نبوت سے ہیں اور خود بھی برگزیدہ نبی و پیغمبر ہیں، اس لئے غیرت و حمیت اور عزتِ نفس کے بدرجۂ اتم مالک ہیں، انھوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ کی اس مہربانی پر میں رہا ہوگیا تو یہ بادشاہ کا رحم و کرم سمجھا جائے گا اور میرا بے قصور اور صاحبِ عصمت ہونا پردۂ خفا میں رہ جائے گا، اس طرح صرف عزتِ نفس ہی کو ٹھیس نہیں لگے گی بلکہ دعوت و تبلیغ کے اس اہم مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا جو میری زندگی کا نصب العین ہے پس اب بہترین وقت ہے کہ معاملہ کی اصل صورت سامنے آجائے اور حق ظاہر و واضح ہو جائے،

صحیحین (بخاری و مسلم) کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا

ذکر فرماتے ہوئے حضرتِ یوسفؑ کے ضبط و صبر کو بہت سراہا اور تواضع و کسرِ نفسی کی حد تک اس کو بڑھا کر یہ ارشاد فرمایا:۔

لَوْ لَبِثْتُ فِی السِّجْنِ مَا لَبِثَ یُوسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ[۱] (الحدیث)

اگر میں اس قدر دراز مدت تک قید میں رہتا جس قدر کہ یوسفؑ رہے تو بلانے والے کی دعوت فوراً قبول کر لیتا۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ یوسف (علیہ السلام) کا معاملہ براہِ راست عزیز کی بیوی کے ساتھ پیش آیا تھا مگر حضرتِ یوسفؑ نے اُس کا ذکر نہیں کیا بلکہ اُن مصری عورتوں کا حوالہ دیا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، حضرتِ یوسفؑ نے ایسا کیوں کیا، اس کی دو وجہیں تھیں، ایک یہ کہ حضرتِ یوسفؑ کو اگرچہ عزیز کی بیوی سے زیادہ تکلیف پہنچی تھی مگر قید کے اس معاملہ میں ان عورتوں کی بھی سازش تھی اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک یوسفؑ کی عاشق اور اُن کو اپنی جانب مائل کرنے کی آرزومند تھی، اور ناکامی کی صورت میں سب نے مل کر عزیز کی بیوی کو اُس کے قید والے فیصلہ میں شہ دی اور عملی جامہ پہنا کر چھوڑا، یہی وجہ ہے کہ زندان کا معاملہ ان عورتوں کے قضیہ کے بعد پیش آیا، دوسری وجہ یہ کہ حضرتِ یوسفؑ سمجھتے تھے کہ عزیز نے میرے ساتھ ممکن حُسنِ سلوک برتا ہے، میری عزت اور میرا احترام کیا ہے اس لئے موزوں نہیں ہے کہ میں اُس کی بیوی کا نام لے کر اُس کی رسوائی کا باعث بنوں۔

غرض بادشاہ نے جب یہ سُنا تو اُن عورتوں کو بُلوایا اور اُن سے کہا کہ صاف صاف اور صحیح صحیح بتاؤ کہ اس معاملہ کی اصل حقیقت کیا ہے جب کہ تم نے یوسفؑ پر ڈورے ڈالے تھے تاکہ تم اُس کو اپنی طرف مائل کر لو؟ وہ ایک زبان ہو کر بولیں:۔

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ

بولیں، حاشاللہ ہم نے اس میں برائی کی کوئی بات نہیں پائی

مجمع میں عزیز کی بیوی بھی موجود تھی اور اب وہ عشق و محبت کی بھٹی میں خام نہ تھی کندن تھی، اور ذلت و رسوائی کے خوف سے آگے نکل چکی تھی" اُس نے جب یہ دیکھا کہ یوسفؑ کی

[۱] بخاری کتاب الانبیاء۔

خواہش ہے کہ حقیقت حال سامنے آجائے تو بے اختیار بول اٹھی :-

اَلْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ جو حقیقت تھی وہ اظاہر ہوگئی ہاں وہ میں ہی تھی جس نے یوسف پر ڈورے ڈالے کہ اپنا دل ہار بیٹھے بلاشبہ وہ (اپنے بیان میں) بالکل سچا ہے

اور یہ بھی کہا :-

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

یہ میں نے اس لئے کہا کہ اُس (یوسف) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اُسکے پیٹھ پیچھے اُس کے معاملہ میں خیانت نہیں کی نیز اس لئے کہ (واضح ہو جائے) اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی) کی راہ نہیں کھولتا، میں اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی، آدمی کا نفس تو برائی کے لئے بڑا ہی اُبھارنے والا ہے مگر ہاں اسی حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے، بلاشبہ میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا، بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔

ہم نے اس آیت کا ترجمہ مشہور مفسر ابن حیان اندلسی کی تفسیر کے مطابق کیا ہے، دوسرے مفسرین اس کے علاوہ تفسیر کرتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) اور اُن کے شاگردِ رشید حافظ عماد الدین بن کثیر اپنی تفسیر میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں۔

"یہ میں نے اس لئے کہا کہ اُس (عزیز) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اُس کی (اس سے زیادہ اور کوئی) خیانت نہیں کی (جس کا حال اُسے معلوم ہے) اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے مکر کو کامیاب نہیں کرتا (سو اگر میں نے اس سے زیادہ خیانت کی ہوتی تو اس کا بھی پردہ فاش ہو کر رہتا) اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، بیشک نفس البتہ برائی کے لئے بڑا ہی اُبھارنے والا ہے مگر جس پر میرا پروردگار رحم کردے، بیشک میرا پروردگار بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

یعنی اُنھوں نے اس مقولہ کو عزیز کی بیوی کا مقولہ قرار دے کر "لَمْ اَخُنْهُ" کی ضمیر کا مرجع

عزیز کو قرار دیا ہے۔

اور عام مفسرین اس پورے مقولے کو حضرتِ یوسفؑ کا مقولہ قرار دیتے ہیں اور "لم اخنہ" کی ضمیر کو اُسی طرح عزیز کی بیوی کی جانب پھیرتے ہیں جس طرح حافظ ابن تیمیہ کی رائے ہے اور آیت کا اس طرح ترجمہ کرتے ہیں :-

"یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اُس کے پیٹھ پیچھے اُس کی خیانت نہیں کی اور اللہ تعالیٰ دغابازوں کا فریب کامیاب نہیں کرتا، اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا، بیشک نفس سکھلاتا ہے برائی مگر یہ کہ رحم کرے میرا پروردگار، بیشک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے"

اور "ما ابرئ نفسی" کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ حضرتِ یوسفؑ نے چونکہ اپنی عصمتِ نفس کا اس موقعہ پر زبردست مظاہرہ کیا تھا تو ایک جلیل القدر نبی اور مقرب بارگاہِ الٰہی ہونے کی وجہ سے یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری تھا کہ میری پاکبازی اور عصمت کا یہ معاملہ میرے اپنے نفس کی بدولت نہیں ہے کیوں کہ نفسِ انسانی تو اکثر برائی پر ابھارتا ہے بلکہ یہ محض خدا کی رحمت و عنایت کا صدقہ ہے اور یہی رحمت، عصمتِ انبیاء کی کفیل ہے۔

بہرحال وقت آپہنچا کہ حضرتِ یوسفؑ کی عصمت و پاکبازی اور صداقت و طہارت کا معاملہ تہمت لگانے والوں کی زبان ہی سے واضح ہو جائے چنانچہ واضح اور ظاہر ہو گیا اور شاہی دربار میں مجرموں نے اعترافِ جرم کر کے یہ بتا دیا کہ یوسفؑ کا دامن ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک اور منزہ ہے۔

لطیفہ: امام رازی (رحمۃ اللہ) فرماتے ہیں کہ یوسفؑ خدا کے سچے پیغمبر اور نبی معصوم تھے اس لئے ان کا دامن ہر قسم کی آلائش سے پاک صاف تھا، اور اُن کی مقدس زندگی کا ایک لمحہ بھی کسی آلودگی سے ملوث نہیں ہوا تھا، اس لئے خدائے تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ یوسفؑ کے واقعہ سے متعلق جس قدر بھی شخصیتیں تھیں اُن سب کی زبانی اُنکی طہارتِ نفس

اور عصمت کا اعتراف کرایا۔ ؎

اَلفضلُ مَاشَھِدَتْ بِہِ الاَعْدَاءُ

اچھا یوسفؑ کے علاوہ اس واقعہ کی شخصیتیں کون ہیں؟ عزیزِ مصر کی بیوی، شہری عورتیں، اور عزیز کی بیوی کا رشتہ دار، یہی افراد ہیں جو کسی نہ کسی طرح تحقیق طلب معاملہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں سب سے پہلے عزیز کی بیوی کا رشتہ دار سامنے آتا ہے اور پیراہن کے چاک ہونے کا عاقلانہ فیصلہ دے کر یوسفؑ کی پاکی کا اظہار کرتا، اور عورت کو مجرم ٹھہراتا ہے، اس کے بعد حقیقتِ حال واضح ہو جانے پر عزیز بھی اقرار کرتا ہے کہ یوسفؑ بے گناہ' بے خطا اور معصوم ہے اور "یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ ھٰذَا" کہہ کر یوسف (علیہ السلام) سے معذرت کرتا اور اپنی ناموس کی حفاظت کی خاطر معاملہ کو ختم کرنے کی درخواست کرتا ہے، تیسرا نمبر شہری عورتوں کا ہے، جب بادشاہ نے بھرے دربار میں یوسفؑ کے معاملہ کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بے تأمل کہہ دیا "حَاشَ لِلّٰہِ مَاعَلِمْنَا عَلَیْہِ مِنْ سُوْءٍ" اور اس طرح یوسف (علیہ السلام) کی پاک دامنی پر مہر لگا دی، یہ سب شہادتیں اگرچہ یوسفؑ کے عزیزوں، رشتہ داروں اور حامیوں کی جانب سے نہ تھیں بلکہ ایک اجنبی ملک، عزیز کی بیوی کے ہم قوم اور اہلِ خاندان کی شہادتیں تھیں تاہم وہم وگمان ہو سکتا تھا کہ کچھ عجب نہیں کہ اس معاملہ میں کسی حد تک " اگرچہ بہت تھوڑا ہی سہی" یوسفؑ کا بھی ضرور تصور ہوگا۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان فضل وکرم تھا کہ اُس نے اپنے پاک اور مقدس بندہ کی عصمت کے اعلان اور اس کے بارہ میں شائبۂ سوءِ ظن کے انہدام کیلئے علیٰ رُؤس الاشہاد خود مجرم سے اقرارِ جرم کرایا، اور اس ہی کی زبان سے یوسفؑ کی عصمت وصداقت کی شہادت دلا کر حقیقتِ حال آشکارا کر دی اور شاہی دربار میں عزیز کی بیوی کو یہ کہنا پڑا کہ "اَلْاٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّہٗ عَنْ نَّفْسِہٖ وَاِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ" (اب حق ظاہر ہوگیا میں نے ہی اُس کو اپنے نفس کے لئے پھسلایا تھا اور بلاشبہ وہ سچا ہے)

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا عطا کرتا ہے اور
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (پ ۲۸ ع ۱) اللہ بڑے فضل والا ہے۔

فرعون پر جب حقیقتِ حال منکشف ہو گئی تو اُس کے قلب میں حضرتِ یوسفؑ کی عظمت وجلالتِ قدر کا سکہ بیٹھ گیا، ساقی کا حسنِ عقیدت کے ساتھ یوسفؑ کی عقل ودانش کا ذکر اپنی خواب کی بہترین اور دل لگتی تعبیر، اور عصمتِ نفس کا یہ انکشاف، یہ سب امور تھے جنھوں نے مل کر بادشاہ کو اس بزرگ اور پُرعظمت ہستی کی دید اور اُس سے استفادہ کا عاشق بنادیا، وہ کہنے لگا:۔

اِئْتُوْنِيْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ (ع ۷) اس کو (جلد) میرے پاس لاؤ کہ میں اس کو خاص اپنے کاموں کیلئے مقرر کروں

یوسف (علیہ السلام) اب بایں رعنائی ودلبری، بایں عصمت وپاکبازی، اور بایں عقل ودانش زنداں سے نکل کر بادشاہ کے دربار میں تشریف لائے، بات چیت ہوئی تو بادشاہ حیران رہ گیا کہ اب تک جس کی راستبازی، امانت داری اور وفاءِ عہد کا یہ کچھ تجربہ کیا تھا وہ عقل ودانش اور حکمت وفطانت میں بھی آپ اپنی نظیر ہے اور مسرت کے ساتھ کہنے لگا:۔

اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ بلاشبہ آج کے دن تو ہماری نگاہوں میں بڑا صاحبِ اقتدار اور امانتدار ہے

پھر اُن سے دریافت کیا کہ میرے خواب میں جس قحط سالی کا ذکر ہے اُس کے متعلق مجھ کو کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، حضرتِ یوسفؑ نے جواب دیا:۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ یوسف نے کہا: اپنی مملکت کے خزانوں پر آپ مجھے مختار کیجئے
اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ۔ میں حفاظت کرسکتا ہوں، اور میں اس کام کا جاننے والا ہوں

چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور حضرتِ یوسفؑ کو اپنی تمام مملکت کا امین وکفیل بنادیا اور شاہی خزانوں کی کنجیاں اُن کے حوالہ کرکے مختارِ عام کردیا، توراۃ میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

یہ تعبیر فرعون کی نگاہ میں اور اس کے سب نوکروں کی نظر میں اچھی معلوم ہوئی، فرعون نے اپنے

نوکروں کو کہا کیا ہم ایسا جیسا یہ مرد کہ جس میں خدا کی روح ہے پا سکتے ہیں؟ اور فرعون نے یوسف سے کہا از بس کہ خدا نے تجھے اس سب میں بینائی دی ہے سو کوئی تجھ سا عاقل و دانشور نہیں ہے تو میرے گھر کا مختار ہو اور اپنا حکم میری سب رعیت پر جاری کر، فقط تخت نشینی میں میں تجھ سے بزرگتر رہوں گا، پھر فرعون نے یوسف سے کہا دیکھ میں نے تجھے ساری زمین مصر پر حکومت بخشی اور فرعون نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسف کے ہاتھ میں پہنا دی اور اُس کو کتان کا لباس پہنایا اور سونے کا طوق اس کے گلے میں ڈالا اور اس نے اُسے مصر کی ساری مملکت پر حاکم کیا، اور فرعون نے یوسف کو کہا میں فرعون ہوں اور بغیر تیرے مصر کی ساری زمین میں کوئی انسان اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ اُٹھائے گا۔[1]

اللہ اللہ! خدائے تعالیٰ کی قدرت اور اُس کے عطاء و کرم کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ کل جس ہستی کو مصر کی متمدن قوم بدوی اور صحرائی سمجھتی تھی جو بدوی تھا اور غلام بھی اس کو پہلے ایک سردار کے گھر کا مختار، اُس کی نگاہوں میں محترم و معزز اور امین و فطین بنایا، اور پھر قید خانہ کی زندگی سے نکالا تو مملکتِ مصر، اور قومِ مصر کا مالک و مختار بنا دیا، اور اس مرتبہ پر پہنچا دیا کہ اسبابِ دُنیوی کے ماتحت جس کا تصور بھی ممکن نہ تھا، یہ قادرِ مطلق کی کار فرمائی کا معجزانہ مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے؟ کل جو کنعان میں گلہ بانی کر رہا تھا وہ آج وقت کی سب سے بڑی متمدن قوم کا مختار و مالک بن کر جہاں بانی کر رہا ہے، سچ ہے جس کو وہاں تولیت کا شرف حاصل ہو گیا اس کے لئے راہ کی تمام دشواریاں ہیچ ہیں اور حالات کی نامساعدت پرِ کاہ کی وقعت بھی نہیں رکھتی۔

اسی لئے حق تعالیٰ نے "عزیز" کے کاروبار کا مختار بنا کر یوسفؑ کے لئے یہ فرمایا تھا کہ ہم نے اس کو "تمکین فی الارض" عطا کر دی اور اب جبکہ اس آغاز کی یہ انتہا نمود میں آ گئی تو پھر ارشاد فرمایا:۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ اور اس طرح ہم نے سرزمینِ مصر میں یوسفؑ کے قدم جما دئے کہ

[1] پیدائش باب ۴۱ آیات ۳۷-۴۴۔

يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ٥ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ۔	جس جگہ سے چاہے حسب مرضی رہنے سہنے کا کام لے، ہم جسے چاہتے ہیں (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیض یاب کردیتے ہیں، اور نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے، اور جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور بدعملیوں سے بچتے رہے ان کے لئے تو آخرت کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے۔

سورۂ یوسف میں حضرتِ یوسفؑ کے لئے دو جگہ" تمکین فی الارض " (زمین کا مالک بنا دینا) کی بشارت سنائی گئی ہے اور دونوں مقام پر تعبیر کا نیا اسلوب اختیار کیا گیا ہے اس کے متعلق مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں کیا خوب کہا ہے :۔

حضرتِ یوسفؑ کی مصری زندگی کے دو انقلاب انگیز نقطے تھے، ایک وہ جب غلام ہو کر بکے اور پھر عزیز کی نظروں میں ایسے معزز ہوئے کہ اس کے علاقے کے مختار ہو گئے، دوسرا یہ کہ قیدخانہ سے نکلے اور نکلتے ہی وہاں پہنچ گئے کہ حکمرانی کی مسندِ اجلال پر جلوہ آرا نظر آئے پس جب پہلے انقلاب تک سرگذشت پہنچی تھی تو آیت (۲۱) میں حکمتِ الٰہی کی کرشمہ سنجیوں پر توجہ دلائی تھی کہ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ اور اب کہ دوسرا انقلاب پیش آیا تو اسی طرح آیت (۵۶) میں فرمایا كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ، وہاں چونکہ معاملہ مصر کی ابتدا ہوئی تھی اور ابھی حضرتِ یوسفؑ کو حکمرانی کی دانش سیکھنی باقی تھی اس لئے فرمایا تھا وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى أَمْرِهِ یہاں چونکہ تکمیلِ کار کے بعد اس کا نتیجہ ظاہر ہو گیا تھا اس لئے فرمایا " لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ " یہ اس لئے ہوا کہ ہمارا قانون ہے، نیک عمل کا بیج کبھی ضائع نہیں ہوتا، ضروری ہے کہ پھل لائے [1]

شروع واقعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ سورۂ یوسف کا نزول یہودیوں کے اس سوال پر ہوا جو انھوں نے مشرکینِ مکہ کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا وہ یہ کہ "ابراہیمؑ کی نسل مصر میں کیسے آئی ؟"

[1] ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۲۴۵ (نوٹ)

اس لئے آیت زیرِ بحث کی تفسیر میں شاہ عبد القادر (نور اللہ مرقدہٗ) ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ جواب ہوا اُن کے سوال کا کہ" اولادِ ابراہیمؑ اس طرح شام سے آئی مصر میں" اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے حضرتِ یوسفؑ کو گھر سے دور پھینکا تاکہ ذلیل ہو، اور اللہ نے زیادہ عزت دی اور ملک پر اختیار دیا" ویسا ہی ہوا ہمارے حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو۔[1]

غرض حضرتِ یوسفؑ نے سلطنتِ مصر کے مختارِ کل ہونے کے بعد خواب سے متعلق وہ تمام تدابیر شروع کر دیں جو چودہ سال کے اندر مفید کار ہوسکیں اور رعایا قحط سالی کے ایام میں بھی بھوک اور پریشان حالی سے محفوظ رہ سکے، چوں کہ یہ تفصیل، خواب اور اُس کی تعبیر کے ضمن میں خود بخود ذہن میں آجاتی ہے، اس لئے قرآنِ عزیز نے واقعہ کے اُن غیر ضروری حصّوں کو بیان نہیں کیا۔ البتہ تورات نے ان تفصیلات کو بھی دُہرایا ہے۔

اور یوسفؑ جس وقت مصر کے بادشاہ فرعون کے حضور کھڑا ہوا تیس برس کا تھا، اور یوسفؑ فرعون کے حضور سے نکل کر مصر کی ساری زمین میں پھرا، اور بڑھتی کے سات برس میں زمین مالا مال ہوئی تب اس نے ان سات برسوں کی ساری چیزیں کھانے کی جو سرزمینِ مصر میں تھیں جمع کیں اور اُس نے اُن کھانے کی چیزوں کو بستیوں میں ذخیرہ کیا اور ان کھیتوں کی جو ہر بستی کے آس پاس تھے کھانے کی چیزیں اسی بستی میں رکھیں، اور یوسفؑ نے غلّہ بہت کثرت سے جیسے دریا کی ریت ایسا کہ وہ حساب کرنے سے باز رہا جمع کیا، کیونکہ وہ بے حساب تھا، اور سات برس سستی کے جو زمینِ مصر میں تھے آخر ہوئے اور گرانی کے سات برس جیسا کہ یوسفؑ نے کہا تھا آنے شروع ہوئے اور سب زمین میں گرانی ہوئی، پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی پھر جب ساری زمینِ مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کے لئے فرعون کے آگے چلائی، فرعون نے سب مصریوں کو کہا کہ یوسفؑ کے پاس جاؤ وہ جو تمہیں کہے سو کرو، اور تمام روئے زمین پر کال تھا، اور یوسفؑ نے ذخیرے کے کھتے کھول کے مصریوں کے ہاتھ بیچے اور مصر کی زمین میں کال بہت بڑھا، اور سارے ملک مصر میں مول

[1] موضح القرآن [illegible]

لینے آئے، کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔

جب یعقوبؑ نے دیکھا کہ مصر میں غلّہ ہے تب یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم کیوں ایک دوسرے کو تاکتے ہو، دیکھو، میں نے سنا ہے کہ مصر میں غلّہ ہے تم وہاں جاؤ اور وہاں سے ہمارے لئے مول لو تاکہ ہم جئیں اور مریں نہیں[1]

غرض جب قحط سالی کا زمانہ شروع ہوا تو مصر اور اس کے قرب و جوار کے علاقے میں بھی سخت کال پڑا اور کنعان میں خاندانِ یعقوبؑ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا جب حالت نزاکت اختیار کر گئی تو حضرتِ یعقوبؑ نے صاحبزادوں سے کہا کہ مصر میں عزیزِ مصر نے اعلان کیا ہے کہ اس کے پاس غلّہ محفوظ ہے تم سب جاؤ اور غلّہ خرید کر لاؤ چنانچہ باپ کے حکم کے مطابق یہ کنعانی قافلہ عزیزِ مصر سے غلّہ لینے کے لئے مصر روانہ ہوا، خدا کی قدرت دیکھئے کہ برادرانِ یوسفؑ کا یہ قافلہ اُسی بھائی سے غلّہ لینے چلا ہے جس کو اپنے خیال میں وہ کسی مصری گھرانے کا معمولی اور گمنام غلام بنا چکے تھے، مگر اس یوسفؑ فروش قافلہ کو کیا معلوم کہ وہ کل کا غلام آج مصر کے تاج و تخت کا مالک و مختارِ کُل ہے اور اُس کو اسی کے سامنے عرضِ حال کرنا ہے، بہرحال کنعان سے چلے اور مصر جا پہنچے اور جب دربارِ یوسفی میں پیش ہوئے تو یوسف (علیہ السلام) نے اُن کو پہچان لیا۔ اور کیوں نہ پہچانتے، رنگ ڈھنگ بول چال، لب و لہجہ، نقشہ و صورت اور ساری ادائیں یوسفؑ کی جانی پہچانی تھیں البتہ وہ یوسفؑ کو نہ پہچان سکے، اور کس طرح پہچانتے؟ کل جو چھوٹا سا بچہ تھا آج وہ تقریباً چالیس سالہ تجربہ کار انسان ہے، نقشہ و رنگ اور بول چال سے کچھ شبہ بھی کرتے تو کس طرح؟ اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یوسفؑ اور تختِ شاہی! مگر یہ واقعہ تھا، حقیقت تھی اور اپنے برگزیدہ بندہ کے ساتھ رب العٰلمین کا وہ معاملہ تھا جو صفحۂ دنیا پر ثبت ہو کر رہا

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ	اور (پھر ایسا ہوا کہ قحط سالی کے زمانہ میں) یوسف (علیہ السلام)

[1] سفر پیدائش باب ۴۱ آیات ۴۶، ۴۹، ۵۳، ۵۷ و باب ۴۲ آیات ۱-۲۔

قَدَخَلُوْا عَلَیْہِ فَعَرَفَھُمْ وَھُمْ لَہٗ مُنْکِرُوْنَ ۝ کے بھائی (غلہ خریدنے مصر سے) آئے، وہ جب یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اس نے فوراً اُن کو پہچان لیا اور وہ یوسفؑ کو نہ پہچان سکے۔

توراۃ کا بیان ہے کہ برادرانِ یوسفؑ پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا اور اس طرح انکو یوسف (علیہ السلام) کے سامنے حاضر ہو کر بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔

غرض حضرت یوسفؑ نے والد، حقیقی بھائی، اور گھر کے حالات کو خوب کرید کرید کر پوچھا اور آہستہ آہستہ سب کچھ معلوم کر لیا، اور پھر اُن کو حسب مرضی غلہ بھر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ قحط اس قدر سخت ہے کہ تم کو دوبارہ یہاں آنا پڑے گا اس لئے یاد رکھو کہ اب کی مرتبہ اگر تم اپنے چھوٹے بھائی بن یمین کو ساتھ نہ لائے جس کے متعلق تم نے مجھ سے کہا ہے کہ اس کا بھائی یوسفؑ گم ہو گیا ہے اور اس لئے تمہارا باپ اُس کو کسی طرح جدا نہیں کرتا، تو تم کو ہرگز غلہ نہیں ملے گا۔

وَلَمَّا جَھَّزَھُمْ بِجَھَازِھِمْ قَالَ ائْتُوْنِیْ بِاَخٍ لَّکُمْ مِّنْ اَبِیْکُمْ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْٓ اُوْفِی الْکَیْلَ وَاَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِہٖ فَلَا کَیْلَ لَکُمْ عِنْدِیْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ۝

اور جب یوسفؑ نے اُن کا سامان مہیا کر دیا تو کہا اب کے آنا تو اپنے سوتیلے بھائی بن یمین کو بھی ساتھ لانا، تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ میں تمہیں (غلہ) پوری تول دیتا ہوں اور باہر سے آنے والوں کیلئے بہتر مہمان نواز ہوں لیکن اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو پھر یاد رکھو نہ تو تمہارے لئے میرے پاس خرید فروخت ہو گی نہ تم میرے پاس جگہ پاؤ گے۔

برادرانِ یوسفؑ نے کہا کہ ہم اپنے والد سے کہیں گے اور ہر طرح ترغیب دیں گے کہ وہ بن یمین کو ہمارے ساتھ یہاں بھیجنے پر راضی ہو جائے پھر جب وہ چلنے لگے اور یوسف (علیہ السلام) سے رخصت ہونے آئے تو انھوں نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ خاموشی کے ساتھ ان کے کجاووں میں اُن کی وہ پونجی بھی رکھ دو جو انھوں نے غلہ کی قیمت کے نام سے دی ہے تاکہ جب گھر جا کر اس کو دیکھیں تو عجب نہیں کہ پھر دوبارہ واپس آئیں، جب یہ قافلہ کنعان واپس پہنچا تو انھوں نے اپنی تمام سرگذشت اپنے باپ یعقوب (علیہ السلام) کو

سنائی اور ان سے کہا کہ مصر کے والی نے صاف صاف ہم سے کہہ دیا ہے کہ اُس وقت تک یہاں نہ آنا اور نہ غلہ کی خرید کا دھیان کرنا، جب تک کہ اپنے سوتیلے بھائی بن یمین کو ساتھ نہ لاؤ، لہٰذا تم کو چاہیئے کہ اس کو ہمارے ساتھ کردو، ہم اس کے ہر طرح نگہبان اور محافظ ہیں۔

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کیا تم پر اسی طرح اعتماد کروں جس طرح اس کے بھائی یوسفؑ کے معاملہ میں کرچکا ہوں، اور تمہاری حفاظت ہی کیا؟ خدا ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی رحم کرنے والا نہیں ہے۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ (ع)

(یعقوبؑ نے) کہا کیا میں تم پر اُس (بن یمین) کے بارہ میں ایسا ہی اعتماد کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی (یوسفؑ) کے بارہ میں کرچکا ہوں سو اللہ ہی بہترین حفاظت کرنے والا ہے اور وہی سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

اس گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد اب انھوں نے اپنا سامان کھولنا شروع کیا۔ دیکھا تو ان کی پونجی ان ہی کو واپس کردی گئی ہے، یہ دیکھ کر وہ کہنے لگے اے باپ! اس سے زیادہ اور کیا ہم کو چاہیئے؟ دیکھئے غلہ بھی ملا اور ہماری پونجی بھی جوں کی توں لوٹا دی گئی اُس نے تو ہم سے قیمت بھی نہ لی، اب ہمیں اجازت دے کہ ہم دوبارہ اس کے پاس جائیں اور گھر والوں کے لئے رسد لائیں اور بن یمین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دے ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ اور زیادہ لائیں گے کیوں کہ یہ غلہ جو پہلے ہم لائے تھے تھوڑا ہے۔

اور توراۃ[1] میں ہے کہ برادرانِ یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ پونجی کو دیکھ کر ڈر گئے تھے کہ نہ معلوم اب کیا نئی آفت آئے، مگر واقعات کی ترتیب اور حضرت یوسفؑ کے طرزِ عمل کے پیشِ نظر جس کا ذکر قرآن اور توراۃ دونوں میں یکساں طور پر کیا گیا ہے یہی صحیح ہے جو

[1] پیدائش باب ۴۲۔ آیت ۳۵۔

قرآنِ عزیز نے بیان کیا ہے، برادرانِ یوسفؑ خود اپنے ہاتھ سے غلہ کی قیمت ادا کر چکے تھے، لین دین کے بعد ہی قافلہ کو روانگی کی اجازت ملی تھی پھر ہر ایک بھائی کے کجاوہ میں سے علیحدہ علیحدہ اُسی طرح قیمت کی واپسی، ہر عقلمند کے لئے یہی راہنمائی کرتی ہے کہ جس طرح والیِ مصر نے دورانِ قیام میں ہمارا اعزاز کیا اُسی طرح یہ پونجی بھی اس نے واپس کر دی اور منّت و احسان سے بچانے کے لئے اس کا اظہار بھی مناسب نہ سمجھا۔

بہرحال یعقوبؑ نے فرمایا میں بن یمین کو ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک تم اللہ کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرو اور وہ یہ کہ جب تک ہم خود نہ گھیر لئے جائیں (یعنی ہر طرح مجبور نہ کر دیئے جائیں) ہم ضرور ضرور اُس کو تیرے پاس صحیح و سلامت لوٹائیں گے، جب ان سب نے متفق ہو کر باپ کے سامنے اس کا پختہ عہد کیا اور ہر طرح اطمینان دلایا تب حضرتِ یعقوبؑ نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہوا محض اسبابِ ظاہری کی بنا پر ہے ورنہ کیا تم اور کیا تمہاری حفاظت، اور کیا ہم اور کیا ہمارا عہد، ہم سب کو اپنے اس معاملہ کو خدا کی نگہبانی میں دینا چاہیئے۔

قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ یعقوب نے کہا ہم نے جو قول و قرار کیا ہے اس پر اللہ نگہبان ہے۔

عہد و پیمان کے بعد برادرانِ یوسفؑ کا قافلہ دوبارہ کنعان سے مصر کو روانہ ہو رہا ہے اور اس مرتبہ بن یمین بھی ہمراہ ہے، حضرتِ یعقوبؑ نے رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ دیکھو سب ایک ہی دروازہ سے مصر میں داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے شہر میں داخل ہونا اور یہ بھی فرمایا کہ اس نصیحت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم اپنی تدابیر پر مغرور ہو بیٹھو کیونکہ میں تمہیں کسی ایسی بات سے ہرگز نہیں بچا سکتا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہونے والی ہو؛ فرماں روائی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے میں نے اُسی پر بھروسہ کیا اور تمام بھروسہ کرنیوالوں کو اُسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے، اس لئے میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف احتیاطی تدابیر کے طور پر ہے اور خدا پر بھروسہ اور یقین کے ساتھ اسبابِ ظاہری کو احتیاطی تدبیر

کے لئے استعمال کرنا خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے۔

علماء تفسیر عام طور پر حضرت یعقوبؑ کی اس نصیحت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ عزیز مصر (حضرت یوسفؑ) نے چونکہ پہلی مرتبہ اُن کا کافی اعزاز کیا تھا اور یہ قافلہ خاص شان کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی دعوت پر مصر میں داخل ہو رہا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مصری اُن سے حسد کرنے لگیں اور یہ اُن کی تکلیف کا باعث بن جائے۔

لیکن بعض مفسّرین اور مؤرخین اس کی وجہ دوسری بتلاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تورات سے اس قدر ثابت ہو چکا ہے کہ پہلی مرتبہ برادرانِ یوسفؑ پر جاسوسی کا گمان کیا جا چکا تھا اور اگرچہ یوسف علیہ السلام نے یہ الزام نہ لگایا ہو لیکن مصریوں نے ضرور اُن پر شبہ کیا تھا، اور حضرت یعقوبؑ بیٹوں کی زبانی پوری تفصیل سن چکے تھے لہٰذا انھوں نے سوچا کہ اگر گیارہ نوجوان اس کرّوفر سے ایک ساتھ شہر میں داخل ہوں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ عزیز مصر کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لئے جائیں، اس لئے نصیحت فرمادی کہ ایک جتھہ بنا کر شہر میں داخل نہ ہونا جدا جدا دروازوں سے ایک مسافر کی طرح داخل ہونا۔

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ یعقوبؑ چونکہ صاحبِ علم و بصیرت تھے اور یہ دولتِ علم ہم نے ہی اس کو بخشی تھی اس لئے اس نے بیٹوں سے یہ نصیحت کی بات کہہ دی جو اُس کے خیال میں آگئی تھی ورنہ تو باپ کے حکم کی تعمیل کرنے کے باوجود بھی خدائے تعالیٰ کی مشیت نے جو کچھ مقرر کر دیا تھا اس کے مقابلہ میں ان کی یہ احتیاط کچھ بھی کام نہ آسکی۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ	پھر جب یہ مصر میں اسی طرح داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے
اَبُوْهُمْ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ	ان کو حکم کیا تھا تو یہ (احتیاط) اُن کو اللہ تعالیٰ (کی مشیت) کے
مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ	مقابلہ میں کچھ کام نہ آئی مگر یہ ایک خیال تھا یعقوبؑ کے جی میں
قَضٰىهَا ۚ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ	جو اُس نے پورا کر لیا اور بلاشبہ وہ صاحبِ علم تھا اور ہم نے ہی

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اُس کو یہ علم سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

مطلب یہ ہے کہ یعقوبؑ نے جو کچھ کیا اس کو بمقتضائے علم ہی کرنا چاہئے تھا کیونکہ علم کی یہ دولت ہم نے ہی اُس کو بخشی تھی مگر یہ ضروری نہیں کہ احتیاطی تدابیر ہر جگہ راست ہی آجائیں اگر خدائے تعالیٰ کی مشیت اس کے برعکس مصلحت دیکھتی ہے تو پھر وہی ہو کر رہتا ہے اور سب تدبیریں بیکار ہو جاتی ہیں جیسا کہ آنے والے واقعہ میں بن یمین کے ساتھ پیش آیا کہ وہ روک لئے گئے اور ایسی مصلحت کے زیر اثر روک لئے گئے کہ اس کا انجام تمام خاندانِ یعقوب (علیہ السّلام) کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔

صورت یہ پیش آئی کہ جب برادرانِ یوسفؑ کنعان سے روانہ ہوئے تو راستہ میں بن یمین کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کبھی اس کو باپ کی محبت وعشق کا طعنہ دیتے اور کبھی اس بات پر حسد کرتے کہ عزیزِ مصر نے خصوصیت کے ساتھ اس کو کیوں بلایا ہے، بن یمین یہ سب کچھ سُنتا اور خاموش رہتا، جب یہ سب منزلِ مقصود پر پہنچے تو حضرتِ یوسفؑ نے بن یمین کو اپنا تمام حال سنایا اور بتایا کہ میں تیرا حقیقی بھائی یوسف ہوں اور پھر تسلی وتشفی کی کہ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ان کی بدسلوکیوں کا دَور ختم ہو گیا، اب یہ تجھ کو کسی قسم کی ایذاء نہیں پہنچا سکیں گے۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

اور جب یہ سب یوسف (علیہ السّلام) کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی (بن یمین) کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اس سے (آہستہ سے) کہا میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں، بس جو بدسلوکی یہ تیرے ساتھ کرتے آئے ہیں، تو اُس پر غمگین نہ ہو۔

توراۃ میں ہے کہ یوسفؑ نے بھائیوں کی بڑی مدارات کی اور نوکروں کو حکم دیا کہ انکو شاہی مہمان خانہ میں اُتاریں، اور ان کے لئے پرتکلف دعوت کا سامان کیا، چند روز کے قیام کے بعد جب یہ رخصت ہونے لگے تو یوسف (علیہ السّلام) نے حکم دیا کہ ان کے اونٹوں کو اس قدر لاد دو جتنا کہ یہ لیجا سکیں۔ حضرتِ یوسفؑ کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے عزیز

بھائی بن یمین کو اپنے پاس روک لیں مگر انتہائی اضطراب اور بیقراری کے باوجود اُنکے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا اس لئے کہ حکومتِ مصر کے قانون میں کسی غیر مصری کو بغیر کسی معقول وجہ کے روک لینا سخت ممنوع تھا، اور حضرت یوسفؑ یہ کسی طرح نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت لوگوں پر یا اُن کے بھائیوں پر اصل حقیقت منکشف ہو، بدیں وجہ خاموش رہے اور جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو کسی کو اطلاع کئے بغیر نشانی کے طور پر اپنا چاندی کا پیالہ بن یمین کے کجاوہ میں رکھ دیا۔

کنعان کے اس قافلہ نے ابھی تھوڑی ہی مسافت طے کی ہوگی کہ یوسف (علیہ السلام) کے کارندوں نے شاہی برتنوں کی دیکھ بھال کی تو اُس میں پیالہ ندارد پایا سمجھے کہ شاہی محل میں کنعانیوں کے سوا دوسرا کوئی نہیں آیا اس لئے انھوں نے ہی یہ چوری کی ہے، فوراً دوڑے اور چلائے، قافلہ والو ٹھہرو تم چور ہو، برادرانِ یوسفؑ کارندوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے ہم کو خواہ مخواہ کیوں الزام لگاتے ہو آخر معلوم تو ہو کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے کارندے کہنے لگے کہ بادشاہ کا پیمانہ (پیالہ) گم ہو گیا ہے اور ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا کہ جو شخص اس چوری کا پتہ لگا دیگا اس کو ایک اونٹ غلہ انعام میں ملے گا، دمیں اس بات کا ضامن ہوں، برادرانِ یوسفؑ نے کہا "خدا علیم ہے کہ ہم مصر میں فساد اور شرارت کی غرض سے نہیں آئے اور تم جانتے ہو کہ ہم اس سے پہلے بھی غلہ لینے آچکے ہیں، ہم میں چوری کی قطعاً عادت نہیں ہے" کارندوں نے کہا "اچھا جس کے پاس سے یہ چوری نکلے اس کی سزا کیا ہونی چاہیے"۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ خود آپ اپنی سزا ہے یعنی وہ تمہارے حوالے کر دیا جائے گا تاکہ وہ اپنے جرم کی پاداش میں پکڑا جائے، اور ہم اپنے یہاں ایسی زیادتی کرنے والوں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔

کارندوں نے یہ جواب سنا تو پہلے دوسرے بھائیوں کے بوروں کی تلاشی لی اور جب اُن میں پیالہ نہ نکلا تو آخر میں بن یمین کی خورجی کی تلاشی لی تو اس میں پیالہ موجود تھا، انھوں نے

وہ پیالہ نکال لیا اور قافلہ کو واپس لوٹا کر عزیزِ مصر" یوسفؑ" کی خدمت میں معاملہ کو پیش کیا،
حضرتِ یوسفؑ نے معاملہ کی نوعیت کو سُنا تو دل میں بیحد مسرور ہوئے اور خدائے تعالیٰ کی
کارسازی پر شکر ادا کیا کہ جس بات کے لئے میں بیقرار تھا کہ کسی طرح بن یمین میرے پاس رک
جائے اور وہ میرے ہاتھوں کسی طرح نہ بن پڑی اس کو قادرِ مطلق نے اس حکمت کے ساتھ
پورا کر دیا اور یہ سوچ کر قطعاً خاموش رہے اور یہ ظاہر نہیں فرمایا کہ یہ پیالہ میں نے خود بن یمین کی
خورجی میں اپنی نشانی کے طور پر رکھ دیا تھا اُدھر بن یمین بھی جو کہ قبل ہی اپنے برادر بزرگ
یوسف علیہ السلام سے واقف ہو چکا تھا اس واقعہ کو مرضی کے مطابق پاکر خاموش رہا۔

برادرانِ یوسفؑ نے جب یہ دیکھا تو اُن کی حاسدانہ رگ پھڑک اُٹھی اور انھوں نے یہ
جھوٹ بولنے کی جرأت کی کہ اگر بن یمین نے یہ چوری کی ہے تو تعجب کا مقام نہیں ہے
اس سے پہلے اس کا بڑا بھائی یوسف بھی چوری کر چکا ہے۔

حضرتِ یوسفؑ نے یہ دیکھ کر بھی کہ میرے منہ پر ہی جھوٹ بول رہے ہیں ضبط سے کام لیا
اور راز فاش نہ کیا اور دل میں کہنے لگے" تمہارے لئے سب سے بُری جگہ ہے کہ تم ایسا جھوٹا
الزام لگا رہے ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت کا خوب جاننے والا ہے"
یا خود اُن ہی سے مخاطب ہو کر فرمایا جیسا کہ بعض مفسرین کی تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی ان کو
شرمندہ کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تو یہ کہتے تھے کہ ہم چوری کے قریب تک نہیں ہیں اور یا اب
غیر حاضر بھائی پر بھی چوری کا الزام لگا رہے ہو جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا خاندان ہی چوری
پیشہ ہے یہ کیسا بُرا مقام ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔

برادرانِ یوسفؑ نے جب یہ رنگ دیکھا تو بہت گھبرائے اور باپ کا عہد و پیمان یاد آگیا
آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کس صورت سے بن یمین کو حاصل کریں؟ ہم تو پہلے ہی قول ہار
چکے صرف ایک ہی پہلو باقی تھا کہ التجائیں اور خوشامدانہ عرض معروض کر کے عزیزِ مصر کو بن یمین
کی واپسی کی ترغیب دلائیں، کہنے لگے" عزیزِ مصر! ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے اس کو اس کے

پہلے بھائی کا بھی بیحد غم ہے اور اسی لئے اس کا عاشق و متوالا ہے، اس پر رحم کیجئے اور اُس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو سزا کے لئے روک لیجئے، آپ ہم پر مہربان رہے ہیں اور اُن لوگوں میں سے ہیں جو احسان کرنے والے ہیں" عزیز مصر یوسفؑ نے کہا "پناہ بخدا! یہ کیسے ممکن ہے، ہم اگر ایسا کریں تو ظالم ہوں گے۔"

جب اس جانب سے مایوس ہو گئے تو اب الگ خلوت میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے، ان میں سے بڑے نے کہا "بھائی تم کو معلوم ہے کہ والد نے بن یمین کے متعلق کس قدر سخت اور پختہ عہد و پیمان ہم سے لیا ہے اور اس سے پہلے تم یوسف کے ساتھ جو ظلم و زیادتی کر چکے ہو وہ بھی سامنے ہے اس لئے میں تو اب اس جگہ سے اس وقت تک ٹلنے والا نہیں کہ یا والد مجھ کو کنعان آنے کی اجازت دیں اور یا خدا میرے لئے کوئی دوسرا فیصلہ کر دے، جاؤ تم سب ان کے پاس جاؤ اور عرض کرو کہ تمہارے بیٹے بن یمین نے چوری کی اور جو بات ہمارے جاننے میں آئی وہی سچ سچ آپ کے سامنے کہہ دی ہم کو کچھ غیب کا علم تو تھا نہیں کہ پہلے سے جان لیتے کہ اس سے ایسی حرکت سرزد ہونے والی ہے، اور یہ بھی کہنا کہ آپ مصر کے لوگوں سے اس کی تصدیق کر لیں نیز اس قافلہ سے بھی کہ جس کے ساتھ ہم مصر سے یہاں آئے ہیں کہ ہم اس معاملہ میں بالکل سچے ہیں۔

اس مشورہ کے مطابق وہ کنعان واپس آئے اور حضرت یعقوبؑ سے بے کم و کاست سارا واقعہ کہہ سنایا، قرآن عزیز نے یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں کی اس گفتگو کو جو اس سلسلہ میں انھوں نے یعقوب علیہ السلام سے کی اس طرح نقل کیا ہے:-

فَقُولُوا يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ پس (باپ کے پاس جاکر) کہنا اے باپ تیرے بیٹے نے چوری کی۔

اور اس سے وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ یوسفؑ کے ان سوتیلے بھائیوں کی شقاوت کا اندازہ کیجئے کہ ایسے سخت وقت میں بھی بڈھے باپ کو طعن و تشنیع اور ملامت سے نہ چھوڑا اور یہ نہ کہا کہ ہمارے بھائی سے یہ غلطی ہو گئی بلکہ اُن کی طرف نسبت کر کے یہ کہا کہ تیرے بیٹے ہاں

چہیتے اور پیارے بیٹے نے چوری کر کے ہم سب کو ذلیل کیا ہم کو کیا معلوم تھا کہ اُسکے ایسے گن ہیں!
حضرتِ یعقوبؑ یوسف علیہ السّلام کے معاملہ میں ان کی صداقت کا تجربہ کر چکے تھے اسلئے فرمایا "نہیں تمہارے جی نے ایک بات بنالی ہے واقعہ یوں نہیں ہے" بن یمین اور چوری: یہ نہیں ہو سکتا خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں" ایسا صبر کہ بہتر سے بہتر ہو" خدائے تعالیٰ سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک دن ان گم گشتگان کو پھر جمع کر دے اور ایک ساتھ ان دونوں کو مجھ سے ملادے، بلاشبہ وہ دانا حکمت والا ہے، اور اُن کی جانب سے رُخ پھیر لیا اور فرمانے لگے: "آہ فراقِ یوسف کی غم انگیزی" حضرتِ یعقوبؑ کی آنکھیں شدتِ غم میں روتے روتے سپید پڑ گئی تھیں اور سینہ غم کی سوزش سے جل رہا تھا، مگر صبر کیا تھا اللہ پر تکیہ کئے بیٹھے تھے، بیٹے یہ حال دیکھ کر کہنے لگے" بخدا تم ہمیشہ اسی طرح یوسف کی یاد میں گھلتے رہو گے یا اسی غم میں جان دیدو گے، حضرتِ یعقوبؑ نے یہ سُن کر فرمایا "میں کچھ تمہارا تو شکوہ نہیں کرتا اور نہ تم کو ستاتا ہوں"

اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ	(بلکہ) میں تو اپنی حاجت اور اپنا غم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض
اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ	کرتا ہوں میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝	نہیں جانتے۔

ہم نے شاہی پیالہ کے واقعہ کی تفسیر میں عام تفاسیر سے جُدا مفسّرین کے اس قول کو اختیار کیا ہے جس کو متاخرین کے یہاں "قولِ شاذ کا درجہ" حاصل ہے، مگر اس مقام پر سب سے بہتر اور بے غل و غش تفسیر ہے، کتبِ تفاسیر میں عام طور پر آیت "جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ" (رکھ دیا یوسف نے پیالہ کو بھائی (بن یمین) کے کجاوہ میں) میں حضرتِ یوسفؑ کے اس عمل کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ چونکہ بن یمین کو روکنا چاہتے تھے اور مصر کا قانون اس کی اجازت نہ دیتا تھا اس لئے انھوں نے یہی سمجھ کر یہ پیالہ رکھ دیا تھا کہ اس طرح بن یمین چور بن جائے گا اور میں اس کو روک سکوں گا اور پھر آیت "اَذَّنَ مؤذن" میں پکارنیوالی شخصیت بھی یوسفؑ ہی

کو بتاتے ہیں، اور اس طرح جب اُن پر جھوٹ کا الزام عائد ہونے لگتا ہے تو اس کو "توریہ" سے تعبیر کرکے ان کی معصوم شخصیت کو اس الزام سے بَری کرتے ہیں، حالانکہ قرآنِ عزیز کے اسلوبِ بیان میں کوئی ایسا اشارہ تک موجود نہیں ہے جس سے حضرتِ یوسفؑ کی شخصیت پر جھوٹ کا شبہ بھی ہو سکتا ہو یا توریہ کہنے کی ضرورت پیش آتی ہو۔

یہ مانا کہ کسی محمود اور نیک مقصود کی خاطر "توریہ" بری اور معیوب بات نہیں ہے، بلکہ اچھی بات ہے لیکن یہ کہنے والے اس کو قطعاً بھول جاتے ہیں کہ معاملہ ہمارا تمہارا یا صالحین اور ابرار کا نہیں ہے بلکہ خدا کے پیغمبر اور رسول کا معاملہ ہے، ان کی اخلاقی زندگی کا معیار اس قسم کی اصطلاحی تعبیروں سے بہت بلند اور برتر ہے، وہ اپنی نیک خواہشات میں بھی عزیمت کی بلندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، پھر کیا ضرور کہ ایسے موقعہ پر جہاں قرآنِ عزیز کا اسلوبِ بیان مجبور نہ کرتا ہو اور احادیثِ صحیحہ اُس کی تائید نہ کرتی ہوں خواہ مخواہ اُن کی جانب ایسی بات منسوب کی جائے جس کے درست کرنے اور پیغمبرانہ معصومیت کو محفوظ رکھنے کے لئے "توریہ" کی پناہ لینی پڑے۔

اس مقام پر قرآنِ عزیز میں حضرتِ یوسفؑ کا صرف یہ عمل مذکور ہے کہ انھوں نے شاہی پیمانہ (چاندی کے کٹورے) کو بن یمین کی خورجی میں رکھ دیا تاکہ بھائی کے پاس ایک نشانی رہے)

جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ — اس (یوسف) نے اپنے بھائی (بن یمین) کے کجاوہ میں کٹورہ رکھ دیا۔

اس کے بعد حضرتِ یوسفؑ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ تمام گفتگو کا معاملہ بھائیوں اور کارندوں کے درمیان دائر نظر آتا ہے۔

ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ	پھر پکارا پکارنے والے نے اے قافلہ والو! تم تو البتہ چور ہو،
إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ۝ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ	وہ کہنے لگے ان کی جانب منہ کرکے تمہاری کیا چیز گم ہوگئی،
مَاذَا تَفْقِدُونَ ۝ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ	وہ کارندے بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ (یوسف) کا پیمانہ
الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ	(کٹورا) اور جو کوئی اس کو لائے اس کو ملے ایک اونٹ کا بوجھ

وَاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ	(غلہ) اور میں ہوں اس کا ضامن۔ وہ بولے خدا کی قسم
عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي	تم کو معلوم ہے کہ ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے
الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ۝ قَالُوْا	ملک (مصر) میں اور نہ ہم کبھی چور تھے، وہ (کارندے)
فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ۝	بولے پھر کیا سزا ہے اس کی اگر تم نکلے جھوٹے۔
قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ	کہنے لگے اس کی سزا یہ ہے کہ جن کے اسباب
فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي	میں سے ہاتھ آئے وہی اس کے بدلے میں جائے،
الظّٰلِمِيْنَ ۝ (غ یوسف)	ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو۔

اس تمام مرحلے کے بعد یہ معاملہ قانونی طور پر عزیزِ مصر (یوسفؑ) کے سامنے پیش ہوا اور اُن کی تلاشی لی گئی تو بن یمین کے کجادہ میں چاندی کا وہ پیمانہ موجود تھا۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ	پھر یوسفؑ نے ان کی خورجیاں دیکھنی شروع کیں اپنے بھائی کی
ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ (غ)	خرجی سے پہلے، آخر میں وہ برتن نکالا اپنے بھائی کی خرجی سے

اس تفصیل کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے احسان، و انعام کا ذکر کرتا اور بتاتا ہے کہ یوسفؑ جس بات کے لئے بے قرار تھے اور مصری قانون کے تحت اُس کو نہیں کر سکتے تھے ہم نے اپنی خفیہ تدبیر سے اُس کا سامان بہم پہنچایا۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۭ مَا كَانَ	یوں خفیہ تدبیر کر دی ہم نے یوسف کے لئے، وہ ہرگز نہ لے
لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ	سکتا تھا اپنے بھائی بن یمین کو اس بادشاہ (مصر) کے
اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ	طریقے کے مطابق مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے، ہم درجے بلند کرتے
وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝ (غ)	ہیں جسکے چاہیں، اور ہر جاننے والے سے اوپر جاننے والا ہے۔

پس اس قدر صاف اور واضح بات کی ایسی تشریح کس لئے کی جائے کہ جس میں یوسف علیہ السلام کے کلام کو توریہ پر محمول کرنے کی ضرورت پڑے اور کیوں نہ وہ معنی لئے جائیں کہ جس سے نہ کوئی شبہ پیدا ہو اور نہ اُس کے لئے تاویلات کی ضرورت پیش آئے۔

بہر حال حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا "دیکھو ایک مرتبہ پھر مصر جاؤ اور یوسفؑ اور اس کے بھائی کی تلاش و جستجو کرو اور خدا کی رحمت سے نا امید و مایوس نہ ہو، اس لئے کہ خدا کی رحمت سے نا اُمیدی کافروں کا شیوہ ہے۔"

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (ع)

اے میرے بیٹو (مصر) جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو، بلاشبہ اللہ کی رحمت سے کافروں کے سوا کوئی نا اُمید نہیں ہوتا۔

حضرت یعقوبؑ نے بن یمین کے ساتھ یوسفؑ کا بھی نام لیا حالانکہ بظاہر اس مقام پر انکے سُراغ کا کوئی جوڑ نہیں لگتا، معلوم ہوتا ہے کہ اب حضرت حق نے یعقوبؑ کے غم اور دکھ کی زندگی ختم کرنے کا ارادہ کر لیا اور یعقوبؑ کو یہ اشارہ کر دیا کہ بن یمین کے اس قصہ میں یوسفؑ کی ملاقات کا راز بھی محفوظ ہے اور تب ہی تو یوسف علیہ السّلام کے پیغام بشارت آنے پر (جس کی تفصیل آنے والی ہے) اُنھوں نے یہ ارشاد فرمایا:۔

اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (ع)

کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

غرض برادرانِ یوسفؑ نے کچھ تو باپ کے اصرار پر اور کچھ اس لئے کہ واقعی قحط کی شدت انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی تھی اور غلہ کا آس پاس نام و نشان نہ تھا تیسری بار پھر مصر کا ارادہ کیا، اور جب دربار شاہی میں پہنچے تو کہنے لگے "اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط نے سخت پریشانی میں ڈال دیا ہے اور اس مرتبہ ہم پونجی بھی بہت تھوڑی لائے ہیں، یہ حاضر ہے اب معاملہ خرید و فروخت اور لین دین کا نہیں ہے ہم سے قیمت ادا نہیں ہو سکتی، اس لئے تیری خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ از راہِ کرم ہم کو غلہ کی پوری تول دیجئے اور ہمیں ضرورت مند سمجھ کر اپنی جانب سے احسان فرمایئے اللہ تعالیٰ صدقہ و خیرات کرنے والے کو نیک بدلہ دیتا ہے۔

حضرت یوسفؑ نے والدین اور بھائیوں کی اس پریشانی کا حال سنا اور ان کی اس عاجزانہ درخواست اور نیازمندانہ طلب کی مجبور کن حالت پر غور کیا تو دل بھر آیا اور اب ضبط نہ ہو سکا کہ خود کو چھپائیں اور راز ظاہر نہ ہونے دیں، آخر فرمانے لگے :-

هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ○	کیوں جی تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ کیا جبکہ تم جہالت میں سرشار تھے،

بھائیوں نے اس موقع پر غیر متوقع گفت گو سنی تو چونکے اور لب ولہجہ پر غور کر کے ایک دم ان کو کچھ خیال آیا اور کہنے لگے :-

قَالُوٓا۟ أَءِنَّكَ لَأَنتَ يُوسُفُ	(انھوں نے کہا) کیا تو واقعی یوسف ہی ہے

یعنی اس حیرانی و پریشانی میں تھے کہ ہم "عزیز مصر" کے دربار میں کھڑے ہیں، اس سے باتیں کر رہے ہیں یہ بے محل یوسف کا ذکر کیسا؟ صورت شکل اور گفتگو کے طرز و انداز کو اب دوسری نیت سے دیکھا تو یوسفؑ کی شکل نگاہ کے سامنے پھر گئی اور سمجھ گئے کہ بیشک یہ یوسفؑ ہے مگر حالت موجودہ کے پیش نظر قدرتی طور پر یہ جراءت نہیں کی کہ یہ کہہ اٹھیں کہ تو یوسفؑ ہے بلکہ ایسے موقعہ کے مناسب لب ولہجہ سے کہنے لگے کیا آپ واقعی یوسفؑ ہی ہیں ؟

حضرت یوسفؑ نے فرمایا:-

أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَآ أَخِى ۖ قَدْ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَيْنَآ ۖ إِنَّهُۥ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ ○	ہاں میں یوسف ہوں اور یہ (بن یمین) میرا ماں جایا بھائی ہے اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا اور جو شخص بھی برائیوں سے بچے اور (مصیبتوں میں) ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔
(یوسف ع)	

اب برادران یوسفؑ کے پاس ندامت، شرمساری، خفت اور اعتراف خطا جرم کے سوا کیا تھا؟ یوسف کی تباہی و بربادی کے لئے اپنی تمام بیہودگیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور جب ان پر یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ جس کو کل کنعان کے کنوئیں میں پھینک کر آئے تھے

وہ آج "عزیزِ مصر" بلکہ مصر کے تاج و تخت کا مالک ہے، تو سر جھکا کر کہنے لگے :۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ ○ (انھوں نے کہا) بخدا اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو ہم پر برتری و بلندی بخشی اور بلاشبہ ہم سرتا سر قصوروار تھے۔

حضرتِ یوسفؑ نے اپنے سوتیلے بھائیوں کی اس خستہ حالی اور پشیمانی کو دیکھا تو اُن کی اخلاقی برتری اور پیغمبرانہ رحمت و رافت اس کو برداشت نہ کر سکی اور عفو و درگذر اور حلم و کرم کے ساتھ فوراً یہ ارشاد فرمایا :۔

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○ (ع) آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں، اللہ تعالیٰ تمہارا قصور بخش دے اور وہ تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

یعنی جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب ہم سب کو یہ تمام داستان فراموش کر دینی چاہئیے میں درگاہِ الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہاری اس غلطی کو معاف فرمادے کیونکہ وہی سب سے بڑھ کر رحیم و کریم ہے۔

اب تم کنعان واپس جاؤ اور میرا پیرہن لیتے جاؤ یہ والد کی آنکھوں پر ڈال دینا۔ انشاء اللہ شمیمِ یوسفؑ ان کی آنکھوں کو روشن کر دے گی اور تمام خاندان کو مصر لے آؤ۔

برادرانِ یوسفؑ کے لئے بھی اس سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہو سکتی تھی؟ یوسفؑ کو چاہِ کنعان میں ڈال کر یعقوب علیہ السلام کے پاس خون آلود پیراہن لے کر آئے تھے اور جھوٹ اور فریب کے ساتھ اُن کے دل و جگر کو زخمی کیا تھا، آج بھی اُنہی کو پیراہنِ یوسفؑ لیجانا چاہئیے تاکہ اُس زخم کا مرہم بنے اور رنج و غم، مسرّت و شادمانی سے بدل جائے۔

یہاں یہ باتیں ختم ہو کر برادرانِ یوسفؑ کا کارواں کنعان کو پیراہنِ یوسفؑ لے کر چلا تو اُدھر خدا کے برگزیدہ پیغمبر یعقوب علیہ السلام کو وحیِ الٰہی نے شمیمِ یوسفؑ سے مہکا دیا، فرمانے لگے اے خاندانِ یعقوب! اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھ کو یوسفؑ کی مہک آرہی ہے، وہ سب کہنے لگے "بخدا تم تو اپنے اُسی پُرانے خبط میں پڑے ہو یعنی اس قدر عرصہ گذر جانے کے بعد بھی جبکہ یوسفؑ کا نام و نشان بھی

باقی نہیں رہا تمہیں یوسفؑ ہی کی رٹ لگی ہوئی ہے۔

کنعان کا قافلہ بخیریت تمام پہنچ گیا اور برادرانِ یوسفؑ نے حضرتِ یوسفؑ کے ارشاد کے مطابق اُن کا پیراہن یعقوبؑ کی آنکھوں پر ڈال دیا اور یعقوبؑ کی آنکھیں فوراً روشن ہوگئیں، اور وہ فرمانے لگے " دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ	پھر جب بشارت دینے والا آپہنچا تو اس نے پیراہنِ یوسفؑ کو
عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ	یعقوبؑ کے چہرہ پر ڈال دیا پس اس کی آنکھیں روشن ہوگئیں
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ	(بینائی لوٹ آئی) یعقوبؑ نے کہا کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں
مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○	اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

برادرانِ یوسفؑ کے لئے یہ وقت بہت کٹھن تھا، شرم وندامت میں غرق سر جھکا کر بولے، اے باپ! آپ خدا کی جناب میں ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لئے دعا فرمائیے، کیوں کہ اب یہ تو ظاہر ہی ہو چکا کہ بلاشبہ ہم سخت خطا کار اور قصوروار ہیں۔

حضرتِ یعقوبؑ نے فرمایا:-

سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّىْ ؕ	عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لئے مغفرت کی دعاء
اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○	کروں گا، بلاشبہ وہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ برادرانِ یوسفؑ نے مصر میں اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام سے بھی مغفرت کی دعاء کی استدعاء کی تھی اور کنعان میں اپنے والد یعقوب علیہ السلام سے بھی یہی درخواست کی، مگر حضرتِ یوسفؑ نے تو اُسی وقت اُن کی بات منظور کرلی، اور "يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ" کہہ دیا، مگر حضرتِ یعقوبؑ نے یہ نہیں کیا بلکہ "سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ" کہہ کر صرف توقع ہی دلائی، اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ اور پھر حسب ذیل دو جواب دیتے ہیں۔

(۱) برادرانِ یوسفؑ کی ان تمام خطا کاریوں کا معاملہ براہِ راست حضرتِ یوسفؑ سے تعلق رکھتا تھا اور حضرتِ یعقوبؑ سے بالواسطہ اس لئے حضرتِ یوسفؑ نے اخلاقِ کریمانہ کی راہ کر

اسی وقت ان کا اطمینان کر دیا۔ مگر حضرت یعقوبؑ نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ اس معاملہ کا تعلق یوسفؑ سے ہے اس لئے اُس کی مرضی بھی معلوم کر لینا ضروری ہے، اس طرح جواب دیا کہ توقع اور امید تک بات رہے اور ساتھ ہی اپنی طبیعت کا رجحان بھی ظاہر کر دیا کہ اُن کی خواہش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ان خطا کاریوں کو معاف کر دے۔

(۴) حضرت یوسفؑ نوجوان تھے اس لئے ان کے کریمانہ وصف میں حزم و احتیاط کا پہلو نہ تھا انھوں نے فوراً معاف کر دیا، مگر حضرت یعقوبؑ تجربہ کار، محتاط اور پھر باپ تھے اسلئے چاہتے تھے کہ بیٹوں کا امتحان کریں کہ ان کا یہ انفعال اور ندامت کا اظہار محض وقتی اور ہنگامی ہے، اور صرف دفع الوقتی کے لئے ہے یا اب انکی طبیعت میں حقیقی ندامت و شرمساری کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور یہ واقعی اپنی خطا پر صداقت سے نادم ہیں، اس لئے ان کو بالکل مایوس بھی نہیں کیا اور رجحانِ طبیعت کا اظہار کرتے ہوئے صرف توقع اور امید تک ہی معاملہ کو چھوڑ دیا۔

خاندانِ یعقوب علیہ السلام مصر میں

غرض حضرت یعقوبؑ اپنے سب خاندان کو لے کر مصر روانہ ہو گئے، توراۃ میں اس واقعہ کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

اور یہی ذکر فرعون کے گھر میں سُنا گیا کہ یوسف کے بھائی آئے اور اس سے فرعون اور اسکے چاکر بہت خوش ہوئے، اور فرعون نے یوسف کو کہا کہ اپنے بھائیوں کو کہہ تم یہ کام کرو، اپنے جانور لادو اور جاؤ، اور کنعان کی سرزمین میں جا پہنچو اور اپنے باپ اور اپنے گھرانے کو لو اور مجھ پاس آؤ اور میں تم کو مصر کی سرزمین کی اچھی چیزیں دوں گا اور تم اس سرزمین کے تحائف کھاؤ گے، اب تجھے حکم ملا تو ان کو کہہ تم یہ کرو کہ اپنے لڑکوں اور اپنی جوروؤں کے لئے مصر کی زمین سے گاڑیاں لیجاؤ اور اپنے باپ کو لے آؤ اور اپنے اسباب کا کچھ افسوس نہ کرو کیوں کہ مصر کی ساری زمین کی خوشی تمہارے لئے ہے اور اسرائیل کے فرزندوں نے یہی کیا اور یعقوب اپنی سب نسل سمیت مصر میں آیا وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بیٹوں کے بیٹوں کو جو اس کے ساتھ تھے اور اپنی بیٹیوں اور اپنے بیٹوں کی بیٹیوں کو اور اپنی سب نسل کو

اپنے ساتھ مصر میں لایا، سو وہ سب جو یعقوبؑ کے گھرانے کے تھے اور مصر میں آئے

ستّر جانیں تھیں[1]

جب حضرتِ یوسفؑ کو اطلاع ہوئی کہ ان کے والد خاندان سمیت شہر کے قریب پہنچ گئے تو وہ فوراً استقبال کے لئے باہر نکلے، حضرتِ یعقوبؑ نے جب مدت دراز کے بچھڑے ہوئے لختِ جگر کو دیکھا تو سینہ سے چمٹا لیا اور جب یہ مسرت افزا اور رقت آمیز ملاقات ہو چکی تو حضرتِ یوسفؑ نے والد سے عرض کیا کہ اب آپ عزت و احترام اور امن و حفاظت کیساتھ شہر میں تشریف لے چلیں،

اس وقت مصر کا دار السلطنت رعمسیس تھا اور وہ "جشن کا شہر" کہلاتا تھا، حضرتِ یوسفؑ والد ماجد اور تمام خاندان کو بڑے کر و فر کے ساتھ شاہی سواریوں میں بٹھا کر شہر میں لائے اور شاہی محل میں اُتارا۔

جب اِن تمام باتوں سے فراغت پائی تو اب ارادہ کیا کہ دربار منعقد کریں تاکہ مصریوں کا بھی بزرگ باپ اور خاندان سے تعارف ہو جائے اور تمام درباری اُن کے عزت و احترام سے آگاہ ہو جائیں، دربار منعقد ہوا، تمام درباری اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے یوسفؑ کے حکم سے اُن کے والدین[2] کو تختِ شاہی پر ہی جگہ دی گئی اور باقی تمام خاندان نے حسب مراتب نیچے جگہ پائی، جب یہ سب انتظامات مکمل ہو گئے تب حضرتِ یوسفؑ شاہی محل سے نکل کر تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوئے، اسی وقت تمام درباری حکومت کے دستور کے مطابق تخت کے سامنے تعظیم کے لئے سجدہ میں گر پڑے، موجودہ صورت کو دیکھ کر تمام خاندانِ یوسفؑ نے بھی یہی عمل کیا[3]۔ یہ دیکھ کر حضرتِ یوسفؑ کو فوراً اپنے بچپنے کا خواب یاد آگیا، اور اپنے والد سے

---

[1] پیدائش باب ۴۵ آیات ۱۶ و ۲۰ و باب ۴۶ آیات ۷، ۲۶ و [2] حضرتِ یوسفؑ کی حقیقی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ [3] تعظیم کا یہ طریقہ انبیاء سابقین میں شاید جائز رہا ہو، اگرچہ مجھے اس میں بھی شک ہے اور میرے نزدیک اس آیت کی دوسری تفسیر ہے جسکو میں نے اس جگہ قصداً ذکر نہیں کیا، تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی تعظیم کو اپنی اُمت کے لئے حرام قرار دیا ہے اور اس کو صرف ذاتِ الٰہی کیلئے ہی مخصوص بتایا ہے

(ترمذی، ابو داؤد، باب النکاح)

کہنے لگے:-

وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ	اور یوسف نے کہا اے باپ! یہ ہے تعبیر اس خواب کی جو تم ہوئی
مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا وَ	میں نے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اُسے سچّا ثابت کردیا، یہ
قَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ	اسی کا احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی دی تم سب کو صحرا سے نکال کر
السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْ	میرے پاس پہنچادیا اور یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں
بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ	اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا۔ بلاشبہ میرا پروردگار
اِخْوَتِيْ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ	ان باتوں کے لئے جو وہ کرنی چاہے بہتر تدبیر کرنے والا ہے کہ وہ
اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ (ع)	سب کچھ جاننے والا اور (اپنے کاموں میں) حکمت والا ہے۔

اور جبکہ یہ تمام واقعات ایک عجیب وغریب ترتیب سے وقوع میں آئے اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سنجیوں اور چارہ سازیوں کے بے نظیر مظاہرے پیش آتے رہے تو ان تمام آغاز وانجام کے اس حسنِ خاتمہ کو دیکھ کر یوسف (علیہ السّلام) بے اختیار ہوگئے اور خدا کی جناب میں شکر ودعاء کا اس طرح اظہار فرمانے لگے:-

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ	اے پروردگار! تونے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا
عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ	مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا اے آسمان اور زمین کے بنانے والے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي	تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تو یہ بھی کیجیو کہ
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا	دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان
وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (ع)	لوگوں میں داخل ہوجاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔

تورات میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرتِ یوسف (علیہ السلام) کا تمام خاندان مصر ہی میں آباد ہوگیا، کیوں کہ فرعون نے حضرتِ یوسف (علیہ السلام) سے اصرار کے ساتھ یہ کہا کہ تم اپنے خاندان کو مصر ہی میں آباد کرو، میں ان کو بہت عمدہ زمین دوں گا اور ہر طرح اُنکی عزت کرونگا۔

یہ دیکھ کر حضرتِ یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والدِ بزرگوار اور خاندان کے دوسرے

افراد کو یہ سمجھا دیا کہ فرعون جب اُن سے مصر میں رہنے کی درخواست کرتے ہوئے زمین اور مقام کے انتخاب کے لئے کہے تو تم فلاں حصۂ زمین طلب کرنا اور کہنا کہ چونکہ ہم قبائلی زندگی کے عادی اور مویشی چرانے کا شوق رکھتے ہیں اس لئے ہم عام شہری زندگی سے علیحدگی پسند کرتے ہیں، چنانچہ فرعون نے خاندانِ یوسفؑ کو وہ سرزمین بطور جاگیر بخش دی اور اس طرح بنی اسرائیل سرزمینِ مصر میں آباد ہو گئے۔

اور فرعون نے یوسف کو کہا کہ اپنے بھائیوں کو کہہ تم یہ کام کرو، اپنے جانور لادو اور جاؤ اور کنعان کی سرزمین میں جا پہنچو اور اپنے باپ اور اپنے گھرانے کو لو اور مجھ پاس آؤ اور میں تم کو مصر کی سرزمین کی اچھی چیزیں دوں گا اور تم اس زمین کے تحائف کھاؤ گے، اب تجھے حکم ملا کہ تو اُن کو کہہ کہ تم یہ کرو کہ اپنے لڑکوں اور اپنی جوروؤں کے لئے مصر کی زمین سے گاڑیاں لے جاؤ اور اپنے باپ کو لے آؤ اور اپنے اسباب کا کچھ فکر نہ کرو کیونکہ مصر کی ساری زمین کی خوشی تمہارے لئے ہے اور اسرائیل کے فرزندوں نے یہی کیا۔[۱]

اور یوں ہو گا کہ جب فرعون تم کو بلائے اور کہے کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟ تو تم کہیو کہ تیرے غلام جوانی سے لے کر اب تک چوپانی کرتے رہے ہیں، کیا ہم اور کیا ہمارے آباء تاکہ تم جشن کی زمین میں رہو اس لئے کہ مصریوں کو ہر ایک چوپان سے نفرت ہے۔[۲]

حضرتِ یوسف (علیہ السلام) کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح مصریوں سے الگ رہنے سے بنی اسرائیل اپنی مذہبی زندگی پر قائم، مصری بت پرستی سے متنفر اور مصری بداخلاقی اور مبتذل شہری عادات و خصائل سے محفوظ رہیں گے، اور اپنی شجاعانہ بدویانہ زندگی کو کبھی نہ بھولیں گے۔

وفات بہرحال حضرتِ یوسف (علیہ السلام) نے اپنی زندگی کے طویل حصۂ عمر کو مصر ہی میں گذارا اور جب اُن کی عمر ایک سو دس سال کو پہنچی تو ان کی وفات ہو گئی، حضرتِ یوسف (علیہ السلام) نے وفات سے پہلے اپنے خاندان والوں سے یہ عہد لیا کہ وہ مجھ کو مصر کی زمین میں نہ دفن کریں گے

---

[۱] پیدائش باب ۴۶ آیات ۱۶-۱۹۔ [۲] پیدائش باب ۴۶ آیات ۳۳-۳۴۔

بلکہ جب خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کہ بنی اسرائیل دوبارہ فلسطین یعنی آباؤ اجداد کی سرزمین میں واپس ہوں تو میری ہڈیاں وہیں لیجا کر سپرد خاک کرنا، چنانچہ انھوں نے وعدہ کیا اور جب حضرت یوسفؑ کا انتقال ہو گیا تو ان کو حنوط (ممی) کر کے تابوت میں محفوظ رکھ دیا اور جب موسٰیؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو اس تابوت کو بھی ساتھ لیتے گئے اور آباء و اجداد کی سرزمین ہی میں لیجا کر سپردِ خاک کر دیا۔ حموی کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی قبر بلاطہ میں ہے جو فلسطین کے علاقہ نابلس کا ایک گاؤں ہے، یہ قبر ایک درخت کے نیچے ہے، اور توراۃ میں ہے :-

اور یوسفؑ اور اس کے باپ کے گھرانے نے مصر میں سکونت کی اور یوسفؑ ایک سو دس برس جیا اور یوسف نے افرائیم کے لڑکے جو تیسری پشت تھے دیکھے اور منسی کے بیٹے مکیر کے بیٹے بھی یوسف کے گھٹنوں پر پلے گئے اور یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا میں مرتا ہوں اور خدا یقیناً تم کو اس سرزمین میں جس کی بابت اس نے ابراہام اور اضحٰق اور یعقوب سے قسم کی ہے لیجائے گا اور یوسفؑ نے بنی اسرائیل سے قسم لے کے کہا خدا یقیناً تم کو یاد کرے گا، اور تم میری ہڈیوں کو یہاں سے لیجائیو سو یوسفؑ ایک سو دس برس کا بوڑھا ہو کے مر گیا اور انھوں نے اس میں خوشبو بھری اور اُسے مصر میں صندوق میں رکھا[1]........

اور موسٰیؑ نے یوسفؑ کی ہڈیاں ساتھ لیں کیونکہ اُس نے بنی اسرائیل کو تاکیداً قسم دیکر کہا تھا کہ خدا یقیناً تمہاری خبرگیری کرے گا تم یہاں سے میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے جائیو[2]

اہم اخلاقی مسائل حضرتِ یوسف (علیہ السلام) کا یہ عجیب و غریب قصہ اربابِ بصیرت کے لئے اپنی آغوش میں نہایت اہم اخلاقی مسائل رکھتا ہے، دراصل یہ قصہ ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ فضائلِ اخلاق کی ایسی زرین داستان ہے جس کا ہر پہلو موعظت و بصیرت کے جواہر سے لبریز ہے۔

قوتِ ایمانی، استقامت، ضبطِ نفس، صبر، شکر، عفت، دیانت و امانت، عفو و درگزر، جذبۂ تبلیغ و اعلاء کلمۃ اللہ کا عشق اور اصلاح و تقویٰ جیسے اخلاقِ فاضلہ اور صفاتِ کاملہ کا ایک

[1] پیدائش باب ۵۰ آیات ۲۲ - ۲۶ - [2] خروج باب ۱۳ آیت ۱۹:-

نادر سلسلۃ الذہب ہے جو اس قصہ کے ہر نقش میں منقش نظر آتا ہے مگر ان میں سے یہ چند امور خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:-

(۱) اگر کسی شخص کی ذاتی سرشت عمدہ ہو اور اس کا ماحول بھی پاک، مقدس اور لطیف ہو تو اس شخص کی زندگی اخلاقِ کریمانہ میں نمایاں اور صفاتِ عالیہ میں ممتاز ہوگی اور وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل ہوگا۔

حضرتِ یوسف (علیہ السلام) کی مقدس زندگی اس کی بہترین مثال ہے، وہ یعقوب، اسحٰق اور ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبیوں اور پیغمبروں کی اولاد تھے اس لئے نبوت و رسالت کے گہوارہ میں نشو و نما پائی اور خانوادۂ نبوت کے ماحول میں تربیت حاصل کی، ذاتی نیک نہادی اور فطری پاکی نے جب ایسے لطیف ماحول کو دیکھا تو تمام فضائل و اوصافِ حمیدہ چمک اٹھے اور بچپن جوانی اور کہولت کی زندگی کے تمام گوشے تقویٰ، عفت، صبر و استقامت، دیانت اور عشقِ الٰہی کے ایسے روشن مظہر بن گئے کہ عقلِ انسانی اس مجموعۂ کمالاتِ ہستی کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتی ہے۔

(۲) اگر کسی شخص میں ایمان باللہ مستقیم و مستحکم ہو اور اس پر اُس کا یقین راسخ اور مضبوط ہو تو پھر اس راہ کی تمام صعوبتیں اور مشکلات اس پر آسان بلکہ آسان تر ہو جاتی ہیں اور رؤیتِ حق کے بعد تمام خطرات اور مصائب ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں، حضرتِ یوسفؑ کی تمام زندگی میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے۔

(۳) ابتلاء و آزمائش، مصیبت و ہلاکت کی شکل میں ہو یا دولت و ثروت اور خواہشاتِ نفسانی کے خوبصورت اسباب کی صورت میں، ہر حالت میں انسان کو خدائے تعالیٰ کی جانب ہی رجوع کرنا چاہئے اور اسی سے التجا کرنی چاہیئے کہ وہ امرِ حق پر ثابت قدم رکھے اور استقامت بخشے۔ عزیز کی بیوی اور حسین مصری عورتوں کی ترغیبات اور اُن کی مرضیات پوری نہ کرنے پر قید کی دھمکیاں اور پھر قید و بند کے مصائب، ان تمام حالات میں حضرتِ یوسفؑ کا اعتماد اور

ان کی دعاؤں اور التجاؤں کا مرکز صرف ایک ہی ہستی سے وابستہ نظر آتا ہے، وہ نہ عزیزِ مصر کے سامنے عرض رساں نظر آتے ہیں نہ فرعون کے سامنے ملتجی، وہ نہ اُن خوبرُویانِ مصر اور عشوہ طرازانِ حسن و جمال سے جی لگاتے ہیں اور نہ اپنے مربّی کی خوبرُو بیوی سے، بلکہ ہر موقعہ پر خدائے تعالیٰ ہی سے مدد کے طالب نظر آتے ہیں۔

"رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ   مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ"

(۴) جب خدائے تعالیٰ کی محبت اور اس کا عشق، قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے تو پھر انسان کی زندگی کا تمام تر مقصد وہی بن جاتا ہے اور اُس کے دین کی دعوت و تبلیغ کا عشق ہر وقت رگ و پے میں دوڑتا رہتا ہے، چنانچہ قید خانہ کی سخت مصیبت کے وقت اپنے رفیقوں سے سب سے پہلا کلام یوسف ؑ کا یہی تھا "یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ"۔

(۵) دیانت و امانت ایک ایسی نعمت ہے کہ اس کو انسان کی دینی و دنیوی سعادتوں کی کلید کہنا چاہیئے، عزیزِ مصر کے یہاں یوسف علیہ السّلام جس طرح داخل ہوئے تھے واقعہ کی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے، یہ حضرتِ یوسف ؑ کی دیانت و امانت ہی کا نتیجہ تھا کہ پہلے وہ عزیزِ مصر کی نظروں میں بلند و باوقار اور محبوب بنے پھر مصر کی حکومت کے مالک ہو گئے۔

(۶) خود اعتمادی انسان کے بلند اوصاف میں سے ایک بڑا وصف ہے خدائے تعالیٰ نے جس شخص کو یہ دولت بخش دی ہے وہی دنیا کے مصائب و آلام سے گذر کر دُنیوی و دینی رفعت و بلندی حاصل کر سکتا ہے۔

خود اعتمادی کی مختلف اقسام میں سے ایک قسم "عزتِ نفس" بھی ہے، جو شخص خودداری اور عزتِ نفس سے محروم ہے وہ انسان نہیں ایک مضغۂ گوشت ہے، حضرتِ یوسف ؑ کی عزتِ نفس کے تحفظ کا یہ عالم ہے کہ برسوں کے بعد جب قید خانہ سے رہائی کا حکم ملتا، اور بادشاہِ وقت کا پیغامِ سربلندی حاصل ہوتا ہے تو مسرّت و شادمانی کے ساتھ فوراً اُس کو لبیک نہیں کہتے

بلکہ صاف انکار کر دیتے ہیں کہ میں اُس وقت تک قید خانہ سے باہر نہیں آؤں گا تاوقتیکہ یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ مصری عورتوں نے مکروفریب سے جس قسم کا معاملہ میرے ساتھ کیا تھا اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ؕ

(۷) صبر ایک عظیم الشان "خُلق" ہے اور بہت سی برائیوں کے لئے سپر اور ڈھال کا کام دیتا ہے، قرآن حکیم میں ستر سے زیادہ مقامات پر اس کی فضیلت کا اعلان کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بہت سے مراتبِ علیا اور درجاتِ رفیعہ کا مدار اسی فضیلت پر رکھا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ؕ — اور ہم نے ان میں سے مقتدا بنائے، جو ہمارے احکام کے ہادی ہیں جبکہ وہ فضیلتِ صبر سے مزین ثابت ہوئے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ؕ (اعراف) — اور پورا ہوا تیرے رب کا نیک کلمہ بنی اسرائیل پر اس وجہ سے کہ وہ صابر رہے۔

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ (بقرہ) — اور بشارت دے دو اُن صبر کرنیوالوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو کہہ اٹھتے ہیں "بیشک ہم اللہ ہی کیلئے ہیں اور بیشک ہم اُسی جانب لوٹ جانے والے ہیں"

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف) — (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم اُسی طرح صبر کرو جس طرح بلند عزیمت والے پیغمبروں نے کیا۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (بقرہ) — اور (اللہ) سے مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ۔

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

الصَّبْرُ نِصْفُ الْإِيمَانِ (بیہقی فی شعب الایمان) — "صبر نصف ایمان ہے"۔

وَسُئِلَ عَنِ الْإِيمَانِ فَقَالَ الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ (بیہقی) — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ ایمان کی تعریف پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا "صبر اور دریا دلی"

حقیقت میں "صبر" ایک ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ انسان برائیوں سے باز رہ سکے اور نفس ان کی طرف اقدام سے رک جائے، اس لئے یہ صرف انسان ہی کا خاصہ ہے اور تمام حیوانات سے اُس کو امتیاز بخشتا ہے۔

صبر کی مختلف اقسام ہیں یا یوں کہئے کہ ان اشیاء کی نسبت کے لحاظ سے جن کی جانب "صبر" کو منسوب کیا جاتا ہے وہ مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

پس اگر پیٹ اور شرمگاہ کی خواہشات کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "عفت" ہے اور اگر مصائب پر صبر ہے تو اس کو "صبر" ہی کہتے ہیں اور اس کی ضد کا نام "جزع و فزع" ہے اور اگر ثروت و دولت کی بہتات کی حالت میں صبر ہے تو اُس کا نام "ضبطِ نفس" ہے اور اس کی ضد کو "بطر" (چھچھورپن) کہتے ہیں، اور اگر میدانِ جنگ اور اسی قسم کے مہلک حالات پر صبر ہے تو وہ "شجاعت" کہلاتا ہے اور اس کی ضد کا نام "جُبُن" (بزدلی) ہے اور اگر غیظ و غضب کے حالات پر صبر ہے تو اسکو "حلم" کہتے ہیں اور اس کی ضد کو "تذمر" (بے قابو ہونا) کہا جاتا ہے، اور اگر حوادثاتِ زمانہ پر صبر ہے تو اس کا نام "وسعتِ صدر" ہے (کشادہ دلی اور حوصلہ مندی) ہے اور اس کی مخالف صفت کو "ضجر" (تنگ دلی اور بے صبری) کہتے ہیں، اور اگر دوسروں کے پوشیدہ رازوں پر صبر ہے تو اُس کا نام "کتمانِ سر" (پردہ پوشی) ہے، اور اگر بقدرِ کفاف معیشت پر صبر ہے تو اس کو "قناعت" کہتے ہیں اور اگر ہر قسم کی عیش پسندی کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "زہد" ہے۔

صبر کی ان تمام اقسام کا بیان جامع ایجاز و اعجاز کے ساتھ قرآنِ عزیز کی اس آیت میں کیا گیا ہے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ	اور ہر قسم کی مصیبتوں اور مضرتوں اور میدانِ جنگ کی
وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ	ہولناکیوں میں صبر کرنے والے ہی دراصل صادق ہیں
صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○	اور یہی متقی و پرہیزگار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو صبر و رضا کے ان تمام مراحل میں وہ کمال عطا

فرمایا تھا جس کو "مثلِ اعلیٰ" کہا جاتا ہے، مثلاً :-

(۱) برادرانِ یوسف کی ایذا رسانیوں پر صبر (۲) آزاد ہونے کے باوجود غلام بن جانے اور ایسے ملک اور ایسی قوم کے ہاتھوں میں فروخت ہو جانے پر صبر جو معاشرت و معیشت میں بھی مخالف اور دین و ایمان میں بھی دشمن تھی' (۳) عزیز مصر کی بیوی اور مصری عورتوں کی پُرفریب ترغیبات پر صبر (۴) قیدخانہ کے مصائب پر صبر (۵) عزیز مصر کی تمام دولت و ثروت کے وکیل بن جانے پر صبر یعنی خدا کی شکر گذاری کا اظہار اور شیخی سے پرہیز (۶) مملکتِ مصر کے حاکمِ مطلق ہونے پر صبر یعنی ظلم، کبر، شیخی سے پرہیز (۷) ہر دو حالتوں میں قناعت و زہد کی زندگی کو ترجیح۔

(۸) ایذا رسا بھائیوں کی ندامت کے وقت اختیارِ صبر، یعنی وسعتِ قلب کا ثبوت "لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ"

(۹) اخلاقِ حسنہ میں "شکر" بھی بہترین خُلق ہے اسلئے کہ یہ اخلاقِ الٰہیہ میں سے بہت بلند خلق ہے، قرآنِ عزیز میں ہے "وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ" انسانی اوصاف میں "شکر" ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ منعمِ حقیقی کی نعمت کا اعتراف کیا جائے، اور اُس پر مسرت و شادمانی کا اظہار ہو اور اسکو محسن و منعم کے مرغوب اور پسندیدہ طریقہ پر استعمال کیا جائے، قرآنِ عزیز میں ہے:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ۝ (بقرہ) — پس تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور ناشکری نہ کرو۔

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ (نساء) — اللہ تم پر عذاب نہ لائے گا، اگر تم اس کے شکر گذار اور اُس پر ایمان والے رہے۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (ابراہیم) اگر تم شکر گذار ہو تو ہم (تمہاری نعمتوں میں) اضافہ کرتے رہیں گے،

مگر افسوس یہ ہے کہ انسانی دنیا میں حقیقی شکر گذار اور سپاس گذار بہت ہی کم ہیں:-

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (سبا) اور میرے بندوں میں حقیقی شکر گذار بہت کم ہیں۔

لیکن حضرتِ یوسف (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے یہ صفت بھی بدرجۂ کمال عطا فرمائی تھی انکی

زندگی کے حالات پڑھو اور اندازہ کرو کہ کس طرح جگہ جگہ شکر اور سپاس گذاری کا مظاہر نمایاں نظر آتا ہے خصوصاً ختم قصہ پر اُن کی جو دعا مذکور ہے وہ اُن کے اس وصف کو اور زیادہ نمایاں کرتی ہے،

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۔ (یوسف ع)

اے پروردگار! بلاشبہ تو نے مجھ کو حکومت بخشی اور باتوں کے فیصلہ کی سمجھ بوجھ عطا فرمائی اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا مددگار ہے تو مجھ کو اپنی اطاعت پر موت دیجیو اور صالحین کے زمرہ میں شامل کیجیو۔

(۱۰) حسد اور بغض کا انجام حاسد اور بغض کرنے والے کے حق میں ہی مضر ہوتا ہے اور اگرچہ کبھی محسود و مبغوض کو بھی دنیوی نقصان پہنچ جانا ممکن ہے لیکن حاسد کسی حال میں بھی فلاح نہیں پاتا، اور خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہی رہتا ہے، الّا یہ کہ تائب ہو جائے اور حاسدانہ زندگی کو ترک کر دے

برادرانِ یوسفؑ کے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کا انجام بھی مگر چشم بصیرت شرط ہے۔

(۱۱) صداقت، دیانت، امانت، صبر اور شکر جیسے صفاتِ عالیہ سے متصف زندگی ہی حقیقی اور کامیاب زندگی ہے، اور اگر انسان میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے تو پھر وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے، بلکہ اس سے بھی بد تر۔

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۚ (بقرہ) (یہ متمرد و سرکش انسان) چوپاؤں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ

(۱۲) حضرتِ یوسفؑ کے اخلاقِ کریمانہ اور صفاتِ عالیہ کی مدحت و منقبت میں سب سے اہم وہ جملہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے حق میں فرمایا "الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیمؑ" یعنی وہ سلسلۂ نسب جو چار پشتوں سے کرامتِ نبوت سے مستفیض ہے، یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم کا سلسلہ ہے، اور ایک روایت میں ہے:۔

"اَكْرَمُ النَّاسِ يُوسُفُ نَبِيُّ اللّٰهِ بْنُ نَبِيِّ اللّٰهِ بْنِ نَبِيِّ اللّٰهِ بْنِ خَلِيْلِ اللّٰهِ" (بخاری کتاب التفسیر)

حضرتِ شعیبؑ (علیہ السلام)

حضرتِ شعیبؑ کا ذکر قرآنِ عزیز میں، قومِ شعیب، مدین و اصحاب ایکہ، زمانۂ بعثت، دعوتِ حق، قوم کی سرکشی، سرکشی کا انجام، بصائر و عبر

حضرتِ شعیبؑ کا ذکر قرآن میں قرآنِ حکیم میں حضرتِ شعیبؑ اور ان کی قوم کا تذکرہ اعراف، ہود اور شعراء میں قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے اور حجر اور عنکبوت میں مختصر، ان سورتوں میں حجر کے علاوہ حضرتِ شعیبؑ کا نام دس جگہ مذکور ہے، ذیل کا نقشہ اس کی تصدیق کرتا ہے،

سورۃ	آیات	شمار
اعراف	۸۵-۸۸-۹۰-۹۲	۴
ہود	۸۴-۸۷-۹۰-۹۵	۴
شعراء	۱۷۷	۱
عنکبوت	۳۶	۱/۱۰

قومِ شعیب حضرتِ شعیب (علیہ السلام) کی بعثت مدین یا مدیان میں ہوئی تھی، مدین کسی مقام کا نام نہیں ہے بلکہ "قبیلہ"[1] کا نام ہے، یہ قبیلہ حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کے بیٹے مدین کی نسل سے تھا جو اُن کی تیسری بیوی قطورا سے پیدا ہوا، اس لئے حضرتِ ابراہیمؑ کا یہ خاندان بنی قطورا کہلاتا ہے۔

"مدین" اپنے اہل و عیال کے ساتھ اپنے سوتیلے بھائی حضرتِ اسمٰعیل (علیہ السلام) کے پہلو ہی میں حجاز میں آباد ہو گیا تھا، یہی خاندان آگے چل کر ایک بڑا قبیلہ بن گیا اور شعیب علیہ السلام

[1] اسی قبیلہ کے نام پر بستی کا نام "مدین" مشہور ہوا۔

بھی چونکہ اسی نسل اور اسی قبیلہ سے تھے اس لئے اُن کی بعثت کے بعد یہ قوم شعیبؑ کہلایا۔

مدین یا اصحابِ ایکہ | یہ قبیلہ کس مقام پر آباد تھا؟ اس کے متعلق عبد الوہاب نجار کہتے ہیں کہ یہ حجاز میں شام کے متصل ایسی جگہ آباد تھا کہ جس کا عرض البلد افریقہ کے جنوبی صحرا کے عرض البلد کے مطابق پڑتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ شام کے متصل معان کے حصۂ زمین پر آباد تھا۔

قرآنِ عزیز نے اس قبیلہ کی آبادی کے متعلق ہم کو دو باتوں سے تعارف کرایا ہے۔

ایک یہ کہ وہ "امامِ مبین" پر آباد تھا۔

وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ۚ اور لوط کی قوم اور مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھے۔

عرب کے جغرافیہ میں جو شاہراہ حجاز کے تاجر قافلوں کو شام، فلسطین، یمن بلکہ مصر تک لیجاتی اور بحرِ قلزم کے مشرقی کنارے سے ہو کر گذرتی تھی قرآن اسی کو امامِ مبین (کھلی اور صاف شاہراہ) کہتا ہے، کیونکہ صیف (گرمی) اور شتاء (سردی) دونوں زمانوں میں قریشی قافلوں کے لئے یہ متعارف اور بڑی تجارتی سڑک تھی جس کا سلسلہ بڑی مسافت کے ساتھ بحری کے بھی ڈانڈے ملا دیتا تھا۔

دوسرے یہ کہ وہ "اصحابِ ایکہ" (جھنڈ والے) تھے، عربی میں "ایکہ" اُن سر سبز و شاداب جھاڑیوں کو کہتے ہیں جو ہرے بھرے درختوں کی کثرت کی وجہ سے جنگلوں اور بنوں میں اُگی رہتی ہیں، اور جھنڈ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

اِن دونوں باتوں کے جان لینے کے بعد مدین کی آبادی کا پتہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے وہ یہ کہ مدین کا قبیلہ بحرِ قلزم کے مشرقی کنارہ اور عرب کے مغرب شمال میں ایسی جگہ آباد تھا جو شام کے متصل حجاز کا آخری حصہ کہا جا سکتا ہے اور حجاز والوں کو شام، فلسطین بلکہ مصر تک جانے میں اس کے کھنڈر راہ میں پڑتے تھے اور جو تبوک کے بالمقابل واقع تھا۔[1]

مفسرین اس بارہ میں مختلف ہیں کہ مدین اور اصحابِ ایکہ ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں۔ یا دو جدا جدا قبیلے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ دونوں جُدا جُدا قبیلے ہیں، مدین متمدن اور شہری

[1] معجم البلدان جلد ۵ ص ۲۱۸۔

قبیلہ تھا اور "اصحاب ایکہ" دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بَن میں آباد تھا، اس لئے اُس کو "بَن والا" یا "جنگل والا" کہا گیا، اور آیت "انھما لبامام مبین" میں "ھما" ضمیر تثنیہ سے یہی دونوں مراد ہیں نہ کہ مدین اور قومِ لوط۔

اور دوسرے مفسرین دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آب ہوا کی لطافت نہروں اور آبشاروں کی کثرت نے اس مقام کو اس قدر شاداب و پُرفضا بنا دیا تھا اور یہاں میووں، پھلوں اور خوشبودار پھولوں کے اس قدر باغات اور چمن تھے کہ اگر ایک شخص آبادی سے باہر کھڑے ہو کر نظارہ کرتا تھا تو اس کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ نہایت خوبصورت اور شاداب گھنے درختوں کا ایک جھنڈ ہے، اسی وجہ سے قرآنِ عزیز نے اس کو "ایکہ" کہہ کر تعارف کرایا۔

اِن مفسرین میں سے حافظ عماد الدین ابن کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہاں "ایکہ" نام ایک درخت تھا، اہلِ قبیلہ چونکہ اس کی پرستش کرتے تھے لہٰذا اس کی نسبت سے "مدین" کو "اصحابِ ایکہ" کہا گیا، نیز چونکہ یہ نسبت نسبی نہ تھی بلکہ مذہبی تھی اس لئے جن آیات میں ان کو اس لقب سے یاد کیا گیا ہے اُن میں حضرتِ شعیبؑ کو "اخوھم" اُن کا بھائی، یا اسی قسم کے نسبی علاقہ سے یاد نہیں کیا، البتہ جن آیات میں 'قومِ شعیبؑ کو مدین کہہ کر یاد کیا ہے، ان میں حضرتِ شعیبؑ کو بھی ان کے نسبی رشتہ میں منسلک ظاہر کیا ہے۔

بہرحال راجح یہی ہے کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ ہے جو باپ کی نسبت سے مدین کہلایا اور زمین کی طبعی اور جغرافی حیثیت سے "اصحابِ ایکہ" کے لقب سے مشہور ہوا۔

زمانۂ بعثت اور ایک غلطی کا ازالہ	عبدالوہاب نجار اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں تحریر فرماتے ہیں کہ ابوالعباس احمد قلقشندی نے "صبح الاعشیٰ" جلد ۴ ص ۱۶ میں یہ تحریر کیا ہے:۔

ثم ملك بعدہ۔ یعنی یوثام، ابنہ احازست   پھر یوثام کے بعد احاز نے بھی سولہ سال تک حکومت کی
عشرۃ سنۃ ایضا وکانت الحرب بینہ وبین   اور اسکے اور دمشق کے بادشاہ کے درمیان جنگ رہی اور
ملك دمشق وفی زمنہ کان شعیب علیہ السلام   اُسی زمانہ میں حضرتِ شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔

قلقشندی کی عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرتِ شعیب علیہ السلام حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) سے صدیوں بعد پیدا ہوئے یعنی سات سو برس بعد آٹھویں صدی کے اوائل میں، کیونکہ آحاز کی حکومت کا یہی زمانہ تھا، حالانکہ یہ بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ہے، اسلئے کہ حضرتِ شعیب (علیہ السلام) حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) سے بڑے ہیں اور حضرتِ موسیٰؑ نے حضرتِ شعیبؑ کا زمانہ پایا ہے یا نہیں یہ بات البتہ اختلافی ہے۔

اسی بنا پر قرآنِ عزیز نے سورۂ اعراف میں حضرتِ نوح، حضرتِ ہود، حضرتِ صالح، حضرتِ لوط اور حضرتِ شعیب (علیہم السلام) کے ذکر کے بعد فرمایا ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوسَىٰ اور اسی طرح سورۂ یونس، سورۂ حج، سورۂ ہود اور سورۂ عنکبوت میں بیان کیا گیا۔

تو قلقشندی سے اس جگہ لغزش ہو گئی ہے کہ اس نے شعیاہ (علیہ السلام) کی جگہ شعیب علیہ السلام تحریر کر دیا، بلاشبہ آحاز کی حکومت کا زمانہ شعیاہ نبی کا زمانہ ہے۔[1]

دعوتِ حق

بہر حال شعیب (علیہ السلام) جب اپنی قوم میں مبعوث ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ خدا کی نافرمانی اور معصیت کا ارتکاب صرف افراد و احاد میں ہی نہیں پایا جاتا بلکہ ساری قوم گردابِ ہلاکت میں مبتلا ہے اور اپنی بداعمالیوں میں اس قدر سرمست و سرشار ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے معصیت اور گناہ ہے بلکہ وہ اپنے ان اعمال کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔

ان کی بہت سی بداخلاقیوں اور نافرمانیوں سے قطع نظر جن قبیح امور نے خصوصیت کے ساتھ ان میں رواج پالیا تھا وہ یہ تھے۔

(۱) بت پرستی اور مشرکانہ رسوم و عوائد (۲) خرید و فروخت میں پورا لینا اور کم تولنا یعنی دوسرے کو اس کے حق سے کم دینا اور اپنے لئے حق کے مطابق لینا بلکہ اس سے زیادہ (۳) تمام معاملات میں کھوٹ اور ڈاکہ زنی۔

قوموں کے عام رواج کے مطابق دراصل ان کی رفاہیت، خوش عیشی، دولت و ثروت کی

[1] قصص الانبیاء نجار ص۱۵۱

فراوانی، زمین اور باغوں کی زرخیزی اور شادابی نے ان کو اس قدر مغرور بنا دیا تھا کہ وہ ان تمام امور کو اپنی ذاتی میراث اور اپنا خاندانی ہنر سمجھ بیٹھے تھے، اور ایک ساعت کے لئے بھی اُن کے دل میں یہ خطرہ نہیں گذرتا تھا کہ یہ سب کچھ خدائے تعالیٰ کی عطا و بخشش ہے کہ شکر گذار ہوتے اور سرکشی سے باز رہتے، غرض ان کی فارغ البالی نے ان میں طرح طرح کی بداخلاقیاں اور قسم قسم کے عیوب پیدا کر دیئے تھے۔

آخر غیرتِ حق حرکت میں آئی اور سنت اللہ کے مطابق ان کو راہِ حق دکھانے، فسق و فجور سے بچانے اور امین و متقی اور بااخلاق بنانے کے لئے اُن ہی میں سے ایک ہستی کو چُن لیا اور شرفِ نبوت و رسالت سے نوازکر اس کو دعوتِ اسلام اور پیغامِ حق کا امام بنایا یہ ہستی حضرتِ شعیب علیہ السلام کی ذاتِ گرامی تھی۔

خدا کی توحید اور شرک سے بیزاری کا اعتقاد تو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کی مشترک بنیاد اور اصل ہے جو حضرتِ شعیب علیہ السلام کے حصہ میں بھی آئی تھی مگر قوم کی مخصوص بداخلاقیوں پر توجہ دلانے اور ان کو راہِ راست پر لانے کے لئے انھوں نے اِس قانون کو بھی اہمیت دی کہ خرید و فروخت کے معاملہ میں یہ ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ جو جس کا حق ہے وہ پورا پورا اس کو ملے کہ دُنیوی معاملات میں یہی ایک ایسی بنیاد ہے جو متزلزل ہو جانے کے بعد ہر قسم کے ظلم، فسق و فجور اور مہلک خرابیوں اور بداخلاقیوں کا باعث بنتی ہے۔

الحاصل حضرتِ شعیب (علیہ السلام) نے بھی اپنی قوم کی بداعمالیوں کو دیکھ کر سخت دکھ محسوس کیا اور رشد و ہدایت کی تعلیم دیتے ہوئے قوم کو انہی اصول کی طرف بلایا جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت و ارشاد کا خلاصہ ہے۔

انھوں نے فرمایا: "اے قوم! ایک خدا کی عبادت کر! اُس کے علاوہ کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے، اور خرید و فروخت میں ناپ تول کر پورا رکھ، اور لوگوں کے ساتھ

معاملات میں کھوٹ نہ کر کل تک ممکن ہے کہ تجھ کو ان بداخلاقیوں کی برائیوں کا حال معلوم نہ ہوا ہو، مگر آج تیرے پاس خدا کی حجت، نشانی اور بُرہان آچکا، اب جہل و نادانی، عفو و درگذر کے قابل نہیں ہے، حق کو قبول کر اور باطل سے باز آ، کہ یہی کامرانی اور کامیابی کی راہ ہے، اور خدا کی زمین میں فتنہ و فساد نہ کر، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صلاح و خیر کے تمام سامان مہیا کر دیئے، اگر تجھ میں ایمان و یقین کی صداقت موجود ہے تو سمجھ کہ یہی فلاح و بہبودی کی راہ ہے اور دیکھ ایسا نہ کر کہ دعوتِ حق کی راہ کو روکنے اور لوگوں کو لوٹنے کے لئے ہر راہ پر جا بیٹھے اور جو آدمی بھی ایمان لائے اُس کو خدا کی راہ اختیار کرنے پر دھمکیاں دینے لگے اور اس میں کج روی پیدا کرنے کے درپے ہو جائے، اے افرادِ قوم اس وقت کو یاد کرو، اور خدا کا احسان مانو کہ تم بہت تھوڑے سے تھے پھر اس نے امن و عافیت دے کر تمہاری تعداد کو بیش از بیش بڑھا دیا۔

اے میری قوم! ذرا اس پر بھی غور کر کہ جن لوگوں نے خدا کی زمین پر فساد پھیلانے کا شیوہ اختیار کیا تھا اُن کا انجام کس قدر عبرت ناک ہوا، اور اگر تم میں سے ایک جماعت مجھ پر ایمان لے آئی اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی تو صرف اتنی ہی بات پر معاملہ ختم ہو جانے والا نہیں، بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کر، تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان آخری فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

حضرتِ شعیب (علیہ السلام) بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے، شیریں کلامی، حُسنِ خطابت، طرزِ بیان اور طلاقت لسانی میں بہت نمایاں امتیاز رکھتے تھے۔ اسی لئے مفسرین ان کو خطیب الانبیاء کے لقب سے یاد کرتے ہیں، پس انھوں نے نرم و گرم ہر طریقہ سے قوم کو رشد و ہدایت کے یہ کلمات ارشاد فرمائے مگر اس بدبخت قوم پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا، اور چند ضعیف اور کمزور ہستیوں کے علاوہ کسی نے پیغامِ حق پر کان نہ دھرا، وہ خود بھی اُسی طرح بداعمال رہے اور دوسروں کی راہ بھی مارتے رہے، وہ راستوں میں بیٹھ جاتے اور حضرتِ

شعیبؑ کے پاس آنے جانے والوں کو قبولِ حق سے روکتے اور اگر موقعہ لگ جاتا تو لوگوں کو لُوٹ لیتے اور اگر اس پر بھی کوئی خوش قسمت حق پر لبیک کہدیتا تو اس کو ڈراتے، دھمکاتے اور طرح طرح سے کج روی پر آمادہ کرتے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرتِ شعیبؑ کی دعوتِ حق کا سلسلہ برابر جاری رہا تو اُن میں سے سربرآوردہ اشخاص نے کہ جن کو اپنی شوکت و طاقت پر غرور تھا حضرتِ شعیبؑ سے کہا "اے شعیب! دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو کر رہے گی، یا ہم تجھ کو اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو اپنی بستی میں سے نکال دیں گے اور تیرا دیس نکالا کریں گے یا تم کو مجبور کریں گے کہ پھر ہمارے دین میں واپس آجاؤ۔"

حضرتِ شعیبؑ نے فرمایا "اگرہم تمہارے دین کو غلط اور باطل سمجھتے ہوں تب بھی زبردستی مان لیں یہ تو بڑا ظلم ہے؟ اور جبکہ ہم کو خدائے تعالیٰ نے تمہارے اس دین سے نجات دیدی تو پھر ہم اس کی طرف لوٹ جائیں تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بول کر خدائے تعالیٰ پر بہتان باندھا، یہ ناممکن ہے، ہاں اگر اللہ کی (جو کہ ہمارا پروردگار ہے) یہی مرضی ہو تو وہ جو چاہے گا کرے گا، ہمارے رب کا علم تمام اشیاء پر چھایا ہوا ہے، ہمارا تو صرف اُسی پر بھروسہ ہے، اے پروردگار! تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق اور سچائی کے ساتھ فیصلہ کردے تو ہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے، قوم کے سرداروں نے جب حضرتِ شعیب علیہ السلام کا یہ عزم و استقلال دیکھا تو اب اُن سے روئے سخن پھیر کر اپنی قوم کے لوگوں سے کہنے لگے "خبردار! اگر تم نے شعیبؑ کا کہنا مانا تو تم ہلاک و برباد ہو جاؤ گے۔

حضرتِ شعیبؑ نے یہ بھی فرمایا " دیکھو خدائے تعالیٰ نے مجھ کو اس لئے بھیجا ہے کہ میں اپنے مقدور بھر تمہاری اصلاح کی سعی کروں اور میں جو کچھ کہتا ہوں اس کی صداقت اور سچائی کے لئے خدا کی حجت اور دلیل اور نشانی بھی پیش کر رہا ہوں، مگر افسوس کہ تم اس واضح حجت کو دیکھ کر بھی سرکشی و نافرمانی پر قائم ہو اور مخالفت کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو تم سے

چھوٹا ہوا ہو پھر میں تم سے اپنی اس رشد و ہدایت کے بدلہ میں کوئی اجرت بھی نہیں مانگتا اور نہ کوئی دنیوی نفع کا طالب ہوں، میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے، اور اگر تم اب بھی نہ مانوگے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں خدا کا عذاب تم کو ہلاک و برباد نہ کر ڈالے، اُس کا فیصلہ اٹل ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کو رد کر دے۔

قوم کے سردار تیوری چڑھا کر بولے۔ شعیب! کیا تیری نماز ہم سے یہ چاہتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے دیوتاؤں کو پوجنا چھوڑ دیں اور ہم کو اپنے مال و دولت میں یہ اختیار نہ رہے کہ جس طرح چاہیں معاملہ کریں، اگر ہم کم تولنا چھوڑ دیں، لوگوں کے کاروبار میں کھوٹ نہ کریں تو مفلس و قلاش ہو کر رہ جائیں۔ پس کیا ایسی تعلیم دینے میں تجھ کو کوئی متین اور سچا رہبر کہہ سکتا ہے؟

حضرت شعیبؑ نے نہایت دل سوزی اور محبت کے ساتھ فرمایا "اے قوم! مجھے یہ خوف لگ رہا ہے کہ تیری یہ بے باکیاں اور خدا کے مقابلہ میں نافرمانیاں کہیں تیرا بھی وہی انجام نہ کر دیں، جو تجھ سے پہلے قوم نوحؑ، قوم ہود، قوم صالحؑ اور قوم لوطؑ کا ہوا، اب بھی کچھ نہیں گیا، خدا کے سامنے جھک جا، اور اپنی بدکرداریوں کے لئے بخشش کی طلب گار بن اور ہمیشہ کے لئے اُن سے تائب ہو جا، بلاشبہ میرا پروردگار رحم کرنے والا اور بہت ہی مہربان ہے، وہ تیری تمام خطائیں بخش دے گا۔

قوم کے سرداروں نے یہ سن کر جواب دیا "شعیبؑ! ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ تو کیا کہتا ہے؟ تو ہم سب سے کمزور اور غریب ہے، اگر تیری باتیں سچی ہوتیں تو تیری زندگی ہم سے زیادہ اچھی ہوتی، اور ہم کو صرف تیرے خاندان کا خوف ہے ورنہ تجھ کو سنگسار کر چھوڑتے، تو ہرگز ہم پر غالب نہیں آسکتا"۔

حضرت شعیبؑ نے فرمایا "افسوس ہے تم پر! کیا تمہارے لئے خدا کے مقابلہ میں میرا خاندان زیادہ ڈر کا باعث بن رہا ہے حالانکہ میرا رب تمہارے تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور وہ دانا و بینا ہے"

خیر اگر تم نہیں مانتے تو تم جانو، تم وہ سب کچھ کرتے رہو جو کر رہے ہو عنقریب خدا کا فیصلہ بتادے گا کہ عذاب کا مستحق کون ہے اور کون جھوٹا اور کاذب ہے تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں؟

آخر وہی ہوا جو قانونِ الٰہی کا ابدی و سرمدی فیصلہ ہے" یعنی حجت و برہان کی روشنی آنے کے بعد بھی جب باطل پر اصرار رہا اور اس کی صداقت کا مذاق اڑایا جائے اور اس کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالی جائیں تو پھر خدا کا عذاب اس مجرمانہ زندگی کا خاتمہ کر دیتا، اور آنے والی قوموں کے لئے اس کو عبرت و موعظت بنا دیا کرتا ہے۔"

نوعِ عذاب | قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں قومِ شعیبؑ کو دو قسم کے عذاب نے آگھیرا ایک زلزلہ کا عذاب اور دوسرا آگ کی بارش کا عذاب یعنی جب وہ اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے تو یک بیک ایک ہولناک زلزلہ آیا اور ابھی یہ ہولناکی ختم نہ ہوئی تھی کہ اوپر سے آگ برسنے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ صبح کو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کل کے سرکش اور مغرور آج گھٹنوں کے بل اوندھے جھلسے ہوئے پڑے ہیں۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ (اعراف ع ۱۱) — پھر آپکڑا اُن کو زلزلے نے پس صبح کو رہ گئے اپنے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (الشعراء ع) — پھر انھوں نے شعیب کو جھٹلایا پس آپکڑا انکو بادل والے عذاب نے (جس میں آگ تھی) بیشک وہ بڑے ہولناک دن کا عذاب تھا۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا — اور ہم نے (قبیلۂ) مدین کی طرف اس کے بھائی شعیب کو بھیجا اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوشحال ہو (یعنی خدا نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے، پس کفرانِ نعمت سے بچو) میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو سب

الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا
تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا
تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝
بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم
مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم
بِحَفِيظٍ ۝ قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ
تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا
أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ
إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ ۝
قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ
بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ
رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَمَا أُرِيدُ أَنْ
أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ
إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ
مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا
بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ
أُنِيبُ ۝ وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ
شِقَاقِي أَن يُصِيبَكُم مِّثْلُ مَا
أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ
أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم
بِبَعِيدٍ ۝ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ

پر چھا جائے گا“۔ اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ تول انصاف
کے ساتھ پوری پوری کیا کرو، لوگوں کو اُن کی چیزیں (اُن کے حق
سے) کم نہ دو، ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو، اگر تم میرا کہا مانو تو
جو کچھ اللہ کا دیا (کاروبار میں) بچ رہے، اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے
اور دیکھو (میرا کام تو صرف نصیحت کر دینا ہے) میں کچھ تم پر نگہبان
نہیں (کہ جبراً اپنی راہ پر چلا دوں) لوگوں نے کہا اے شعیبؑ! کیا
تیری یہ نمازیں (جو تو اپنے خدا کے لئے پڑھتا ہے) تجھے یہ حکم دیتی ہیں
کہ ہمیں آکر کہے: ان معبودوں کو چھوڑ دو جنہیں ہمارے باپ دادے
پوجتے رہے ہیں، یا یہ کہ ہمیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا
تصرف کرنا چاہیں کریں بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی
رہ گئے ہو، شعیبؑ نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات
پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن رکھتا ہوں
اور اُس کے فضل و کرم کا یہ حال ہو کہ اچھی (سے اچھی) روزی عطا
فرما رہا ہو (تو پھر بھی میں چپ رہوں اور تمہیں راہ حق کی طرف نہ بلاؤں)
اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روکتا ہوں اُس سے تمہیں تو
روکوں اور خود اس کے خلاف چلوں میں تمہیں جو کچھ کہتا ہوں اسی پر
عمل بھی کرتا ہوں میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس
میں ہے اصلاحِ حال کی کوشش کروں، میرا کام بنتا ہے تو اللہ ہی کی مدد
سے بنتا ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع ہوں“ اور
اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آکر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں
بھی ویسا ہی معاملہ پیش آجائے جیسا قوم نوح کو یا قوم ہود کو یا قوم صالح کو

تُوبُوٓا اِلَيۡهِ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ رَحِيۡمٌ
وَّدُوۡدٌ ۝ قَالُوۡا يٰشُعَيۡبُ مَا
نَفۡقَهُ كَثِيۡرًا مِّمَّا تَقُوۡلُ وَاِنَّا
لَنَرٰٮكَ فِيۡنَا ضَعِيۡفًا ۚ وَلَوۡلَا
رَهۡطُكَ لَرَجَمۡنٰكَ ؗ وَمَاۤ
اَنۡتَ عَلَيۡنَا بِعَزِيۡزٍ ۝ قَالَ
يٰقَوۡمِ اَرَهۡطِىۡۤ اَعَزُّ عَلَيۡكُمۡ
مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذۡتُمُوۡهُ وَرَآءَكُمۡ
ظِهۡرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ
مُحِيۡطٌ ۝ وَيٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰى
مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ ؕ سَوۡفَ
تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ يَّاۡتِيۡهِ عَذَابٌ
يُّخۡزِيۡهِ وَمَنۡ هُوَ كَاذِبٌ ؕ
وَارۡتَقِبُوۡۤا اِنِّىۡ مَعَكُمۡ رَقِيۡبٌ ۝
وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا شُعَيۡبًا
وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ
مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا
الصَّيۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ
دِيَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ۝ كَاَنۡ لَّمۡ
يَغۡنَوۡا فِيۡهَا ؕ اَلَا بُعۡدًا لِّمَدۡيَنَ
كَمَا بَعِدَتۡ ثَمُوۡدُ ۝ (ہود)

پیش آچکا ہے، اور قوم لوطؑ (کا معاملہ) تم سے کچھ دُور نہیں، اور
دیکھو اللہ سے (اپنے گناہوں کی) معافی مانگو۔ اور اس کی طرف
لوٹ جاؤ۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت والا۔ بڑا ہی محبت والا ہے"
لوگوں نے کہا" اے شعیبؑ! تم جو کچھ کہتے ہو اس میں سے اکثر
باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہم لوگوں
میں ایک کمزور آدمی ہو، اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے
آدمی نہ ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگسار کر دیتے، تمہاری ہمارے
سامنے کوئی ہستی نہیں، شعیبؑ نے کہا اے میری قوم کے لوگو!
کیا اللہ سے بڑھ کر تم پر میری برادری کا دباؤ ہوا؟ اور اللہ تمہارے
لئے کچھ نہ ہوا کہ اُسے پیچھے ڈال دیا؟ (اچھا) جو تم کرتے ہو میرے
پروردگار کے احاطہ (علم) سے باہر نہیں، اے میری قوم کے
لوگو! تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ، میں بھی اپنی جگہ، سرگرم عمل ہوں،
بہت جلد معلوم کر لوگے کہ کس پر عذاب آتا ہے، جو اُسے رسوا کریگا
اور کون فی الحقیقت جھوٹا ہے، انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ
انتظار کرتا ہوں اور پھر جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آپہنچا
تو ایسا ہوا کہ ہم نے شعیبؑ کو اور ان کو جو اُن کے ساتھ ایمان
لائے تھے اپنی رحمت سے، بچا لیا اور جو لوگ ظالم تھے انھیں
ایک سخت آواز نے آپکڑا، پس جب صبح ہوئی تو اپنے اپنے گھروں
میں اوندھے پڑے تھے (وہ اس طرح اچانک ہلاک ہوگئے،
گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے! تو سُن رکھو کہ قبیلۂ مدین کے
لئے بھی محرومی ہوئی جس طرح ثمود کے لئے محرومی ہوئی تھی!

قبر شعیب علیہ السلام حضرموت میں ایک قبر ہے جو زیارت گاہ عوام و خواص ہے، وہاں کے باشندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ شعیب (علیہ السلام) کی قبر ہے، حضرت شعیبؑ مدین کی ہلاکت کے بعد یہاں بس گئے تھے اور یہیں اُن کی وفات ہوئی، حضرموت کے مشہور شہر "شیون" کے مغربی جانب میں ایک مقام ہے جس کو "شبام" کہتے ہیں اس جگہ اگر کوئی مسافر وادیٔ ابن علی کی راہ ہوتا ہوا، شمال کی جانب چلے تو وادی کے بعد وہ جگہ آتی ہے جہاں یہ "قبر" ہے، یہاں مطلق کوئی آبادی نہیں ہے اور جو شخص بھی یہاں آتا ہے صرف زیارت ہی کے لئے آتا ہے۔[۱]

عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ مجھ کو اس قبر کے متعلق شک ہے کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر ہے، لیکن انھوں نے اس شک کے لئے کوئی وجہ نہیں بیان فرمائی۔

بصائر و عبر پچھلی اُمتوں اور قوموں کے یہ واقعات کہانیاں نہیں ہیں بلکہ عبرت بیں نگاہوں کے لئے سرمایۂ صد ہزار عبرت ہیں، اگر زیادہ غور و فکر سے بھی کام نہ لیا جائے تب بھی بآسانی مسطورۂ بالا واقعات سے ہم حسب ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

(۱) سورۂ اعراف میں مذکور ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی حجت و بینہ آچکی قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ مگر قرآن عزیز نے دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت شعیبؑ کے کسی معجزہ "آیۃ اللہ" کا ذکر نہیں کیا، علماء نے اس سے دو نتیجے نکالے ہیں، ایک یہ کہ اگر نبی اور پیغمبر کسی قسم کا معجزہ نہ بھی لائے اور صرف خدا کے پیغام کے لئے روشن دلائل و براہین کی حجت ہی پیش کرے تو یہ روشن برہان، اس کا سب سے بڑا اور عظیم الشان معجزہ ہے، دوسرے یہ کہ اس مقام پر "بینہ" کی تفصیلات کو خدا کے سپرد کرنا چاہیے، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ شریعت کے روشن دلائل کے علاوہ حضرت شعیبؑ کو بھی خدا کی جانب سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح کوئی نشان (آیۃ اللہ) بطور معجزہ عطا کیا گیا ہو اور اگرچہ قرآن نے اس جگہ اس کی تصریح نہیں کی کہ شعیب علیہ السلام

[۱] قصص الانبیاء۔

ہے کہ اس خطاب میں اسی جانب اشارہ ہو۔

(۲) ہماری غلط فہمیوں میں سب سے بڑی ہلاکت آفریں غلطی عرصہ سے یہ رہی ہے کہ ہم قرآنِ عزیز کی تعلیم سے یکسر غافل ہونے کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ اسلامی زندگی کے ارکان میں صرف عبادات ہی اہم رکن ہیں اور معاملات میں درست کاری اور اصلاحِ معاشرت کو اسلام میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں فساقِ امت کا تو ذکر ہی کیا اکثر اتقیاء اور پرہیزگار بھی حقوق العباد اور معاملات میں بے پروا نظر آتے ہیں، مگر حقوق العباد کی حفاظت معاشرتی درستکاری اور معاملات میں دیانت وامانت کو اسلام میں کس درجہ اہم شمار کیا گیا ہے وہ اس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت کا مقصد اسی کو قرار دیا اور ان کو انہی امور کی اصلاحِ حال کے لئے رسول بنا کر بھیجا۔

(۳) خرید وفروخت میں دوسروں کے حق کو پورا نہ دینا انسانی زندگی میں ایسا روگ لگا دیتا ہے کہ یہ بداخلاقی بڑھتے بڑھتے تمام حقوق العباد کے بارے میں حق تلفی کی خصلت پیدا کر دیتی ہے اور اس طرح انسانی شرافت اور باہمی اخوت ومودت کے رشتہ کو منقطع کر کے لالچ، حرص، خود غرضی اور خست ودناءت جیسے رذائل کا حامل بنا دیا کرتی ہے اسی لئے خدائے برتر کا ارشاد ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝ (مطففین ع۱)

ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو دوسروں سے جب لیتے ہیں تو پورے پیمانے سے لیتے ہیں اور جب خود اپنی چیز دیتے ہیں تو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں اور کم تولتے ہیں۔

پس أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ (ہود ع۸) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ ناپ تول میں انصاف صرف اشیاء کی خرید وفروخت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ انسانی کردار کا یہ کمال ہونا چاہیے کہ خدا اور اس کے بندوں کے تمام حقوق وفرائض میں اس ایک اصل کو بنیادی کار بنائے اور کسی موقع اور کسی حالت میں بھی عدل وانصاف کی ترازو کو ہاتھ سے نہ دے اور خرید وفروخت کے درمیان ناپ تول میں کمی نہ کرنا اور انصاف کو برقرار رکھنا گویا ایک کسوٹی ہے کہ جو انسانی زندگی کے معمولی لین دین

میں عدل وانصاف نہیں برتتا اس سے کیا توقع ہوسکتی ہے کہ وہ اہم معاملاتِ دینی و دُنیوی میں عدل وقسط کو کام میں لائے گا ؟

(۴) اصلاحِ حال کے بعد خدا کی زمین میں فساد پیدا کرنے سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں ہے اسلئے کہ ظلم، کبر، قتل اور عصمت ریزی جیسے بڑے بڑے جرائم کی بُنیاد اور اصل یہی رذیلہ ہے،

(۵) باطل کی ایک بڑی شناخت یہ ہے کہ نہ وہ اپنے لئے دلائل کی روشنی رکھتا ہے اور نہ روشن دلائل کو برداشت کرتا ہے بلکہ جب اُس کے سامنے روشنی آتی ہے تو وہ مُنہ پھیر لیتا، اور آنکھیں بند کرلیتا ہے اور اس کی موجودگی کو برداشت نہ کرتے ہوئے دلائل کا جواب غصہ، دھمکی اور قتل سے دینے پر آمادہ ہوجاتا ہے، تم انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروانِ حق کی زندگی اور پھر اُن کے مقابل اور مخالف باطل پرستوں کی زندگی کا موازنہ کرو اور تاریخ کے اوراق سے واضح شہادت لو تو تم کو قدم قدم پر یہ حقیقت آشکارا اور روشن نظر آئیگی کہ انبیاء علیہم السلام روشن دلائل دے رہے ہیں، آیات اللہ اور خدا کی نشانیاں دکھا رہے ہیں، محبت اور رحم کے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں اور اپنی دعوت وتبلیغ پر مخاطبین پر مالی دباؤ نہ ڈالنے کا اطمینان دلا رہے ہیں مگر ان تمام باتوں کے باوجود دوسری جانب سے ان کو کہا جا رہا ہے کہ ہم تمہارا دیس نکالا کردیں گے، ہم تم کو سنگسار کردینگے، ہم تم کو قتل کردیں گے، اور اگر خدا کے پیغمبر آخری طور پر یہ کہتے ہیں کہ اگر تم ہماری آواز پر لبیک نہیں کہتے تو کم از کم ہمارے وجود کو برداشت کرو اور اتنا تو صبر کرو کہ خدا تمہارے اور ہمارے درمیان حق وباطل کا خود ہی فیصلہ کردے تو دوسری جانب سے اس کے جواب میں بھی انکار، تمسخر اور یہ مطالبہ پیش ہوتا ہے کہ بس اب اپنی نصیحت ختم کرو اور اگر سچے ہو تو جس عذاب سے ڈراتے ہو وہ ابھی لے آؤ، ورنہ تو ہم ہمیشہ کے لئے تمہارا اور تمہارے مشن کا خاتمہ کردیں گے۔

(۶) حق وباطل کا یہی وہ آخری مرحلہ ہے جس کے بعد خدائے تعالیٰ کا وہ قانون جس کو قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے ایسی سرکش اور متکبر قوموں کیلئے دنیا ہی میں نافذ ہوجاتا ہے اور انکو ہلاک وتباہ کرکے آنے والی نسلوں اور قوموں کے لئے سامانِ عبرت وموعظت مہیا کردیتا ہے

حضرتِ موسیٰ و ہارون علیہما السلام

بنی اسرائیل مصر میں، موسیٰؑ و ہارونؑ کا ذکر قرآن میں، نسب و ولادتِ موسیٰؑ، ارضِ مدین اور موسیٰؑ کا مصر سے خروج، وادیِ مقدس و بعثتِ موسیٰؑ، واپسیِ مصر اور فرعون کو دعوتِ اسلام، آیات اللہ اور فرعون کا انکار، قتلِ موسیٰؑ کا مشورہ، بنی اسرائیل کی ہجرت اور فرعون کی مزاحمت، نجاتِ بنی اسرائیل و غرقِ فرعون، عبورِ قلزم کے بعد بنی اسرائیل کا پہلا مطالبہ، قومی پستی کا مظاہرہ، دیگر مطالبات اور آیاتِ بینات کا ظہور، موسیٰؑ کا طور پر اعتکاف، نزولِ تورات، گوسالہ پرستی کا واقعہ، سامری، ستّر سرداروں کا انتخاب، حیات بعد الموت، بنی اسرائیل اور جبلِ طور، ارضِ مقدس اور بنی اسرائیل، ذبحِ بقرہ کا واقعہ، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور قارون، حضرتِ موسیٰؑ اور ایذاءِ بنی اسرائیل، حضرتِ ہارونؑ کی وفات، حضرتِ موسیٰؑ اور خضرؑ، حضرتِ موسیٰؑ کی وفات، بنی اسرائیل کا قومی مزاج اور خدا کی جانب سے تذکیرِ نعمت، حضرتِ موسیٰؑ کی ثناء و منقبت قرآن میں، ایک لطیف تاریخی نکتہ، بصیرتیں اور عبرتیں

بنی اسرائیل مصر میں

قرآن عزیز نے حضرتِ یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بنی اسرائیل کا ذکر صرف اسی قدر کیا تھا کہ حضرتِ یعقوبؑ اور اُن کا خاندان حضرتِ یوسفؑ سے ملنے مصر میں آکر مگر اس کے بعد صدیوں بعد حضرتِ موسیٰؑ کے واقعات میں پھر ایک مرتبہ قرآن حکیم بنی اسرائیل کے واقعات تفصیل کے ساتھ سُناتا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرتِ یوسفؑ کے زمانے میں مصر ہی میں بس گئے تھے اور ان تمام پچھلی صدیوں میں اُن کی تاریخ مصر ہی سے وابستہ رہی ہے، تورات کی یہ تفصیلات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں :-

"تب فرعون یوسفؑ سے متکلم ہوا اور کہا کہ تیرا باپ اور تیرے بھائی تجھ پاس آئے ہیں، مصر کی زمین تیرے آگے ہے، اپنے باپ اور اپنے بھائیوں کو اس سرزمین کے ایک مقام میں جو سب سے بہتر ہے بسا، جشن کی زمین میں انہیں رہنے دے، اور اگر تو جانتا ہے کہ بعضے اُن کے درمیان چالاک ہیں تو اُن کو میری مواشی پر مختار کر۔[1]

اور یوسفؑ نے اپنے باپ اور بھائیوں کو ملکِ مصر کی ایک بہتر زمین میں جو رعمسیس کی زمین ہے جیسا فرعون نے فرمایا تھا بٹھایا اور انہیں اس کا مالک کیا اور یوسفؑ نے اپنے باپ اور اپنے بھائیوں اور اپنے باپ کے سب گھرانے کی، اُن کے لڑکے بالوں کے موافق روٹی سے پرورش کی۔[2]

اور اسرائیل نے مصر کی زمین میں جشن کے ملک میں سکونت کی اور وہاں ملکیتیں رکھتے تھے اور بڑھے اور بہت زیادہ ہوئے اور یعقوب مصر کی زمین میں سترہ برس جیا، سو یعقوبؑ کی ساری عمر ایک سو سینتالیس (۱۴۷) برس کی ہوئی۔"[3]

توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرتِ یوسف (علیہ السلام) نے فرعون سے اپنے باپ اور اہلِ خاندان کے لئے "ارضِ جاشان" طلب کی جو فرعون نے بخوشی ان کے سپرد کر دی۔[4] مصر کے نقشہ میں یہ جگہ بلبیس کے شمال میں واقع ہے، اس علاقہ کا ایک موجودہ شہر قلوسنہ (سفط الحنۃ) ہے۔

حضرتِ یوسفؑ کے واقعہ میں ہم بتا چکے ہیں کہ شہری آبادی سے دُور حضرتِ یوسفؑ نے اپنے خاندان کے لئے یہ جگہ غالباً اس لئے منتخب کی تھی کہ یہاں رہ کر اُن کے خاندان کی بدویانہ زندگی بحالہٖ باقی رہے گی اور اس کی وجہ سے مصری بُت پرست اُن کے ساتھ اختلاط نہ کر سکیں گے، اور اُن کی مشرکانہ رسوم اور بداخلاقیاں بنی اسرائیل میں سرایت نہ کر سکیں گی

[1] پیدائش باب ۴۷ آیات ۵-۶
[2] پیدائش باب ۴۷ آیات ۱۱-۱۲
[3] پیدائش باب ۴۷ آیات ۲۷-۲۸
[4] پیدائش باب ۴۷ آیات ۳۰-۳۱

کیونکہ مصری لوگ چرواہوں کاشتکاروں اور بدوی لوگوں کو کمتر اور نجس سمجھتے اور ان کے ساتھ اختلاط کو معیوب جانتے تھے۔

توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے حضرتِ یوسفؑ کو بلا کر وصیت کی کہ مجھ کو سرزمینِ مصر میں دفن نہ کیا جائے بلکہ باپ دادا کے وطن فلسطین میں میری قبر بنائی جائے، حضرتِ یوسفؑ نے باپ کو پورا اطمینان دلایا اور انتقال کے بعد ان کے جسدِ اطہر کو حنوط (ممی) کر کے تابوت میں رکھا اور فلسطین بیجا کر سپردِ خاک کیا۔

حضرتِ یعقوب (علیہ السلام) نے وفات سے پہلے ساری اولاد کو جمع کیا اور حضرتِ یوسفؑ کے صاحبزادوں افرائیم اور منسی کو بھی بلایا اور ان سب کو اوّل دعاءِ برکت دی اور محبت و شفقت کے ساتھ اُن کو نوازا اس کے بعد اُن کو نصیحت کی کہ "دیکھو میرے بعد اپنے ایمانیات و اعتقادات کو کہیں خراب نہ کر لینا اور خدا کے اُس پاک رشتہ کو جو میں نے اور میرے باپ دادا نے ہمیشہ مضبوط رکھا مشرکانہ رسوم و عوائد سے شکست و ریخت نہ کر دینا۔"

قرآنِ عزیز نے بھی یعقوب علیہ السلام کی اس مقدس وصیت کا ان معجزانہ جملوں میں ذکر کیا ہے،

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (بقرہ)	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی موت کا وقت تھا، جبکہ اُس نے اپنی اولاد سے کہا "میرے بعد کس کی پرستش کروگے (یعنی کون سا دین اختیار کروگے) تو انھوں نے جواب دیا "ہم اُسی ایک خدا کی پرستش کریں گے جو تیرا اور تیرے باپ دادا ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کا خدا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں۔"

توراۃ نے حضرتِ یوسف (علیہ السلام) کی وفات کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اُن کی عمر اور اُن کی نسل کا بھی ذکر حسب ذیل عبارت میں کیا ہے:-

لہ پیدائش باب ۴۷ آیات ۳۰، ۳۱۔

اور یوسفؑ اور اُس کے باپ کے گھرانے نے مصر میں سکونت کی اور یوسفؑ ایک سو دس برس جیا، اور یوسفؑ نے افرائیم کے لڑکے جو تیسری پشت میں تھے دیکھے اور منسی کے بیٹے مکیر کے بیٹے بھی یوسفؑ کے گھٹنوں پر پالے گئے، اور یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا میں مرتا ہوں اور خدا یقیناً تم کو یاد کریگا اور تم کو اس زمین سے باہر اُس زمین میں جس کی بابت اُس نے ابراہام اور اضحاقؑ اور یعقوبؑ سے قسم کی ہے لیجائیگا، اور یوسفؑ نے بنی اسرائیل سے قسم لے کے کہا خدا یقیناً تم کو یاد کریگا اور تم میری ہڈیوں کو یہاں سے لیجائیو، سو یوسفؑ ایک سو دس برس کا بوڑھا ہو کے مرگیا اور انھوں نے اُس میں خوشبو بھری اور اُسے مصر میں صندوق میں رکھا۔[1]

اور موسیٰؑ نے یوسفؑ کی ہڈیاں ساتھ لیں کیونکہ اس نے بنی اسرائیل کو تاکیداً قسم دے کے کہا تھا کہ خدا یقیناً تمہاری خبرگیری کریگا، تم یہاں سے میری ہڈیاں ساتھ لیجائیو۔[2]

چنانچہ حضرت یوسفؑ کی وصیت کے مطابق اُن کی اولاد نے اُن کے جسم مبارک کو بھی حنوط (ممی) کر کے تابوت میں محفوظ کردیا، اور جب موسیٰ علیہ السّلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے ہجرت کر کے چلے ہیں تو یوسف (علیہ السّلام) کی وصیت کو پورا کرنے کے لئے اُن کا تابوت بھی ساتھ لے گئے اور نبیوں کی سرزمین میں لاکر دفن کردیا، یہ مقام کونسا ہے؟ اس کے متعلق اہلِ جبرون یہ کہتے ہیں کہ وہ جبرون میں مدفون ہیں اور حرمِ خلیلی میں مکفیلہ کے قریب ایک محفوظ تابوت کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہی تابوتِ یوسفؑ ہے لیکن عبدالوہاب مصری اس کو وہم بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرتِ فاضل محمد تمر حسن نابلسی اور نابلس کے سرکردہ عالم حضرتِ فاضل امین بک عبدالہادی نے بیان کیا کہ حضرتِ یوسفؑ کی ضریح مبارک نابلس میں ہے اور یہی صحیح ہے اسلئے کہ توریت کہتی ہے کہ حضرتِ یوسفؑ ارضِ فرائیم میں دفن ہوئے اور نابلس ارضِ فرائیم ہی میں ہے اور اُس کو قدیم زمانہ میں شیکم کہتے تھے۔[3]

بہرحال ان تفصیلات سے یہ واضح ہوگیا کہ بنی اسرائیل حضرتِ یوسفؑ اور حضرتِ موسیٰؑ کی درمیانی صدیوں میں مصر میں آباد رہے۔

[1] پیدائش باب ۵۰ آیات ۲۲-۲۶۔ [2] خروج باب ۱۳ آیات ۱۹۔ [3] قصص الانبیاء ص ۱۸۸۔

فرعونِ موسیٰ | گذشتہ واقعات میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ "فرعون" شاہانِ مصر کا لقب ہے، کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے، تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر عہدِ سکندر تک فراعنہ کے اکتیس ۳۱ خاندان مصر پر حکمراں رہے ہیں، سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا جو ۳۳۲ء قبل از مسیح سکندر کے ہاتھوں مفتوح ہو گیا، ان میں سے حضرت یوسفؑ کا فرعون (ہیکسوس) (عمالقہ) کے خاندان سے تھا جو در اصل عرب خاندانوں ہی کی ایک شاخ تھی تو اب سوال یہ ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا فرعون کون ہے اور کس خاندان سے متعلق ہے؟

عام مورخینِ عرب اور مفسرین اس کو بھی "عمالقہ" ہی کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں، اور کوئی اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان بتاتا اور کوئی مصعب بن ریان کہتا ہے اور ان میں سے اربابِ تحقیق کی رائے یہ ہے کہ اس کا نام ریان یا ریان ابا تھا، ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کی کنیت ابا مرۃ تھی، یہ سب اقوال قدیم مورخین کی تحقیقی روایات پر مبنی تھے مگر اب جدید مصری اثری تحقیقات اور حجری کتبات کے پیشِ نظر اس سلسلہ میں دوسری رائے سامنے آئی ہے، وہ یہ کہ موسیٰؑ کے زمانہ کا فرعون رعمسیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دورِ حکومت ۱۲۹۲ء ق م سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ء ق م پر ختم ہوتا ہے۔

اس تحقیقی روایت کے متعلق احمد یوسف احمد آفندی نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے، یہ مصری دار الآثار کے مصور ہیں اور اثری و حجری تحقیق کے بہت بڑے عالم ہیں، اُن کے اس مضمون کا خلاصہ نجار نے قصص الانبیاء میں نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔

"یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یوسف علیہ السلام جب مصر میں داخل ہوئے ہیں تو یہ فراعنہ کے سولہویں خاندان کا زمانہ تھا اور اس فرعون کا نام "اپاپی الاوّل" تھا، میں نے اس کی شہادت اُس حجری کتبہ سے حاصل کی جو عزیزِ مصر "فوتی فارع" (فوطیفار) کے مقبرہ میں پایا گیا، اور سترھویں خاندان کے بعض آثار سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اس خاندان سے قبل مگر قریب ہی زمانہ میں مصر میں ہولناک قحط پڑ چکا تھا، لہٰذا ان توضیحات کے بعد آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرتِ یوسف کا

داخلۂ مصر ابابی الاول کے زمانے میں تقریباً ۱۶ق م ہوا ہے، اور حضرت یوسف کا عزیز مصر کے یہاں رہنا اور پھر قید خانہ کی زندگی بسر کرنا ان دونوں کی مدت کا اندازہ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف سے تقریباً ستائیس سال بعد مصر میں اُس نشان سے داخل ہوئے جس کا ذکر قرآن حکیم اور تورات میں کیا گیا، ہم اگرچہ فراعنۂ مصر کی حکومت اور شاہی خاندانوں کے متعلق اچھی طرح آگاہی پا چکے ہیں اور مصری آثار نے اس میں ہم کو کافی مدد دی ہے مگر ابھی تک ان اثریات میں وہ تفصیلی تصریحات دستیاب نہیں ہوئیں جو فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور غرقِ فرعون و نجاتِ بنی اسرائیل سے متعلق ہیں، تورات میں مذکور ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ عداوت کا معاملہ کیا۔ بد اُن کو سخت مصائب میں مبتلا رکھا، اس نے بنی اسرائیل سے دو شہروں رعمسیس اور فیثوم کی تعمیر کی خدمت بھی لی اور ان کو مزدور بنایا، تو اثری حفریات (پرانے آثار کی کھدائی) میں ان دو شہروں کا پتہ تو لگ چکا ہے، ایک کے کتبہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس کا نام "بر-توم" یا "فیثوم" ہے اس کا ترجمہ ہے "خدائے توم کا گھر" اور دوسرے کا نام "بر رعمسیس" ہے جس کا ترجمہ "قصر رعمسیس" ہوتا ہے۔

اور شرقی جانب میں جو مقام اب "تل مسخوطہ" کے نام سے مشہور ہے، یہیں "فیثوم" کی آبادی تھی، اور جس جگہ اب قنتیر یا قدیم مصری زبان کے اعتبار سے خنت نفر واقع ہے اس مقام پر رعمسیس آباد تھا، اس کو رعمسیس ثانی نے اس لئے آباد کیا تھا کہ یہ مصر کی بحری جانب کے سینٹر میں بہترین قلعہ کا کام دے اور فیثوم کی آبادی کا بھی یہی مقصد تھا، اس شہر کی چہار دیواری کے جو کھنڈر معلوم ہوئے ہیں وہ بلاشبہ اس کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ دونوں شہر مصر کے بہترین حفاظتی قلعے تھے نہ کہ تورات کے بیان کے مطابق غلوں کے گودام۔

اس تمام قیل و قال کا مطلب یہ ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کو مصائب میں مبتلا کیا وہ یہی رعمسیس دوم ہو سکتا ہے، یہ مصر کے حکمرانوں کا اُنیسواں خاندان تھا، حضرت موسیٰ

اس کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور اُسی کی آغوش میں پرورش پائی، تاریخِ اثریات سے پتہ چلتا ہے کہ "ایسویہ" قبائل جو مصر کے قریب آباد تھے اُن کے اور فراعنہ کے اس خاندان کے درمیان پیہم نو سال تک سخت جنگ و پیکار رہی، بدیں وجہ یہ قرینِ قیاس ہے کہ رمسیس دوم نے اس خوف سے کہ کہیں بنی اسرائیل کا یہ عظیم الشان قبیلہ جو لاکھوں نفوس پر مشتمل تھا اندرونی بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے بنی اسرائیل کو اِن مصائب میں مبتلا کرنا ضروری سمجھا جن کا ذکر توراۃ اور قرآن حکیم میں کیا گیا ہے[1]

رمسیس دوم اس زمانہ میں بہت مُسن اور معمر ہو چکا تھا، اس لئے اُس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے منفتاح کو شریک حکومت کر لیا تھا، رمسیس کی ڈیڑھ سو اولاد میں سے یہ تیرھواں لڑکا تھا، لہذا منفتاح ہی وہ فرعون ہے جس کو حضرتِ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اسلام کی دعوت دی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا، اور اُسی کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے اور یہی غرقِ دریا ہوا، چونکہ اس نے حضرتِ موسیٰؑ کو اپنے گھر میں پرورش پاتے دیکھا تھا اس لئے جب حضرتِ موسیٰؑ نے اس کو اسلام کا پیغام سنایا تو قرآن عزیز کے ارشاد کے مطابق اس نے یہ طعنہ دیا:۔

اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ (شعراء)	کیا ہم نے اپنے یہاں تیرے بچپن میں تیری پرورش نہیں کی؟ اور تو اپنی عمر کے چند سال ہم میں بسر کر چکا ہے،

توراۃ میں ہے کہ خروج سے پہلے مصر کے بادشاہ کا انتقال ہو گیا، اُس سے مراد وہی رمسیس دوم ہے جو منفتاح کا باپ تھا۔

علامہ فلانڈرس نے ایک حجری کتبہ دریافت کیا ہے جس پر سیاہ حروف کندہ ہیں اور وہ ۱۸۹۹ء

[1] توراۃ سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے، اس میں کہا گیا ہے "اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں، آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاہدہ کریں تا یہ نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جائیں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں (خروج باب آیت ۱۰-۱۱)

مصری میں لکھا گیا ہے، یہ دراصل ایک بہت بڑی چٹان ہے جس کی بلندی ۳ میٹر[1] اور ۴۱ سم[2] ہے، یہ کتبہ "دو وجہ سے معرضِ تحریر میں آیا تھا، ایک یہ کہ اُن تمام تفصیلات کو بیان کیا جائے جو اٹھارھویں خاندان کے بادشاہ "امنحتب" نے "معبد امون" کی خدمات کے متعلق انجام دی تھیں، اور دوسرے یہ کہ انیسویں خاندان کے بادشاہ "منفتاح" بن رعمسیس دوم کی تعریف میں کچھ لکھا جائے، اس لئے اس کتبہ کی عبارت شاعرانہ اسلوب پر لکھی گئی ہے اور منفتاح نے لوبین پر جو فتح حاصل کی تھی اس کا بڑے فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور عسقلان جیرز، بانوعیم جو فلسطین کے علاقہ کے مشہور شہر تھے انکے سقوط کی جانب اشارات کئے گئے ہیں، اسی کے ضمن میں بنی اسرائیل کے متعلق بھی مختصر عبارت میں اظہارِ خیال کیا گیا اور یہ سب سے پہلا اثری نقش اور حضریاتِ مصری کا پہلا کتبہ ہے جس میں بنی اسرائیل کا صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:-

لقد محق بنو اسرائیل	بنی اسرائیل تمام ہلاک ہو گئے اور اب
ولم یبق لھم بذر۔	ان کی نسل کا خاتمہ ہو گیا۔

ایک باریک بیں اس عبارت کو دیکھ کر بآسانی یہ علم حاصل کر سکتا ہے کہ یہ تحریر منفتاح کے زمانے میں نہیں لکھی گئی ورنہ تو مصری دستور کے مطابق بنی اسرائیل جیسے عظیم الشان قبیلہ کی ہلاکت کے واقعہ کو اس معمولی اور مختصر الفاظ میں درج نہ کیا جاتا۔ بلکہ منفتاح کی شان میں بڑے زبردست قصیدہ کے ساتھ اس دشمن پر کامیابی کا اظہار کیا جاتا، اور جن واقعات پر اس کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے ان کی اہمیت اور عظمت کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ یونہی ضمنی طور پر اور وہ بھی سابق بادشاہ کے حالات سے متعلق کتبہ پر درج نہ کر دیئے جاتے بلکہ اُن اہم واقعات کیلئے منفتاح کے زمانہ میں مستقل الگ ایک کتبہ اسی غرض سے تحریر کیا جاتا۔

مگر ایسا کیوں نہ ہوا؟ سو بات بہت واضح ہے وہ یہ کہ مصری کاہنوں کو اس واقعہ ہائلہ

---

[1] ۱ میٹر = ۱.۰۹۳ گز [2] سم (سینٹی میٹر) میٹر ۱/۱۰۰ حصہ۔

کی ہرگز توقع نہ تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں غرقِ فرعون کی شکل میں ظاہر ہوا اور وہ منفتاح کی موت کے لئے اس عجلت کے متوقع نہ تھے، اس زمانہ کی عمرِ طبعی کے لحاظ سے ابھی کافی زمانہ تھا کہ منفتاح کے کاہن مصری دستور کے مطابق اس انیسویں خاندان کے بادشاہ کے ان حالات کو مرتب کر کے لوح پر محفوظ کر دیں تاکہ وہ بادشاہ کے مقبرہ پر کندہ ہو سکے، اب جبکہ یہ واقعہ ہائلہ پیش آ گیا تو اصل حقیقت کو چھپانے کی سعی کی گئی تاکہ آئندہ قبطی نسلیں اس ذلت و رسوائی کو معلوم نہ کر سکیں جو ان کے واجب الاحترام دینی عقائد پر خدا کی طرف سے سخت ضرب کا باعث بن چکی تھی۔ پس انھوں نے بیجا جسارت اور تاریکی بددیانتی کے ساتھ حالات کو منقلب کر کے معاملہ کو بالکل مخالف شکل میں تحریر کر دیا اور بنی اسرائیل کی کامیاب واپسیِ وطن کو ان مسطورۂ بالا الفاظ میں ظاہر کیا تاکہ غرقِ فرعون کا قصہ آئندہ مصریوں کے سامنے باقی ہی نہ رہے۔

اس نتیجہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مصری دستور کے مطابق ہر ایک بادشاہ کا مقبرہ جدا ہوتا تھا اور اس کے تمام حالات اور خصوصی نمایاں امتیازات کی تاریخ اور اس کے زمانہ کی بعض شاہی اشیاء اور جواہرات اس کی قبر کے ساتھ ہی محفوظ کر کے رکھے جاتے تھے، لیکن منفتاح کی اس شان کے باوجود جس کا مذکورۂ بالا کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ نہ اس کا علیحدہ مقبرہ بنایا گیا اور نہ وہ تمام رسوم انجام پا سکیں جو ہمیشہ بادشاہوں کیلئے ضروری سمجھی جاتی تھیں، بلکہ اس کو عجلت کے ساتھ امنحتب کے مقبرہ ہی میں دفن کر دیا گیا اور اٹھارھویں خاندان کے بادشاہ اور انیسویں خاندان کے بادشاہ کی نعشیں ایک ہی جگہ جمع کر دی گئیں۔[1]

مصری عجائب خانہ میں یہ نعش آج بھی محفوظ ہے اور قرآنِ عزیز کے اس کلامِ بلاغت نظام کی تصدیق کر رہی ہے۔

اَلْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ   پس آج کے دن ہم تیرے جسم کو (دریا سے) نجات

[1] قصص الانبیاء، نجار ص ۲۳۹، ۲۴۱۔

لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً   دیں گے تاکہ وہ تیرے بعد آنے والوں کیلئے (خدا کا) نشان رہے۔

اور محمد احمد عدوی کتاب " دعوۃ الرسل الی اللہ " میں لکھتے ہیں کہ اس نعش کی ناک کے سامنے کا حصہ ندارد ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حیوان کا کھایا ہوا ہے غالباً دریائی مچھلی نے خراب کیا ہے اور پھر اس کی نعش خدائی فیصلہ کے مطابق کنارہ پر پھینک دی گئی[1]

ان نقول کے لئے کسی شرح کی ضرورت نہیں ہے، البتہ یہ یورپ کے ان مقلدین کے لئے ضرور سرمایۂ صد عبرت ہیں جو جلد بازی کے ساتھ مستشرقین کی ہر ایک تحقیق پر بغیر کسی پس وپیش کے آمنا وصدقنا کہہ دینے کے عادی ہیں، جو قرآن اور خدا کے نبی کے احکام پر شک کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں مگر یورپین مورخین اور مستشرقین کی تحقیقات علمی کو وحی الٰہی سے زیادہ سمجھتے ہیں، جو اپنے علماء اسلام کی تقلید کو حرام جانتے مگر علماء یورپ کے ہر نوشتہ کو نوشتۂ الٰہی یقین کرتے ہیں۔

چنانچہ یورپ کے مورخین جدید نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰ (علیہما السلام) اور فراعنۂ مصر کے درمیان جو واقعات، تورات و قرآن عزیز سے ثابت ہوتے ہیں وہ تاریخی معیار پر اس لئے غلط اور بے اصل ہیں کہ مصری حضریات و اثریات میں ان اہم اور عظیم الشان حالات وواقعات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا، حالانکہ یہ مسلم ہے کہ مصری اپنی تاریخ کی تدوین میں بہت زیادہ چست وچالاک اور سب سے پیش پیش ثابت ہوئے ہیں اور آج ان کے اسی طرزِ عمل کی بدولت تین ہزار سال قبل مسیح کے حالات کی صحیح تاریخ مرتب ہو سکی ہے۔

تو اس دعویٰ کی کورانہ تقلید میں ہندوستان کے بعض یورپ زدہ مسلمانوں نے بھی ان واقعات کی صحت سے انکار کر دیا اور خدا کی سچی وحی سے اعراض کرتے ہوئے ان تخمینی قیاسات کو یقینی اور الہامی نوشتہ کی حیثیت دی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لیکن آج جبکہ مصری حضریات واثریات میں صراحت کے ساتھ اُس زمانہ کے فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت کا حال روشنی میں آچکا ہے اور مسطورۂ بالا ترتیبی واقعات خود بخود ان حقائق

[1] دعوۃ الرسل الی اللہ، ص ۱۸۱۔

کو سامنے لے آتے ہیں جن کا ذکر قرآنِ عزیز میں موجود ہے، تو اب نہ معلوم جلد بازی سے انکار کرنے والے اِن مدعیانِ علم کی علمی روش کیا صورت اختیار کرے گی؟ اپنی نادانی اور کورانہ تقلید کی پردہ دری کے خوف سے انکار پر اصرار یا حقیقت کے اقرار کے ساتھ ساتھ پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بتائی ہوئی راہِ یقین (وحیِ الٰہی) کے سامنے اظہارِ ندامت و تاسف؟

بہرحال وہ اپنا معاملہ جو کچھ بھی رکھیں یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اذعان اور یقین کی جو راہ وحیِ الٰہی یعنی قرآنِ عزیز کے ذریعہ حاصل ہو چکی ہے اس کو ذرہ برابر اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور استقراء و قیاس سے حاصل شدہ علم اُس وقت تک برابر گردش میں رہے گا جب تک قرآنی صداقت پر آکر نہ ٹھہر جائے۔

فرعون کا خواب تورات اور مؤرخین کہتے ہیں کہ فرعون کو بنی اسرائیل کے ساتھ اس لئے عداوت ہو گئی تھی کہ اس زمانہ کے کاہنوں، نجومیوں اور قیافوں نے اس کو بتایا تھا کہ تیری حکومت کا زوال ایک اسرائیلی لڑکے کے ہاتھ سے ہوگا اور بعض تاریخی روایات میں ہے کہ فرعون نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر دربار کے منجموں اور کاہنوں نے یہی دی تھی جس کا ذکر ابھی گذر چکا ہے، مفسرین نے بھی انہی روایات کو کتبِ تفسیر میں نقل فرمایا ہے، تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ فرعون نے دایہ مقرر کر دی تھیں کہ قلمروِ مصر میں جب اسرائیل کے یہاں لڑکا پیدا ہو اُس کو قتل کر دیا جائے مگر ان عورتوں کے دلوں میں ایسی ہمدردی پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس عمل کیلئے کوئی اقدام نہیں کیا، اور جب فرعون نے باز پُرس کی تو یہ معذرت پیش کی کہ اسرائیلی عورتیں شہری عورتوں کی طرح نازک اندام نہیں ہیں وہ خود ہی بچہ جن لیتی ہیں اور ہم کو اطلاع تک نہیں دیتیں، اس پر فرعون نے ایک جماعت کو اس لئے مقرر کیا کہ وہ تفتیش اور تلاش کے ساتھ اسرائیلی لڑکوں کو قتل کر دیں اور لڑکیوں کو چھوڑ دیا کریں [1]

حضرتِ موسیٰ اور ہارون کا ذکر قرآن میں قرآنِ عزیز میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بے شمار مقامات میں آیا ہے چونکہ اُن کے بیشتر حالات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک حالات سے

[1] خروج باب ۱-۱آیات ۱۵-۲۲-

بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں، اور ان واقعات میں غلامی اور آزادی، کے باہم معرکہ آرائی اور حق و باطل کے مقابلہ کی بے نظیر داستان ودیعت ہے، نیز ان کے اندر بصائر و مواعظ کا نادر ذخیرہ جمع ہے، اس لیے قرآنِ عزیز نے حسب ضرورت اور حسب موقع و محل جگہ جگہ اس قصہ کے اجزاء کو مجمل اور مفصل طریقہ پر بیان کیا ہے۔

مندرجۂ ذیل نقشہ سے "اعداد و شمار کے ساتھ ساتھ" اس واقعہ کی اہمیت کا بھی صحیح اندازہ ہو سکے گا اور اس اولو العزم پیغمبر کی عظمتِ شان کا بھی۔

اس نقشہ کے دو حصہ ہیں پہلے حصے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ اور حضرتِ ہارونؑ یا بنی اسرائیل اور فرعون کے واقعات کن کن سورتوں اور کتنی آیات میں مذکور ہیں، اور دوسرا حصہ یہ واضح کرتا ہے کہ قرآنِ عزیز میں حضرتِ موسیٰؑ اور حضرتِ ہارونؑ کے نامہائے مبارک کتنی جگہ مذکور ہیں اور اُن کی مجموعی تعداد کیا ہے؟

نقشہ (۱)

سورۃ	آیات	شمار	سورۃ	آیات	شمار
بقرۃ	۴۷ تا ۶۱، ۶۳ تا ۷۵، ۸۳ تا ۸۷،		ھود	۹۶ تا ۹۹، ۱۱۰	۱۵
	۹۲ تا ۹۳، ۱۰۸، ۱۳۶، ۲۴۳، ۲۵۱	۶۵	ابراھیم	۵، ۶، ۸	۳
نساء	۱۵۳ تا ۱۵۶، ۱۶۴	۱۲	نحل	۱۲۴	۱
مائدۃ	۱۲، ۱۳، ۲۰ تا ۲۵، ۳۲، ۴۵		بنی اسرائیل	۲ تا ۷، ۱۰۱ تا ۱۰۴	۱۱
	۷۰، ۷۱، ۷۸، ۷۹	۳۷	کہف	۶۰ تا ۸۲	۲۳
انعام	۸۴ تا ۹۰، ۱۴۶، ۱۵۴، ۱۸۹	۲۱	مریم	۵۱ تا ۵۳	۳
اعراف	۱۰۳ تا ۱۵۷، ۱۵۹ تا ۱۷۱	۶۷	طٰہٰ	۹۰ تا ۹۸	۹
انفال	۵۴	۱	انبیاء	۴۸، ۴۹	۲
یونس	۷۴ تا ۹۳	۲۰	مؤمنون	۴۵ تا ۴۹	۵

سورہ	آیات	شمار	سورہ	آیات	شمار
فرقان	۳۵-۳۶	۲	جاثیہ	۱۶، ۱۷	۲
شعراء	۱۰ تا ۶۶	۵۷	الذاریات	۳۸ تا ۴۰	۳
نمل	۷ تا ۱۴	۸	قمر	۴۱ تا ۵۵	۱۵
قصص	۳ تا ۴۸	۴۶	صف	۵	۱
عنکبوت	۳۹، ۴۰	۲	جمعہ	۵، ۶	۲
سجدہ	۲۳، ۲۴	۲	تحریم	۱۱	۱
احزاب	۶۹	۱	الحاقہ	۹، ۱۰	۲
الصّٰفّٰت	۱۱۴ تا ۱۲۲	۹	مزمّل	۱۵، ۱۶	۲
مؤمن	۲۳ تا ۴۵	۲۰	النّٰزعٰت	۱۵ تا ۲۵	۱۱
زخرف	۳۶ تا ۵۶	۲۱	فجر	۱۰ تا ۱۳	۴
دخان	۱۷ تا ۳۳	۱۷			۵۱۴

نقشہ (۲)

موسیٰ (علیہ السلام)		ہارون (علیہ السلام)		موسیٰ (علیہ السلام)		ہارون (علیہ السلام)	
سورۃ	شمار	سورۃ	شمار	سورۃ	شمار	سورۃ	شمار
بقرہ	۱۳	بقرہ	۱	یونس	۸	یونس	۱
نساء	۲	نساء	۱	ہود	۲	۰	۰
مائدہ	۲			ابراہیم	۳	۰	۰
انعام	۲	انعام	۱	بنی اسرائیل	۳	۰	۰
اعراف	۱۶	اعراف	۱	کہف	۲	۰	۰

موسیٰ (علیہ السلام)		ہارون (علیہ السلام)		موسیٰ (علیہ السلام)		ہارون (علیہ السلام)	
سورۃ	شمار	سورۃ	شمار	سورۃ	شمار	سورۃ	شمار
مریم	۱		۰	سجدہ	۱	۰	۰
طٰہٰ	۱۴	طٰہٰ	۳	احزاب	۱	۰	۰
انبیاء	۱	انبیاء	۱	صافّٰت	۲	۰	۰
مومنون	۲	مومنون	۱	مؤمن	۴	۰	۰
فرقان	۱	فرقان	۱	زخرف	۱	۰	۰
شعراء	۸	شعراء	۲	ذاریات	۱	۰	۰
نمل	۲		۰	صفّ	۱	۰	۰
قصص	۱۴	قصص	۱	النّازعات	۱	۰	۰

نسب وولادت حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کا نسب چند واسطوں سے حضرتِ یعقوبؑ تک پہنچتا ہے ان کے والد کا نام عمران اور والدہ کا نام یوکابد تھا، باپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

عمران بن قاہت بن لاوی بن یعقوب (علیہ السلام) اور حضرتِ ہارون (علیہ السلام) حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے حقیقی اور بڑے بھائی تھے۔

عمران کے گھر میں موسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت ایسے زمانہ میں ہوئی جبکہ فرعون اسرائیلی لڑکوں کے قتل کا فیصلہ کر چکا تھا اس لئے اُن کی والدہ اور اہلِ خاندان اُن کی ولادت کے وقت سخت پریشان تھے کہ کس طرح بچہ کو قاتلوں کی نگاہ سے محفوظ رکھیں؟ بہرحال جوں توں کر کے تین مہینہ تک اُن کو ہر ایک کی نگاہ سے اوجھل رکھا اور ان کی پیدائش کی مطلق کسی کو خبر نہ ہونے دی، لیکن جاسوسوں کی دیکھ بھال اور حالات کی نزاکت کی وجہ سے زیادہ دیر تک اس واقعہ کے پوشیدہ رہنے کی توقع نہ ہو سکی اور اس لئے اُن کی والدہ سخت پریشان رہنے لگیں، اس سخت اور نازک وقت میں آخر خدائے قدوس نے مدد کی اور موسیٰ (علیہ السلام) کی

والدہ کے دل میں یہ القا کیا کہ ایک تابوت کی طرح کا صندوق بناؤ جس پر رال اور روغن کی پالش کرو تاکہ پانی اندر اثر نہ کر سکے اور اس میں اس بچہ کو محفوظ رکھ دو اور پھر اس صندوق کو نیل کے بہاؤ پر چھوڑ دو۔[1]

موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ نے ایسا ہی کیا، اور ساتھ ہی اپنی بڑی لڑکی اور موسیٰ (علیہ السلام) کی ہمشیر کو مامور کیا کہ وہ اس صندوق کے بہاؤ کے ساتھ کنارے کنارے چل کر صندوق کو نگاہ میں رکھے اور دیکھے کہ خدا اُس کی حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا کرتا ہے، کیوں کہ موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کو خدائے تعالیٰ نے یہ بشارت پہلے ہی سنادی تھی کہ ہم اس بچہ کو تیری ہی جانب واپس کر دیں گے اور یہ ہمارا پیغمبر اور رسول ہوگا۔

فرعون کے گھر میں تربیت حضرتِ موسیٰؑ کی ہمشیر برابر صندوق کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ کنارے کنارے نگہداشت کرتی جارہی تھیں کہ انھوں نے دیکھا کہ صندوق تیرتے ہوئے شاہی محل کے کنارے آلگا اور فرعون کے گھرانے میں سے ایک عورت نے اپنے خادموں کے ذریعے اُس کو اُٹھوالیا اور شاہی محل میں لے گئی۔ حضرتِ موسیٰ کی ہمشیر یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور حالات کی صحیح تفصیل معلوم کرنے کے لئے شاہی محل کی خادماؤں میں شامل ہوگئیں۔

قرآنِ عزیز نے اس شاہی خاندان کی عورت کو فرعون کی بیوی بتایا ہے اور تورات کے حصۂ خروج[1] میں اُس کو فرعون کی بیٹی کہا ہے مگر مؤرخین اس اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اور کہتے ہیں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ پانی میں بہتے ہوئے صندوق کو فرعون کی بیٹی نے اٹھایا ہو اور پھر بیٹا بنانے کی آرزو، اور فرعون سے اس بچہ کے قتل نہ کرنے اور خود پالنے کی خواہش کا اظہار اور فرعون سے سفارش فرعون کی بیوی (آسیہ) نے کی ہو۔

قرآنِ کریم کے اسلوبِ بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کیوں کہ اُس نے موسیٰ کو دریا سے نکالنے والے کے متعلق کہا ہے "فَالْتَقَطَهُ اٰلُ فِرْعَوْنَ" (اس کو اٹھایا فرعون کے گھر والوں نے) اور بیٹا بنانے کی آرزو اور اس کے قتل نہ کرنے کی سفارش کرنے والے کے متعلق فرمایا وَقَالَتِ

[1] خروج ۲ آیت ۲۰۔

امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ " (اور فرعون کی بیوی نے کہا) حضرت ابن عباس رضؓ سے یہی منقول ہے۔[1]
بہرحال فرعون کے گھروالوں نے جب صندوق کھولا تو دیکھا کہ ایک حسین اور تندرست بچہ آرام سے لیٹا ہوا انگوٹھا چوس رہا ہے، فرعون کی بیٹی فوراً اُس کو محل میں لے گئی' فرعون کی بیوی نے بچہ کو دیکھا تو باغ باغ ہوگئی اور انتہائی محبت سے اُس کو پیار کیا، محل کے شاگرد پیشہ میں سے کسی نے کہا کہ یہ تو اسرائیلی معلوم ہوتا ہے اور ہمارے دشمنوں کے خاندان کا بچہ ہے اس کا قتل کردینا ضروری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی ہمارے خواب کی تعبیر ثابت ہو؟ اس بات کو سن کر فرعون کو بھی خیال پیدا ہوا، فرعون کی بیوی نے شوہر کے تیور دیکھے تو کہنے لگی کہ ایسے پیارے بچہ کو قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ میرے اور تیرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے، یا ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنالیں اور ہمارے لئے اس کا وجود نفع بخش ثابت ہو، یعنی اگر یہ وہی اسرائیلی بچہ ثابت ہو جو تیرے خواب کی تعبیر بننے والا ہے تو ہماری محبت اور آغوشِ تربیت شاید اس کو معزر ہونے کے بجائے مفید ثابت کردے، مگر فرعون اور اس کے خاندان کو یہ کیا معلوم کہ خدا کی تقدیر اُن پر ہنس رہی ہے کہ رب العالمین کی کرشمہ سازی دیکھو کہ تم اپنی نادانی اور بے خبری میں اپنے دشمن کی پرورش پر نگراں مقرر کئے گئے ہو۔

غرض اب یہ سوال پیدا ہوا کہ بچہ کے لئے دُودھ پلائی مقرر کی جائے مگر خدائے تعالیٰ نے موسیٰ کی والدہ سے کئے گئے وعدہ کو پورا کرنے کیلئے بچہ کی طبیعت میں یہ بات پیدا کردی کہ وہ کسی عورت کے پستان کو مُنہ ہی نہیں لگاتا، شاہی دایہ تھک کر بیٹھ گئی مگر موسیٰؑ نے کسی ایک پستان سے بھی دودھ نہ پیا، یہ سارا حال موسیٰؑ کی ہمشیر مریم دیکھ رہی تھیں، کہنے لگیں اگر اجازت ہو تو میں ایک ایسی دایہ کا پتہ بتاؤں جو نہایت نیک اور اس خدمت کے لئے بہت موزوں ہے بلکہ حکم ہو تو میں خود اس کو ساتھ لے کر آؤں؟ فرعون کی بیوی نے دایہ کو لانے کا حکم دے دیا، اور (موسیٰ علیہ السلام) کی ہمشیر خوش خوش گھر کو روانہ ہوئیں کہ والدہ کو لے کر آئیں۔

شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ موضح القرآن میں فرماتے ہیں ــــ "فرعون کی عورت تھی

[1] روح المعانی جلد ۲۰ سورۂ قصص۔

بنی اسرائیل میں کی، حضرت موسیٰ کے چچا کی بیٹی اس لفظ سے وہ پہچان گئی کہ لڑکا اُن کا ہے۔[1] یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا اُدھر بُرا حال تھا، ایک الہامی خیال سے بچہ کو سپردِ دریا تو کر آئیں مگر ماں کی ماتا نے زور کیا اور بے چین ہو کر اس پر آمادہ ہو گئیں کہ اپنے اس راز کو افشا کر دیں، اسی اضطراب و بے چینی کی حالت میں خدائے تعالےٰ نے اُن پر اپنے فضل و کرم کی بارش کی اور اُن کے قلب میں اطمینان و سکون نازل کیا، اب لطیفۂ غیبی کے انتظار میں چشم براہ تھیں کہ لڑکی نے آکر پوری داستان کہہ سنائی اور بتایا کہ جب موسیٰ نے کسی دایہ کا بھی دودھ نہ پیا تو میں نے کہا اسرائیلی قبیلہ میں ایک نہایت شریف اور نیک عورت ہے وہ اس بچہ کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کر سکتی ہے، فرعون کی بیوی نے یہ سُنکر مجھ کو حکم دیا ہے کہ فوراً آپ کو لیکر آؤں، یہ ہم پر خدا کا بڑا احسان اور فضل و کرم ہوا، اب تم چل کر اپنے بچہ کو سینے سے لگاؤ اور آنکھیں ٹھنڈی کرو اور اُس کا شکر ادا کرو کہ اُس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ	اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ پھر
فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ	جب تجھ کو ڈر ہو اُس کا تو ڈال دے اس کو دریا میں
وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ	اور نہ خطرہ کر اور نہ غمگین ہو، ہم پھر پہنچا دیں گے اس کو
اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○	تیری طرف اور کریں گے اس کو رسولوں سے، پھر
فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ	اُٹھا لیا اُس کو فرعون کے گھر والوں نے کہ ہو اُن کا
عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۭ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ	دشمن اور غم میں ڈالنے والا، بیشک فرعون اور ہامان
وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ○ وَقَالَتِ	اور اُن کے لشکر تھے چوکنے والے، اور بولی فرعون کی
امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّىْ وَلَكَ ۭ	عورت یہ تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لئے اور
لَا تَقْتُلُوْهُ ڰ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ	تیرے لئے اس کو مت مارو کچھ بعید نہیں جو ہمارے

[1] مفسرین نے فرعون کی اس بیوی کا نام "آسیہ" بتایا ہے اور قرآنِ عزیز امرأۃ فرعون کو مومنہ قرار دیتا ہے بایں ہمہ یہ قول کہ وہ اسرائیلی تھیں اور حضرت موسیٰ کی چچا زاد بہن، ضعیف ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ فرعون ہی کے خاندان کی تھیں۔ (روح المعانی جلد ۲۰ ص ۱)

اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَ	کام آئے یا ہم اس کو بنا لیں بیٹا، اور ان کو کچھ خبر
اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ	نہ تھی اور صبح کو موسیٰ کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا۔
لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا	قریب تھی کہ ظاہر کر دے بیقراری کو اگر ہم نہ مضبوط
لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ	کر دیتے اس کے دل کو تاکہ رہے یقین کرنیوالوں میں اور
قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ	کہہ دیا اس کی بہن کو پیچھے چلی جا، پھر دیکھتی رہی اسکو اجنبی
لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ	ہوکر اور ان کو خبر نہ ہوئی اور روک رکھا تھا ہم نے موسیٰ
مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ	سے دائیوں کو پہلے سے، پھر بولی میں بتاؤں تم کو ایک
بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝	گھر والے کہ اس کو پال دیں تمہارے لئے اور وہ اس کا
فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا	بھلا چاہنے والے ہیں، پھر ہم نے پہنچا دیا اُسکو اُسکی
تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ	ماں کی طرف کہ ٹھنڈی رہے اس کی آنکھ اور غمگین نہ ہو
وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (قصص ع)	اور جانے کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے پر بہت لوگ نہیں جانتے
وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۝	اور (تجھے معلوم ہے) ہم تجھ پر پہلے بھی ایک مرتبہ کیسا احسان کر چکے ہیں؟ ہم
اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۝	تجھے بتاتے ہیں، اس وقت کیا ہوا تھا۔ جب ہم نے تیری ماں کے دل میں
اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ	بات ڈال دی تھی، ہم نے اُسے سمجھایا تھا کہ بچہ کو ایک صندوق میں ڈال دے اور
فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ	صندوق کو دریا میں چھوڑ دے، دریا اُسے کنارے پر دھکیل دیگا، پھر اُسے
بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ	وہ اٹھا لے گا جو میرا (یعنی میری مسلم قوم کا) دشمن ہے نیز اس بچہ کا بھی دشمن
وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ	اور (اے موسیٰ!) ہم نے اپنے فضل خاص سے تجھ پر محبت کا سایہ ڈال دیا تھا
مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى	(کہ اجنبی بھی تجھ سے محبت کرنے لگے) اور یہ اسلئے تھا کہ ہم چاہتے تھے تو ہماری
عَيْنِيْ ۝ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ	نگرانی میں پرورش پائے، تیری بہن جب وہاں کو گذری تو (یہ ہماری ہی کارسازی
هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ	تھی کہ) اُس نے (فرعون کی لڑکی سے) کہا میں تمہیں ایسی عورت بتلا دوں
فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ	جو اُسے پالے پوسے؟ اور اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کی گود میں

عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ (طٰہٰ ع) لوٹا دیا کہ اُس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور (بچہ کی جدائی سے) غمگین نہ ہو۔

توارات میں ہے کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ نے موسیٰؑ کا دودھ چھڑایا تو انھوں نے اُن کو فرعون کی بیٹی کے سپرد کر دیا، اور اُس کے بعد عرصہ تک وہ شاہی محل میں زیرِ تربیت رہے اور وہیں نشوونما پائی، مگر توارات کا یہ کہنا واقعہ کے بالکل خلاف ہے کہ موسیٰؑ فرعون کی لڑکی کے بیٹے بنے۔

جب لڑکا بڑھا وہ اُسے فرعون کی بیٹی پاس لائی اور وہ اس کا بیٹا ٹھہرا اور اُس نے اس کا نام موسیٰ (عبرانی موشی) رکھا اور کہا اس سبب سے کہ میں نے اُسے پانی سے نکالا[1]

موسیٰؑ کا مصر سے نکلنا

حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) ایک عرصہ تک شاہی تربیت میں بسر کرتے کرتے شباب کے دَور میں داخل ہوئے تو نہایت قوی الجثہ اور بہادر جوان نکلے، چہرہ سے رعب ٹپکتا اور گفتگو سے ایک خاص وقار اور شانِ عظمت ظاہر ہوتی تھی، اُن کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اسرائیلی ہیں اور مصری خاندان سے اُن کا کوئی رشتۂ قرابت نہیں ہے، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ بنی اسرائیل پر سخت مظالم ہو رہے ہیں اور وہ مصر میں نہایت ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر اُن کا خون کھولنے لگتا اور موقعہ بہ موقعہ عبرانیوں کی حمایت و نصرت میں پیش پیش ہو جاتے۔

طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) جوان ہو گئے اور قوی ہیکل جوان ثابت ہوئے تو عبرانیوں کے معاملات میں اُن کی نصرت و حمایت کا یہ اثر ہوا کہ مصری گماشتوں کے مظالم عبرانیوں پر کم ہونے لگے[2]

اور اس میں شک نہیں کہ موسیٰ (علیہ السلام) کا بنی اسرائیل کی ذلت و غلامی پر غم و غصہ اور اُن کی حمایت و نصرت کا عمیق اور بے پناہ جذبہ ایک فطری اور قدرتی جذبہ تھا۔

اب اللہ تعالیٰ کے عطاء و نوال کا ہاتھ اور آگے بڑھا اور جسمانی طاقت و قوت کے ساتھ اس نے اُن کو زیورِ علم و حکمت سے بھی نوازا اور سنِ رُشد کو پہنچ کر اُن کی قوتِ فیصلہ اور دقتِ علم و نظر بھی عروج تک پہنچ گئے اور اس طرح اُن کو جسمانی و روحانی تربیت کا کمال حاصل ہو گیا۔

[1] خروج باب ۱۔ آیت ۱۰۔ [2] طبری جلد ص۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَاسْتَوٰٓی اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا اور جب (موسیٰ) پہنچا اپنے زور پر اور سنبھالا تو بخشا ہم نے اسکو (قوتِ)
وَّعِلْمًا وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (قصص ع) فیصلہ اور علم اور اس طرح ہم نکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔

غرض موسیٰؑ شہر میں گشت کرتے ہوئے اکثر ان حالات کا مشاہدہ کرتے رہتے اور گاہے گاہے بنی اسرائیل کی مدد کرتے۔

ایک مرتبہ شہری آبادی سے ایک کنارہ جارہے تھے کہ دیکھا ایک مصری ایک اسرائیلی کو بیگار کے لئے گھسیٹ رہا ہے، اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو لگا فریاد کرنے اور مدد چاہنے، حضرتِ موسیٰؑ کو مصری کی اس جابرانہ حرکت پر سخت غصہ آیا اور اس کو باز رکھنے کی کوشش کی، مگر مصری نہ مانا، موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں آکر ایک طمانچہ رسید کر دیا، مصری اس ضرب کو برداشت نہ کرسکا اور اُسی وقت مر گیا، حضرتِ موسیٰؑ نے یہ دیکھا تو بہت افسوس کیا کیوں کہ اُن کا ارادہ ہرگز اُس کے قتل کا نہ تھا، اور ندامت وشرمندگی کے ساتھ دل میں کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ کارِ شیطان ہے، وہی انسان کو ایسی غلط راہ پر لگاتا ہے، اور خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں عرض کرنے لگے کہ یہ جو کچھ ہوا نادانستگی میں ہوا، میں تجھ سے مغفرت کا خواستگار ہوں، خدا نے بھی اُن کی غلطی کو معاف کر دیا اور مغفرت کی بشارت سے نوازا۔ ادھر شہر میں مصری کے قتل کی خبر شائع ہوگئی مگر قاتل کا کچھ پتہ نہ چلا، آخر مصریوں نے فرعون کے پاس استغاثہ کیا کہ یہ کام کسی اسرائیلی کا ہے لہٰذا آپ دادرسی فرمائیے، فرعون نے کہا کہ اس طرح ساری قوم سے تو بدلہ نہیں لیا جاسکتا تم قاتل کا پتہ لگاؤ، میں ضرور اُس کو کیفرِ کردار تک پہنچاؤں گا۔

سوءِ اتفاق کہئے یا حسنِ اتفاق کہ دوسرے دن بھی حضرتِ موسیٰؑ شہر کے آخری کنارہ پر سیر فرما رہے تھے کہ دیکھا وہی اسرائیلی ایک قبطی سے جھگڑ رہا ہے اور قبطی غالب ہے، موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر کل کی طرح آج بھی اُس نے فریاد کی اور دادرسی کا خواستگار ہوا۔

اس واقعہ کو دیکھ کر حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے دوہری ناگواری محسوس کی، ایک جانب قبطی کا ظلم تھا اور دوسری جانب اسرائیلی کا شور وغوغا اور گذشتہ واقعہ کی یاد تھی اُسی جھنجلاہٹ

میں ایک طرف انھوں نے مصری کو باز رکھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی اسرائیلی کو بھی جھڑکتے ہوئے فرمایا "اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ" "تو بھی بلاشبہ کھُلا ہوا گمراہ ہے، یعنی خواہ مخواہ جھگڑا مول لے کر داد فریاد کرتا رہتا ہے۔

اسرائیلی نے حضرتِ موسیٰؑ کو ہاتھ بڑھاتے اور پھر اپنے متعلق ناگوار اور تلخ الفاظ کہتے سُنا تو یہ سمجھا کہ یہ مجھ کو مارنے کے لئے ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور مجھ کو گرفت میں لینا چاہتے ہیں، اس لئے شرارت آمیز انداز سے کہنے لگا۔

اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا	جس طرح تو نے کل ایک جان (قبطی) کو ہلاک کر دیا تھا
قَتَلْتَ نَفْسًاۢ بِالْاَمْسِ	اسی طرح آج مجھ کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔

مصری نے جب یہ سُنا تو اُسی وقت فرعونیوں سے جاکر ساری داستان کہہ سُنائی انھوں نے فرعون کو اطلاع دی کہ مصری کا قاتل موسیٰ ہے، فرعون نے یہ سنا تو جلاّد کو حکم دیا کہ موسیٰ کو گرفتار کر کے حاضر کرے، مصریوں کے اس مجمع میں ایک معزز مصری وہ بھی تھا جو دل وجان سے حضرتِ موسیٰؑ سے محبت رکھتا اور اسرائیلی مذہب کو حق جانتا تھا، یہ فرعون ہی کے خاندان کا فرد تھا اور دربار کا حاضر باش، اُس نے فرعون کا یہ حکم سنا تو فرعونی جلاّدوں سے پہلے ہی دربار سے نکل کر دوڑتا ہوا حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان سے سارا قصّہ بیان کیا، اور ان کو مشورہ دیا کہ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ خود کو مصریوں سے نجات دلائیے اور کسی ایسے مقام میں ہجرت کر جائیے جہاں ان کی دسترس نہ ہو سکے، حضرتِ موسیٰؑ نے اس کے مشورہ کو قبول فرمایا اور ارضِ مدین کی جانب خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

اس مقام پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ قرآنِ عزیز نے اس شخص کے متعلق صرف اس قدر کہا ہے:

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى • اور شہر کے آخری کنارہ سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔

مگر ہم نے اس کے اوصاف میں "شریف" اور "معزز" کا اضافہ کر دیا تو بقولِ نجّار اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے اس آنے والے شخص کے متعلق دو صفات بیان کی ہیں

(۱) وہ شہر کے آخری کنارے سے آیا تھا، اور عرب میں یہ مثل مشہور ہے کہ "الاطراف سکنی الاشراف" (شہر کے کنارے شرفاء کے رہنے کی جگہ ہیں)

(۲) اُس نے آکر حضرتِ موسیٰؑ سے یہ کہا اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ" (بھری جماعت تیرے قتل کا مشورہ کر رہی ہے) اور یہ ظاہر ہے کہ یہ علم اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو فرعون اور اس کے ارکان کے درمیان نمایاں حیثیت رکھتا ہو۔[1]

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۚ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۖ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۖ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ قَالَ رَبِّ بِمَا اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ۝ فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ۖ قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝ فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ

اور آیا شہر کے اندر جس وقت بے خبر ہوئے تھے وہاں کے لوگ، پھر پائے اس میں دو مرد لڑتے ہوئے یہ ایک اس کے رفیقوں میں اور یہ دوسرا اس کے دشمنوں میں، پھر فریاد کی اس سے اُس نے جو تھا اس کے رفیقوں میں اس کے مقابلہ میں جو تھا اس کے دشمنوں میں پھر مُکّا مارا اس کو موسیٰؑ نے پھر اس کو تمام کر دیا، بولا یہ ہوا شیطان کے کام سے بیشک وہ دشمن ہے بہکانے والا صریح موسیٰؑ بولا! اے میرے رب میں نے برا کیا اپنا سو بخش مجھ کو، پھر اس کو بخش دیا بیشک وہی ہے بخشنے والا مہربان بولا اے رب جیسا تو نے فضل کر دیا مجھ پر پھر میں کبھی نہ ہوں گا مددگار گناہگاروں کا، پھر صبح کو اٹھا اس شہر میں ڈرتا ہوا انتظار کرتا ہوا پھر ناگہاں دیکھا جس نے کل مدد مانگی تھی وہ آج پھر فریاد کرتا ہے، اُس سے کہا موسیٰؑ نے بیشک بے راہ ہے تو صریح، پھر جب چاہا کہ ہاتھ ڈالے اس پر جو دشمن تھا اُن دونوں کا، بول اٹھا فریادی کرنے والا اے موسیٰ کیا تو چاہتا ہے کہ خون کرے میرا جیسے خون کر چکا

[1] قصص الانبیاء ص ۱۹۷۔

اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِى الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ	کل ایک جان کا، تیرا یہی جی چاہتا ہے کہ زبردستی کرتا پھرے
اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝ وَجَآءَ رَجُلٌ	ملک میں اور نہیں چاہتا کہ ہو صلح کرا دینے والا، اور
مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰى	آیا شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا، کہا
اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ	اے موسیٰؑ! دربار والے مشورہ کرتے ہیں تیرے متعلق کہ
اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ فَخَرَجَ مِنْهَا	تجھ کو مار ڈالیں سو نکل جا میں تیرا بھلا چاہنے والا
خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىْ مِنَ الْقَوْمِ	ہوں، پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا راہ دیکھتا، بولا:
الظّٰلِمِيْنَ ۝ (قصص ع)	اے رب بچا لے مجھ کو اس قوم بے انصاف سے۔
وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ	اور تو نے ایک شخص کو مار ڈالا پھر ہم نے تجھ کو غم
وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۝ (طٰہٰ)	سے نجات دی اور جانچا تجھ کو معمولی جانچنا۔

اس مقام پر قرآنِ عظیم اور تورات کے بیانات میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے:

(۱) قرآنِ حکیم نے دوسرے دن کے جھگڑا کرنے والوں میں سے ایک کو عبرانی بتایا ہے اور دوسرے کو مصری (فرعونی) اور تورات دونوں کا عبرانی ہونا ظاہر کرتی ہے۔

(۲) تورات میں اس شخص کا کوئی ذکر نہیں ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعونیوں کے مشورہ کی اطلاع دی تھی۔

مگر ان دونوں باتوں کے متعلق (بلا لحاظ جانبداری) عقل اور فطرت اسی جانب رہنمائی کرتی ہے کہ قرآنِ عزیز کی تفصیلات صحیح ہیں، اور اسی پر یقین رکھنا ضروری ہے، اسلئے کہ فرعون اور فرعونیوں کے نزدیک تو اسرائیلیوں کی جان کی کوئی وقعت ہی نہ تھی کہ موسیٰ (علیہ السلام) جیسے شاہی خاندان میں رہنے والے شخص کے مقابلہ میں قصاص کے طالب ہوتے اور دوسری بات تورات کے بیان پر ایک فطری اضافہ ہے جو علم و یقین کے ساتھ کیا گیا۔

موسیٰؑ اور ارضِ مدین | حضرت شعیب (علیہ السلام) کے واقعات میں "مدین" کے متعلق بہت

کچھ لکھا جا چکا ہے، حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے جب مصر سے روانہ ہونے کا ارادہ کیا تو اسی جگہ کو منتخب فرمایا، مدین کی آبادی مصر سے آٹھ منزل پر واقع تھی[۱]۔ غالباً یہ انتخاب اس لئے کیا گیا کہ یہ قبیلہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) سے نزدیک کی قرابت رکھتا تھا اسلئے کہ حضرتِ موسیٰؑ، حضرتِ اسحٰق بن ابراہیم (علیہما السلام) کی نسل سے ہیں اور یہ قبیلہ اسحٰقؑ کے بھائی مدین بن ابراہیم (علیہ السلام) کی نسل سے ہے۔

حضرتِ موسیٰؑ چونکہ فرعون کے خوف سے بھاگے تھے اس لئے اُن کے ہمراہ نہ کوئی رفیق اور رہنما تھا اور نہ زادِ راہ، اور تیز روی کی وجہ سے برہنہ پا تھے، طبری بروایتِ سعید بن جُبیرؓ لکھتے ہیں کہ اس تمام سفر میں موسیٰ (علیہ السلام کی خوراک درختوں کے پتوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھی، اور برہنہ پا ہونے کی وجہ سے سفر کی طوالت نے پاؤں کے تلووں کی کھال تک اُڑا دی تھی، اس پریشان حالی میں موسیٰ (علیہ السلام) ارضِ مدین میں داخل ہوئے[۲]،

ماءِ مدین | جب مدین کی سرزمین میں قدم رکھا تو دیکھا کہ کنوئیں کے سامنے پانی کے حوض (پیاؤ) پر بھیڑ لگی ہوئی ہے اور جانوروں کو پانی پلایا جا رہا ہے مگر اس جماعت سے ذرا فاصلہ پر دو لڑکیاں کھڑی ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پر جانے سے روک رہی ہیں۔

حضرتِ موسیٰؑ سمجھ گئے کہ یہاں بھی وہی سب ہو رہا ہے جو دنیا کی ظالم طاقتوں نے اختیار کر رکھا ہے اور خدائے برتر کے بہترین قانون کو توڑ کر قوموں کا سارا نظام ظلم کی بنیادوں پر قائم کر دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیاں کمزور اور ضعیف گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں تب ہی تو اس انتظار میں ہیں کہ قوی اور سرکش جب اپنے جانوروں کو سیراب کر چکیں اور ہر وارد و صادر پانی پر سے چلا جائے تو بچا کھچا پانی ان کے جانوروں کا حصہ بنے، ہر قوی نے ضعیف کے لئے یہی قانون تجویز کر دیا ہے کہ ہر فائدے میں وہ مقدم ہے اور ضعیف مؤخر، اور قوی کا "اوّلش خور" عرب کا مشہور شاعر عمرو بن کلثوم کہتا ہے:

---

[۱] طبری عن سعید بن جُبیرؓ جلد ۱ ص ۲۰۵۔ [۲] تاریخ طبری جلد اوّل ص ۲۰۵۔

وَنَشْرَبُ اِنْ وَرَدْنَا الْمَاءَ صَفْوًا   وَيَشْرَبُ غَيْرُنَا كَدِرًا وَّطِيْنًا

اور ہم جب کسی پانی پر آتے ہیں تو عمدہ اور صاف پانی ہمارے حصہ میں آتا ہے اور ہمارے غیروں کے (جو ہم سے کمزور ہیں) حصہ میں گدلا پانی اور مٹی ہے۔

درحقیقت یہ شعر تنہا عمرو بن کلثوم اور اس کے قبیلے کی حالت کا نقشہ نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے ظالمانہ نظام کا ٹھیک ٹھیک آئینہ دار ہے۔

بہرحال حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) سے یہ حالت نہ دیکھی گئی اور آگے بڑھ کر لڑکیوں سے دریافت کیا "تم کیوں پانی نہیں پلاتیں، پیچھے کس لئے کھڑی ہو؟ دونوں نے جواب دیا "ہم مجبور ہیں اگر جانوروں کو آگے لے کر بڑھتے ہیں تو یہ طاقتور زبردستی ہم کو پیچھے ہٹا دیتے ہیں، اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں اُن میں اب یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کی مزاحمت کو دور کر سکیں، پس جب یہ سب پانی پلا کر واپس ہو جائیں گے تب بچا ہوا پانی ہم پلا کر لوٹینگے، یہی ہمارا روز کا دستور ہے۔

حضرتِ موسیٰؑ کو جوش آگیا اور آگے بڑھ کر تمام بھیڑ کو چیرتے ہوئے کنوئیں پر جا پہنچے اور کنوئیں کا بڑا ڈول اُٹھایا اور تنہا کھینچ کر لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی پلا دیا۔ حضرت موسیٰؑ جب مجمع کو چیرتے ہوئے دندانہ گھسنے لگے تو اگرچہ لوگوں کو ناگوار گذرا مگر اُن کی پُرجلال صورت اور جسمانی طاقت سے مرعوب ہو گئے اور ڈول کو تنہا کھینچتے دیکھ کر اسی قوت سے ہار مان گئے جس کے بل بوتے پر کمزوروں اور ناتوانوں کو پیچھے ہٹا دیا کرتے اور ان کی حاجات کو پامال کرتے رہتے تھے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے دیکھا کہ کنوئیں کے مُنہ پر بہت بڑا پتھر ڈھکا ہوا ہے جو ایک جماعت کے متفقہ زور لگانے سے اپنی جگہ سے ہٹتا ہے، مگر وہ آگے بڑھے اور تنہا اس کو ہٹا کر لڑکیوں کے مویشیوں کے لئے پانی بھر دیا، عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ یہ قول قرآنِ حکیم کی تصریح کے خلاف ہے، قرآن کہتا ہے :-

وَلَمَّا وَرَدَ مَاۤءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۝ (قصص ۳) — اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچے تو اُس پر ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ پانی پلا رہی ہے۔

تو پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ کنوئیں کا منہ پتھر سے ڈھکا ہوا ہو اور جس طرح یہ قول صحیح نہیں ہے اسی طرح یہ تاویل بھی درست نہیں ہے کہ اس مقام پر دو کنوئیں تھے ایک سے مدین کے لوگ پانی پلا رہے تھے اور دوسرے کا منہ پتھر سے ڈھکا ہوا تھا اور یہ کہ اس زمانہ میں بھی اس مقام پر دو کنوئیں موجود پائے گئے ہیں۔

اس تاویل کے درست نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو قرآنِ حکیم نے دوسرے کنوئیں کا قطعی کوئی ذکر نہیں کیا اور جو کچھ بیان کیا ہے ایک ہی سے متعلق بیان کیا ہے، دوسرے بعد میں اس جگہ دو کنوئیں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس وقت بھی وہاں اسی طرح دو کنوئیں موجود تھے، ہو سکتا ہے کہ عرصہ دراز کے بعد یا اسلامی عہد میں ضرورت کے لحاظ سے یہاں دوسرا کنواں تیار کیا گیا ہو، پس قرآنِ حکیم کے صاف اور سادہ بیان کو محض ایک غیر مستند روایت کی خاطر پیچیدہ بنانا قطعی بے محل اور غیر مناسب ہے۔

غرض جب ان لڑکیوں کے گلّے نے پانی پی لیا تو وہ گھر کو واپس چلیں، گھر پہنچیں تو خلافِ عادت جلد واپسی پر اُن کے والد کو سخت تعجب ہوا، دریافت کرنے پر لڑکیوں نے گذرا ہوا ماجرا کہہ سنایا کہ کس طرح ایک مصری" نے اُن کی مدد کی، باپ نے کہا عجلت سے جاؤ اور اسکو میرے پاس لیکر آؤ۔

یہاں تو باپ بیٹی کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی اور اُدھر حضرتِ موسیٰؑ پانی پلانے کے بعد قریب ہی ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر ستانے لگے، مسافرت و غربت اور پھر بھوک پیاس حضرتِ موسیٰؑ نے دعا کی "پروردگار! اس وقت جو بھی بہتر سامان میرے لئے تو اپنی قدرت سے نازل کرے میں اس کا محتاج ہوں۔"

لڑکی تیزی سے وہاں پہنچی تو دیکھا کہ کنوئیں کے قریب ہی وہ بیٹھے ہوئے ہیں شرم وحیا کے ساتھ نیچی نظریں کئے لڑکی نے کہا "آپ ہمارے گھر چلئے، والد بلاتے ہیں، وہ آپکے اس

احسان کا بدلہ دیں گے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے سوچا کہ شاید اس سلسلہ میں کوئی بہتر صورت نکل آئے اس لئے چلنا ہی بہتر ہے اور اس کی دعوت کو رَد کرنا مناسب نہیں، خدا نے میری دعا سُن لی اور یہ اُسی کا پیش خیمہ ہے، حضرتِ موسیٰ اُٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکی کو ہدایت کی کہ وہ آگے نہ چلے بلکہ میرے پیچھے پیچھے چلے اور ٹھکری یا اشارے کے ساتھ راہ کی رہنمائی کرے۔

موسیٰ (علیہ السلام) چل تو پڑے لیکن طبعی اور فطری غیرت اور عزتِ نفس کے پیش نظر بار بار اس جملہ سے متاثر ہو رہے تھے "میرا باپ تم کو اس محنت کا عوض دینا چاہتا ہے" مگر مسافرت اور حالات کی نزاکت نے آخر یہی مشورہ دیا کہ اس وقت اس گرانی کو بھی انگیز کر لو تاکہ اس غربت میں ایک غمخوار اور مونس و ہمدم کی مستقل ہمدردی کو حاصل کیا جا سکے۔

حضرتِ موسیٰ چلتے چلتے منزلِ مقصود پر پہنچے اور اس بزرگ صورت و سیرت انسان کی خدمت میں حاضر ہو کر شرفِ ملاقات سے بہرہ اندوز ہوئے، بزرگ نے پہلے کھانا کھلایا اور پھر اطمینان کے ساتھ بٹھا کر اُن کے حالات سُنے حضرتِ موسیٰ نے من وعن اپنی ولادت اور فرعون کے بنی اسرائیل پر مظالم سے شروع کر کے آخر تک ساری داستان کہہ سنائی، سب کچھ سُننے کے بعد بزرگ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو تسلی دی اور فرمایا کہ خدا کا شکر کرو کہ اب تم کو ظالموں کے پنجہ سے نجات مل گئی اب کوئی خوف کا مقام نہیں ہے۔

یہاں قومِ ظالمین کے ظلم سے بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل اور اُن کی غلامی و تباہ حالی کے واقعات ہی مراد ہو سکتے ہیں، نیز اُن کا کفر اور فساد فی الارض، ورنہ تو قبطی کے قتل میں تو خود موسیٰ (علیہ السلام) بھی اپنے فعل پر نادم تھے اور خود کو قصور وار سمجھتے تھے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى	اور جب مُنہ کیا مدین کی سیدھ پر بولا امید ہے کہ میرا رب
رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ وَلَمَّا	لیجائے مجھ کو سیدھی راہ پر اور جب پہنچا مدین کے پانی
وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ	پر پایا وہاں ایک جماعت کو لوگوں کی پانی پلاتے
النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۫ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ	ہوئے اور پایا اُن سے ورے دو عورتوں کو

امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ
قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا
شَيْخٌ كَبِيْرٌ ۝ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ
فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ
فَقِيْرٌ ۝ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى
اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِىْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ
اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ
الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٚ نَجَوْتَ مِنَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (قصص ع ۳)

کہ روکے ہوئے کھڑی تھیں اپنی بکریاں بولا تمہارا کیا حال ہے، بولیں
ہم نہیں پلاتیں پانی چرواہوں کے پھیر لیجانے تک اور ہمارا باپ
بوڑھا ہے بڑی عمر کا پھر اس نے پانی پلا دیا اس کے جانوروں
کو، پھر ہٹ کر آیا چھاؤں کی طرف، بولا اے رب تو جو چیز
اتارے میری طرف اچھی میں اس کا محتاج ہوں، پھر آئی
اُس کے پاس اُن دونوں میں سے ایک چلتی تھی شرم سے
بولی میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے کہ بدلے میں دے حق اس کا کہ تو نے
پانی پلا دیا ہمارے جانوروں کو، پھر جب پہنچا اُسکے پاس اور بیان
کیا اس سے احوال کہا مت ڈر بچ آیا تو اس قوم بے انصاف سے

توراۃ میں اس موقعہ پر بھی دو جگہ اختلاف موجود ہے۔

(۱) وہ لڑکیوں کی تعداد دو کی جگہ سات بتاتی ہے۔

(۲) اس کا بیان ہے لڑکیوں نے حوض کو پانی سے بھر لیا تھا مگر دوسرے لوگوں نے زبردستی ان کو ہٹا کر اپنے جانوروں کو پانی پلانا شروع کر دیا، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ کو غصہ آیا۔

ہم کو اس موقعہ پر بھی قرآنِ عزیز کے بیان پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے اوّل اس لئے کہ سابق اختلافات میں قرآنِ عزیز کے بیانات کی روش عقل اور فطرت کے مطابق رہی ہے، دوسرے اس لئے کہ اس جگہ بھی تعداد کے معاملہ سے قطع نظر توراۃ کی دوسری بات اس لئے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ لڑکیاں مدین ہی کے قبیلہ اور اُن ہی کی بستی کی ساکن تھیں اور پانی کا معاملہ روزانہ ہی ان کے ساتھ پیش آتا رہتا تھا، لہٰذا اُن کو یہ معلوم تھا کہ یہ قوی گروہ کسی حالت میں بھی ہم کو پیش قدمی نہیں کرنے دے گا، اور عرب کے شعراء کے کلام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پانی کے معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ ان کے یہاں قوی کو ضعیف پر ترجیح حاصل تھی، اور عرب کے ماسواء دنیا کے ہر گوشہ میں یہی حال تھا، تو وہ کیسے اس اقدام کی جرأت کر سکتی تھیں، صحیح بات یہی ہے کہ

وہ ضعیف گھرانے کی فرد ہونے اور پھر عورت ہونے کی وجہ سے اسی پر اکتفا کرتی تھیں کہ جب سب پانی پلا کر واپس ہو جائیں تو بچے ہوئے پانی سے یہ فائدہ اٹھالیں اور بس۔

رہا لڑکیوں کی تعداد کا معاملہ سو ابنِ کثیر (رحمۃ اللہ) نے ہر دو اقوال کی مطابقت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مدین کے اس بزرگ کے سات لڑکیاں ہوں جیسا کہ تورات میں مذکور ہے مگر مدین کے پانی پر جو واقعہ پیش آیا اس میں صرف دو لڑکیاں ہی موجود تھیں جیسا کہ قرآنِ حکیم کی تصریح سے ظاہر ہوتا ہے۔

شیخ سے رشتۂ مصاہرت | حضرتِ موسیٰ اور قبیلۂ مدین کے بزرگ میزبان کے درمیان یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اس لڑکی نے جو موسیٰ کو بلانے گئی تھی اپنے باپ سے کہا، اے باپ! آپ اس مہمان کو اپنے مویشیوں کے چرانے اور پانی مہیا کرنے کے لئے اجیر رکھ لیجئے، اجیر وہی بہتر ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔

مفسرین کہتے ہیں کہ باپ کو لڑکی کی یہ گفتگو عجیب سی معلوم ہوئی اور اس نے دریافت کیا، "تجھ کو اس مہمان کی قوت وامانت کا حال کیا معلوم؟" لڑکی نے جواب دیا "میں نے مہمان کی قوت کا اندازہ تو اس سے کیا کہ کنوئیں کا بڑا ڈول (چرس) اس نے تنہا بھر کر کھینچ لیا، اور امانت کی آزمائش اس طرح کی کہ جب میں اُس کو بلانے گئی تو اُس نے مجھے دیکھ کر نیچی نظریں کر لیں، اور گفتگو کے دوران میں ایک مرتبہ بھی میری طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا، اور جب یہاں آنے لگا تو مجھ کو پیچھے چلنے کو کہا اور خود آگے آگے چلا، اور صرف اشاروں سے میں اسکی رہنمائی کرتی رہی[1]۔

بزرگ باپ نے بیٹی کی اِن باتوں کو سُنا تو بہت مسرور ہوئے اور حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا کہ اگر تم آٹھ سال تک میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراؤ تو میں اپنی اِس بیٹی کی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں اور اگر تم اس مدت کو دو سال بڑھا کر دس سال کر دو تو اور بھی بہتر ہے، یہی اس لڑکی کا مہر ہوگا، حضرتِ موسیٰ نے اس شرط کو منظور کر لیا اور فرمایا کہ یہ میری خوشی پر چھوڑ دیئے کہ میں ان دونوں مدتوں میں سے جس کو چاہوں پورا کر دوں، آپ کی جانب سے مجھ پر اس بارہ میں

[1] تفسیر ابن جریر سورۂ قصص۔

کوئی جبر نہ ہوگا۔ طرفین کی اس باہمی رضامندی کے بعد بزرگ میزبان نے اس بیان کردہ مدت کو مہر قرار دے کر موسیٰ علیہ السلام سے اپنی اس بیٹی کی شادی کر دی۔

اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدت ختم ہونے پر "عقد" عمل میں آیا، اور عقد کے فوراً بعد ہی موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو لے کر روانہ ہو گئے، مفسرین نے حضرتِ موسیٰ کی بیوی کا نام "صفورہ" بتایا ہے۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝ (ع قصص)	بولی اُن دونوں میں سے ایک اے باپ اسکو نوکر رکھ لے، البتہ بہتر نوکر جس کو تو نوکر رکھنا چاہے وہ ہے جو زوردار ہو امانت دار، کہا میں چاہتا ہوں کہ بیاہ دوں تجھ کو ایک بیٹی اپنی ان دونوں میں سے اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس، پھر اگر تو پورے کر دے دس برس تو وہ تیری طرف سے ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر تکلیف ڈالوں تو پائے گا مجھ کو اگر اللہ نے چاہا نیک بختوں سے، بولا یہ وعدہ ہو چکا میرے اور تیرے بیچ جونسی مدت ان دونوں میں پوری کر دوں سو زیادتی نہ ہو مجھ پر اور اللہ پر بھروسہ ہے اس چیز کا جو ہم کہتے ہیں۔
فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ۝ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ۔ (طٰہٰ ع)	پھر تو نے مدین میں چند سال قیام کیا، پھر تو اے موسیٰ مقررہ اندازہ پر پورا اُتر آیا اور میں نے تجھ کو اپنے لئے (اپنے خاص کام کے لئے) بنایا ہے۔

موسیٰ (علیہ السلام) کے خُسر کون ہیں؟

قرآن عزیز نے حضرتِ موسیٰ اور مدین کے شیخ کے متعلق جو واقعات بیان کئے ہیں اُن میں کسی ایک جگہ بھی اس شیخ کا نام نہیں بتایا، اس لئے تاریخی حیثیت سے شیخ مدین کے نام میں مؤرخین و مفسرین کے مختلف اقوال پائے جاتے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مفسرین اصحاب سیر اور ادباءِ عرب کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ یہ حضرتِ شعیب (علیہ السلام) ہیں، یہ قول بہت مشہور اور شائع ذائع ہے۔

مشہور مفسر امام ابن جریر طبریؒ نے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے "لوگ کہتے ہیں کہ صاحبِ موسیٰؑ حضرتِ شعیب (علیہ السلام) ہیں"[۱]

اور حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ حسن بصریؒ اسی طرف مائل ہیں کہ مدین کے شیخ حضرتِ شعیب (علیہ السلام) ہیں اور فرماتے ہیں کہ ابن ابی حاتم نے سلسلۂ سند کے ساتھ مالک بن انسؓ سے روایت نقل کی ہے "کہ اُن کو یہ بات پہنچی ہے کہ صاحبِ موسیٰؑ حضرتِ شعیبؑ ہیں"[۲]

(۲) ایک جماعت کہتی ہے کہ شیخ کا نام "یثرون" تھا اور یہ حضرتِ شعیب (علیہ السلام) کے بھتیجے تھے، طبری نے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے کہ ابو عبیدہ فرماتے تھے کہ جس نے حضرتِ موسیٰؑ کو اجیر بنایا وہ شعیب علیہ السلام کا برادر زادہ یثرون تھا"[۳]

(۳) بعض کہتے ہیں کہ صاحبِ موسیٰؑ کا نام "یثری" تھا، طبری نے سند کے ساتھ حضرتِ ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ موسیٰؑ کو اجیر رکھنے والا مدین کا شیخ "یثری" نامی تھا، اور اسی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں "عورت کے والد کا نام "یثری" تھا مگر یثری والی روایت میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ حضرتِ شعیبؑ کا برادر زادہ تھا[۴]۔ اور توراۃ نے اسی سے ملتا جلتا نام "یثرو" بتایا ہے[۵]۔

(۴) بعض علماء فرماتے ہیں کہ "یہ شیخ" حضرتِ شعیب علیہ السلام کی قوم کا ایک مردِ مومن" تھا،

(۵) ایک جماعت کا گمان ہے کہ "یہ شیخ" نہ شعیبؑ ہو سکتے ہیں اور نہ اُن کے بھتیجے، اسلئے کہ قرآنِ عزیز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ شعیبؑ کا زمانہ حضرتِ موسیٰؑ سے بہت پہلے کا زمانہ ہے جس کے درمیان صدیاں ہیں، قرآن حکیم کہتا ہے کہ حضرتِ شعیبؑ نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے

---

[۱] تفسیر سورۂ قصص [۲] تفسیر ابن کثیر جلد ۷، ص ۲۴۸ [۳] ابن جریر جلد ۱، ص ۲۰۶ [۴] تفسیر ابن کثیر جلد ۷، ص ۲۴۸ [۵] ان حوالجات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سید سلیمان صاحب کا یہ فرمانا صحیح نہیں ہے کہ "مسلمان مفسرین بھی علی العموم یثرو، حوباب اور شعیب کو ایک ہی سمجھتے ہیں"

فرمایا۔ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ۔ اور قومِ لوط (کا معاملہ) تم سے کچھ دور نہیں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ قومِ لوط کی ہلاکت کا زمانہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہے! اور ان کے اور حضرتِ موسیٰؑ کے زمانہ کی درمیانی مدت چار سو سال سے بھی زیادہ ہے، اور جن لوگوں نے اس مدت کو قریب کر دینے کے لئے یہ کہا ہے کہ حضرتِ شعیبؑ کی عمر غیر معمولی طور پر طویل ہوئی، تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔[1]

اِس قول کی تائید کے لئے یہ دلیل بھی قوت رکھتی ہے کہ اگر "صاحبِ موسیٰ شعیب (علیہ السلام)" ہوتے تو قرآنِ عزیز ضرور اُن کے نام کی تصریح کرتا، اور اس طرح مجمل و مبہم نہ چھوڑتا۔[2]

ان مختلف پانچ اقوال کی نقل کے بعد ہمارے نزدیک اصح اور صحیح مسلک وہی معلوم ہوتا ہے جو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اختیار کیا ہے' وہ فرماتے ہیں کہ نام کی تصریح کے بارہ میں کوئی روایت صحت کو نہیں پہنچتی اور جو روایات نقل کی گئی ہیں' وہ قابلِ احتجاج نہیں ہیں' اس لئے جس طرح تصریح کئے بغیر قرآن عزیز نے انکا ذکر کیا ہے' اسی طرح ہم بھی اُن کے نام کی تصریح کو خدا کے علم کے حوالہ کر دیں، ابن کثیر کی عبارت یہ ہے:۔

قال ابو جعفر (الطبری) وھذا مما لا یدرک علمہ الا بخبر ولا خبر بذالک تجب بحجۃ فلا قول فی ذالک اولے بالصواب مما قالہ اللہ جل ثناءہ[3]، الخ	ابو جعفر طبری نے کہا ہے کہ نام کی تصریح کا یہ معاملہ خبر اور اطلاع کے بغیر طے نہیں ہو سکتا اور اس سلسلہ میں کوئی خبر (روایت) ایسی موجود نہیں ہے جو حجت اور دلیل بن سکے پس سب سے بہتر قول اس سلسلہ میں وہی ہے جو قرآن میں اللہ جل شانہ نے اختیار فرمایا (یعنی سکوت)

ابن جریر کا اشارہ قرآن عزیز کے اس جملہ کی جانب ہے "وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ"

عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک بڑے فاضل عالم نے یہ بحث کی کہ حضرت موسیٰؑ جلیل القدر نبی تھے اس لئے اُن کو کوئی معمولی شخص اپنا اجیر رکھنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۷، ص ۲۴۸۔ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۷، ص ۲۴۸۔ [3] ایضاً جلد ۷، ص ۲۴۹۔

اور نہ وہ اس کو منظور فرماتے بلکہ اُن کا منشا جز نبی اور پیغمبر ہی ہو سکتا ہے اس لئے مدین کے "شیخ کبیر" حضرت شعیبؑ ہی ہو سکتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ آپ کا یہ ارشاد نہ عقلی حجت و برہان کی حیثیت رکھتا ہے اور نہ نقلی دلیل و حجت کی، زیادہ سے زیادہ استحسان کے درجہ کا قیاس ہے اور اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا بلکہ یہ یقین اور قطعیت کو چاہتا ہے، علاوہ ازیں اس وقت حضرت موسیٰؑ نبی نہ تھے نبوت سے بعد کو سرفراز کئے گئے۔[1]

بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ "شیخ کبیر" کے نام کی تصریح میں کوئی قابلِ حجت روایت موجود نہیں ہے اور ابن جریر اور ابنِ کثیر نے "وفاءِ مدت" کے سلسلہ میں بھی جس قدر روایات نقل کی ہیں اُن میں بھی بزّار اور ابن ابی حاتم کی طویل روایات کے علاوہ کسی میں بھی نام کا ذکر موجود نہیں ہے اور ان دونوں روایات کی اس "زیادت" کے بارہ میں ابنِ کثیر فرماتے ہیں۔

مدار هذا الحديث على عبد الله بن لهيعة المصري وفي حفظه سوء واخشى ان تكون رفعه خطاء[2]	اس (نام کی تصریح والی) حدیث کا مدار ابن لہیعہ مصری پر ہے اور اس کا حافظہ خراب تھا اور مجھے خوف ہے کہ اس حدیث کو مرفوع کہنے میں غلطی ہوئی ہے۔

اور ابنِ جریر فرماتے ہیں:۔

ثم قد روى ايضا نحوه من حديث عتبة بن المنذر بزيادة غريبة جدا[3]	نیز اسی طرح عتبہ بن المنذر سے روایت کی گئی ہے مگر ایک یقینی نادر اور غیر معروف زیادت کے ساتھ (وہ زیادت ہی نام کی صراحت ہے)

ایفاءِ مدت غرض حضرت موسیٰؑ اپنے خسر کے یہاں مدتِ اجارہ پوری کرنے یعنی بکریاں چرانے کے لئے مقیم رہے، مفسرین مستند روایات کے پیشِ نظر فرماتے ہیں کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے کامل مدت یعنی دہ سالہ مدت کو پورا کیا۔

قرآنِ عزیز نے یہ نہیں بتایا کہ مدت پوری ہونے کے کس قدر بعد تک موسیٰ (علیہ السلام)

---

[1] قصص الانبیاء ص ۲۰۲ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۳۸۵ [3] تفسیر ابن کثیر جلد ۷۔

نے شیخ کے پاس قیام کیا؟ البتہ مفسرین یہ کہتے ہیں کہ مدت ختم ہونے کے فوراً بعد ہی موسیٰ مصر کو روانہ ہوگئے اور اُن کے خُسر نے روانگی کے سال میں بکریوں نے جس قدر بچے دیئے تھے اُن کے حوالے کردیئے اور وہ اپنی بیوی اور اس ریوڑ کو لے کر چل پڑے[۱]۔ شاید اُن کا یہ قول اس آیت کے پیشِ نظر ہو۔

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ (قصص ع)

پس جب موسیٰ نے مدت پوری کردی اور اپنے اہل کو لے کر چل دیا تو محسوس کیا طور کی جانب آگ کو۔

ان حضرات نے مدت کے ایفاء اور روانگی کے بیان میں جو قربت ہے اس سے یہ اندازہ کرلیا کہ وہ فوراً ہی روانہ ہوگئے حالانکہ جب تک خاص قرینہ موجود نہ ہو اُس وقت تک "واؤ" نہ تعقیب پر دلالت کرتی ہے اور نہ ترتیب پر۔

اور معالم التنزیل میں ہے کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) وفاءِ مدت کے بعد دس سال مزید اپنے خسر کے یہاں مقیم رہے[۲]۔

توراۃ اسی قول کی تائید کرتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام مدت ختم ہونے پر فوراً ہی مصر روانہ نہیں ہوگئے تھے بلکہ بکریاں چراتے ہوئے بھولے بھٹکے جب "وادیِ مقدس" میں پہنچکر خدا کا حکم ملا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے رہا کراؤ اور مصر جاکر فرعون کے ظلم سے انکو نجات دلاؤ تب وہ مصر روانہ ہوئے۔

اور موسیٰ اپنے سسرے یترو کے جو مدیان کا کاہن تھا گلے کی نگہبانی کرتا تھا، تب اُس نے گلے کو بیابان کی طرف ہانک دیا اور خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک آیا، اُس وقت خدا کا فرشتہ ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا، اس نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوٹا آگ کا روشن ہے اور وہ جل نہیں جاتا...... اب دیکھ بنی اسرائیل کی فریاد مجھ تک آئی اور میں نے وہ ظلم جو مصری اُن پر کرتے ہیں دیکھا ہے، پس اب تو جا میں تجھے فرعون پاس بھیجتا ہوں میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال[۳]۔

---

[۱] معالم جلد ۵ ص ۱۴۳۔ [۲] حاشیہ خازن جلد ۵ ص ۱۴۳۔ [۳] خروج باب ۳ آیت ۱۔۱۰۔

تب موسیٰ روانہ ہوا اور اپنے سسرے یترو پاس گیا اور اُسے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے رخصت دے کہ اپنے بھائیوں پاس جو مصر میں ہیں جاؤں [1]

بہتر یہی ہے کہ حقیقتِ حال کو علمِ الٰہی کے ہی سپرد کر دیا جائے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ تاہم قرآنِ حکیم کا اسلوبِ بیان یہ ضرور رہنمائی کرتا ہے کہ عام کتبِ تفسیر میں جو یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی یہ روانگی "جو طٰہٰ" اور "قصص" میں مذکور ہے فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖ مصر کیلئے تھی غالباً صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام گھر کے ارادہ سے چلے تھے تو جب وادیِ مقدس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن کو کہا گیا کہ ظالم فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ اور ان کو سمجھاؤ تو حضرت موسیٰ جواب میں یہ نہ فرماتے :-

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا	موسیٰ نے کہا اے پروردگار میں نے اُن (فرعونیوں) کے ایک آدمی کو
فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ (قصص)	مار ڈالا تھا پس مجھے یہ ڈر ہے کہیں وہ مجھ کو نہ مار ڈالیں (اگر میں مصر گیا)
وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ	اور اُن (مصریوں) کا میں نے ایک گناہ کیا ہے پس میں
اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝ (الشعراء)	ڈرتا ہوں کہ وہ مجھ کو قتل کر دیں گے۔

یہ جواب خود بول رہا ہے کہ اس گفتگو کے وقت تک قتل والے معاملہ کی وجہ سے حضرت موسیٰ کو مصر جانے کا حوصلہ نہیں تھا، البتہ جب خدائے تعالیٰ کی عطا و بخشش نے ان کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا اور اس وقت مصر جانے کا حکم ملا تو موسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ سے اپنا اطمینان کر کے یہیں سے مصر روانہ ہو گئے اور حکمِ الٰہی کے سامنے خسر کے پاس جا کر اجازت لینے کی بھی پرواہ نہ کی۔

بہرحال حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے مدین میں ایک عرصہ قیام کیا، اور اس پوری مدت میں اپنے خسر کے مویشیوں کی گلہ بانی کرتے رہے، تورات میں مذکور ہے کہ اس قیام میں حضرتِ موسیٰ کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جیرسون رکھا، مدیانی عبرانی میں اس کے معنی "غربت و مسافرت" کے ہیں، گویا حضرتِ موسیٰ نے بیٹے کے نام میں اپنی "مسافرت" کو بطور

[1] خروج باب ۴ آیت ۱۸۔

یادگار قائم رکھا، تاکہ خاندان والوں کو یاد رہے کہ اس بچہ کی ولادت "غربت و مسافرت" میں ہوئی تھی، تورات کی عبارت یہ ہے:-

"اور اس نے اپنی بیٹی صفورہ موسیٰ کو دی، وہ بیٹا جنی اس نے اس کا نام جیرسون رکھا کیونکہ اس نے کہا میں اجنبی ملک میں مسافر ہوں"[1]

وادیِ مقدس ایک روز حضرت موسیٰؑ اپنے اہل و عیال سمیت بکریاں چراتے چراتے مدین سے بہت دور نکل گئے، گلہ بان قبائل کے لئے یہ بات کوئی قابلِ تعجب نہ تھی مگر رات ٹھنڈی تھی اس لئے سردی آگ کی جستجو پر مجبور کر رہی تھی، سامنے کوہِ سینا کا سلسلہ نظر آرہا تھا، یہ سینا کا مشرقی گوشہ تھا اور مدین سے ایک روز کے فاصلہ پر بحرِ قلزم کے دو شاخے کے درمیان مصر کو جاتے ہوئے واقع تھا، حضرت موسیٰؑ نے چقماق استعمال کیا مگر سخت خنکی تھی، اس نے کام نہ دیا۔ سامنے کی وادی (وادیِ ایمن) میں نگاہ دوڑائی تو ایک شعلہ چمکتا ہوا نظر پڑا، بیوی سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو میں آگ لے آؤں تاپنے کا بھی انتظام ہو جائے گا اور اگر وہاں کوئی رہبر مل گیا تو بھٹکی ہوئی راہ کا بھی کھوج لگ جائے گا۔

فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى - (طٰہٰ)

پھر موسیٰؑ نے اپنی بیوی سے کہا تم یہاں ٹھہر دیکھے آگ دیکھی ہے شاید اس میں سے کوئی چنگاری تمہارے لئے لاسکوں یا وہاں الاؤ پر کسی رہبر کو پا سکوں۔

بعثت خدا کے فضل کا موسیٰؑ سے پوچھئے احوال ✽ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے دیکھا کہ عجیب آگ ہے، درخت پر روشنی نظر آتی ہے مگر نہ درخت کو جلاتی ہے اور نہ گل ہی ہو جاتی ہے، یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے جاتے تھے آگ اور دور ہوتی جاتی تھی یہ دیکھ کر موسیٰؑ کو خوف سا پیدا ہوا اور انھوں نے ارادہ کیا کہ واپس ہو جائیں، جوں ہی وہ پلٹنے لگے آگ قریب آگئی اور قریب ہوئے تو سنا کہ یہ آواز آرہی ہے:

يٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (قصص) اے موسیٰ! میں ہوں میں اللہ پروردگار جہانوں کا۔

[1] خروج باب ۲ آیت ۲۱-۲۲۔

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ | پس جب موسیٰ اس (آگ) کے قریب آئے تو پکارے گئے اے موسیٰ!
فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ | میں ہوں تیرا پروردگار پس اپنی جوتی اُتار دے تو طویٰ کی مقدس وادی
طُوًى ۝ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ | میں کھڑا ہے اور دیکھ! میں نے تجھ کو اپنی رسالت کیلئے چن لیا ہے
لِمَا يُوْحٰى ۝ (سورۂ طٰهٰ) | پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سن۔

قرآنِ عزیز کی سابق آیت اور ان آیات کے پیشِ نظر دو باتیں کتبِ تفسیر میں زیرِ بحث لائی جاتی ہیں (۱) موسیٰؑ نے جس روشنی کو آگ سمجھا تھا وہ آگ نہ تھی بلکہ تجلیِ الٰہی کا نور تھا لیکن جو آواز اس پردۂ نور سے سُنی گئی وہ فرشتے کی آواز تھی اور اس کے واسطہ سے خدا نے موسیٰؑ کو شرف ہم کلامی بخشا، یا خود اللہ تعالیٰ کی ندا تھی؛ بعض مفسرین کہتے ہیں یہ فرشتے کی آواز تھی اور اسکے واسطہ سے موسیٰؑ کو خدا کی ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا، یہ خدا کی آواز نہ تھی اس لئے کہ ؎

قولِ او را لحن نے آواز نے

اور اربابِ تحقیق کی رائے یہ ہے کہ یہ براہِ راست ندائے الٰہی تھی اور موسیٰؑ نے اس کو کسی واسطہ سے بھی نہیں سنا بلکہ اسی طرح سُنا جس طرح پیغمبرانِ خدا وحیِ الٰہی کو سنتے اور "مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ" اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں[۱]

(۲) وادیِ مقدس پر موسیٰ (علیہ السلام) کو جوتی اتارنے کا حکم دیا گیا، حالانکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) مساجد میں جوتیوں سمیت نماز ادا کیا کرتے تھے اور آج اُمت کیلئے بھی یہی اسلامی مسئلہ ہے کہ اگر جوتیاں پاک ہوں تو اُن سے بے تامل نماز پڑھنا درست ہے تو پھر اس جگہ موسیٰؑ سے یہ کیوں کہا گیا کہ یہ وادیِ مقدس ہے لہٰذا جوتی اُتار دو تو اس کا جواب صحیح حدیث میں موجود ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

كَانَتَا مِنْ جِلْدِ حِمَارٍ مَيِّتٍ[۲] | (موسیٰ علیہ السلام) کی جوتیاں مُردہ گدھے کی کھال سے بنائی گئی تھیں (یعنی غیر مدبوغ تھیں اس لئے طاہر نہ تھیں)

[۱] صفۃ الکلام ابن تیمیہ ص ۲۷۔ [۲] تفسیر ابن کثیر مع فتح البیان ج ۶ ص ۲۲۹۔

بہرحال اب حضرت موسیٰؑ خدائے تعالیٰ کے پیغمبر اور جلیل القدر رسول ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو انبیاء کے سچے دین کی تلقین اور فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کی رہائی کی اہم خدمات کے لئے چن لیا ہے وہ اب وادیٔ مقدس میں حق تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر رہے ہیں، وہ موسیٰ (علیہ السلام) جو دین کی راہ سے بھٹکے ہوئے تھے آج مصر جیسے متمدن و مہذب ملک اور اُس کے سرکش و مغرور بادشاہ کی رہنمائی کرنے کیلئے منتخب کئے گئے ہیں اور جو کل تک اُونٹوں اور بکریوں کی گلہ بانی کر رہے تھے آج انسانوں کی قیادت کے فرض کو انجام دینے کیلئے چنے گئے ہیں اور جو نصابِ زندگی کل بکریوں کے گلہ کی چرائی سے شروع ہوا تھا وہ آج وادیٔ مقدس میں خدا کی بہترین مخلوق "حضرتِ انسان" کی گلہ بانی پر تکمیل کو پہنچ رہا ہے، اور کل کا گلہ بان آج جہاں بان بن رہا ہے۔

خدائے تعالیٰ کے یدِ قدرت کی یہی کرشمہ سازیاں ہیں جو زبان سے انکار کرنے والوں کے دلوں میں بھی اقرار کا کانٹا چبھوئے رکھتی ہیں، کجا خانہ بدوش چرواہا اور کجا متمدن حکومتوں کے لئے خدا کی صداقت کی پیغامبری!

حضرتِ موسیٰؑ نے جب خدا کی اس آواز کو سُنا اور اُن کو یہ معلوم ہوا کہ آج اُن کے نصیب میں وہ دولت آگئی ہے جو انسانی شرافت کا طغرائے امتیاز اور خدا کی موہبت کا آخری نشان ہے تو پھولے نہ سمائے اور والہانہ فریفتگی میں مثلِ مورت حیران کھڑے رہ گئے، آخر پھر اُسی جانب سے ابتدا ہوئی اور پوچھا گیا:-

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ ○ موسیٰؑ! تیرے داہنے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟

بس پھر کیا تھا محبوبِ حقیقی کا سوال عاشقِ صادق سے "یہ نصیب اللہ اکبر لُوٹنے کی جائے ہے" وارفتگیٔ عشق میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ سوال کے پیمانہ ہی پر جواب کو تولا جائے اور جو کچھ پوچھا گیا ہے صرف اسی قدر جواب دیا جائے، بولے:-

هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا یہ میری لاٹھی ہے، اس پر (بکریاں چراتے وقت) سہار

وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ   لیا کرتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑ لیتا ہوں،

جواب میں صرف یہ کہنا چاہیے تھا "عصا" مگر محبت کے اس ولولہ کو کیسے روکیں جو محبوب کے ساتھ ہمکلامی کے شرف کو طول دیکر سوختہ جانی کے سامان مہیا کرنا چاہتا ہے، کہتے ہیں کہ میری لاٹھی ہے اور اس کے فوائد بیان کرنے لگتے ہیں مگر یکایک جذبۂ شوق کی جگہ محبوبِ حقیقی کا پاسِ ادب دل میں چٹکی لیتا ہے، موسیٰؑ! خبردار کس دربار میں کھڑے ہو، کہیں یہ طول بیانی گستاخی اور بے ادبی میں نہ شمار ہو جائے موسیٰؑ نے یہ سوچ کر فوراً پہلو بدلا اور جنابِ باری میں عرض کی :-

وَلِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی ۝   اور میرے لئے اس سے متعلق اور ضروریات بھی ہیں۔

خدایا! دل کے ولولے اور روح کی بیتابیاں تو چاہتی ہیں کہ کہے جاؤں اور اس لطفِ بے پایاں کی لذت کو حاصل کئے جاؤں لیکن پاسِ ادب مانع اور چشمِ حقیقت بیں کا حکم ہے کہ خاموش ہو جاؤں اس لئے قصہ کوتاہ کرتا ہوں ورنہ داستانِ عشق تو بہت طویل ہے۔

عشق کہتا ہے جنوں کا جوش رہنا چاہیے   ضبط کی تاکید ہے خاموش رہنا چاہیے
قصۂ موسیٰؑ! سبق ہے ہوش والوں کیلئے   کس طرح عشاق کو خاموش رہنا چاہیے

آیات اللہ | اب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

اَلْقِهَا یٰمُوْسٰی ۝   موسیٰؑ! اپنی اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو۔

اور موسیٰ علیہ السلام نے اس ارشادِ عالی کی تعمیل کی :-

فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی ۝   موسیٰؑ نے لاٹھی کو زمین پر ڈال دیا، پس ناگاہ وہ اژدہا بن کر دوڑنے لگا،

حضرتِ موسیٰؑ نے جب یہ حیرت زا واقعہ دیکھا تو گھبرا گئے، اور بشریت کے تقاضہ سے متاثر ہو کر بھاگنے لگے، پیٹھ پھیر کر بھاگے ہی تھے کہ آواز آئی :

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُهَا   (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) موسیٰ! اس کو پکڑلو اور خوف نہ کھاؤ،
سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی ۝   ہم اس کو اس کی اصل حالت پر لوٹا دیں گے۔

حضرتِ موسیٰؑ کی لکڑی دو شاخہ تھی، اب وہی دو شاخہ اژدہے کا منہ نظر آرہا تھا۔ سخت

پریشان تھے مگر قربتِ الٰہی نے طمانیت وسکون کی حالت پیدا کردی اور انھوں نے بے خوف ہوکر اس کے مُنہ پر ہاتھ ڈال دیا، اس عمل کے ساتھ ہی فوراً وہ دوشاخہ پھر لاٹھی بن گیا۔

اب موسیٰؑ کو دوبارہ پکارا گیا اور حکم ہوا کہ اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لیجا کر بغل سے مَس کیجئے اور پھر دیکھئے وہ مرض سے پاک اور بے داغ چمکتا ہوا نکلے گا۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ (طٰہٰ) — اور ملائے اپنے ہاتھ کو اپنی بغل کے ساتھ، نکل آئے گا وہ روشن بغیر کسی مرض کے (یعنی برص سے پاک) یہ دوسری نشانی ہے،

موسیٰ! یہ ہماری جانب سے تمہاری نبوت ورسالت کے دو بڑے نشان ہیں، یہ تمہارے پیغامِ صداقت اور دلائل وبراہینِ حق کی زبردست تائید کریں گے، پس جس طرح ہم نے تم کو نبوت ورسالت سے نوازا اسی طرح تم کو یہ دو عظیم الشان نشان (معجزے) بھی عطا کئے۔

لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَىٰ (طٰہٰ) — تاکہ ہم تجھ کو اپنی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرادیں

فَذَانِكَ بُرْهَانَانِ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ○ (قصص ع) — پس تیرے پروردگار کی جانب سے فرعون اور اس کی جماعت کے مقابلہ میں تیرے لئے یہ دو "برہان" ہیں، بلاشبہ وہ فرعون اور اس کی جماعت نافرمان قوم ہیں

اب جاؤ اور فرعون اور اس کی قوم کو راہِ ہدایت دکھاؤ، انھوں نے بہت سرکشی اور نافرمانی اختیار کر رکھی ہے اور اپنے غرور وتکبر اور انتہاءِ ظلم کے ساتھ انھوں نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے سو اُن کو غلامی سے رستگاری دلاؤ۔

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے جنابِ باری میں عرض کیا "پروردگار! میرے ہاتھ سے ایک مصری قتل ہوگیا تھا اس لئے یہ خوف ہے کہ کہیں وہ مجھ کو قتل نہ کردیں، مجھے یہ بھی خیال ہے کہ وہ میری بڑی زور سے تکذیب کریں گے اور مجھ کو جھٹلائیں گے، یہ منصبِ عالی جب تونے عطا فرمایا ہے تو میرے سینہ کو فراخ اور نور سے معمور کردے اور اس اہم خدمت کو میرے لئے آسان بنادے اور زبان میں پڑی ہوئی گرہ کو کھول دے تاکہ لوگوں کو میری بات سمجھنے میں آسانی ہو، اور

چونکہ میری گفتگو میں روانی نہیں ہے اور میری بہ نسبت میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح بیان ہے اس لئے اس کو بھی اپنی اس نعمت (نبوت) سے نواز کر میرا شریک کار بنا دے،

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰؑ کو اطمینان دلایا کہ تم ہمارا پیغام لے کر ضرور جاؤ اور ان کو حق کی راہ دکھاؤ، وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، ہماری مدد تمہارے ساتھ ہے، اور جو نشانات ہم نے تم کو بخشے ہیں وہ تمہاری کامیابی کا باعث ہوں گے اور انجام کار تم ہی غالب رہو گے، ہم تمہاری درخواست منظور کرتے ہیں اور تمہارے بھائی ہارونؑ کو بھی تمہارا شریک کار بناتے ہیں، دیکھو تم دونوں فرعون اور اس کی قوم کو جب ہماری صحیح راہ کی جانب بلاؤ تو اس پیغام حق میں نرمی اور شیریں کلامی سے پیش آنا کیا عجب ہے کہ وہ نصیحت قبول کر لیں اور خوفِ خدا کرتے ہوئے ظلم کو باز آجائیں۔

داخلہ مصر | سُدی کہتے ہیں کہ جب حضرتِ موسیٰؑ منصبِ نبوت سے سرفراز ہو کر کلامِ ربانی سے فیضیاب بن کر اور دعوت و تبلیغِ حق میں کامیابی و کامرانی کا مژدہ پا کر وادیٔ مقدس سے اُترے تو اپنی بیوی کے پاس پہنچے جو وادی کے سامنے جنگل میں اُن کی منتظر اور چشم براہ تھیں انکو ساتھ لیا اور یہیں سے تعمیلِ حکمِ الٰہی کے لئے مصر روانہ ہو گئے، منزلیں طے کرتے ہوئے جب مصر پہنچے تو رات ہو گئی تھی خاموشی کے ساتھ مصر میں داخل ہو کر اپنے مکان پہنچے مگر اندر داخل نہ ہو کر اور والدہ کے سامنے ایک مسافر کی حیثیت میں ظاہر ہوئے، یہ بنی اسرائیل میں مہمان نواز گھر تھا، حضرتِ موسیٰؑ کی خوب خاطر و مدارات کی گئی، اسی دوران میں اُن کے بڑے بھائی حضرتِ ہارون (علیہ السلام) آپہنچے، یہاں پہنچنے سے قبل ہی ہارونؑ کو خدا کی طرف سے منصبِ رسالت عطا ہو چکا تھا اسلئے اُن کو بذریعہ وحی حضرتِ موسیٰؑ کا سارا قصہ بتا دیا گیا تھا وہ بھائی سے آکر لپٹ گئے اور پھر اُنکے اہل و عیال کو گھر کے اندر لے گئے اور والدہ کو سارا حال سُنایا، تب سب خاندان آپس میں گلے ملا اور بچھڑے ہوئے بھائیوں نے ایک دوسرے کی گذشتہ زندگی سے تعارف پیدا کیا اور والدہ کی دونوں آنکھوں نے ٹھنڈک حاصل کی[1] تورات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے؛

اور خداوند نے ہارون کو کہا کہ بیابان میں جا کے ملاقات کر وہ گیا اور خدا کے پہاڑ پر

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۱ ص ۲۵۲

اُسے مِلا اور اُسے بوسہ دیا اور موسٰی نے خدا کی جس نے اسے بھیجا ساری باتیں اور معجزے کہ جن کا اُس نے حکم دیا تھا ہارون سے بیان کئے۔[1]

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ

حضرتِ موسٰی (علیہ السلام) نے وادی مقدس میں خدائے تعالٰی کی جناب میں عرض کیا تھا کہ میری زبان میں جو گرہ ہے اس کو کھول دے اور یہ کہ میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح ہے تو مفسّرین نے اس "عقدہ" کے متعلق ایک حکایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسٰیؑ زمانۂ طفولیت میں ایک روز فرعون کی آغوش میں بیٹھے ہوئے تھے اور فرعون کی ڈاڑھی جواہرات اور موتیوں سے مرصّع تھی بچوں کی عادت کے مطابق حضرتِ موسٰیؑ نے ڈاڑھی پر ہاتھ چلا دیا اور چمکتے ہوئے موتیوں کے ساتھ فرعون کی ڈاڑھی کے چند بال بھی اکھڑ آئے، فرعون کو سخت غصہ آیا اور چاہا کہ اُن کو قتل کرادے، آسیہ زوجۂ فرعون نے شوہر کا یہ رنگ دیکھا تو عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ بچہ ہے اس کو نہ مار، یہ ان احترامات سے کیا واقف ہے، اسکے نزدیک تو تمرہ (کھجور) اور جمرہ (چنگاری) دونوں برابر ہیں "راج ہٹ" پرانی مثل ہے، بادشاہ نے کہا کہ میں ابھی اس کا امتحان کرتا ہوں، اگر اس نے انگارہ کو دیکھ کر ہاتھ کھینچا تو ضرور قتل کرادوں گا، خدائے تعالٰی کو موسٰیؑ سے کام لینا تھا اس لئے اُن کی حفاظت کی ذمّہ داری کا وعدہ کرلیا تھا، لہٰذا جب فرعون نے چند کھجور کے دانے اور چند دہکتی آگ کے سُرخ انگارے منگا کر موسٰیؑ کے سامنے رکھے تو موسٰیؑ نے جلد ہاتھ بڑھا کر ایک سُرخ انگارے کو اُٹھا کر مُنہ میں رکھ لیا، سکنڈ بھر کا کام تھا ہو گذرا، مگر زبان پر داغ پڑگیا اور زبان موٹی ہوگئی، اس وقت سے موسٰی علیہ السلام کی زبان میں لکنت آگئی، اور مسلسل گفتگو میں رکاوٹ ہونے لگی، پس وادئ مقدس میں خدائے تعالٰی کے سامنے موسٰی علیہ السلام نے اسی "عقدہ" (گرہ) کا ذکر کیا۔[2] لیکن عام مفسّرین کی اس نقلِ حکایت سے جدا نجار مصری نے اس سلسلہ میں اپنی ایک قیاسی رائے بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

میں اس قصہ کو صحیح نہیں سمجھتا، میرے خیال میں تو صرف موسٰی علیہ السلام کی غیر فصیح بیانی اور گفتگو میں رکاوٹ کی دو وجہوں میں سے ایک ہوسکتی ہے:۔

[1] خروج باب ۴ آیت ۲۷-۲۸- [2] تاریخ ابن کثیر جلد ۱ ص ۲۴۹-

(۱) قرآنِ عزیز میں مذکور ہے کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) کو دریائے نیل میں سے نکال کر شاہی محل پہنچایا گیا تو دودھ پلانے کے لئے دایہ کی فکر ہوئی، شہر کی بیسیوں دایہ آئیں گر انھوں نے کسی کا دودھ مُنہ سے نہ لگایا، تو اس واقعہ میں ضرور عرصہ لگا ہوگا اور موسیٰ علیہ السلام ایک عرصہ دُودھ سے محروم رہے ہوں گے، ایسی حالت میں یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ بچہ کی زبان موٹی ہوجاتی ہے اور بات کرنے میں کاوٹ کا مرض پیدا ہوجاتا ہے لہٰذا حضرت موسیٰؑ کو بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی۔

(۲) حضرت موسیٰؑ ابتداءِ جوانی ہی میں مصر سے مدین چلے گئے اور وہاں ایک طویل عرصہ رہے، اگر صاحب معالم التنزیل یا تورات کی روایات کو صحیح مان لیا جائے تو بیس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں یہ قدرتی بات ہے کہ وہ مصری زبان سے ایک حد تک ناآشنا اور اس کے محاورات اور اس زبان میں تقریر کے ملکہ سے محروم ہوچکے ہونگے، اسی کو انھوں نے "عقدۃ لسانی" فرمایا اور ہارون (علیہ السلام) کے متعلق فرمایا "ھُوَ اَفْصَحُ مِنِّی"

اس دوسری وجہ میں البتہ یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اسکو صحیح مان لیا جائے تو پھر حضرت موسیٰؑ کس طرح حضرتِ ہارونؑ سے بے تکلف بات چیت کرنے پر قادر رہے ہوں گے جبکہ حضرت ہارونؑ کبھی مصر سے باہر ہی نہیں گئے، اور صرف مصری زبان ہی میں بات چیت کرسکتے تھے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرتِ ہارونؑ مصری اور عبرانی دونوں زبانوں کے خوب واقف اور ماہر تھے، مصری زبان ان کی ملکی زبان تھی، اور عبرانی زبان انکی مادری زبان تھی جس کو صدیاں گذرنے کے باوجود بھی بنی اسرائیل نے محفوظ رکھا تھا اور باہمی بات چیت اور نوشت وخواند میں اسی کو استعمال کرتے تھے اور مدیانی اور عبرانی میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اس لئے کہ دونوں زبانیں ایک ہی جدِاعلیٰ (حضرتِ ابراہیمؑ) کی نسل سے متعلق تھیں۔

اور ان ہر دو وجوہ کو نقل کرنے کے بعد نجار کہتے ہیں کہ میری طبیعت کا میلان پہلی وجہ کی جانب ہے اور میں اسی کو راجح سمجھتا ہوں [۱]

مگر ہمارے نزدیک پہلی وجہ تو کسی طرح بھی قرینِ قیاس نظر نہیں آتی، اس لئے کہ "دایہ"

[۱] قصص الانبیاء عربی ص ۲۰۸ و ۲۰۹۔

کی تفتیش کا معاملہ قرآنِ عزیز اور صحیح احادیث میں تو بہت ہی مختصر ہے اور اس کی تفصیل جو توراۃ اور تاریخی روایات سے نقل کی گئی ہے اُن سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ صرف چند گھنٹوں کے اندر طے ہوگیا، موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ان کو دودھ پلانے کیلئے لے گئیں، اور شاہی احکام کے بعد ایک بچہ کے دُودھ پلانے کے معاملہ میں دنوں کی تاخیر بھی کیسے سکتی تھی نیز دوسری وجہ بھی کچھ زیادہ قابلِ قبول نہیں ہے اس لئے کہ اس توجیہ کے مطابق حضرتِ ہارونؑ کے متعلق "هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي" کا فقرہ تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن مصری زبان کی فراموشی کو عقدةً مِّن لِّسَانِي کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے، علاوہ ازیں اگر یہ صحیح ہے تو حضرتِ موسیٰؑ کی دعا تو قبول کرلی گئی پھر اس فراموشی کے کیا معنیٰ ؟

بلکہ صاف اور بے غل وغش بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) ایسی حالت میں مولود ہوئے کہ اُن کی زبان میں لکنت تھی اور بات کرنے میں رکاوٹ واقع ہوجاتی تھی اور حضرتِ ہارونؑ لسان اور فصیح البیان تھے، پس حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے متعلق صرف اسی قدر دعا مانگی کہ زبان کا یہ حصر اور اُس کی لکنت اس درجہ شدید نہ رہے کہ گفتگو میں عاجز ہوجانا پڑے، اگر فطری رکاوٹ دور نہیں ہوتی نہ ہو صرف اس قدر خواہش ہے کہ مخاطبین گفتگو کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور فصاحت وطلاقتِ لسانی کے لئے میری خواہش یہ ہے کہ میرے بھائی ہارونؑ کو میرا قوتِ بازو بنا دیجئے کہ وہ میرا ایسے بھی دست وبازو ہے، چنانچہ دربارِ الٰہی میں دونوں باتیں قبول اور منظور ہوگئیں۔

بعض علماءِ تفسیر نے "يَفْقَهُوا قَوْلِي" میں ایک اور نکتہ پیدا کیا اور فرمایا کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے صرف یہ دعا مانگی کہ اُن کی زبان کی گرہ اس حد تک کُھل جائے کہ جس قوم کو تبلیغ کرنے جا رہے ہیں وہ اُن کی گفتگو سمجھ سکے لہٰذا اُسی درجہ دعا قبول ہوئی اور اُن کی زبان میں قدرے لکنت اور رکاوٹ پھر بھی باقی رہی، موسیٰ (علیہ السلام) نے شرط لگا کر دعا کا دائرہ خود ہی تنگ کردیا، ورنہ وہ بھی فصاحت اور طلاقتِ لسانی میں فرد ہوجاتے۔

میرے خیال میں اس نکتہ سنجی کی بھی یہاں مطلق ضرورت نظر نہیں آتی اس لئے کہ جس مقام پر اور جس وقت میں موسیٰ علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں یہ دعا فرمائی ہے اس کی برکت اور عظمت کو ان نکتہ سنجوں نے بالکل فراموش کر دیا اور یہ غور نہیں فرمایا کہ موسیٰ (علیہ السلام) منصبِ نبوت سے سرفراز کئے جا رہے ہیں، خدا کا انتہائی فضل و کرم بارش کی طرح اُن پر برس رہا ہے، آغوشِ رحمت وا ہے، اس حالت میں موسیٰ (علیہ السلام) معاملہ اور ذمہ داری کی اہمیت کو محسوس فرماتے ہوئے آسانیٔ کار کے لئے دعائیں اور استدعائیں کر رہے ہیں اور خدائے تعالیٰ خود موسیٰ علیہ السلام کی مشکلات اور مہم کی نزاکت کا عالم و دانا ہے تو پھر کیا ایسے وقت میں خدائے تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا یہ تقاضا ہو سکتا تھا کہ وہ عطاء و نوال کی بیکراں نوازش کی جگہ مول تول اور سودے کی طرح لین دین کا سا معاملہ کرتی یا حقیقتِ حال کے پیشِ نظر موسیٰ علیہ السلام کے دعائیہ الفاظ کی لفظی گرفت سے درگذر فرما کر وہ سب کچھ عطا کرتی جو اُن کی مشکلات کو ختم کرنے کیلئے معاون و مددگار ثابت ہو سکے، بیشک اس نے ایسا ہی کیا البتہ موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد میں ایک راز تھا جس کو وہ اور ان کا پروردگار دونوں سمجھتے تھے، اُن کی خواہش تھی کہ ان کی اس اہم خدمت میں اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام ضرور شریکِ کار بنیں اس لئے کہ وہ بھائی بھی ہیں اور فطری فصاحت و طلاقتِ لسانی کے مالک بھی، لہٰذا وہ اس سے زیادہ کے خواہش مند ہی نہ تھے کہ ان کو حصر کی دشواری سے نجات مل جائے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ہارونؑ کو بھی یہ دولتِ نبوّت عطا ہو پس اُن کی سفارش کے لئے اسی وصف "فصاحت بیانی" کو خدا کی درگاہ میں پیش کیا، یہ نہ تھا کہ انھوں نے الفاظِ دعاء میں تنگی کی تھی تو خدا نے بھی کم دینے کی خاطر ان کے الفاظ کو پکڑ لیا اور اسی قدر دیا جو اُن کی دعاء کے الفاظ میں محدود تھا۔

وَهَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى ۘ	اور اے پیغمبر! موسیٰ کی حکایت تو نے سنی؟ جب اس نے (دور سے)
اِذۡ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّىۡۤ	آگ دیکھی تو اپنے گھر کے لوگوں سے کہا ٹھہرو مجھے آگ دکھائی دی ہے

اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا
بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝
فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰى ۝ اِنِّیْٓ
اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ
اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝
وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰى ۝
اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا
فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ۝
اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَكَادُ اُخْفِیْهَا
لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ۝ فَلَا
یَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ
بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝
(طٰهٰ ع)

میں جاتا ہوں ممکن ہے تمہارے لئے ایک انگارہ لیتا آؤں یا
(کم از کم) الاؤ پر کوئی راہ دکھانے والا ہی مل جائے، پھر جب وہ
وہاں پہنچا تو اس وقت پکارا گیا (ایک آواز اٹھی کہ) اے موسیٰ
میں ہوں تیرا پروردگار! پس اپنی جوتی اتار دے۔ تو طویٰ کی
مقدس وادی میں کھڑا ہے، اور دیکھ میں نے تجھے (اپنی رسالت
کیلئے) چن لیا ہے، پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اُسے کان لگا کر سُن
میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی بندگی کر
اور میری ہی یاد کیلئے نماز قائم کر، بلاشبہ (مقررہ) وقت آنیوالا ہے
میں اُسے پوشیدہ رکھنے کو ہوں تاکہ (لوگوں کے یقین و عمل کی
آزمائش ہو جائے اور) جس شخص کی جیسی کچھ کوشش ہو اسی کے
مطابق بدلہ پائے، پس دیکھ ایسا نہ ہو کہ جو لوگ اس وقت کے ظہور
پر یقین نہ رکھتے ہوں اور اپنی خواہش کے بندے ہوں وہ تجھے
بھی (قدم بڑھانے سے) روک دیں اور نتیجہ یہ نکلے کہ تو تباہ ہو جائے

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ
نَارًا ۭ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ
بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝
فَلَمَّا جَاۗءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی
النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ
الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (ع النمل)

جب کہا موسیٰ نے اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے
ایک آگ اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے
کچھ خبر یا لاتا ہوں انگارہ سلگا کر تاکہ تم تاپو، پھر جب پہنچا
اُس کے پاس آواز ہوئی کہ برکت ہے اُس پر جو کوئی
آگ میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے، اور پاک
ہے ذات اللہ کی جو رب ہے سارے جہان کا۔ اے موسیٰ
وہ میں اللہ ہوں زبردست حکمتوں والا۔

وَمَا تِلْكَ بِیَمِیْنِكَ یٰمُوْسٰى ۝ قَالَ
اور صدائے غیبی نے پوچھا: اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں

هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ	کیا ہے؟ عرض کیا "میری لاٹھی ہے چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں
اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا	اسی سے اپنی بکریوں کیلئے درختوں کے پتے جھاڑ لیتا ہوں، میرے
مَاٰرِبُ اُخْرٰى ۝ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ۝	لئے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں، حکم ہوا "اے موسیٰ!
فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝	اسے ڈال دے" موسیٰؑ نے ڈال دیا، اور کیا دیکھتا ہے ایک سانپ ہے،
قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ وقف	جو دوڑ رہا ہے حکم ہوا "اسے اب پکڑ لے، خوف نہ کھا، ہم اُسے پھر
سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ۝	اس کی اصل حالت پر کئے دیتے ہیں" اور نیز حکم ہوا "اپنا ہاتھ اپنے
وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ	پہلو میں رکھ اور پھر نکال بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو چمکتا ہوا
تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ	نکلے گا، یہ (تیرے لئے) دوسری نشانی ہوئی (اور یہ دونوں نشانیاں
اٰيَةً اُخْرٰى ۝ لِنُرِيَكَ مِنْ	اس لئے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت سے بڑی بڑی
اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۝ (ع طٰهٰ)	نشانیاں دکھائیں۔
وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ	اور تو نہ تھا غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم اور
اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝	نہ تھا تو دیکھنے والا لیکن ہم نے پیدا کیں کئی جماعتیں پھر دراز
وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ	ہوئی اُن پر مدت، اور تو نہ رہتا تھا مدین والوں میں
الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ	کہ ان کو سناتا ہماری آیتیں، پر ہم رہے رسول
تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝	بھیجتے۔ اور تو نہ تھا طور کے کنارے جب ہم نے
وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَ	آواز دی۔ لیکن یہ انعام ہے تیرے رب کا کہ
لٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ	تو ڈر سنا دے اُن لوگوں کو جن کے پاس نہیں
اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ	آیا کوئی ڈر سنانے والا تجھ سے پہلے تاکہ وہ
يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (ع قصص)	یاد رکھیں۔
هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ اِذْ	کچھ پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی۔ جب پکارا اس کو اس
نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝	کے رب نے پاک میدان میں جس کا نام طویٰ ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ (النّٰزعٰت)

جا فرعون کے پاس اُس نے سر اُٹھایا، پھر کہہ تیرا جی چاہتا ہے کہ تو سنور جائے اور راہ بتاؤں تجھ کو تیرے رب کی طرف پھر تجھ کو ڈر ہو؟

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ وَيَسِّرْ لِيْۤ اَمْرِيْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْۤ اَمْرِيْ ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ۝ (ع طٰهٰ)

(حکم ہوا) اے موسیٰ! تو فرعون (یعنی پادشاہِ مصر) کی طرف جا وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے" موسیٰ نے عرض کیا اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے (کہ بڑے سے بڑا بوجھ اٹھانے کیلئے مستعد ہو جاؤں) میرا کام میرے لئے آسان کر دے (کہ راہ کی کوئی دشواری بھی غالب آسکے) میری زبان کی گرہ کھول دے کہ (خطاب و کلام میں پوری طرح رواں ہو جائے اور) میری بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے، نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے، اس کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہو جائے، وہ میرے کام میں میرا شریک ہو، ہم دونوں یک دل ہو کر تیری پاکی اور بڑائی کا بکثرت اعلان کریں تیری یاد میں زیادہ سے زیادہ لگے رہیں، اور بلاشبہ تو ہمارا حال دیکھ رہا ہے (ہم سے کسی حال میں غافل نہیں) ارشاد ہوا اے موسیٰ! تیری درخواست منظور ہوئی

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝ اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَاۤ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝ قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِيْ مَعَكُمَاۤ

اب تو اور تیرا بھائی، دونوں میری نشانیاں لے کر جائیں اور میری یاد میں کوتاہی نہ کریں، ہاں تم دونوں (یعنی موسیٰ اور ہارون کیونکہ اب دونوں اکٹھے ہو گئے تھے اور مصر کے قریب وحی الٰہی نے انہیں دوبارہ مخاطب کیا تھا) فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکشی میں بہت بڑھ چلا ہے، پھر جب اس کے پاس پہنچو تو سختی کے ساتھ پیش نہ آنا۔ نرمی سے بات کرنا (تمہیں کیا معلوم؟) ہوسکتا ہے کہ نصیحت پکڑے یا (عواقب سے) ڈر جائے، دونوں نے عرض کیا "پروردگار! ہمیں

أَسْمَعُ وَأَرٰى ○ فَأْتِيٰهُ فَقُوْلَآ إِنَّا — اندیشہ ہے فرعون ہماری مخالفت میں جلدی نہ کرے یا سرکشی سے

رَسُوْلَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیٓ — پیش آئے ارشاد ہوا کچھ اندیشہ نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں،

إِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ — میں سب کچھ سنتا ہوں، سب کچھ دیکھتا ہوں! تم اس کے پاس

جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ — بے دھڑک جاؤ اور کہو ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے

عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ○ (طٰہٰ) — سامنے آگئے، اُس پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا — اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور کر دیا ہم نے اُس کے ساتھ

مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۚ فَقُلْنَا — اُس کا بھائی ہارون کام بٹانے والا، پھر کہا ہم نے دونوں

اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا — جاؤ اُن لوگوں کے پاس جنھوں نے جھٹلایا ہماری باتوں

بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ۭ (فرقان) — کو پھر دے مارا ہم نے ان کو اکھاڑ کر۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ — اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ جا اس قوم گنہگار کے

الظّٰلِمِيْنَ ۙ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ○ — پاس، قوم فرعون کے پاس کیا وہ ڈرتے نہیں، بولا اے

قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ○ — رب میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلائیں اور رک جاتا ہے میرا جی

وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ — اور نہیں چلتی ہے میری زبان سو پیغام دے ہارون کو اور انکو

فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ○ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ — مجھ پر ہے ایک گناہ کا دعویٰ، سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں،

فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۚ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا — فرمایا کبھی نہیں، تم دونوں جاؤ لیکر ہماری نشانیاں ہم

بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ○ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ — ساتھ تمہارے سنتے ہیں، سو جاؤ فرعون کے پاس اور

فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (الشعراء) — کہو ہم پیغام لے کر آئے ہیں پروردگار عالم کا۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا — اور ڈال دے لاٹھی اپنی، پھر جب دیکھا اس کو پھن لہراتے

جَاۤنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰى — جیسے سفید پتلا سانپ، لوٹا پیٹھ پھیر کر اور مُڑ کر نہ دیکھا۔

لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ○ — اے موسیٰ مت ڈر میں جو ہوں میرے پاس نہیں ڈرتے رسول

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْۗءٍ — مگر جس نے زیادتی کی، پھر بدلے میں نیکی کی برائی کے پیچھے

فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَاَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝ (ع النمل)

تو میں بخشنے والا ہوں اور ڈال دے ہاتھ اپنا اپنے گریبان میں کہ نکلے سفید ہو کر بغیر کسی عیب کے، یہ دونوں مل کر نو نشانیاں لے کر جا، فرعون اور اُس کی قوم کی طرف بے شک وہ تھے لوگ نافرمان۔

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰٓی اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ۚ یٰمُوْسٰٓی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ۝ اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ وَّاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۝ وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْٓ اِنِّیْٓ

پھر جب پوری کر چکا موسیٰ وہ مدت اور لے کر چلا اپنے گھر والوں کو دیکھی کوہ طور کی طرف سے ایک آگ کہا اپنے گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے آگ شاید لے آؤں تمہارے پاس وہاں کی کچھ خبر یا انگارہ آگ کا تاکہ تم تاپو، پھر جب پہنچا اس کے پاس آواز ہوئی میدان کے داہنے کنارے سے، برکت والے تختہ میں ایک درخت سے کہ اے موسیٰ میں ہوں میں اللہ جہان کا رب، اور یہ کہ ڈال دے اپنی لاٹھی، پھر جب دیکھا اس کو پھن ہلاتے جیسے پتلا سانپ الٹا پھرا منہ موڑ کر اور نہ دیکھا پیچھے پھر کر، اے موسیٰ آگے آ اور مت ڈر تجھ کو کچھ خطرہ نہیں، ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں نکل آئے سفید ہو کر نہ کسی برائی سے، اور ملا لے اپنی طرف اپنا بازو ڈر سے، سو یہ دو سندیں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں پر، بے شک وہ تھے لوگ نافرمان، بولا اے رب میں نے خون کیا ہے اُن میں ایک جان کا سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں گے اور میرا بھائی ہارون اس کی زبان چلتی ہے مجھ سے زیادہ سو اس کو بھیج میرے ساتھ مدد کو کہ میری تصدیق کرے

اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ	میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھوٹا کریں، فرمایا ہم مضبوط کر دینگے
بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ	تیرے بازو کو تیرے بھائی سے اور دیں گے تم کو غلبہ
اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا	پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے،
الْغٰلِبُوْنَ ۝ (ع قصص)	تم اور جو تمہارے ساتھ ہو غالب رہو گے۔
وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى	اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور کیا اس کو ہدایت
لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ	بنی اسرائیل کے واسطے کہ نہ ٹھہراؤ میرے سوا کسی کو
وَكِيْلًا ۝ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ	کارساز تم جو اولاد ہو ان لوگوں کی جن کو چڑھایا ہم نے
كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝ (ع بنی اسرائیل)	نوح کے ساتھ بیشک وہ تھا بندہ حق ماننے والا۔
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ	اور ہم نے دی ہے موسیٰ کو کتاب سو تو مت رہ دھوکے میں
مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ	اس کے ملنے سے اور کیا ہم نے اس کو ہدایت بنی اسرائیل
اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ	کے واسطے اور کیے ہم نے اُن میں پیشوا جو راہ چلاتے
بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۟ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝	تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے اور رہے ہماری
اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	باتوں پر یقین کرتے تیرا رب جو ہے وہی فیصلہ کریگا ان میں
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (سجدہ)	دن قیامت کے جس بات میں کہ وہ اختلاف کرتے تھے،

ان آیات میں "عصاءِ موسیٰ" کے معجزہ یا آیۃ اللہ ہونے کو "مختلف تعبیرات سے ادا کیا گیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں "حَيَّةٌ تَسْعٰى" فرمایا اور سورۂ نمل اور قصص میں "جَآنٌّ" کہا گیا، اور شعراء میں "ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ" ظاہر کیا، مفسرین فرماتے ہیں کہ "عصاءِ موسیٰ" کی اگرچہ یہ تعبیرات لفظی اعتبار سے مختلف ہیں لیکن حقیقت اور معنی کے لحاظ سے مختلف نہیں ہیں، بلکہ ایک حقیقت کے مختلف اوصاف کو ادا کیا گیا ہے یعنی جنس کے اعتبار سے وہ "حیۃ" سانپ تھا، اور تیزروی کے اعتبار سے جَآنّ (تیز رو سانپ) تھا۔ اور جسامت کے پیشِ نظر وہ "ثعبان" (اژدہا) تھا۔

اور سورۂ قصص میں موسیٰ (علیہ السلام) کے دونوں معجزوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ اور اپنی جانب اپنے بازو لے خوف کی حالت میں

اس آیت میں کس قسم کے خوف کا ذکر ہے؟ اس کے متعلق حضرتِ شاہ صاحب دہلوی نوّر اللہ مرقدہٗ ارشاد فرماتے ہیں "بازو ملا ڈر سے یعنی سانپ کا ڈر جاتا رہے"[1]

اور بعض علماء کہتے ہیں کہ اس خوف سے فرعون کے دربار کا خوف مراد تھا یعنی اگر فرعون کے سامنے کسی وقت خوف محسوس ہونے لگے تو اے موسیٰ! تو اپنے بازو کو بدن کے ساتھ ملا لینا فوراً ڈر جاتا رہے گا، اور دل میں سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہ دو نشانیوں کے علاوہ تیسری نشانی نہیں تھی بلکہ خوف اور ڈر دور کرنے کا ایک فطری علاج بتلایا گیا تھا جو ایسے موقع پر عموماً فائدہ مند ثابت ہوتا ہے، اور اب جبکہ خدائے تعالیٰ کا فرمودہ تھا تو اُس کے راست آنے میں موسیٰؑ کو شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔[2]

ہمارے نزدیک آیت کا سیاق حضرتِ شاہ عبدالقادرؒ کی تائید کرتا ہے اور نجارؔ کی توجیہ ایک دُور کی بات معلوم ہوتی ہے۔

فرعون کے دربار میں دعوتِ حق

بہرحال حضرتِ موسیٰ و حضرتِ ہارون (علیہما السلام) کے درمیان جب ملاقات اور گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو اب دونوں نے طے کیا کہ خدائے تعالیٰ کے امتثالِ حکم کے لئے فرعون کے پاس چلنا اور اس کو پیغامِ الٰہی سُنانا چاہئے۔

بعض مفسّرین نے لکھا ہے کہ جب دونوں بھائی فرعون کے دربار میں جانے لگے تو والدہ نے غایتِ شفقت کی بنا پر روکنا چاہا کہ تم ایسے شخص کے پاس جانا چاہتے ہو جو صاحبِ تخت و تاج بھی ہے اور ظالم و مغرور بھی، وہاں نہ جاؤ وہاں جانا بے سود ہوگا، مگر دونوں نے والدہ کو سمجھایا کہ خدائے تعالیٰ کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا، اور اُس کا وعدہ ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے۔

غرض دونوں بھائی اور خدا کے سچے پیغمبر و نبی فرعون کے دربار میں پہنچے اور بغیر خوف و خطر اندر داخل ہو گئے، جب فرعون کے تخت کے قریب پہنچے تو حضرتِ موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی اور گفتگو شروع ہوئی اور انھوں نے فرمایا:۔

[1] موضح القرآن۔ [2] قصص الانبیاء نجار ص ۲۱۲۔

"فرعون: ہم کو خدا نے اپنا پیغمبر اور رسول بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے، ہم تجھ سے دو اہم باتیں چاہتے ہیں، ایک یہ کہ خدا پر یقین لا، اور کسی کو اس کا ساجھی اور سہیم نہ بنا، دوسرے یہ کہ ظلم سے باز آ، اور بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے نجات دے، ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یقین رکھ کہ یہ بناوٹ اور تصنع نہیں ہے اور نہ ہم کو یہ جراءت ہوسکتی ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ذمہ غلط بات لگائیں، ہماری صداقت کے لئے جس طرح ہماری یہ تعلیم خود شاہد ہے اسی طرح خدائے تعالیٰ نے ہم کو اپنی دو زبردست نشانیاں (معجزات) بھی عطا فرمائی ہیں، لہٰذا تیرے لئے مناسب یہی ہے کہ صداقت وحق کے اس پیغام کو قبول کر اور بنی اسرائیل کو رستگاری دے کر میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں پیغمبروں کی اُس سرزمین میں لیجاؤں جہاں بجز ذات واحد کے یہ اور کسی کی پرستش نہ کریں کہ یہی راہِ حق ہے اور ان کے باپ دادوں کا ابدی شعار۔

وَقَالَ مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ	اور موسیٰ نے کہا اے فرعون! میں جہانوں کے پروردگار کا
مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ	بھیجا ہوا ایلچی ہوں، میرے لئے کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ
لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ قَدْ	پر حق اور سچ کے علاوہ کچھ اور کہوں، بلاشبہ میں تمہارے
جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ	لئے تمہارے پروردگار کے پاس سے دلیل اور نشان
مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ (اعراف)	لایا ہوں پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔

فرعون نے جب یہ سنا تو کہنے لگا "موسیٰ! آج تو پیغمبر بن کر میرے سامنے بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے، وہ دن بھول گیا جب تو نے میرے ہی گھر میں پرورش پائی اور بچپن کی زندگی گذاری اور کیا تو یہ بھی بھول گیا کہ تو نے ایک مصری کو قتل کیا اور یہاں سے بھاگ گیا، حضرت موسیٰ نے فرمایا "فرعون! صحیح ہے کہ میں نے تیرے گھر میں پرورش پائی اور ایک مدت تک شاہی محل میں رہا۔ اور مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ غلطی کی بنا پر مجھ سے نادانستہ ایک شخص قتل ہوگیا اور میں اس خوف سے چلا گیا تھا، لیکن یہ خدائے تعالیٰ کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اس نے تمام بیکسانہ مجبوریوں کی حالت میں تیرے ہی گھرانے میں میری پرورش کرائی اور پھر مجھ کو اپنی

سب سے بڑی نعمت، نبوت و رسالت سے سرفراز کیا۔

فرعون! کیا یہ طریقہ عدل و انصاف کا طریقہ ہوگا کہ مجھ ایک اسرائیلی کی پرورش کا بدلہ یہ ٹھہرے کہ بنی اسرائیل کی تمام قوم کو تو غلام بنائے رکھے؟"

فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ	پھر وہ دونوں فرعون کے پاس آئے پس انھوں نے کہا "ہم بلاشبہ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ أَنْ أَرْسِلْ	جہانوں کے پروردگار کے پیغمبر اور ایلچی ہیں، یہ پیغام لے کر آئے ہیں
مَعَنَا بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ ۝ قَالَ أَلَمْ	کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے" فرعون نے کہا "کیا ہم نے
نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا	تجھ کو اپنے یہاں لڑکا سا نہیں پالا اور تو ہمارے یہاں ایک مدت
مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝ وَفَعَلْتَ	نہیں رہا اور تو نے جو کچھ اس زمانے میں کام کیا وہ تجھے خود بھی معلوم
فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ	ہے اور تو ناشکر گذار ہے۔ موسیٰ نے کہا "میں نے وہ کام (مصری
الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ فَعَلْتُهَا إِذًا وَّأَنَا	کا قتل) ضرور کیا اور میں اس میں چوک جانے والوں میں سے ہوں
مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ	پھر یہاں سے تمہارے خوف سے بھاگ گیا، پھر میرے رب نے
لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا	مجھ کو صحیح فیصلہ کی سمجھ دی اور مجھ کو اپنے پیغمبروں میں سے بنالیا
وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَ	(یہ اُس کی حکمت کی کرشمہ سازیاں ہیں) اور میری (پرورش)
تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ	کا یہ احسان جس کو تو مجھ سے جتا رہا ہے کیا ایسا احسان ہے کہ
عَبَّدْتَّ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ ۝ (شعراء)	تو بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھے۔

سورہ شعراء کی اس آیت "وَتِلْكَ نِعْمَةٌ الخ" کا ترجمہ عام مفسرین کی تفسیر کے مطابق کیا گیا ہے لیکن اس کے برعکس عبدالوہاب نجار اس آیت کے یہ معنی کرتے ہیں "اور تیرا یہ انعام ہوگا اور تو مجھ پر احسان کرے گا کہ تو بنی اسرائیل کو عزت بخشے یعنی اُن کو میرے ساتھ بھیج دے کہ وہ اپنے خدا کی عبادت میں آزاد ہو جائیں۔"

اور اس معنی کے جواز میں فرماتے ہیں کہ "عَبَّدْتَّ" بمعنی "کرمت" لغت عرب سے ثابت ہے، چنانچہ لسان العرب ص ۲۶۳ جلد ۴ میں ہے "العبد: المکرم" اور یہاں یہ معنی لینے اسلئے

ضروری ہیں کہ قرآن عزیز میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰؑ کو یہ تلقین کر دی تھی کہ فرعون کے سمجھانے میں نرمی اور لطف و مہربانی کو پیشِ نظر رکھنا، غصہ یا سخت کلامی کا اظہار نہ کرنا لہٰذا حضرتِ موسیٰؑ سے یہ بعید ہے کہ وہ اس ہدایتِ الٰہی کے خلاف طعن و تشنیع یا معاریض و مجازات سے کام لیں جو رفق و تلطف کے قطعاً خلاف ہے اور جو معنی عام مفسرین نے لئے ان میں طعن و معاریض کا پہلو نکلتا ہے[1]

مگر نجار نے اس موقعہ پر جو کچھ کہا ہے وہ خود تکلفِ بارد اور رکیک تاویل کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہے، اس لئے کہ عام مفسرین کے معنی کے مطابق یہاں نہ طعن و تشنیع ہے اور نہ معاریض و مجازات بلکہ روشن دلیل اور واضح حجت کے ذریعہ فرعون کو اس کی کج روی اور متمردانہ سرکشی پر توجہ دلانا ہے جو ایک پیغمبر اور خدا کے سچے رسول کا فرضِ منصبی ہے۔

فرعون نے اپنی مغرورانہ سرشت کے مطابق حضرتِ موسیٰؑ کے پیغمبرِ خدا ہونے کا استخفاف کیا اور مذاق و تحقیر کرتے ہوئے حضرتِ موسیٰؑ کی شخصیت سے بحث شروع کر دی، اپنے گھرانے کے احسان جتائے اور مصری کے قتل والا معاملہ یاد دلا کر خوف زدہ کرنے کی سعی کی مگر موسیٰ علیہ السلام چونکہ ان سب مراحل کے متعلق خدائے برحق سے ہر قسم کا اطمینان کر چکے تھے، اس لئے اُن پر مطلق نہ خوف کا اثر ہوا اور نہ اُن کو غصہ آیا، بلکہ انھوں نے فرعون کے گھرانے کی تربیت کا اعتراف بھی کیا اور مصری کے قتل کی غلطی کو بھی تسلیم کیا مگر ساتھ ہی ایک ایسا مُسکِت بُرہان اور خاموش کن دلیل بھی پیش کر دی کہ فرعون واقعی لاجواب ہو گیا اور اس لئے ناراضی اور غصہ کے اظہار کی بجائے گفتگو کا پہلو فوراً بدل دیا اور موسیٰ علیہ السلام سے ربّ العٰلمین کے متعلق بات چیت شروع کر دی، اور وہ دلیل و حجت یہی تھی کہ موسیٰؑ نے کہا "تو نے جو کچھ کہا میری شخصیت اور ذات سے متعلق ہے لیکن کیا یہ باتیں اس کے لئے جواز کا سبب بن سکتی ہیں کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم کو تو غلام بنائے رہے، یہ تو صریح ظلم ہے۔

لہٰذا مفسرین کی تفسیر اور ترجمہ ہی صحیح ہے اور نجار کے ترجمہ کو تسلیم کر لینے کے بعد کلام کی تمام

[1] قصص الانبیاء، عربی۔ ص ۲۱۶۔

لطافت اور خوبی فنا ہو جاتی ہے اور سیاق و سباق کیساتھ بھی بے تکلف اس کا جوڑ نہیں لگتا۔

ربوبیتِ الٰہی پر حضرتِ موسیٰؑ و فرعون کا مذاکرہ

فرعون نے دورانِ گفتگو میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پر جو یہ طعن کیا تھا کہ تونے ہمارے یہاں تربیت پائی ہے اور میں تیرا مربی ہوں تو اس کے معنی صرف اسی قدر نہیں تھے بلکہ اس کی تہ میں وہ عقیدہ کام کر رہا تھا جس کی شکست و ریخت کے لئے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام مبعوث کئے گئے تھے یعنی سلطنتِ مصر کا بادشاہ صرف بادشاہ ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ "راعؔ" (سورج) کا اوتار مانا جاتا تھا اور اس لئے فرعون کے لقب سے ملقب تھا، مصریوں کے عقیدہ میں تربیتِ کائنات کا معاملہ "راع" دیوتا کے سپرد تھا اور دنیا میں اس کا صحیح مظہر شاہِ مصر (فرعون) تھا، اب حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے جب خدائے واحد کی پرستش اور دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف آواز بلند کی اور فرمایا "اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ" تو اول اس نے اپنی اور اپنے باپ دادا کی ربوبیت کو اس طرح ثابت کیا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت پر اس کا بوجھ پڑے، اور جب اس طرح اصل مسئلہ کو حل ہوتے نہ دیکھا تو اب مسئلہ کو زیادہ عریاں کر کے حضرتِ موسیٰؑ کے ساتھ مناظرہ پر آمادہ ہو گیا اور کہنے لگا موسیٰؑ! یہ تو نئی بات کیا سناتا ہے کیا میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے کہ جس کو تو رب العٰلمین کہتا ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو اس کی حقیقت بیان کر، حضرتِ موسیٰؑ نے ارشاد فرمایا "اگر تجھ میں یقین اور ایمانِ صحیح کی گنجائش ہے تو تجھ کو سمجھنا چاہیئے کہ میں جس ہستی کو رب العٰلمین کہتا ہوں وہ ذاتِ اقدس ہے جس کے قبضۂ قدرت میں آسمان، زمین اور ان دونوں کے درمیان کی کل مخلوقات کی ربوبیت ہے، فرعون! کیا تو دعویٰ کر سکتا ہے

۱؎ مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جن میں سے بعض تو خاص خاص قبیلوں اور علاقوں کے تھے، جیسے ننفات فتاء اور مات اور بعض عالمگیر قوتوں کے الگ مظاہر تھے، جیسے اوزیرس عالمِ آخرت کا خدا، سیاورت آسمان کا خدا، کینو، جسم بنانے والا، ایزیر روح بخشنے والی دیوی۔ طوطا عمر کی مقدار مقرر کرنے والا، ہوراس درد و غم دور کرنے والا، حاتو (رکاتے) رزق بخشنے والی دیوی، اور ان سب سے بلند تر آمن راع تھا یعنی سورج دیوتا۔

نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشو و نما پا چکا تھا اور تاجدارانِ مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی ان کا لقب "فاراع" اس لئے ہوا کہ وہ "راع" یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔

(ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۶۲) (دائرۃ المعارف للبستانی جلد ۵ مادہ "راع")

کہ ان آسمانوں، زمینوں اور اُن کے درمیان تمام مخلوقات کو تو نے پیدا کیا ہے یا اُنکی ربوبیت کا کارخانہ تیرے یدِ قدرت میں ہے؟ اگر نہیں اور بلا شبہ نہیں! تو پھر رب العلمین کی ربوبیتِ عام سے انکار کیوں؟ "فرعون نے یہ سُنا تو درباریوں کی جانب مخاطب ہو کر تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ "کیا تم سنتے ہو؟ یہ کیسی عجیب بات کہہ رہا ہے۔

حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون اور اس کے درباریوں کے اس تعجب اور حیرانی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور اپنے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا "رب العلمین" وہ ہستی ہے جس کی ربوبیت کے اثر سے تیرا اور تیرے باپ کا وجود بھی خالی نہیں ہے، یعنی جس وقت تو عالمِ وجود میں نہ آیا تھا تو تجھ کو پیدا کیا اور تیری تربیت کی اور اسی طرح وہ تجھ سے پہلے تیرے آباء و اجداد کو عالمِ وجود میں لایا اور اُن کو اپنی ربوبیت سے نوازا، فرعون نے جب اس مسکت اور زبردست دلیل کو سُنا اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو درباریوں سے کہنے لگا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو خود کو تمہارا پیغمبر اور رسول کہتا ہے مجنون اور پاگل ہے" حضرتِ موسیٰ نے جب یہ دیکھا کہ اس سے اب کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو سوچا یہ بہتر ہے کہ اور زیادہ دل نشیں پیرایۂ بیان میں خدا کی ربوبیت کو واضح کیا جائے اس لئے فرمایا: یہ جو مشرق و مغرب اور اس کے درمیان ساری کائنات نظر آتی ہے اس کی ربوبیت جس کے یدِ قدرت میں ہے اسی کو میں "رب العلمین" کہتا ہوں، تم اگر ذرا بھی عقل و سمجھ سے کام لو تو بآسانی اس حقیقت کو پا سکتے ہو،

غرض حضرتِ موسیٰ اللہ رب العلمین کے حکم کے مطابق برابر شیریں کلامی، نرم گفتاری اور رفق و لطف کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کو راہِ حق دکھاتے اور رسالت کا فرض ادا فرماتے رہے اور فرعون کی تحقیر و توہین اور مجنون جیسے سخت الفاظ کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے اس کی رشد و ہدایت کیلئے بہترین دلائل اور مسکت جوابات دیتے رہے،

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ

بولا فرعون کیا معنی ہیں پروردگار عالم کے؟ کہا، پروردگار آسمان اور زمین کا اور جو کچھ اُن کے بیچ میں ہے، اگر تم یقین کرو،

كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا | بولا اپنے گردوالوں سے کیا تم نہیں سنتے ہو؟ کہا
تَسْتَمِعُوْنَ ۝ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ | پروردگار تمہارا اور پروردگار تمہارے اگلے باپ
الْاَوَّلِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْۤ | دادوں کا، بولا تمہارا پیغام لانے والا جو تمہاری
اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ | طرف بھیجا گیا ضرور باؤلا ہے، کہا پروردگار مشرق کا
وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ | اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں موجود ہے اگر
تَعْقِلُوْنَ ۝ (ع شعراء) | تم سمجھ رکھتے ہو۔

ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو یاد دلایا کہ جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے یہ صحیح نہیں ہے بلکہ رب العلمین ہی وہ ذات ہے جو لائقِ پرستش ہے اور اس کے مقابلہ میں کسی انسان کا دعوائے ربوبیت کھلا ہوا شرک ہے۔ اے فرعون! تو اس سے باز آ کیونکہ اُس ہستی نے جس کو میں رب العلمین کہہ رہا ہوں ہم پر یہ وحی نازل کی ہے کہ جو شخص اس قولِ حق کی خلاف ورزی اور تکذیب کرے گا اور اس سے منہ موڑیگا وہ خدا کے عذاب کا مستحق ٹھہرے گا

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَاۤ اَنَّ الْعَذَابَ | جو کوئی اور سرتابی کرے تو ہم پر وحی اتر چکی کہ اس کے
عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ | لئے عذاب کا پیام ہے۔

فرعون نے پھر وہی پہلا سوال دُہرادیا "اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے"؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں ایسی لاجواب بات کہی کہ فرعون حیران رہ گیا اور پہلو بدل کر بات کا رُخ دوسری جانب پھیرنے کی اس طرح سعی کرنے لگا جس طرح باطل کوش مناظرین کا قاعدہ ہے کہ جب صحیح جواب نہ بن پڑے اور حقیقتِ حال صاف سامنے آجائے تو پھر اس کو دبانے کے لئے کجروی کے ساتھ بات کا رُخ دوسری جانب پھیر دیا کرتے ہیں۔

بہرحال حضرت موسیٰ ع نے فرمایا "ہمارا پروردگار تو وہ ایک ہی پروردگار ہے جس نے دنیا کی ہر چیز کو اس کا وجود بخشا اور پھر ہر طرح کی ضروری قوتیں (حواس و عقل وغیرہ) دے کر اُس پر

زندگی و عمل کی راہ کھول دی، جس نے ہر شئے کو نعمتِ جسم و وجود عطا کی اور پھر سب کو منزلِ کمال کی طرف چلنے کی راہ دکھائی "تب فرعون نے لاجواب ہو کر بات کا رُخ یوں بدلا" کہنے لگا۔ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى تو پھر پہلے لوگوں کا حال کیا ہوا" مطلب یہ تھا کہ اگر تیری یہ بات صحیح ہے تو پھر ہم سے پہلے لوگ اور ہمارے باپ دادا جن کا عقیدہ تیرے عقیدے کی تائید میں نہ تھا کیا وہ سب عذاب میں گرفتار ہیں اور سب جھوٹے تھے۔ حضرتِ موسیٰؑ فرعون کی کج بحثی کو سمجھ گئے اور انھیں یقین ہو گیا کہ یہ اصل مقصد کو الجھانا چاہتا ہے اس لئے فوراً جواب دیا "عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى" ان پر کیا گذری اور ان کے ساتھ خدا کا کیا معاملہ رہا اس کی ذمہ داری نہ مجھ پر ہے اور نہ تجھ پر۔ اُن کا علم میرے پروردگار کے پاس محفوظ ہے ہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرا پروردگار بھول چوک اور خطا سے پاک ہے جس نے جو کچھ کیا ہے اس کے معاملہ میں کوئی بھول یا ظلم نہ ہو گا۔ اس کے بعد حضرتِ موسیٰؑ نے پھر گفتگو کو اصل مسئلہ کی طرف پھیر دیا اور رب العالمین کے اوصاف کا ذکر کر کے مسئلہ کی حقیقت کو اچھی طرح واضح اور مستحکم بنایا۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

فرعون نے پوچھا" اگر ایسا ہی ہے تو بتاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اے موسیٰ؟ موسیٰ نے کہا" ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر اس پر زندگی و عمل کی راہ کھول دی" فرعون نے کہا، پھر اُن کا کیا حال ہونا ہے جو پہلے زمانوں میں گذر چکے ہیں؟ موسیٰؑ نے کہا اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتہ میں ہے میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھو جائے یا بھول میں پڑ جائے وہ پروردگار جس نے تمہارے لئے زمین بچھونے کی طرح بچھا دی۔ نقل و حرکت کیلئے اس میں راہیں نکال دیں، آسمان سے پانی برسایا۔ اس کی آبپاشی سے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا کر دیئے، خود بھی کھاؤ

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّھٰی ؏ مِنْھَا | اور اپنے مویشی بھی چراؤ، اس بات میں عقل والوں کے لئے کیسی کھلی
خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْھَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْھَا | نشانیاں ہیں؛ اس نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا، اسی میں
نُخْرِجُکُمْ تَارَةً اُخْرٰی ○ (طٰہٰ ع۲) | لوٹتا ہے اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائے جاؤ گے۔

ہندوستان کے ایک مشہور معاصر عالم نے سورۂ طٰہٰ کی آیت اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی میں "ہدایت" کے معنی رہنمائی حواس وعقل تسلیم کرتے ہوئے مفسرین کو بے محل مورد طعن بنایا ہے کہ انھوں نے قرآنِ عزیز کی آیت زیرِ بحث کی روح کو نہ پاتے ہوئے غلطی سے یہاں بھی "ہُدٰی" کے معنی ہدایتِ دین ومذہب کے لئے ہیں، اور گویا صرف انھوں نے ہی سب سے پہلی مرتبہ اس روح کو پہچانا اور اس حقیقت پر آگاہی حاصل کی ہے، حالانکہ چند مفسرین کے علاوہ قدیم اور جدید عام مفسرین اور محققین نے بھی اس مقام پر "ہُدٰی" کے وہی معنی بیان کئے ہیں جن کو اچھوتا اور طبعزاد بتایا گیا ہے۔[1]

علماءِ تفسیر کہتے ہیں کہ فرعون اور موسیٰ (علیہ السلام) کے ان مکالمات میں حضرتِ ہارونؑ دونوں کے درمیان ترجمان ہوتے اور حضرتِ موسیٰؑ کے دلائل وبراہین کو نہایت فصاحت وبلاغت کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔

بہرحال مختلف مجالس میں مکالمت کا یہ سلسلہ حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان جاری رہا، فرعون، حضرتِ موسیٰ وحضرتِ ہارون (علیہما السلام) کے روشن اور پُراز صداقت دلائل سُن سُن کر اگرچہ پیچ وتاب کھاتا مگر لاجواب ہوجانے کی وجہ سے کوئی صورت نہیں بنتی تھی کہ موسیٰ (علیہ السلام) سے رستگاری حاصل کرے، وہ خوب جانتا تھا کہ میری ربوبیت اور الوہیت کی بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ دلائلِ موسیٰ کی صداقت کے سامنے تارِ عنکبوت کی طرح تار تار ہوجاتی ہے اور درباری بھی اس کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے فرعون کیلئے یہ بات

---

[1] ثم ھدی ای طریق الانتفاع والارتفاق بما اعطاہ وعرفہ کیف یتوصل الی بقائہ وکمالہ اما اختیاراً کما فی الحیوانات او طبعاً کما فی الجماد الخ

(روح المعانی جلد ۱۶ ص ۱۸۳)

سخت ناقابلِ برداشت تھی، اور جس قلمرو میں اس کے رعبِ شاہی اور دبدبۂ حکومت کے ساتھ ساتھ اس کی ربوبیت والوہیت کا جاہ و جلال بھی مانا جاتا ہو وہاں موسیٰؑ اور ہارونؑ کی یہ جرأتِ حق اندری اندر اس کو سخت خائف اور پریشان کر رہی تھی، اس لئے فرعون نے اب سلسلۂ بحث کو ختم کرنے کے لئے دوسرے طریقے اختیار کئے جن میں اپنی طاقت و قہرمانیت کا مظاہرہ، مصری قوم کو موسیٰ اور بنی اسرائیل کے خلاف مشتعل کرنا اور "رب العالمین" سے جنگ کا اعلان کر کے اس بحث کا خاتمہ کر دینا شامل تھا چنانچہ اس نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي ۚ (۴ قصص)

اور فرعون نے کہا اے جماعت میں تمہارے لئے اپنے سوائے کوئی خدا نہیں جانتا۔

اور پھر (اپنے مشیر یا وزیر) ہامان کو حکم دیا:۔

فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَل لِّي صَرْحًا لَّعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝ (قصص ۴)

اے ہامان! اینٹیں پکا اور ایک بہت بلند عمارت بنا شاید اس پر چڑھ کر میں موسیٰؑ کے خدا کا پتہ لگا سکوں اور میں تو بلاشبہ اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں،

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا هَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَّعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ ۝ أَسْبَابَ السَّمَاوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا ۚ وَكَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوءُ عَمَلِهِ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيلِ ۚ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ ۚ (غافر ۴)

فرعون نے کہا: اے ہامان! میرے لئے ایک بلند عمارت تیار کر تا کہ میں آسمانوں کی بلندیوں اور ان کے ذرائع تک دسترس حاصل کر سکوں اور اس طرح موسیٰ کے خدا کا حال معلوم کر سکوں اور میں تو اُس کو جھوٹا سمجھتا ہوں، اسی طرح فرعون کے لئے اس کی بد عملی کو خوبصورت کر دیا گیا اور وہ راہِ حق سے (بد عملی پر اصرار کی وجہ سے) روک دیا گیا، اور فرعون کے مکر کا آخری انجام ہلاکت ہے۔

حضرتِ شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہٗ) موضح القرآن میں ارشاد فرماتے ہیں کہ آیت "مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون دہری (ناستک) تھا اور کتب

تفسیر و تاریخ میں جو مصرِ قدیم کے تاریخی حوالجات نقل کئے گئے ہیں ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ مصری دیوتاؤں کے پرستار تھے اور ان کا سب سے بڑا دیوتا "آمن راع" (سورج دیوتا) تھا اور وہ خدائے واحد کے کسی معنی میں بھی قائل نہ تھے بلکہ تمام کائنات کی تخلیق اور اُن کے ہر قسم کے معاملات وحادثات کا تعلق کواکب وسیارات اور ان دیوتاؤں ہی سے متعلق سمجھتے تھے، غالباً فرعون اور اس کی قوم کا عقیدہ ہندوستان کے جین مت کے قریب قریب تھا کیونکہ جینی بھی خدا کے منکر مگر دیوتاؤں کے پرستار ہیں۔

ہامان؟ | ہامان کے متعلق قرآنِ عزیز نے کوئی تصریح نہیں کی کہ یہ کسی شخصیت کا نام ہے یا عہدہ اور منصب کا اور اُس کا منصب وعُہدہ فرعون کے دربار میں کیا تھا، اور نہ اُس نے اُس پر روشنی ڈالی کہ ہامان نے عمارت تیار کرائی یا نہیں اور فرعون نے پھر اُس پر چڑھ کر کیا کیا؟ کیونکہ یہ اُس کے مقصد کے لئے غیر ضروری تھا، تورات نے بھی اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا بلکہ اس نے فرعون کے عمارت بنانے کے حکم کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ مفسّرین نے یہ قصّہ ضرور نقل کیا ہے کہ جب ہامان نے ایک بہت اونچا مینارہ تیار کرا کے فرعون کو اطلاع دی تو فرعون اس پر چڑھا اور تیر کمان ہاتھ میں لے کر آسمان کی طرف تیر پھینکا، قدرتِ الٰہی کے فیصلہ کے مطابق وہ تیر خون آلود ہو کر واپس ہوا، فرعون نے یہ دیکھ کر غرور اور شیخی کے ساتھ مصریوں سے کہا کہ لو اَب میں نے موسیٰ کے خدا کا بھی قصّہ تمام کر دیا، واللّٰہ اعلم۔

فرعون نے درباریوں، عام قبطیوں اور ہامان پر حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں اپنی شکست کو چھپانے کے لئے اگرچہ مسطورۂ بالا طریقہ اختیار کیا مگر وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ ایک دھوکا ہے اور بس اس سے دلوں کی تسلی نہیں ہو سکتی، اور بہت ممکن ہے کہ بہت سے مصری بھی اسکو سمجھتے ہوں تاہم درباریوں اور خواص وعوام میں ایک بھی ایسا "رجل رشید" نہ تھا جو جرأتِ حق گوئی کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کر دیتا اور رشد وہدایت کی قبولیت کا دروازہ وا کرتا۔

فرعون کے دربار میں "آیات اللّٰہ" کا مظاہرہ | غرض فرعون کا خدشہ بڑھتا ہی رہا اُس کو حق و باطل

کی اس کشمکش میں اپنے لئے سخت خطرہ نظر آرہا تھا اس لئے اس نے معاملہ کو صرف یہیں ختم نہیں کردیا بلکہ ضروری سمجھا کہ اپنی سطوت و جبروت اور قہرمانیت کا اثر حضرتِ موسیٰؑ اور حضرتِ ہارونؑ پر بھی ڈالے اور اس طرح اُن کو مرعوب کرکے پیغامِ حق کے فرض سے ان کو باز رکھے، چنانچہ کہنے لگا "موسیٰؑ! اگر تو نے میرے سوائے اور کسی کو معبود قرار دیا تو میں تجھ کو قید میں ڈال دونگا" حضرتِ موسیٰؑ نے فرمایا "اگرچہ میں تیرے پاس خدائے واحد کی جانب سے واضح نشان لے کر آیا ہوں تب بھی تیرے غلط راستے کو اختیار کرلوں؟" فرعون نے کہا "اگر واقعی تو اس بارہ میں سچا ہے تو کوئی "نشان" دکھا"

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۰ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ۰ قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۰ (شعراء)	فرعون نے کہا اگر تو نے میرے سوائے کسی کو معبود بنایا تو میں تجھے ضرور قید کردوں گا، موسیٰؑ نے کہا، اگرچہ میں تیرے پاس ظاہر نشان لایا ہوں تب بھی؟ فرعون نے کہا اگر تو سچا ہے تو وہ نشان دکھا۔
قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۰ (اعراف)	فرعون نے کہا اگر تو اپنے خدا کے پاس سے کوئی نشانی لایا ہے تو اس بارے میں سچا ہے تو لا وہ نشان دکھا۔

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور بھرے دربار میں فرعون کے سامنے اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالا، اسی وقت اُس نے اژدہا کی شکل اختیار کرلی اور یہ حقیقت تھی نظر کا دھوکا نہ تھا اور پھر حضرتِ موسیٰؑ نے اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لے جاکر باہر نکالا تو وہ ایک روشن ستارہ کی طرح چمکتا ہوا نظر آرہا تھا، یہ دوسری نشانی اور دوسرا معجزہ تھا۔

فرعون کے درباریوں نے جب اس طرح ایک اسرائیلی کے ہاتھوں اپنی قوم اور اپنے بادشاہ کی شکست کو دیکھا تو تلملا اُٹھے اور کہنے لگے: بلاشبہ یہ بہت بڑا ماہر جادوگر ہے اور اس نے یہ سب ڈھونگ اس لئے رچا ہے کہ تم پر غالب آکر تم کو تمہاری سرزمین (مصر) سے باہر نکال دے۔ لہٰذا اب ہم کو سوچنا ہے کہ اس کے متعلق کیا ہونا چاہیے" آخر فرعون اور فرعونیوں

کے باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ فی الحال تو اس کو اور ہارونؑ کو مہلت دو اور اس دوران میں تمام قلمرو سے ماہر جادوگروں کو دارالسلطنت میں جمع کرو اور پھر موسیٰؑ کا مقابلہ کراؤ بلاشبہ یہ شکست کھا جائے گا اور اس کے تمام ارادے خاک میں مل جائیں گے، تب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا: موسیٰ! ہم خوب سمجھ گئے کہ تو اس حیلہ سے ہم کو سرزمینِ مصر سے بے دخل کرنا چاہتا ہے لہٰذا اب تیرا علاج اس کے سوائے کچھ نہیں ہے کہ بڑے بڑے ماہر جادوگروں کو جمع کر کے تجھ کو شکست دلائی جائے اب تیرے اور ہمارے درمیان مقابلہ کے دن کا معلوم ہونا چاہیے، اور پھر نہ ہم اس سے ٹلیں گے اور نہ تو وعدہ خلافی کرنا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کام کے لئے سب سے بہتر وقت "یوم الزینۃ" (جشن کا روز) ہے، اس دن سورج بلند ہونے پر ہم سب کو میدان میں موجود ہونا چاہیے۔

فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ۝	پس موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی کو ڈالا پھر اچانک وہ اژدہا تھی صاف
وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ ۝	اور ظاہر اور اس نے ہاتھ کو گریبان سے نکالا تو دیکھنے والوں
قَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَٰذَا	کے لئے چمکتا ہوا روشن تھا، فرعونیوں کی ایک جماعت نے کہا
لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ ۝ يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ	بلاشبہ یہ ماہر جادوگر ہے، اس کا ارادہ ہے کہ تم کو تمہاری سرزمین
أَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۝ قَالُوا أَرْجِهْ	(مصر) سے نکال دے، پس تمہارا کیا مشورہ ہے، انھوں نے کہا
وَأَخَاهُ وَأَرْسِلْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ۝	اس کو اور اس کے بھائی ہارون کو مہلت دو اور شہروں میں
يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيمٍ ۝ (اعراف ع ۱۴)	ایک جماعت کو بھیجو جو ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے لائے۔
ثُمَّ بَعَثْنَا مِن بَعْدِهِم مُّوسَىٰ وَ	پھر ہم نے ان رسولوں کے بعد موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھیجا، فرعون
هَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ بِآيَاتِنَا	اور اس کے درباریوں کی طرف، وہ ہماری نشانیاں اپنے ساتھ
فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝	رکھتے تھے، مگر فرعون اور اس کے درباریوں نے گھمنڈ کیا اُن کا
فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِندِنَا	گروہ مجرموں کا گروہ تھا، پھر جب ہماری جانب سے سچائی اُن
قَالُوا إِنَّ هَٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ قَالَ	میں نمودار ہوگئی تو کہنے لگے یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جادو ہے!

مُوسٰىٓ اَتَقُوۡلُوۡنَ لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمۡ ؕ اَسِحۡرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفۡلِحُ السّٰحِرُوۡنَ ۞ قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِتَلۡفِتَنَا عَمَّا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوۡنَ لَكُمَا الۡكِبۡرِيَآءُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَمَا نَحۡنُ لَكُمَا بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۞ وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ائۡتُوۡنِىۡ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيۡمٍ (۴ یونس)	صریح جادو" موسیٰؑ نے کہا تم سچائی کے حق میں جب وہ نمودار ہوگئی ایسی بات کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر تو کبھی کامیابی نہیں پاسکتے انھوں نے جواب میں کہا کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا اس سے ہمیں ہٹا دو اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لئے سرداری ہو جائے؟ ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں اور فرعون نے کہا لاؤ میرے پاس ہر قسم کے ماہر ساحر
قَالَ اَجِئۡتَنَا لِتُخۡرِجَنَا مِنۡ اَرۡضِنَا بِسِحۡرِكَ يٰمُوۡسٰى ۞ فَلَنَاۡتِيَنَّكَ بِسِحۡرٍ مِّثۡلِهٖ فَاجۡعَلۡ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكَ مَوۡعِدًا لَّا نُخۡلِفُهٗ نَحۡنُ وَلَاۤ اَنۡتَ مَكَانًا سُوًى ۞ قَالَ مَوۡعِدُكُمۡ يَوۡمُ الزِّيۡنَةِ وَاَنۡ يُّحۡشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۞ (۳ طٰہٰ)	اُس نے کہا اے موسیٰؑ! کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے نکال باہر کرے؟ اچھا ہم بھی اسی طرح کے جادو کا کرتب لا دکھائیں گے، ہمارے اور اپنے درمیان ایک دن (مقابلہ کا) مقرر کر دے، نہ تو ہم اس سے پھریں نہ تو، دونوں کی جگہ برابر ہوئی، موسیٰؑ نے کہا "جشن کا دن تمہارے لئے مقرر ہوا، دن چڑھے لوگ اکٹھے ہو جائیں۔

غرض حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان "یوم الزینۃ" طے پا گیا، اور فرعون نے اُسی وقت اپنے اعیان وارکان کے نام احکام جاری کر دیئے کہ تمام قلمرو میں جو مشہور اور ماہر جادوگر ہوں ان کو جلد از جلد دار الحکومت روانہ کر دو،

نجار مصری کہتے ہیں کہ غالباً "یوم الزینۃ" سے مصریوں کی عید کا وہ دن مراد ہے جو "وفاء النیل" کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ ان کے یہاں تمام عیدوں میں سب سے بڑی عید کا دن یہی تھا[1]

ساحرینِ مصر حضرتِ موسیٰؑ (علیہ السلام) کی بعثت کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم وفنون میں "سحر" کو ایک مستقل علم وفن کی حیثیت حاصل تھی اور اسی بنا پر ساحرین کا رتبہ مصریوں میں بہت بڑا سمجھا جاتا تھا، حتیٰ کہ

[1] قصص الانبیاء۔

اُن کو شاہی دربار میں بھی بڑا رسوخ حاصل تھا اور جنگ و صلح، پیدائش و وفات کی زائچہ کشی اور اہم سرکاری معاملات میں بھی اُنہیں کی جانب رجوع کیا جاتا تھا اور ان کے ساحرانہ نتائج کو بڑی وقعت دی جاتی تھی، حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی اُن کو اہم جگہ دی جاتی تھی، قدیم شاہی مقبروں میں بھی (حنوط شدہ نعشوں) کے ساتھ جو کاغذات و دستاویزات برآمد ہوئی ہیں اور اُن حجروں میں جو تصاویر و نقوش پائے جاتے ہیں اُن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

قدیم قوموں کی عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو پر مذہبی حیثیت سے اعتقاد رکھتے اور اس کو اپنی مذہبی زندگی میں اثر انداز یقین کرتے تھے، اور اسی اعتقاد کے پیشِ نظر وہ اس کو سیکھتے اور سکھاتے بھی تھے اور اس میں طرح طرح کی ایجادات و اختراعات کرتے رہتے تھے، چنانچہ بابل (عراق) مصر، چین اور ہندوستان کی تاریخ اسکی شاہد ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مصری قوم پر فرعون اور اس کے اعیان و ارکانِ حکومت کا یہ جادو چل گیا، کہ موسیٰؑ جادوگر ہے، اور یہ اپنے جادو کی مہارت کے اثر و رسوخ کو کام میں لاکر مصری حکومت پر قابض ہونا اور تم کو اس سے خارج کر دینا چاہتا ہے اور اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اپنے قلمرو کے ماہر جادوگروں کو جمع کر کے موسیٰؑ کو شکست دیدی جائے اور اس کی اس چال کو پادر ہوا بنا دیا جائے، موسیٰ علیہ السّلام نے بھی اس بات کو اس لئے غنیمت جانا کہ وہ خدائے تعالیٰ کے جس قدر نشانات (معجزات) فرعون اور قوم فرعون کو دکھا چکے تھے انھوں نے ان کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ یہ تو جادو اور سحر ہے، لہٰذا اب جبکہ ساحروں اور جادوگروں کے مقابلہ کے بعد بھی خدا کا معجزہ غالب رہے گا تو ناچار ان کو صداقت اور حق کے سامنے جھکنا پڑیگا، اور اقرار کئے بغیر کوئی چارہ نہ رہے گا، نیز یہ سوچا کہ اگرچہ "وحی الٰہی" کے یقین اور روشن حجت و برہان کے ذریعہ "آیات اللّٰہ" (معجزات) کی صداقت کا کافی یقین دلایا جا چکا ہے تاہم فرعون اور اعیانِ سلطنت ہمیشہ ان واقعات کو سحر اور جادو کہہ کر عوام کو اصل حقیقت سے بے خبر

رکھنے کی کوشش کرتے رہے یا شدید حسد اور تعصب نے خود ان کو بھی حقیقی روشنی سے محروم رکھا،
پس اگر جشن کے روز خواص و عوام کے مجمع میں ساحر اور جادوگر عاجز ہو کر میری صداقت کا اقرار
کرلیں تو پھر کسی کو بھی لب کشائی کا موقع نہ رہے گا اور برسرِ عام حق کا مظاہرہ منصبِ تبلیغ کیلئے
بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔"

سحر؟ لغت میں "سحر" کے معنی امرِ خفی اور پوشیدہ چیز کے ہیں، چنانچہ صبح کے اول وقت کو "سحر"
اس لئے کہتے ہیں کہ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی اور قدرے تاریکی ہے اور
علمی اصطلاح میں ایسے عجیب و غریب امور کا نام ہے جن کے وجود پذیر ہونے کے اسباب
نظر سے اوجھل ہوں اور بادی النظر میں محسوس نہ ہوتے ہوں۔

اعلم ان لفظ السحر فی عرف الشرع مختص بکل امر یخفی سببہ ویتخیل علی غیر حقیقتہ الخ [1]

واضح رہے کہ لفظِ "سحر" شریعت کی اصطلاح میں ایسے امر کیلئے مخصوص ہے جس کا سبب پوشیدہ ہو اور وہ اصل حقیقت کے خلاف خیال میں آنے لگے،

"سحر" کی حقیقت کچھ ہے یا وہ محض نظر کا دھوکا اور بے حقیقت شے ہے؟ اس کے متعلق جمہور
علماءِ اہلِ سنّت کی یہ رائے ہے کہ سحر واقعی ایک حقیقت ہے اور مضرت رساں اثرات رکھتا ہے،
حق تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ اور مصلحتِ کاملہ کے پیشِ نظر اس میں اسی طرح مضر اثرات رکھ دیئے
ہیں جس طرح زہر میں یا دوسری نقصان رساں ادویہ میں، یہ نہیں ہے کہ "سحر" قدرتِ الٰہی سے
بے نیاز ہو کر "العیاذ باللہ" خود موثر بالذات ہے کیونکہ یہ عقیدہ تو کفرِ خالص ہے۔

اور امامِ اعظم ابو حنیفہؒ، ابوبکر جصاصؒ صاحبِ احکام القرآن، ابو اسحٰق اسفرائنی شافعیؒ
علامہ ابن حزم ظاہریؒ اور معتزلہ کہتے ہیں کہ "سحر" کی حقیقت شعبدۂ نظر بندی اور فریبِ خیال
کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے بلاشبہ وہ ایک باطل اور بے حقیقت شے ہے، چنانچہ ابوبکر رازیؒ فرماتے ہیں:

ومتی اطلق فھو اسم لکل امر مموّہٍ باطلٍ لا حقیقۃ

اور جب "سحر" کو کسی قید کے بغیر استعمال کیا جائے تو وہ ایک ایسے امر کا نام ہے جو محض دھوکا اور باطل ہو کہ جس کی اس سے

[1] تفسیر کبیر جلد ا ص ۴۲۰۔

لہ ولا ثبات [1] زیادہ نہ کوئی حقیقت ہو اور نہ اس کو ثبات حاصل ہو۔

اور حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :۔

وقد ذکر الوزیر ابو المظفر یحیٰی بن محمد بن هبیرة فی کتابہ الاشراف فی مذهب الاشراف بابا فی السحر فقال اجمعوا علی ان السحر لہ حقیقة الا ابا حنیفة فانہ قال لا حقیقة لہ عندہ۔ [2]

اور وزیر ابو المظفر یحیٰی بن محمد بن ہبیرہ نے اپنی کتاب "الاشراف فی مذہب الاشراف" میں ایک باب سحر کے متعلق بھی رکھا ہے، اس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سحر کی بھی حقائق کی طرح ایک حقیقت ہے مگر امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ وہ قطعاً بے حقیقت شے ہے،

قال ابو عبد اللہ القرطبی وعندنا ان السحر حق ولہ حقیقة ویخلق اللہ عندہ ما یشاء خلافا للمعتزلة وابی اسحٰق الاسفرائینی من الشافعیة حیث قالوا انہ تمویہ او تخییل الخ [3]

ابو عبد اللہ قرطبی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سحر حقیقت ہے، اور ایک واقعی شے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے، مگر معتزلہ اور شوافع میں سے ابو اسحٰق اسفرائنی اس قول کے مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سحر محض فریبِ نظر اور خیال بندی کا نام ہے،

اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ تحریر فرماتے ہیں :۔

واختلف فی السحر فقیل هو تخییل فقط ولا حقیقة لہ وهذا اختیار ابی جعفر الاستراباذی من الشافعیة وابی بکر الرازی من الحنفیة وابن حزم الظاهری وطائفة قال النووی والصحیح ان لہ حقیقة وبہ قطع الجمهور وعلیہ عامة العلماء۔ [4]

اور سحر کے متعلق اختلاف ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ فقط تخییل کا نام ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ ابو جعفر شافعیؒ، ابو بکر رازی حنفی اور ابن حزم ظاہری اور ایک چھوٹی جماعت کا خیال ہے، اور نووی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ "سحر" حقائق میں سے ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اور جمہور اسی پر یقین رکھتے ہیں اور عام علماء کا یہی مسلک ہے۔

---

[1] احکام القرآن جلد ۱ ص ۴۸، [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۴۷، [3] " جلد ۱ ص ۱۴۷، [4] فتح الباری جلد ۱۰ ص ۱۸۲

اور جو علماء، سحر کو "حقیقت" تسلیم کرتے ہیں ان کے درمیان پھر یہ اختلاف رائے ہے کہ کیا خدائے تعالیٰ نے "سحر" میں یہ تاثیر بخشی ہے کہ وہ حقائق اور ماہیات میں بھی انقلاب کر دے یا مضرت رساں اشیاء کی طرح صرف نقصان دہ ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس کے اثر سے انسان کی حقیقت گھوڑے میں تبدیل ہو جائے یا گدھا مثلاً انسان ہو جائے، پس ایک چھوٹے سے گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس کے اندر انقلاب ماہیت کی تاثیر بھی ودیعت ہے اور جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس میں یہ تاثیر قطعاً ودیعت نہیں اور سحر کے ذریعہ کسی بھی ماہیت کا انقلاب نہیں ہوتا بلکہ اس مرحلہ پر وہ محض نظر بندی اور قوتِ متخیلہ کی شعبدہ بازی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

لکن محل النزاع هل يقع بالسحر انقلاب	لیکن محلِ نزاع یہ امر ہے کہ سحر سے ذات کا انقلاب ہو جاتا ہے
عين، اولا فمن قال انه تخييل فقط منع	یا نہیں پس جس شخص نے یہ کہا ہے کہ محض تخییل کا نام ہے
ذلك ومن قال ان له حقيقة اختلفوا	وہ تو انقلاب کے منکر ہیں اور جو سحر کو حقیقت مانتے ہیں وہ
هل له تاثير فقط بحيث يغير المزاج	اس بارہ میں مختلف الرائے ہیں آیا سحر کی تاثیر اسی حد تک ہے
فيكون نوعا من الامراض او ينتهی	کہ مزاج میں اس قسم کے تغیرات پیدا کر دے جس طرح امراض میں
الی الاحالة بحيث يصير الجماد حيوانا	ہوا کرتا ہے اور وہ بھی ایک مرض شمار ہو یا اس کی تاثیر اس سے
مثلا وعکسه فالذی عليه الجمهور هو	زیادہ ہے کہ ایک شے کی حقیقت کو بدل ڈالے مثلاً جماد کو حیوان
الاول وذهبت طائفة قليلة الی	بنا دے یا اس کا عکس کر دے پس جمہور پہلی بات کے قائل ہیں
الثانی الخ [1]	اور ایک چھوٹی سی جماعت دوسری بات کی !

اور اس تمام این وآں کے بعد ساحرینِ فرعون کے اس ساحرانہ مظاہرہ کے متعلق جو جشن کے دن حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے مقابلہ میں کیا گیا، حافظ ابن حجرؒ تصریح کرتے ہیں کہ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ محض تخییل اور تمویہ کی حد تک تھا، اور ابوبکر جصاصؒ اور ابن حجرؒ دونوں یہ تفصیل دیتے ہیں کہ ساحرینِ فرعون کی لاٹھیاں اور چمڑے کی رسیاں سانپ نہیں

[1] فتح الباری جلد ۱۰ ص ۱۸۳، احکام القرآن جلد ۱ ص ۵۰۔

بن گئی تھیں بلکہ ان کے اندر پارہ بھر دیا گیا تھا اور جس زمین میں یہ مظاہرہ کیا گیا تھا اس کو کھوکھلا کر کے اس کے اندر آگ بھر دی گئی تھی، چنانچہ وقتِ معین پر نیچے کی گرمی سے پارہ میں حرکت پیدا ہو گئی اور وہ لاٹھیاں اور رسّیاں سانپ کی طرح دوڑتی نظر آنے لگیں۔[1]

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں "سحر" پر بحث کرتے ہوئے لغوی معنی کے پیشِ نظر ان تمام اشیا کو بھی اقسامِ سحر میں شمار کرایا ہے جو عام نگاہوں میں تعجب خیز اور حیرت زا سمجھے جاتے ہیں، مثلاً مسمریزم، ہپناٹزم، تعویذات، حیرت زا نقاشی اور سائنس کی ایجادات اور دنیا کے مختلف عجائبات حتیٰ کہ مقرر کی جادو بیانی کو بھی اس عمومیت میں شامل کر لیا ہے، ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے:۔

إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا۔[2] — بلاشبہ بعض بیان جادو ہوتے ہیں۔

پس یہ واضح رہے کہ ان اقسام کا اُس "سحر" سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ہے جو مذہب اور اخلاق کی نگاہ میں مذموم، گمراہی یا کفر سمجھا جاتا ہے۔

سحر اور مذہب فقہائے اسلام نے "سحر" کے متعلق تصریح کی ہے کہ جن اعمالِ سحر میں شیاطین ارواحِ خبیثہ اور غیر اللہ سے استعانت کی جائے اور اُن کو حاجت روا قرار دے کر منتروں کے ذریعہ ان کی تسخیر سے کام لیا جائے تو وہ شرک کے مترادف ہے، اور اس کا عامل کافر ہے۔

اور جن اعمال میں ان کے علاوہ دوسرے طریقے استعمال کیے جائیں اور ان سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے ان کا مرتکب حرام اور گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

قرآنِ عزیز میں حضرتِ سلیمان (علیہ السلام) کے واقعہ میں مذکور ہے:۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ۔[3] — اور سلیمان نے کفر نہیں کیا لیکن شیاطین نے کفر کیا سکھاتے تھے وہ لوگوں کو سحر۔

---

[1] یہ تفصیل ہے ان اقوال کی جو سحر کے متعلق علماءِ سلف و خلف میں دائر رہے ہیں، ہم نے فریقین کے دلائل اور ان سے متعلق معرکۃ الآراء مباحث کو اس مقام پر قصداً ترک کر دیا ہے اس لیے کہ اس حیثیت سے اس مسئلہ کو چھیڑنا ایسی طوالت کا باعث ہے جو ہم کو کتاب کے مقصد سے دور لے جاتا ہے اور اختصار کے ساتھ بیان کرنا بجائے فائدہ کے نقصان دہ نظر آتا ہے۔ [2] بخاری جلد ۲ باب السحر۔ [3] فتح الباری جلد ۱۰ ص ۱۸۳۔

اور حدیث میں ہے:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اِجْتَنِبُوا الْمُوْبِقَاتِ الشرك باللہ والسحر[1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہلک باتوں سے بچو یعنی شرک سے اور جادو سے۔

اور حافظ ابن حجرؒ "حدیث سحر" پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

قال النووی عمل السحر حرام وھو من الکبائر بالاجماع وقد عدہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم من السبع الموبقات ومنہ مایکون کفراً ومنہ لایکون کفراً بل معصیۃ کبیرۃ فان کان فیہ قول او فعل یقتضی الکفر فھو کفر والا فلا واما تعلمہ وتعلیمہ فحرام اھ[2]	نوویؒ کہتے ہیں عمل سحر حرام ہے اور وہ بالاجماع کبائر میں سے ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سات مہلک چیزوں میں سے شمار کیا ہے اور سحر کی بعض صورتیں کفر ہیں اور بعض کفر تو نہیں ہیں مگر سخت معصیت ہیں پس اگر سحر کا کوئی منتر یا کوئی عمل کفر کا مقتضی ہے تو وہ کفر ہے ورنہ نہیں، بہرحال سحر کا سیکھنا اور سکھانا قطعاً حرام ہے۔

معجزہ اور سحر میں فرق علماءِ اسلام میں یہ بحث ہمیشہ سے معرکۃ الآراء رہی ہے کہ سحر اور معجزہ میں کیا فرق ہے؟ ایک شخص یہ کیسے اندازہ لگائے کہ یہ نبی و پیغمبر کا معجزہ ہے یا ساحر (جادوگر) کا سحر اور جادو؟ اس سلسلہ میں جو اہم علمی دلائل و براہین پیش کئے گئے ہیں اس کے لئے "علم کلام" کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، خصوصاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) کی کتاب النبوات اور شیخ محمد سفارینی کی شرح عقیدہ سفارینی قابلِ مطالعہ ہیں، البتہ اس مقام پر ایک سہل الوصول اور آسان دلیل پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نبی اور رسول کا اصل معجزہ اس کی وہ تعلیم ہوتی ہے جو وہ گم گشتگانِ راہِ حق اور بھٹکی ہوئی قوموں کی ہدایت کے لئے نسخۂ کیمیا اور دینی و دنیوی فلاح و کامرانی کے لئے بے نظیر قانون کی شکل میں پیش کرتا ہے یعنی "کتاب اللہ" لیکن جس طرح اربابِ علم و حکمت اس کے لائے ہوئے علوم و حِکَم اور بتائی ہوئی رشد و ہدایت کی صداقت و کمال کو پرکھتے ہیں اسی طرح عام انسانی دنیا کی سرشت و نہاد اس پر قائم ہے کہ وہ سچائی اور صداقت کے لئے بھی بعض ایسی چیزوں کے

[1] [2] فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۱۸۵

خواہش مند ہوتے ہیں جو لانے والے کے رُوحانی کرشموں سے تعلق رکھتی ہوں اور جن کے مقابلہ سے تمام دُنیوی طاقتیں عاجز ہو جاتی ہوں کیونکہ اُن کا مبلغِ علم کسی صداقت کے لئے اسی کو معیار قرار دیتا ہے۔

اس لئے "سنۃ اللہ" یہ جاری رہی ہے کہ وہ انبیاء و رسل کو دینِ حق کی تعلیم و پیغام کے ساتھ ایک یا چند نشانات (معجزات) بھی عطا کرتا ہے، اور جب وہ دعویٔ نبوت کے ساتھ بغیر اسباب کے ایسا "نشان" دکھاتا ہے جس کا کوئی دُنیوی طاقت مقابلہ نہیں کر سکتی تو اس کا نام "معجزہ" ہوتا ہے۔

اور اسی لئے یہ بھی "سنۃ اللہ" ہے کہ کسی نبی و رسول کو جو معجزہ یا نشان دیا جاتا ہے وہ اسی نوع میں سے ہوتا ہے جس میں اس قوم کو جس کو کہ سب سے پہلے اس پیغمبر نے خطاب کیا ہے "درجۂ کمال" حاصل ہو۔ اور وہ اس کے تمام دقائق سے بخوبی آگاہ ہو تاکہ اس کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو سکے کہ پیغمبر کا یہ نشان انسانی اور بشری طاقت سے بالاتر قوت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اگر تعصب اور ہٹ دھرمی حائل نہ ہو تو وہ بے ساختہ یہ اقرار کرلے کہ:

"ایں سعادت بزورِ بازو نیست ٭ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"

اور اسی طرح ہر فردِ بشر پر خدا کی حجت تمام ہو جائے۔

پس معجزہ دراصل براہِ راست خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو بغیر اسباب کے ایک صادق کی صداقت کے لئے وجود میں آتا ہے، اور وہ کسی اصول و قوانین پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سیکھا جا سکے اور نبی ہر وقت اس کے کر دکھانے پر قادر ہو تا وقتیکہ مخالفین صداقت کے سامنے بطور تحدی (چیلنج) اس کو دکھانے کی ضرورت پیش نہ آجائے، سو جب وہ اہم وقت آتا ہے اور "نبی" خدا سے رجوع کرتا ہے تو خدائے تعالیٰ کی جانب سے اس کو کر دکھانے کی قوت عطا ہو جاتی ہے، بخلافِ سحر اور جادو کے کہ وہ ایک "فن" ہے کہ جس کو اس کے اصول و قوانین کی پابندی کے ساتھ ہر فن داں ساحر ہر وقت کام میں لا سکتا ہے، اس کے اسباب اگرچہ عام نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن اس فن کے تمام واقف کار اُس سے واقف

ہوتے ہیں اسی لئے وہ دوسرے علوم و فنون کی طرح مدوّن و مرتب فن ہے جس کو مصریوں، چینیوں، اور ہندیوں نے بہت فروغ دیا اور حدِ کمال کو پہنچایا۔

یہ مسئلہ کی علمی حیثیت ہے کہ جس سے معجزہ اور سحر کی حدود قطعاً جدا اور متمائز ہو جاتی ہیں، رہا حس اور مشاہدہ کا معاملہ تو "معجزہ" اور "سحر" میں یہ فرق ہے کہ ساحر کی عام زندگی خوف و دہشت ایذا رسانی اور بد عملی سے وابستہ ہوتی ہے اور لوگ اس نظر سے ساحر سے خوف کھاتے ہیں یا اُس کے سامنے مرعوب ہو جاتے ہیں، بخلاف نبی اور رسول کے کہ اس کی تمام زندگی صداقت خلوص، مخلوقِ خدا کی ہمدردی و غمگساری، اور تقویٰ و طہارت سے وابستہ ہوتی ہے اور اس کا کیرکٹر بے داغ اور صاف اور روشن ہوتا ہے، اور وہ معجزہ کو پیشہ نہیں بناتا بلکہ خاص اہم موقع پر صداقت اور حق کی حمایت میں اس کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ ایسے وقت معجزہ دکھاتا ہے جبکہ دشمن بھی اُس کی عصمت و صداقت اور کیرکٹر کی پاکیزگی کے پہلے سے معترف ہوتے ہیں مگر اسکی دعوت کو یا شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یا جحود و انکار کے نقطۂ نظر سے اور پھر اس سے معجزہ کے طالب ہوتے ہیں، نیز اگر سحر اور معجزہ کا مقابلہ آن پڑے تو معجزہ غالب رہے گا اور اعلیٰ سے اعلیٰ سحر بھی مغلوب و عاجز، اور اس کا عکس محال اور ناممکن ہے، چنانچہ ساحرین اور انبیاء و رسل کے مقابلہ کی تاریخ اس کی شاہدِ عدل ہے۔

الحاصل موسیٰ (علیہ السلام) کو عصا اور ید بیضا کے نشانات (معجزہ) اس لئے عطا کیے گئے کہ ان کے زمانے میں مصر سحر اور جادو کا مرکز تھا اور فنِ سحر شباب پر، اور مصریوں نے تمام دنیا کے مقابلہ میں اس کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا تھا۔

لہٰذا "سنۃ اللہ" کا تقاضا تھا کہ ایسے زمانہ میں موسیٰ (علیہ السلام) کو ایسے نشانات (معجزات) عطا کیے جائیں جو اسی نوع سے متعلق ہوں تاکہ جب انکار پر اصرار حد سے بڑھ جائے اور معاندین و مخالفین اپنے محیر العقول سحر اور جادو کے ذریعہ اُن کے مقابلہ پر آجائیں تو خدا کے نشان (معجزات و آیات اللہ) مخالفوں کو یہ باور کرا دیں کہ موسیٰ کے پاس جو قوت و طاقت ہے وہ انسانی

صنعتوں اور عجوبہ کاریوں سے بلند اور بشری دسترس سے باہر ہے، اور اس طرح عوام و خواص کو ان کی صداقت اور اُن کے "من اللہ" ہونے کا یقین آجائے اور خواہ زبان اقرار کرے یا نہ کرے لیکن ان کا عجز اور اُن کی درماندگی علیٰ رؤس الاشہاد ان کے دلوں کے اقرار کی شہادت دینے لگے۔

حضرتِ موسیٰ اور ساحروں کا مقابلہ

بہرحال یومِ جشن آپہنچا، میدانِ جشن میں تمام شاہانہ کر و فر کے ساتھ فرعون تخت نشین ہے اور درباری بھی حسبِ مراتب قرینے سے بیٹھے ہیں اور لاکھوں انسان حق و باطل کے معرکہ کا نظارہ کرنے کو جمع ہیں، ایک جانب مصر کے مشہور جادوگروں کا گروہ اپنے ساز و سامانِ سحر سے لیس کھڑا ہے، اور دوسری جانب خدا کے رسول حق کے پیغامبر سچائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰ و حضرتِ ہارون (علیہما السلام) کھڑے ہیں، فرعون بہت مسرور ہے اور اس یقین پر کہ ساحرینِ مصر ان دونوں کو جلد ہی شکست دیدیں گے، ساحروں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے، اگر تم نے موسیٰ کو شکست دیدی تو نہ صرف انعام و اکرام سے مالامال کئے جاؤ گے بلکہ میرے دربار میں خاص جگہ پاؤ گے، ساحر بھی اپنی کامیابی کے یقین پر فرعون سے اپنے اعزاز و اکرام کا وعدہ لے رہے ہیں، اور مستقبل کے تصور سے بہت شاداں اور مسرور ہیں۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ (اعراف)	اور جادوگر فرعون کے پاس آئے اور کہنے لگے کیا اگر ہم موسیٰ پر غالب آجائیں تو ہمارے لئے انعام و اکرام ہے؟ فرعون نے کہا ہاں ضرور، اور یہی نہیں بلکہ تم مقربین بارگاہِ شاہی ہو گے۔
فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۝ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ	پھر وعدہ کے دن جادوگر جمع ہو گئے، اور لوگوں سے کہا گیا کہ تم (اس میدان میں) جمع ہو گے، شاید ہم جادوگروں کی پیروی کریں اگر وہ غالب رہیں، سو جب جادوگر آگئے تو انھوں نے فرعون سے کہا کیا ہمارے لئے انعام ہے اگر ہم غالب رہیں؟ فرعون نے کہا ہاں، اور تم اس صورت میں (ہمارے)

وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ (ع شعراء) — مقربین میں سے ہو گے۔

جادوگروں نے جب اس طرف سے اطمینان کرلیا تو اب حضرت موسیٰؑ کی طرف متوجہ ہوئے مگر قبل اس کے کہ ایک دوسرے کو چیلنج کریں، حضرتِ موسیٰؑ نے حق تبلیغ ادا فرماتے ہوئے مجمع کو مخاطب کرکے فرمایا: تمہاری حالت پر سخت افسوس ہے، تم کیا کر رہے ہو؟ تم ہم کو جادوگر کہہ کر خدا پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ، مجھ کو ڈر ہے کہیں وہ تم کو اس بہتان طرازی کی سزا میں عذاب دے کر تم کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکے۔ کیونکہ جس کسی نے بھی بہتان باندھا وہ نامراد ہی رہا، لوگوں نے یہ سنا تو آپس میں ردّوکد شروع کردی اور سرگوشیاں کرنے لگے اور درباریوں نے یہ حال دیکھا تو جادوگروں کو مخاطب کرکے کہنے لگے یہ دونوں بھائی بلاشبہ جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ جادو کے زور سے تم کو تمہارے وطن سے نکال دیں اور تم پر غلبہ کرلیں تم اپنا کام شروع کرو اور پرے باندھ کر موسیٰؑ کے مقابلہ میں ڈٹ جاؤ آج جو بھی غالب آجائے گا وہی کامیاب ثابت ہوگا۔

قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُم بِعَذَابٍ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ ۝ فَتَنَازَعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ وَأَسَرُّوا النَّجْوَىٰ ۝ قَالُوا إِنْ هَٰذَانِ لَسَاحِرَانِ يُرِيدَانِ أَن يُخْرِجَاكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ ۝ فَأَجْمِعُوا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوا صَفًّا ۚ وَقَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَىٰ ۝ (ع طٰهٰ)	موسیٰؑ نے کہا افسوس تم پر! دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ ایسا نہو کہ وہ کوئی عذاب بھیجکر تمہاری جڑ اکھاڑ دے جس کسی نے جھوٹ بات بنائی وہ ضرور نامراد ہوا پس لوگ آپس میں ردوکد کرنے لگے اور پوشیدہ سرگوشیاں شروع ہوگئیں پھر (درباری) بولے یہ دونوں بھائی ضرور جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کریں اور پھر تمہارے شرف اور تمہاری عظمت کے مالک ہوجائیں، پس اپنے سارے داؤں جمع کرو اور پرا باندھ کر ڈٹ جاؤ، جو آج بازی لے گیا وہی کامیاب ہوگا۔

جادوگروں نے آگے بڑھ کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا، موسیٰ! اس قصہ کو چھوڑ اور یہ بتا کہ ابتداء تیری جانب سے ہوگی یا ہماری جانب سے؟ حضرتِ موسیٰؑ نے جب یہ دیکھا کہ ان پر اس تنبیہ کا بھی

کوئی اثر نہیں ہوا تو فرمایا کہ ابتدا تم ہی کرو، اور اپنے کمالِ فن کی پوری حسرت نکال لو، چنانچہ ساحروں نے اپنی رسّیاں، بان اور لاٹھیاں زمین پر ڈالیں جو سانپ اور اژدہے کی شکل میں دوڑتی نظر آنے لگیں، حضرتِ موسیٰؑ نے یہ دیکھا تو دل میں خوف وہراس محسوس کیا کہ کہیں لوگ اس مظاہرہ سے متاثر نہ ہو جائیں اور ساحروں کے سحر کو حقیقت نہ سمجھ لیں، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو یہ تاثر اور رعب قبولِ حق کے لئے سدِ راہ بن جائے گا، تب خدائے تعالیٰ نے اُن کو مطمئن فرمایا اور وحی کے ذریعہ مطلع کیا کہ موسیٰؑ خوف نہ کھاؤ ہمارا وعدہ ہے کہ تم ہی غالب رہو گے، اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالو، موسیٰ (علیہ السّلام) نے جب لاٹھی کو ڈالا تو اژدہا بن کر اُس نے ساحروں کے تمام شعبدوں کو نگل لیا اور تھوڑی سی دیر میں سارا میدان صاف ہو گیا، اور اس طرح ساحر اپنے سحر میں ناکامیاب رہے:

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰی ○ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی ○ فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ○ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ○ وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی ○ (طٰہٰ)

جادوگروں نے کہا اے موسیٰؑ! تم پہلے اپنی لاٹھی پھینکو یا پھر ہماری طرف سے پہل ہو، موسیٰؑ نے کہا نہیں تم ہی پہلے پھینکو، چنانچہ انھوں نے اپنا کرتب دکھایا اور اچانک موسیٰؑ کو ان کے جادو کی وجہ کر ایسا دکھائی دیا کہ اُن کی رسّیاں اور لاٹھیاں سانپ کی طرح دوڑ رہی ہیں، موسیٰؑ نے دل میں ہراس محسوس کیا (کہ اس منظر سے لوگ متاثر نہ ہو جائیں) ہم نے کہا۔ "اندیشہ نہ کر تو ہی غالب رہے گا، تیرے داہنے ہاتھ میں جو لاٹھی ہے فوراً پھینک دے، جادوگروں کی تمام بناوٹیں نگل جائے گی انھوں نے جو کچھ کیا ہے محض جادوگروں کا فریب ہے، اور جادوگر کسی راہ سے آئے کبھی کامیابی نہیں پا سکتا۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِیْنَ ○ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ ○ وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِیَ

جادوگروں نے کہا اے موسیٰ! یا تم اپنی لاٹھی پھینکو یا پھر ہم پھینکیں، موسیٰ نے کہا تم ہی پہلے پھینکو، پھر جب جادوگروں نے جادو کی بنائی ہوئی لاٹھیاں اور رسّیاں پھینکیں تو لوگوں کی نگاہیں جادو سے مار دیں اور اپنے کرتبوں سے ان میں دہشت پھیلا دی اور بہت بڑا جادو بنا لائے اور اس وقت ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ تم بھی اپنی لاٹھی ڈال دو، جونہی اس نے

تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُوْنَ ۚ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ	لاٹھی پھینکی تو اچانک کیا ہوا کہ جو کچھ جھوٹی نمائش جادوگروں کی تھی سب
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۚ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ	اُس نے نگل کر نابود کردی، پس حق قائم ہوگیا اور وہ جو عمل کر رہے تھے باطل
وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۚ (اعراف ع ۱۴)	ہوکر رہ گیا پس اس موقع پر وہ مغلوب ہوگئے اور ذلیل ہوکر بولے۔
فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى	جب جادوگر آموجود ہوئے تو موسیٰ نے کہا "تمہیں جو کچھ میدان میں
اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ فَلَمَّآ اَلْقَوْا	ڈالنا ہو ڈال دو" جب انھوں نے جادو کی رسّیاں اور لاٹھیاں
قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ۭ اِنَّ	ڈال دیں تو موسیٰ نے کہا تم جو کچھ بنا کر لائے ہو یہ جادو ہے اور یقیناً
اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ	اُسے اللہ ملیا میٹ کردے گا، اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ مفسدوں
عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ	کا کام نہیں سنوارتا، وہ حق کو اپنے احکام کے مطابق ضرور ثابت
بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (یونس ع ۸)	کردکھائے گا، اگرچہ مجرموں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے۔

جادوگروں نے "جو کہ اپنے فن کے ماہر و کامل تھے" جب عصاءِ موسیٰؑ کا یہ کرشمہ دیکھا تو وہ حقیقتِ حال سمجھ گئے اور جس کو اس وقت تک فرعون اور اس کے درباری لوگ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے وہ اس کو نہ چھپا سکے اور انھوں نے برسرِ مجلس یہ اقرار کرلیا کہ موسیٰؑ کا یہ عمل جادو سے بالاتر خدا کا معجزہ ہے اس کا سحر سے دُور کا بھی واسطہ نہیں اور پھر فوراً سجدہ میں گر پڑے اور اعلان کردیا کہ ہم موسیٰؑ اور ہارونؑ کے پروردگار پر ایمان لے آئے کیوں کہ وہی "رب العٰلمین" ہے۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا	پس سب جادوگر سجدہ میں گر گئے اور کہنے لگے ہم ہارونؑ
بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝ (طٰہٰ ع)	اور موسیٰؑ کے رب پر ایمان لے آئے۔
وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا	اور سب جادوگر سجدہ میں گر پڑے، کہنے لگے ہم تو جہانوں کے
بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ (اعراف ع)	پروردگار پر ایمان لے آئے جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کا پروردگار ہے،

فرعون نے جب یہ دیکھا کہ میرا تمام دامِ فریب تار تار ہوگیا، اور موسیٰؑ کو شکست دینے کی جو آخری پناہ تھی وہ بھی منہدم ہوگئی، اب کہیں ایسا نہ ہو کہ مصری عوام بھی ہاتھ سے جائیں اور موسیٰؑ

اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے تو اس نے مکروفریب کا دوسرا طریقہ اختیار کیا اور ساحروں سے کہنے لگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ تم سب کا اُستاذ ہے اور تم سب نے آپس میں سازش کر رکھی تھی تب ہی تو میری رعایا ہوتے ہوئے میری اجازت کے بغیر تم نے موسیٰ کے خدا پر ایمان لانے کا اعلان کر دیا، اچھا! میں تم کو عبرتناک سزا دوں گا تاکہ آئندہ کسی کو ایسی غداری کی جرأت نہ ہو، پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا اور پھر سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ○ (ع طٰہٰ)	فرعون نے کہا تم بغیر میرے حکم کے موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، اچھا دیکھو میں کیا کرتا ہوں میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا، پھر تمہیں پتہ چلے گا ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے، اور کس کا عذاب دیرپا ہے؟
قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ (اعراف ع)	فرعون نے کہا مجھ سے اجازت لئے بغیر تم موسیٰ پر ایمان لے آئے! ضرور یہ ایک پوشیدہ تدبیر ہے جو تم نے مل جل کر شہر میں کی ہے تاکہ اس کے باشندوں کو اس سے نکال باہر کرو، اچھا تھوڑی دیر میں تمہیں اس کا نتیجہ معلوم ہوجائیگا

مگر سچا ایمان جب کسی کو نصیب ہوجاتا ہے خواہ وہ ایک لمحہ کا ہی کیوں نہ ہو وہ ایسی بے پناہ روحانی قوت پیدا کر دیتا ہے کہ کائنات کی کوئی زبردست سے زبردست طاقت بھی اس کو مرعوب نہیں کرسکتی، دیکھئے، وہی جادوگر جو فرعون سے تھوڑی دیر پہلے انعام واکرام اور عزت وجاہ کی آرزوئیں اور التجائیں کر رہے تھے، ایمان لانے کے بعد ایسے نڈر اور بیخوف ہوگئے کہ ان کے سامنے سخت سے سخت مصیبت اور دردناک سے دردناک عذاب بھی ہیچ ہوکر رہ گیا اور کوئی دہشت بھی ان کے ایمان کو متزلزل نہ کرسکی اور انھوں نے

فرعون کی موجودگی ہی میں بے دھڑک اسلام کا اعلان کر دیا، اور جب انھوں نے فرعون کی ان جابرانہ دھمکیوں کو سُنا تو کہنے لگے :۔

قَالُوا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا	انھوں نے کہا ہم یہ کبھی نہیں کر سکتے کہ سچائی کی جو روشن دلائل ہمارے
مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا	سامنے آگئی ہیں اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس سے مُنہ
فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا	موڑ کر تیرا حکم مان لیں تو جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر گذر تو زیادہ سے
تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ	زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے
اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا	ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے کہ وہ ہماری خطائیں بخش دے
وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ	خصوصاً جادوگری کی خطا کہ جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، ہمارے
وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ (طٰہٰ)	لئے اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔
قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۡ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ؁	جادوگروں نے کہا (تیرا یہ عذاب ہمارے لئے) کوئی نقصان کی بات نہیں
اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ	بلاشبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جانے والے ہیں، بیشک ہم اس کے
اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؀ (شعراء)	حریص ہیں کہ وہ ہماری خطاؤں کو بخشدے کیونکہ ہم ہوگئے مومنوں میں اول

غرض حق و باطل کی اس کشمکش میں فرعون اور اس کے اعیان و ارکان کو سخت شکست اُٹھانی پڑی اور وہ برسرِ عام ذلیل و رسوا ہوئے اور حضرت موسیٰؑ پر خدا کا وعدہ پورا ہوا اور کامیابی کا سہرا اُن ہی کے سر رہا۔

اس صورتِ حال کو دیکھ کر جادوگروں کے علاوہ اسرائیلی نوجوانوں میں سے بھی ایک مختصر جماعت مسلمان ہوگئی مگر وہ فرعون کے ظلم و ستم کی وجہ سے اعلان نہ کر سکی کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ اس کی عام قاہرانہ ستم کیشیوں اور ظلم پرستیوں کے علاوہ اس وقت کی ذلت نے اس کو اور زیادہ غضبناک بنا دیا تھا۔

حضرت موسیٰؑ نے ان کو تلقین فرمائی کہ اب مؤمن ہونے کے بعد تمہارا سہارا صرف خدا پر ہونا چاہئے، جماعتِ مومنین نے اس پر لبیک کہا اور وہ خدا کے سامنے گڑگڑا کر رحمت و

مغفرت کی دعائیں اور ظالموں کے عذاب و معصیت سے محفوظ رہنے کی التجائیں کرنے لگے،

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّیَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ
عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهِمْ اَنْ
یَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی
الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ ○ وَ
قَالَ مُوْسٰى یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ
بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ
مُّسْلِمِیْنَ ○ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا
لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ○ وَنَجِّنَا
بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ○ (یونس ع)

پھر موسیٰؑ پر کوئی ایمان نہیں لایا، مگر صرف ایک گروہ جو اس قوم
کے نوجوانوں کا گروہ تھا وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے
ڈرتا ہوا کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ ڈالدے اور اس میں شک نہیں کہ
فرعون سرزمین مصر پر تمرد انہ قابض اور ظلم و استبداد میں بالکل چھوٹ
تھا اور موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: لوگو! اگر تم فی الحقیقت اللہ پر ایمان
لائے ہو اور اسکی فرمانبرداری کرنی چاہتے ہو تو چاہئے کہ صرف اسی پر بھروسہ
کرو اور فرعون کی طاقت سے نہ ڈرو پس انھوں نے کہا: ہم صرف اللہ ہی
پر بھروسہ کرتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم کو ظالم قوم کی آزمائش
میں نہ ڈال اور ہم کو اپنی رحمت سے منکروں سے نجات دے۔

الحاصل فرعون حضرتِ موسیٰؑ کی روحانی قوت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر بیحد مرعوب ہوگیا اور اگرچہ وہ جادوگروں پر اپنے انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کرتا رہا لیکن حضرتِ موسیٰؑ سے اس وقت کچھ کہنے کی مطلق ہمت نہ پڑی اور درباریوں اور ارکانِ سلطنت نے جب یہ احتجاج کیا کہ تو موسیٰؑ کو قتل کیوں نہیں کرا دیتا، کیا اس کو اور اس کی قوم کو یہ موقع دیا جا رہا ہے کہ وہ مصر میں فساد پھیلائیں اور تجھ کو اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکراتے رہیں؟ تو کہنے لگا کہ تم گھبراتے کیوں ہو؟ میں اسرائیلیوں کی طاقت کو بڑھنے نہ دونگا اور مقابلہ کے قابل ہی نہ رکھوں گا، ابھی یہ حکم جاری کرتا ہوں کہ ان کی اولاد نرینہ کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا کرو اور صرف لڑکیوں کو چاکری کے لئے زندہ رہنے دو۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ
مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ
وَیَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ

اور فرعون کی قوم میں سے ایک جماعت نے فرعون سے
کہا کیا تو موسیٰؑ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ وہ
زمین (مصر) میں فساد کرتے پھریں اور تجھ کو اور تیرے

أَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ۝ (اعراف ع۱۵)

دیوتاؤں کو ٹھکرائیں فرعون نے کہا ہم ان کے لڑکوں کو قتل کردیں گے اور انکی لڑکیوں کو (باندیاں بنانے کیلئے) زندہ رکھیں گے اور ہم ان پر ہر طرح غالب ہیں اور وہ ہمارے ہاتھوں میں بے بس ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُونَ فَقَالُوا سَاحِرٌ كَذَّابٌ ۝ فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْحَقِّ مِنْ عِندِنَا قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ ۚ وَمَا كَيْدُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝ (غافر ع۳)

اور بلاشبہ ہم نے فرعون ہامان اور قارون کی طرف موسیٰ کو رسول بنا کر اور واضح نشان دے کر بھیجا، پس انھوں نے کہا کہ یہ تو جادوگر ہے جھوٹا، پھر جب وہ ہمارے پاس سے ان کے پاس حق لے کر آیا تو کہنے لگے کہ جو لوگ اس (موسیٰ) پر ایمان لے آئے ہیں، ان کے لڑکوں کو مار ڈالو اور ان کی لڑکیوں کو باقی رہنے دو، اور (انجام کار) کافروں کا مکروفریب باطل و برباد ہو کر رہا۔

گویا فرعون کا یہ دوسرا اعلان تھا جو بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل سے متعلق کیا گیا۔

حضرتِ موسیٰ اور بنی اسرائیل

تاریخ کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ جب کسی قوم پر غلامی کی حالت میں صدیاں گذر جاتی ہیں تو اس کی زبوں حالی اور پستی کے حدود یہیں ختم نہیں ہو جاتے کہ وہ مفلس و بدحال ہوں اور کاہل و پریشان بال، بلکہ ان کے قوائے عملی کی خرابی سے زیادہ اُنکے قوائے دماغی بیکار، مضمحل، اور ناکارہ ہو جاتے ہیں، اُن میں سے ہمت و شجاعت مفقود ہو جاتی ہے اور وہ پستی پر ہی قناعت کر لیتے ہیں، نا امیدی اُن کا شیوہ ہو جاتا ہے اور ذلت و نکبت کو وہ صبر و قناعت سمجھنے لگتے ہیں، اس لئے جب کوئی مصلح یا پیغمبر و رسول اس دماغی و عملی پستی سے نکالنے کے لئے ان کو پکارتا اور ہمت و شجاعت پر آمادہ کرتا ہے تو یہ ان کے لئے سب سے مشکل اور ناممکن العمل پیغام نظر آتا ہے اور کبھی وہ اس راہ کی سختیوں سے گھبرا کر آپس میں دست بگریباں ہونے لگتے، اور کبھی اپنے نجات دہندہ پر

شک وشبہ کی نگاہ ڈالنے لگتے ہیں اور اگر اس جدوجہد میں ان کو کوئی فائدہ حاصل ہو جاتا ہے تو وقار اور سنجیدگی سے بھی گذر کر اظہارِ مسرت کرنے لگتے ہیں، اور اگر اس راہ میں کوئی آزمائش اور مصیبت کا سوال آپڑتا ہے تو مصلح یا پیغمبر کو الزام دینے لگتے ہیں، کہ ہم کو خواہ مخواہ تونے اس مصیبت میں پھنسایا، ہم تو اپنی حالت پر ہی صابر و شاکر تھے۔

یہی حال بنی اسرائیل کا حضرتِ موسیٰؑ کے ساتھ تھا، چنانچہ حضرتِ موسیٰؑ کو تبلیغِ حق سے لے کر مصر سے خروج کے وقت تک جو حالات پیش آئے وہ اس امر کی زندہ شہادت ہیں،

چنانچہ حضرتِ موسیٰؑ کو جب فرعون اور اس کے درباریوں کی گفتگو کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے بنی اسرائیل کو جمع کر کے صبر اور توکل الی اللہ کی تلقین کی، بنی اسرائیل نے سنکر جواب دیا کہ موسیٰ! ہم پہلے ہی سے مصیبتوں میں گرفتار تھے اب تیرے آنے پر کچھ امید بندھی تھی مگر تیرے آنے کے بعد بھی وہی مصیبت باقی رہی، یہ تو سخت آفت کا سامنا ہے۔

حضرتِ موسیٰؑ نے تسلی دی کہ خدا کا وعدہ سچا ہے، گھبراؤ نہیں تم ہی کامیاب ہوگے اور تمہارے دشمن کو ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑے گا، زمین کا مالک فرعون یا اسکی قوم نہیں ہے بلکہ رب العالمین اور مختارِ مطلق خدا ہے، پس وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا مالک بنا دے اور انجام کار یہ انعام متقیوں کا ہی حصہ ہے۔

قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللّٰهِ	موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو، بلاشبہ
وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُورِثُهَا	زمین اللہ کی ملک ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسکو چاہتا ہے
مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ	وارث بنا دیتا ہے اور انجام (کی کامیابی) متقیوں کیلئے ہی ہے
لِلْمُتَّقِينَ ۝ قَالُوا أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ	انھوں نے جواب دیا "تیرے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبت
أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ	میں تھے اور تیرے پیغام لانے کے بعد بھی مصیبت ہی میں
قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ	گرفتار ہیں" موسیٰ نے کہا وہ وقت قریب ہے کہ تمہارا پروردگار
وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ	تمہارے دشمن کو برباد کر دے گا اور تم کو اس زمین کا خلیفہ

كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿ (اعراف ع۱) بنادے گا اور پھر دیکھے گا کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔

اس کے بعد حضرتِ موسیٰؑ نے مسلمانوں سے کہا کہ فرعون کے مظالم کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا، اور بنی اسرائیل اور قبطی مومنوں کو آزادی کے ساتھ مصر سے چلے جانے پر راضی نہیں ہے اس لئے خدا کے فیصلہ تک تم سرزمینِ مصر ہی میں اپنے گھروں کو مساجد بنالو اور ان کو قبلہ رُخ کر کے خدائے واحد کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ کہ خدا کی وحی کا یہی فیصلہ ہے، اور ساتھ ہی خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی، بار الہا! فرعون اور فرعونیوں کو تو نے جو دولت و سطوت عطا فرمائی ہے اس پر شکریہ ادا کرنے کے بجائے وہ تیرے بندوں پر جبر اور ظلم و ستم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور تیری راہِ حق کو نہ یہ خود قبول کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے ہیں بلکہ جبر و تشدد سے کام لے کر ان کے آڑے آتے ہیں لہٰذا اب تو ان کے مظالم کا ذائقہ چکھا، اور ان کی اس دولت و ثروت کو تباہ و ہلاک کردے جس پر یہ نازاں ہیں، اور جس طرح یہ ایمان کی سچائی کو ٹھکرا رہے ہیں تو بھی انکو ایمان کی دولت کے بجائے اب ایسا دردناک عذاب دے کہ اُن کی داستان دوسروں کے لئے عبرت بن جائے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ	اور ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ پر وحی کی کہ اپنی
لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ	قوم کے لئے مصر میں مکان بناؤ اور ان کو قبلہ رُخ تعمیر کرو اور ان
قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ	میں نماز قایم کرو، اور جو ایمان لائے ہیں انہیں کامیابی کی
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ	بشارت دو، اور موسیٰؑ نے دعا مانگی خدایا تو نے فرعون اور
اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً	اس کے سرداروں کو اس دنیا کی زندگی میں زیب و
وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا	زینت کی چیزیں اور مال و دولت کی شوکتیں بخشی ہیں،
لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ	تو خدایا! کیا اسلئے کہ تیری راہ سے یہ لوگوں کو بھٹکائیں،
عَلٰٓي اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ	خدایا ان کی دولت زائل کردے اور ان کے دلوں پر

فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ○ قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَلَا تَتَّبِعَآنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (یونس ع)

مہر لگا دے کہ اُس وقت تک یقین نہ کریں کہ جب تک عذاب دردناک اپنے سامنے نہ دیکھ لیں، اللہ نے فرمایا: میں نے تم دونوں کی دعا قبول کی تو اب تم اپنی راہ میں جم کر کھڑے ہو جاؤ اور ان لوگوں کی پیروی نہ کرو جو میرا طریقِ کار نہیں جانتے۔

فرعون نے اپنے سرداروں سے اگرچہ اطمینان کا اظہار کر دیا تھا، لیکن حضرت موسیٰؑ کے روحانی غلبہ کا خیال اس کو اندر ہی اندر گھلائے ڈالتا تھا اور بنی اسرائیل کی اولادِ نرینہ کے قتل کے حکم سے بھی اس کو سکونِ قلب نصیب نہ تھا، آخر اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ موسیٰؑ کو قتل کئے بغیر یہ معاملہ ختم نہیں ہوگا، لہٰذا سرداروں اور ندیموں سے ایک روز کہنے لگا کہ اگر موسیٰؑ کو ہم نے یوں ہی چھوڑے رکھا تو مجھے یہ خوف ہے کہ یہ تمہارے دین کو بھی آہستہ آہستہ بدل ڈالیگا اور تمام مصر میں فساد مچادے گا' اب یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ موسیٰؑ کو قتل کر دیا جائے، حضرتِ موسیٰؑ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں ایسے متکبر و مغرور سے کیا ڈرتا ہوں، جو خدا کے یومِ حساب سے نہیں ڈرتا، میرا پشت پناہ تو وہ ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تم سب کا بھی، میں صرف اُسی کی پناہ چاہتا ہوں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَکُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ○ وَقَالَ مُوْسٰۤی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ○ (مومن ع)

اور فرعون نے کہا: مجھے موسیٰؑ کو قتل ہی کر لینے دو اور اس کو چاہیئے کہ اپنے رب کو پکارے، میں ڈرتا ہوں کہ وہ تمہارے دین کو بدل ڈالے یا زمین میں فساد برپا کر دے اور موسیٰؑ نے کہا: میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ چاہتا ہوں ہر اُس متکبر سے جو حساب کے دن پر ایمان نہیں لاتا۔

فرعون اور اس کے سردار جب اس گفتگو میں مصروف تھے تو اس مجلس میں ایک مصری "مردِ مومن" بھی تھا، جس نے ابھی تک اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا تھا، اس نے جب یہ سنا تو

اپنی قوم کے ان افراد کے مقابلہ میں حضرتِ موسیٰؑ کی جانب سے مدافعت کی کوشش شروع کی، اور اُن کو سمجھایا کہ تم ایسے شخص کو قتل کرنے چلے ہو جو یہ سچی بات کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور جو تمہارے سامنے اپنی صداقت پر بہترین دلائل و نشانات لایا ہے، اور بالفرض اگر وہ جھوٹا ہو تو اس کے جھوٹ سے تم کو کچھ نقصان نہیں پہنچ رہا ہے اور اگر وہ سچا ہے تو پھر اس کی اُن وعیدوں سے ڈرو جو وہ تم کو خدا کی جانب سے سناتا ہے۔

فرعون نے مردِ مومن کا کلام قطع کرتے ہوئے کہا کہ میں تم کو وہی مشورہ دے رہا ہوں جس کو اپنے خیال میں درست سمجھتا ہوں اور تمہاری بھلائی کی بات کہہ رہا ہوں۔

مردِ مومن نے آخری نصیحت کے طور پر پھر کہا "اے میری قوم! مجھے یہ خوف ہے کہ ہمارا حال کہیں اُن پچھلی قوموں کا سا نہ ہو جائے جو قومِ نوح، عاد اور ثمود کے نام سے مشہور ہیں یا اُن کے بعد جو قومیں آئیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا، بلکہ ان قوموں کی ہلاکت خود اپنے اسی قسم کے اعمال کی بدولت پیش آئی تھی، جو آج تم موسیٰؑ کے خلاف سوچ رہے ہو، تم تو آج دنیا کی وجاہت کے سوچ میں پڑے ہو اور میں تمہارے لئے اس دن سے ڈر رہا ہوں جب قیامت کا دن ہوگا اور سب ایک دوسرے کو پکاریں گے مگر اس وقت تمہیں کوئی خدا کے عذاب سے بچانے والا نہ ہوگا۔

اے قوم کے سردارو! تمہارا حال تو یہ ہے کہ اس سرزمین میں جب حضرت یوسف (علیہ السلام) نے خدا کا پیغام سنایا تھا تب بھی تم یعنی تمہارے باپ دادا اسی شک و تردد میں پڑے رہے اور ان پر ایمان نہ لائے اور جب اُن کی وفات ہوگئی تو کہنے لگے کہ اب خدا اپنا کوئی رسول نہیں بھیجے گا، اب یہی معاملہ تم موسیٰؑ کے ساتھ کر رہے ہو، خدارا سمجھو اور سیدھی راہ اختیار کرو۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ	اور بولا ایک مردِ ایمان دار فرعون کے لوگوں میں جو چھپاتا
يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ	تھا اپنا ایمان کیا مارے ڈالتے ہو ایک مرد کو اس بات پر کہ
يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ	کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور لایا ہمارے پاس کھلی

بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا
فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا
يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝
يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي
الْاَرْضِ ۫ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ
اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا
مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝
وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ
عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝ مِثْلَ
دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ
مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝
وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝
يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ
مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ
مِنْ هَادٍ ۝ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ
قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا
جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ
لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ
كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ
مُّرْتَابُ ۚ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ

نشانیاں تمہارے رب کی، اور اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس پر
پڑے گا اس کا جھوٹ، اور اگر وہ سچا ہوگا تو تم پر پڑیگا
کوئی نہ کوئی وعدہ جو تم سے کرتا ہے، بے شک اللہ
راہ نہیں دیتا جو ہو بے لحاظ جھوٹا، اے میری قوم!
آج تمہارا راج ہے، غالب ہو رہے ہو ملک میں، پھر
کون مدد کرے گا ہماری اللہ کی آفت سے اگر آگئی
ہم پر! بولا فرعون میں تو وہی بات سجھاتا ہوں تم کو
جو سوجھی مجھ کو، اور وہی راہ بتاتا ہوں جس میں بھلائی
ہے، اور کہا اس ایمان دار نے، اے میری قوم!
میں ڈرتا ہوں کہ آئے تم پر دن اگلے فرقوں کا سا،
جیسے حال ہوا قوم نوح کا اور عاد اور ثمود کا اور جو
لوگ اُن کے پیچھے ہوئے اور اللہ بے انصافی
نہیں چاہتا بندوں پر، اور اے میری قوم! میں
ڈرتا ہوں کہ تم پر آئے دن چیخ و پکار کا، جس دن
بھاگو گے پیٹھ پھیر کر، کوئی نہیں تم کو اللہ سے بچانیوالا
اور جس کو غلطی میں ڈالے اللہ تو کوئی نہیں اسکو سمجھانیوالا
اور تمہارے پاس آچکا ہے یوسف اس سے پہلے کھلی باتیں
لے کر پھر تم رہے دھوکے ہی میں اُن چیزوں سے جو وہ تمہارے
پاس لے کر آیا یہاں تک کہ جب مر گیا، لگے کہنے ہرگز
نہ بھیجے گا اللہ اُس کے بعد کوئی رسول، اسی طرح بھٹکاتا ہے
اللہ اس کو جو ہو بے باک شک کرنے والا، وہ جو جھگڑتے

آيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ كَبُرَ مَقْتًا
عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ
يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ
جَبَّارٍ ○ (مومن ع)
وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ
سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۚ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ
الْقَرَارِ ○ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا
يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا
مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ
حِسَابٍ ○ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى
النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۚ النصف
تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ
مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۚ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى
الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ○ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ
اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا
فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ
الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ○
فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ
اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ○ (مومن ع)

ہیں اللہ کی باتوں میں بغیر کسی سند کے جو پہنچی ہو ان کو
بڑی بیزاری ہے (اس جھگڑے سے) اللہ کے یہاں
اور ایمان داروں کے یہاں، اسی طرح مہر لگا دیتا ہے
اللہ ہر دل پر غرور والے سرکش کے۔
اور کہا اس ایماندار نے اے قوم! راہ چلو میری پہنچا دوں تم کو
نیکی کی راہ پر اے میری قوم! یہ جو زندگی ہے دنیا کی سو کچھ فائدہ
اٹھا لینا ہے اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی ہے جم کر رہنے کا گھر جس نے
کی ہے برائی تو وہی بدلا پائے گا اس کی برابر اور جس نے
کی ہے بھلائی مرد ہو یا عورت اور وہ یقین رکھتا ہو سو وہ
لوگ جائیں گے بہشت میں روزی پائیں گے وہاں بے شمار
اور اے قوم! مجھ کو کیا ہوا ہے بلاتا ہوں تم کو نجات
کی طرف اور تم بلاتے ہو مجھ کو آگ کی طرف، تم چاہتے
ہو مجھ کو کہ منکر ہو جاؤں اللہ سے اور شریک
ٹھہراؤں اس کا، اس کو جس کی مجھ کو خبر نہیں،
اور میں بلاتا ہوں تم کو اس زبردست گناہ
بخشنے والے کی طرف، آپ ہی ظاہر ہے کہ جسکی
طرف تم مجھ کو بلاتے ہو اس کا بلاوا کہیں نہیں دنیا میں اور
نہ آخرت میں اور یہ کہ ہم کو پھر جانا ہے اللہ کے پاس اور
یہ کہ زیادتی والے وہی ہیں دوزخ کے لوگ سو آگے یاد
کرو گے جو میں کہتا ہوں تم کو اور میں سونپتا ہوں اپنا
معاملہ اللہ کو، بیشک اللہ کی نگاہ میں ہیں سب بندے

جب فرعون اور اُس کے سرداروں نے اس مردِ مومن کی یہ باتیں سُنیں تو اُن کا رُخ موسیٰ (علیہ السلام) سے ہٹ کر اس کی طرف ہو گیا اور فرعونیوں نے چاہا کہ پہلے اس ہی کی خبر لیں، اور اس کو قتل کر دیں، مگر اللہ تعالیٰ نے اس ناپاک ارادہ میں اُن کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ — سو اللہ تعالیٰ نے اس کو ان کی تدبیروں کے شر سے بچا لیا

فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۚ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ — اور فرعون کے لوگوں کو بُرے عذاب نے آلیا۔ نارِ جہنم ہے جس پر

عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا ۚ وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ — وہ صبح شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت آجائے گی،

اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (مومن ع ۵) — (تو کہا جائیگا) فرعونیوں کو سخت عذاب میں داخل کرو۔

توراۃ میں اگرچہ گذشتہ واقعات کا اکثر حصہ مذکور ہے مگر دو باتوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا ایک فرعون کے اس دوسرے حکم کا ذکر نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کی اولادِ نرینہ کو قتل کیا جائے اور دوسرے اس واقعہ کا کہ فرعون کی قوم میں سے بھی بعض آدمی ایمان لائے تھے اور ان میں سے ایک مردِ مومن نے فرعون اور اپنی قوم کو حضرتِ موسیٰؑ کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کی، ان کو دین کی تبلیغ کی اور سچائی کو قبول کر لینے کی دعوت دی۔

بظاہر اس دوسرے واقعہ کے ترک کر دینے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون اور فرعونیوں کے مظالم کی وجہ سے انتہائی رنج و غصہ تھا اور اس نے بغض و کینہ کی شکل اختیار کر لی تھی، لہٰذا اس نے اجازت نہ دی کہ اس قوم کے کسی فرد کیلئے بھی یہ ثابت کریں کہ اس میں سعادت اور حمایتِ حق کی روح موجود تھی۔

فرعون کا دعوئے ربوبیت والوہیت

فرعون اور اس کے سرداروں کا موسیٰ (علیہ السلام) کو شکست دینے میں جب کوئی مکر و فریب اور غیظ و غضب کام نہ آیا اور ارادۂ قتل کے باوجود موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کرنے کی بھی ہمت نہ پڑی تو اب فرعون نے دل کا بخار نکالنے کا یہ طریقہ نکالا کہ ایک جانب حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کی توہین کے درپے رہتا اور دوسری جانب یہ اعلان کرتا کہ تمہارا "ربِ اعلیٰ" اور معبود میرے علاوہ کوئی نہیں ہے، موسیٰؑ بن دیکھے خدا کو

ربِ بتارہاہے اور میں بایں صدہزار شوکت وسطوت تمہارے سامنے موجود ہوں، چنانچہ مصری قوم پر جو اثر حضرتِ موسیٰؑ کے "آیاتِ بینات" دیکھ کر ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا اور دُنیوی شوکت وسطوت کی مرعوبیت اور عزت وجاہ کی حرص میں دب کر رہ گیا، اور اس طرح وہ سب حضرتِ موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی مخالفت میں پھر فرعون کے ہم نوا ہوگئے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۞ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۞ فَلَوْلَآ اُلْقِىَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۞ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۞ (زخرف ع ۵)

اور فرعون نے اپنی قوم میں اعلان کیا اے قوم! کیا میں مصر کے تاج و تخت کا مالک نہیں ہوں اور میری حکومت کے قدموں کے نیچے یہ نہریں بہہ رہی ہیں، کیا تم (میرے اس جاہ وجلال کو) نہیں دیکھتے (اب بتاؤ) کیا میں بلند وبالا ہوں یا یہ جس کو نہ عزت نصیب اور جو بات بھی صاف نہ کرسکتا ہو (اگر یہ اپنے خدا کے یہاں عزت والا ہے) تو کیوں اس پر (آسمان سے) سونے کے کنگن نہیں گرتے یا فرشتے ہی اس کے سامنے پرے باندھ کر کھڑے نہیں ہوتے، پس عقل کھودی فرعون نے اپنی قوم کی سو انہوں نے اسی کی اطاعت کی اور تھے وہ نافرمان بندے۔

فرعون نے اس جگہ بلند وبالا ہونے کا معیار دو باتوں پر رکھا اور عام طور پر دنیا کو مقصدِ زندگی سمجھنے والوں کی یہی شان رہی ہے، ایک دولت وثروت، دوسرے دُنیوی جاہ وحشم، اور یہ دونوں فرعون کے پاس موجود تھے، موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس نہ تھے۔

حضرتِ شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہٗ) نے ان دونوں باتوں کو موضح القرآن میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے:-

"وہ آپ کنگن پہنتا تھا جواہر کے مکلف، اور جس امیر پر مہربان ہوتا سونے کے کنگن پہناتا تھا اور اس کے سامنے فوج کھڑی ہوتی تھی پرا باندھ کر۔" [1]

اس لئے اس نے انہی باتوں کا ذکر کیا کہ اگر موسیٰؑ کا خدا مجھ سے الگ کوئی اور ہستی ہے،

[1] فوائد سورۂ زخرف ۱۲۔

تو وہ موسیٰ کو سونے کے کنگن آسمان سے کیوں نہیں برساتا اور فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر کیوں کھڑے نہیں ہوتے اور چونکہ قوم کی نگاہ میں دینی و دنیوی عزت کا معیار یہی تھا، اس لئے فرعون کا داؤں اُن پر چل گیا اور انھوں نے یک زبان ہو کر فرعون کی اطاعت کا دوبارہ اعلان کر دیا، یہ بدبخت یہ نہ سمجھے کہ خدائے تعالےٰ کے یہاں عزت کا معیار "صدق و خلوص" اور خدا کی "وفادارانہ عبودیت" ہے نہ کہ دنیوی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت، البتہ جو شخص اصل عزت کو حاصل کر لیتا ہے تو خدائے تعالیٰ یہ چیزیں بھی اس کے قدموں پر نثار کر دیتا ہے اور صرف دنیوی عظمت پر اترانے والوں کو ابدی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، چنانچہ آخر میں یہی صورت موسیٰؑ اور اُن کی قوم بنی اسرائیل اور فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ پیش آئی۔

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ۝ (زخرف ع۵)

پھر جب ہم کو غصہ آیا تو ہم نے (ان کی بدکرداریوں کا) بدلہ لیا پس ڈبو دیا اُن سب کو اور کر دیا گئے گذرے اور آنیوالی نسلوں کے واسطے ان کو کہاوت بنا دیا۔

ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ (النازعات ع۱)

پس پیٹھ پھیر کر چل دیا پھر (قوم کو) جمع کیا، پھر پکارا اور کہنے لگا! "میں ہی تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" پس اس کو پچھلے (آخرت کے) اور پہلے (دنیا کے) عذاب نے آپکڑا بلاشبہ اس واقعہ میں اس شخص کے لئے عبرت ہے جو خوفِ خدا رکھتا ہو

مصریوں پر قہرِ خدا

غرض حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی رشد و ہدایت کا فرعون اور اس کے سرداروں پر مطلق اثر نہیں ہوا اور معدودے چند کے سوا نے عام مصریوں نے بھی ان ہی کی پیروی کی اور صرف یہی نہیں بلکہ فرعون کے حکم سے بنی اسرائیل کی نرینہ اولاد قتل کی جانے لگی، موسیٰ (علیہ السلام) کی توہین و تذلیل ہونے لگی، اور فرعون نے اپنی ربوبیت اور معبودیت کی زور شور سے تبلیغ شروع کر دی تب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی آئی کہ فرعون کو مطلع کر دو کہ اگر تمہارا یہی طور طریق رہا تو

عنقریب تم پر خدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے، چنانچہ جب انھوں نے اس پر بھی دھیان نہ دیا تو اب یکے بعد دیگرے عذابِ الٰہی آنے لگے، یہ دیکھ کر فرعون اور اس کی قوم نے اب یہ وطیرہ اختیار کیا کہ جب عذابِ الٰہی کسی ایک شکل میں ظاہر ہوتا تو فرعون اور قوم فرعون حضرت موسیٰؑ سے وعدہ کرنے لگتی کہ اچھا ہم ایمان لے آئیں گے تو اپنے خدا سے دعا کر کہ یہ عذاب جاتا رہے اور جب وہ عذاب جاتا رہتا تو پھر سرکشی و نافرمانی پر اتر آتے، پھر عذاب جب دوسری شکل میں آتا تو کہتے کہ اچھا ہم بنی اسرائیل کو آزاد کر کے تیرے ساتھ روانہ کردیں گے، دعا کر کہ یہ عذاب دفع ہوجائے اور جب حضرت موسیٰؑ کی دعا سے ان کو پھر مہلت مل جاتی، اور عذاب دفع ہوجاتا تو پھر اسی طرح مخالفت پر کمربستہ ہوجاتے، اس طرح خدا کی جانب سے مختلف قسم کے نشانات ظاہر ہوئے اور فرعون اور قوم فرعون کو بار بار مہلت عطا ہوتی رہی لیکن جب انھوں نے اس کو بھی ایک مذاق بنالیا تب خدا کا آخری عذاب آیا اور فرعون اور اس کے سرکش سردار سب ہی غرق کردیئے گئے۔

آیات اللہ کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو بہت سے نشانات (معجزات) عطا فرمائے تھے جن کا ذکر بقرہ، اعراف، نمل، قصص، اسراء، طٰہٰ، زخرف، مومن، قمر، اور النازعات میں مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے، چنانچہ اسراء میں ہے:-

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ	اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو نو نشانات واضح عطا کیے پس تو بنی اسرائیل
فَسْئَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ	سے دریافت کر کہ جب یہ نشانات ان کے پاس آئے تو حضرت موسیٰؑ
لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا	سے فرعون نے یہ کہا، اے موسیٰ! بلاشبہ میں تجھ کو جادو کا مارا ہوا سمجھتا ہوں
قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا	موسیٰ نے کہا، تو خوب جانتا ہے کہ ان کو بصیرتیں بنا کر آسمانوں اور
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّىْ	زمین کے پروردگار کے سوائے اور کسی نے نہیں اتارا اور (اسلئے)
لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (بنی اسرائیل)	بلاشبہ اے فرعون میں تجھ کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔

اور طٰہٰ، نمل، زخرف اور النازعات میں شمار بتائے بغیر صرف "آیات" کہہ کر ذکر کیا گیا ہے،

پھر کسی جگہ "ایات بینات" اور کہیں "ایات مفصلات" اور کسی موقعہ پر "الآیۃ الکبریٰ" اور کہیں صرف "ایاتنا" سے تعبیر کیا ہے۔

اور ان تفصیلی اور اجمالی تعبیرات کے علاوہ مسطورۂ بالا تمام سورتوں میں علیحدہ علیحدہ نشانات (معجزات) کا بھی ذکر موجود ہے، اور اگر ان سب کو یکجا جمع کیا جائے تو حسب ذیل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے:۔

عصا، ید بیضا، سنین (قحط) نقص ثمرات (پھلوں کا نقصان) طوفان، جراد (ٹڈی دل) قمل (جوں[1]) ضفادع (مینڈک) دم (خون) فلق بحر (قلزم کا پھٹ کر دو حصہ ہو جانا) من و سلویٰ (حلوا و بٹیر) غمام (بادلوں کا سایہ) انفجار عیون (پتھر سے چشموں کا بہہ پڑنا) نتق جبل (پہاڑ کا اکھڑ کر سروں پر آجانا) اور نزول تورات۔

پس مسطورۂ بالا مختلف تعبیرات و تفصیلات کی بنا پر مفسرین کو حیرانی ہے کہ کونسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے "تسع آیات" کی تعیین بھی ہو جائے اور باقی آیات اللہ کی تفصیل بھی صحیح اسلوب پر باقی رہ جائے، چنانچہ قاضی بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ تشریح فرمائی کہ سورۂ اسراء میں جن "تسع آیات" کا تذکرہ ہے اُن سے وہ نشان (معجزات) مراد نہیں ہیں جو فرعون اور قوم فرعون کے مقابلہ میں بطور سرزنش عذاب اور عبرت کے لئے بھیجے گئے بلکہ اس سے وہ احکام مراد ہیں جو بنی اسرائیل کو قلزم عبور کر لینے کے بعد دیئے گئے تھے اور اپنی اس تشریح کی تائید میں حضرت صفوان بن عسال کی حدیث پیش کی جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو یہودیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کا امتحان لیا جائے اور مشورہ کے بعد آپ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو جو "تسع آیات" دیئے تھے ان کی تشریح کیجئے

---

[1] مفسرین کہتے ہیں جوں اور مینڈک کے عذاب کی صورت یہ تھی کہ برتنے، کھانے، پینے اور رہنے سہنے کی کوئی شئے اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جس کو ان دونوں نے فاسد اور خراب نہ کر دیا ہو، اور زندگی تلخ نہ کر دی ہو اور خون کے عذاب کی شکل یہ تھی کہ قلزم اور کنوؤں کا تمام پانی خون آلود ہو گیا تھا جس کو کسی حالت میں پیا نہ جا سکتا تھا۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ احکام یہ ہیں :- شرک نہ کرنا، زنا نہ کرنا، ناحق کسی کو قتل نہ کرنا، چوری نہ کرنا - جادو نہ کرنا - حکامِ رسی کے ذریعے جرم سے پاک انسان کو قتل نہ کرانا، سود نہ کھانا، پاک دامن کو تہمت نہ لگانا، میدانِ جنگ سے نہ بھاگنا (شعبہ کو شک ہو گیا کہ دواں حکم یہی فرمایا یا کوئی اور) اور اے یہود! تمہارے لئے خصوصیت کے ساتھ یہ کہ سبت کی خلاف ورزی نہ کرنا۔[1]

مگر ان مفسرین کی یہ تشریح اس لئے صحیح نہیں کہ اسرا میں "تسع آیات" کے ذکر کے ساتھ فرعون اور حضرتِ موسیٰؑ کا مقابلہ بھی درج ہے، فرعون ان آیات کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے موسیٰؑ! یہ سب جادو کا دھندا ہے اور حضرتِ موسیٰؑ فرماتے ہیں، اے فرعون! یہ اللہ تعالیٰ کے نشانات ہیں اور تو انکار کر کے ہلاکت میں پڑ رہا ہے، پس اس جگہ "احکام" مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ ان کا نزول خود ان مفسرین کے نزدیک بھی غرقِ فرعون کے بعد ہوا ہے، چنانچہ یہی اشکال ترمذی کی حدیث پر بھی وارد ہوتا ہے، نیز یہ بات بھی خدشہ سے خالی نہیں کہ قرآنِ عزیز کی آیات زیرِ بحث میں "نو آیات" کا ذکر ہے اور صفوانؓ کی حدیث میں دس احکام شمار کرائے ہیں تو یہ گنتی کا تعارض ہے اور پھر احکامِ عشر کو "تسع آیات" کی تشریح بتانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

ان ہر دو اہم خدشات کے علاوہ اس قول اور حدیثِ صفوان کی تشریح پر جو سخت اشکال لازم آتا ہے وہ یہ ہے کہ سورۂ نمل میں "تسع آیات" کا ذکر کرتے ہوئے ید بیضاء کو ان میں کا ایک بتایا گیا اور یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ یہ آیات (نشانات) فرعون اور قومِ فرعون کی عبرت و بصیرت کے لئے بھیجے گئے تھے۔

وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ	اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں وہ نکلے گا روشن
مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ	بغیر کسی مرض کے (یہ ان) نو آیات میں سے (ہے) جو فرعون
وَقَوْمِهٖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ○ (نمل ع ۱)	اور اس کی قوم کے لئے (بھیجی گئیں) بلاشبہ تھے وہ نافرمان گروہ

---

[1] ترمذی کتاب التفسیر جلد ۲ ص ۱۵۹   [2] تورات میں بھی ان احکام کا ذکر موجود ہے، "اور اس نے ان لوحوں پر ان عہد کی باتوں کو یعنی موجودہ دس احکام کو لکھ کر" (خروج باب ۳۴ آیت ۲۸)

پس قرآنِ عزیز کی اس صراحت کے بعد نہ حدیث نکارت سے خالی رہتی ہے اور نہ مفسّرین کا یہ قول صحیح ہو سکتا ہے، اس لئے حافظ حدیث ابن کثیرؒ نے اس حدیث کے متعلق یہ فرمایا ہے:۔

فھذا الحدیث رواہ ھکذا الترمذی والنسائی وابن ماجۃ وابن جریر فی تفسیرہ من طرق عن شعبۃ بن الحجاج بہ وقال الترمذی حسن صحیح وھو حدیث مشکل وعبد اللہ بن سلمۃ فی حفظہ شئ وقد تکلموا فیہ ولعلہ اشتبہ علیہ التسع الآیات بالعشر الکلمات وصایا فی التوراۃ لا تعلق لھا بقیام الحجۃ علی فرعون واللہ اعلم ولھذا قال موسیٰ لفرعون لقد علمت ما انزل ھؤلاء الا رب السمٰوٰت والارض بصائر ای حجۃ وادلۃ علی صدق ما جئتک بہ وانی لاظنک یا فرعون مثبورا۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۶ ص ۱۱۲	پس اس حدیث کو اس طرح ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں مختلف طریقوں سے شعبہ بن الحجاج سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حسن صحیح ہے، مگر اس حدیث میں اشکال ہے اور عبد اللہ بن سلمہ راوی کے حفظ میں کچھ خرابی ہے اور محدثین نے اس کے بارے میں کلام کیا ہے اور شاید اس کو اشتباہ ہو گیا کہ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ دس احکام کو تسع آیات سمجھ کر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا، حالانکہ وہ دس وصیتیں ہیں جو توراۃ میں بیان کی گئی ہیں، ان کا فرعون پر قیامِ حجت و دلیل سے مطلق کوئی تعلق نہیں، (واللہ اعلم) اور تسع آیات میں قیامِ حجت مقصود ہے اسی لئے حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے یہ فرمایا "تو خوب جانتا ہے کہ ان آیات (معجزات) کو آسمانوں اور زمین کے پروردگار نے نہیں اتارا مگر عبرت و بصیرت کے لئے یعنی جو حق کا پیغام میں لے کر آیا ہوں اس کی تصدیق کیلئے حجت و دلیل بنا کر بھیجا ہے، اور میں بلاشبہ اے فرعون! تجھ کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔

بہرحال یہ تشریح قطعاً مخدوش و مجروح ہے، اور بعض مفسّرین نے اس کے خلاف تسع آیات کی تعیین میں ان ہی آیات (معجزات) کو شمار کرایا ہے جو عبرت و بصیرت اور مخالفین کے مقابلہ میں حضرتِ موسیٰؑ کی صداقت کے لئے عطا کئے گئے تھے، لیکن یہ اقوال بھی مختلف ہیں اور ان میں کافی انتشار موجود ہے، اس لئے کہ ان میں قبلِ عبور اور بعدِ عبور نشانات کو خلط کر دیا گیا ہے، البتہ ان سب اقوال میں قابلِ ترجیح حضرتِ عبد اللہ بن عباسؓ کا یہ قول ہے کہ تسع آیات سے مراد حسبِ ذیل

"آیات اللہ" مراد ہیں :-

عصا، ید بیضا، سنین، نقص ثمرات، طوفان، جراد، قمل، ضفادع، دم، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ مجاہد، عکرمہ، شعبی اور قتادہ (رضی اللہ عنہم) بھی اسی کی تائید فرماتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) کی اس تشریح کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو جس قدر بھی آیات (معجزات) عطا کئے گئے، ایک حصہ بحر قلزم کے عبور سے قبل اور دوسرا حصہ عبور کے بعد سے متعلق ہے، اور پہلے حصہ کا تعلق اُن تمام واقعات سے ہے جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کے درمیان پیش آئے اور معرکۂ حق و باطل کا باعث بنے اور یہ نو ہیں ان میں سے عصاء اور ید بیضاء آیاتِ کبریٰ ہیں۔

فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ (النازعات) پس دکھایا اس (فرعون) کو ایک بڑا نشان (یعنی عصاء کا نشان)

وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ ۖ فِي تِسْعِ آيَاتٍ (نمل ع) اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں، نکلے گا وہ روشن بغیر کسی مرض کے نو نشانات (معجزات) میں سے۔

اور باقی سات "آیاتِ عذاب" ہیں جس نے فرعون اور اہلِ مصر (قبطیوں) کی زندگی تنگ کر دی تھی۔

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝ فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَٰذِهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُ ۗ أَلَا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِندَ اللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ

اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور میووں کے نقصان میں تاکہ وہ نصیحت مانیں۔ پھر جب پہنچی اُن کو بھلائی کہنے لگی یہ ہے ہمارے لائق، اور اگر پہنچی برائی تو نحوست بتلاتے موسیٰ کی اور اس کے ساتھ والوں کی سن لو اُن کی شومی تو اللہ کے پاس ہے، پر اکثر لوگ نہیں جانتے، اور کہنے لگے جو کچھ تو لائے گا، ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اس کی وجہ سے جادو کرے سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے، پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان

وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ (الاعراف ع) — اور ٹڈی اور چچڑی اور مینڈک اور خون بہت سی نشانیاں جُدا جُدا دیں۔

اور آیاتِ بینات کے دوسرے حصہ کا تعلق حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) اور بنی اسرائیل سے متعلق واقعات سے ہے جن میں سے بعض (معجزات) اُن کو ہلاکت سے محفوظ رکھنے اور صداقتِ موسیٰ (علیہ السلام) کو قوت دینے کے لئے ہیں، مثلاً من وسلویٰ کا نزول، غمام (بادلوں کا سایہ) اور انفجارِ عیون (پتھر سے بارہ چشموں کا پھوٹ نکلنا) اور بعض بنی اسرائیل کی سرکشی پر تہدید وتخویف کے لئے ہیں مثلاً نتقِ جبل (طور کے ایک حصہ کا اپنی جگہ سے اکھڑ کر بنی اسرائیل کے سر پر آجانا)

وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ (بقرہ ع) — اور اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر من (حلوائے شیریں) اور سلویٰ (بٹیریں) نازل کیا، پس تم ان پاک چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تم کو رزق بنا کر دی ہیں۔

وَظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ (بقرہ ع) — اور (اے بنی اسرائیل) ہم نے تم پر بادل کا سایہ قائم کر دیا۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا (بقرہ ع) — اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے کہا (اے موسیٰ) تو پتھر پر اپنی لاٹھی مار، پس بہہ پڑے اس سے بارہ چشمے۔

اور دونوں قسم کے نشانات کے لئے حدِ فاصل وہ عظیم الشان نشان ہے جو فلقِ بحر (قلزم) کے دو ٹکڑے ہو کر راہ نکل آنا) کے عنوان سے معنون ہے، اور دراصل ظلم وقہر کی ہلاکت اور مظلومانہ زندگی کی نصرت وحمایت کے لئے ایک فیصلہ کن نشان تھا، یا یوں کہہ دیجئے کہ واقعات قبل از عبور کے انجام اور بعد از عبور روشن آغاز کے لئے نمایاں حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ اعراف، اسراء، طٰہٰ، شعراء، قصص، زخرف، دخان، اور الذاریات میں اس کو تفصیل کیساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ تمام نشانات (معجزات) درحقیقت توطیہ اور تمہید تھے ایک ایسے عظیم الشان اور جلیل المرتبت نشان کے جو اس پوری تاریخ کا حقیقی مقصد اور بنیاد واساس تھا،

اور وہ نزولِ تورات کا نشانِ اعظم ہے۔

وَاَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ — اور ہم نے اتاری تورات جس میں ہدایت اور نور (کا ذخیرہ) ہے

الحاصل حضرتِ عبداللہ بن عباسؓ کا یہ اثر زیرِ بحث مسئلہ کے لئے قولِ فیصل ہے اسی لئے حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے اس کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے:-

وَهٰذَا الْقَوْلُ ظَاهِرٌ جَلِيٌّ قَوِيٌّ [1] — اور یہ قول صاف ہے، واضح ہے، عمدہ ہے اور قوی ہے،

بہرحال فرعون اور اس کی پیہم اور مسلسل سرکشی، ظلم، حق کے ساتھ استہزاء، تمرد، اور نافرمانی، کے باعث خدائے تعالیٰ کی جانب سے مصریوں پر مختلف بلائیں اور عذاب آتے رہے اور وقفہ کے ساتھ ان "نشانات" کا ظہور ہوتا رہا، جب ایک عذاب آتا تو سب واویلا کرنے لگتے اور حضرتِ موسیٰؑ سے کہتے کہ اگر اس مرتبہ تو نے اپنے خدا سے کہہ کر اس عذاب کو ٹال دیا تو ہم سب ایمان لے آئیں گے اور جب وہ ٹل جاتا تو پھر سرکشی شروع کر دیتے۔ آخر پھر دوسرا عذاب آپکڑتا اور پھر وہی صورت پیش آجاتی۔

اس تفصیلی واقعہ کا ذکر ابھی سورۂ اعراف کی آیات میں گذر چکا ہے۔

ان آیات میں بیان کردہ نشانیوں میں سے قمل [2] (جوں) اور ضفادع (مینڈک) کے متعلق علماءِ سیر نے لکھا ہے کہ ان دونوں چیزوں کی یہ حالت تھی کہ بنی اسرائیل کے کھانے پینے

---

[1] تفسیر کثیر ج ۶ ص ۱۱۱۔

اس بحث کے لئے روح المعانی، ابن کثیر، تفسیر کبیر اور البحر المحیط خصوصیت کے ساتھ قابلِ مراجعت ہیں، ان کے مطالعہ کے بعد مؤلف کے قولِ فیصل کی اہمیت و لطافت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

[2] قمل سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ وہ کیڑا مراد ہے جو اناج میں پیدا ہو کر اس کو خراب کر دیتا ہے (اردو میں اس کو سُرسُری کہتے ہیں) اور انہی سے ایک روایت ہے کہ اس سے وہ چھوٹی ٹنڈی مراد ہے جس کے پر نہیں ہوتے اور وہ بھی غلہ کو گھن لگا دیتی ہے، مجاہدؒ، عکرمہؒ، قتادہؒ کی بھی یہی رائے ہے اور ابن جریرؒ کہتے ہیں کہ جوں کی طرح کا ایک کیڑا ہوتا ہے جو اونٹوں میں ہلاکت پیدا کرتا ہے اور راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ چھوٹی مکھی ہے جو انسانی صحت کے لئے بحد مضرت رساں ہے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

اور برتنے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جن میں یہ موجود نظر نہ آتے ہوں حتیٰ کہ قوم فرعون کی عافیت تنگ ہو گئی اور وہ عاجز آ گئے، اور خون کے متعلق لکھا ہے کہ دریائے نیل کا پانی لہو کی رنگت کا ہو گیا تھا، اور اس کے ذائقہ نے اس کا پینا دشوار کر دیا تھا اور پانی میں مچھلیاں تک مر گئی تھیں، تورات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَاۤءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ (اسراء ع)

اور بیشک ہم نے موسیٰ کو نو ظاہر نشانات دیئے پس (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) تو بنی اسرائیل سے دریافت کر کہ جب وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے موسیٰ سے کہا اے موسیٰ! میں تجھ کو جادو کا مارا ہوا گمان کرتا ہوں" موسیٰ نے کہا "تو خوب جانتا ہے کہ آسمان و زمین کے پروردگار نے ان نشانات کو عبرتیں بنا کر اتارا ہے اور اے فرعون میں سمجھتا ہوں کہ تو نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔"

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ۝ (طٰہٰ ع)

اور بیشک ہم نے فرعون کو اپنے سب نشانات (معجزے) دکھائے پھر بھی اس نے جھٹلایا اور انکار ہی کیا۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۝

پھر جب ان کے پاس ہمارے نشانات بصیرت کے لئے آپہنچے تو وہ کہنے لگے "یہ تو صریح جادو ہے" اور انھوں نے اپنے جی میں یقین رکھتے ہوئے کہ یہ "صحیح ہیں" ظلم اور غرور کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) قمل عربی میں عام طور پر جوں کو کہتے ہیں، تورات میں اس جگہ جوں اور مکھی دونوں کا ذکر ہے لیکن ابن عباسؓ مجاہدؒ، قتادہؒ، عکرمہؒ، ابن جریرؒ اور راغب جیسے ائمہ لغت اس لفظ کا اطلاق مسطورۂ بالا مختلف کیڑوں پر کرتے ہیں، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قمل اپنے معنی میں ان مصادیق کے لئے وسیع ہے، اس لئے ان تمام اطلاقات کی تطبیق کے لئے یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں پر یہ عذاب نازل فرمایا کہ انسانوں پر جوئیں مسلط کر دیں، ان کے کھانے پینے کی چیزوں میں چھوٹی مکھیوں کو پھیلا دیا، ان کے جانوروں میں ہلاک کرنے والا کیڑا پیدا کر دیا۔ اور ان کے اناج اور غلہ میں گھن لگا کر خراب کر دینے والی سُرسُری کی تباہی پھیلا دی، اور ان سب مہلک کیڑوں کو قرآن کے اعجاز نے قمل کی وسیع تعبیر میں بیان فرما دیا ہے۔ (مؤلف)

وَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (نمل) پس دیکھ (اے مخاطب) مفسدوں کا انجام کیسا ہوا!

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ	پھر جب ان کے پاس ہماری صریح نشانیاں پہنچیں، کہنے لگے
قَالُوْا مَا هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا	یہ کچھ نہیں ہے مگر گھڑا ہوا جادو اور ہم نے اپنے پہلے باپ دادوں
سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَ	میں یہ باتیں نہیں سنیں، اور موسیٰؑ نے کہا! میرا پروردگار خوب
قَالَ مُوْسٰى رَبِّيْۤ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى	جانتا ہے کہ کون شخص لایا ہے اس کے پاس سے ہدایت
مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ	کو اور کون ہے جس کے لئے آخرت کا انجام مقرر ہے، بلاشبہ
اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (قصص ع)	وہ بے انصافوں کو فلاح نہیں دیتا۔
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى	اور بیشک ہم نے موسیٰؑ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف اپنی
فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ	نشانیاں دے کر بھیجا، پس موسیٰؑ نے کہا میں جہانوں کے
الْعٰلَمِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَاۤ اِذَا هُمْ	پروردگار کا رسول ہوں پھر جب وہ ہماری نشانیاں لایا۔
مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ۝ وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ	اچانک وہ اس کا مذاق اڑانے لگے، اور ہم نے جو نشان اُنکو
اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا وَاَخَذْنٰهُمْ	دکھایا اُن میں سے ایک دوسرے سے بڑا ہی تھا اور ہم نے
بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ وَقَالُوْا	ان کو (دنیوی) عذاب میں گرفتار کیا تاکہ وہ باز آجائیں اور وہ
يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ	کہنے لگے اے جادوگر! تو اپنے پروردگار سے اپنے اس عہد (نبوت)
عِنْدَكَ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝ فَلَمَّا	کی بنا پر ہمارے لئے دعا کر (کہ یہ مصیبت جاتی رہے) تو ہم بلاشبہ
كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ	ہدایت قبول کرلیں گے، پھر جب ہم نے اُن سے عذاب کو دور
يَنْكُثُوْنَ ۝ (زخرف ع)	کردیا تو پھر وہ بدعہد ہو گئے۔
وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ	اور بلاشبہ آلِ فرعون کے پاس (بدکرداریوں کے انجام سے ڈرانے
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ	والے آئے، انھوں نے ہماری سب نشانیوں کو جھٹلایا پس ہم نے ان کو
اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ (قمر ع)	(اپنے عذاب میں) پکڑلیا، ایک غالب اور قدرت والے کی پکڑ کی طرح۔
فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝	پھر دکھلائی (موسیٰؑ نے) اُس کو بڑی نشانی، پس اُس (فرعون)

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝ (والنازعات ۴) نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔

بنی اسرائیل کا خروج اور فرعون کا تعاقب

جب معاملہ اس حد کو پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ تم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر باپ دادا کی سرزمین کی جانب لے جاؤ۔

مصر سے فلسطین یا ارضِ کنعان جانے کے دو راستے ہیں، ایک خشکی کا راستہ ہے اور وہ قریب ہے اور دوسرا بحرِ احمر (قلزم) کا راستہ یعنی اس کو عبور کر کے بیابانِ سور اور سینا (تیہ) کی راہ ہے اور یہ دور کی راہ ہے، مگر خدائے تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دُور کی راہ اختیار کریں اور قلزم کو پار کر کے جائیں۔

واقعاتِ رونما ہو جانے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اس راہِ حق کو حق تعالیٰ نے اس لئے ترجیح دی کہ خشکی کی راہ سے گذرنے میں فرعون اور اس کی فوج سے جنگ ضروری ہو جاتی، کیوں کہ انھوں نے بنی اسرائیل کو قریب ہی آ لیا تھا اور اگر دریا کا معجزہ پیش نہ آتا تو فرعون بنی اسرائیل کو واپس مصر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا اور چونکہ صدیوں کی غلامی نے بنی اسرائیل کو بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا اس لئے وہ خوف اور رعب کی وجہ سے کسی طرح فرعون کے ساتھ جنگ پر آمادہ نہ ہوتے، توراۃ سے بھی اس توجیہ کی تائید نکلتی ہے، اس میں مذکور ہے:۔

"اور جب فرعون نے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی تو خدا اُن کو فلستیوں کے ملک کے راستے سے نہیں لے گیا اگرچہ ادھر سے نزدیک پڑتا کیوں کہ خدا نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچھتانے لگیں اور مصر کو لوٹ جائیں بلکہ خداوند اُن کو چکر کھلا کر بحرِ قلزم کے بیابان کے راستے لے گیا۔" (خروج باب ۱۳ آیت ۱۷ و ۱۸)

علاوہ ازیں فرعون اور قوم فرعون کو ان کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش اور عظیم الشان اعجاز کے ذریعہ ظالم و قاہر اقتدار سے مظلوم قوم کی نجات کا عدیم النظیر مظاہرہ کرنا بھی مقصود تھا،

اسی لئے یہ راستہ موزوں سمجھا گیا۔

غرض حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحرِ احمر کی راہ پر ہو لئے اور روانہ ہونے سے پہلے مصری عورتوں کے زیورات اور قیمتی پارچہ جات جو ایک تہوار میں مستعار لئے تھے وہ بھی واپس نہ کر سکے کہ کہیں مصریوں پر اصل حال نہ کھل جائے۔

ادھر پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع کی کہ بنی اسرائیل مصر سے فرار ہونے کے لئے شہروں سے نکل گئے فرعون نے اُسی وقت ایک زبردست فوج کو ساتھ لیا اور رعمسیس سے نکل کر اُن کا تعاقب کیا، اور صبح ہونے سے پہلے پہلے اُن کے سر پر جا پہنچا۔

بنی اسرائیل کی تعداد بقولِ توراۃ علاوہ بچوں اور چوپایوں کے چھ لاکھ تھی، مگر پَو پھٹنے کے وقت جب انھوں نے پیچھا پھر کے دیکھا تو فرعون کو سر پر پایا، گھبرا کر کہنے لگے:۔

"کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لئے بیابان میں لے آیا ہے؟ تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں؟ کیوں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔"

(خروج باب ۱۴ آیات ۱۱، ۱۲)

غرقِ فرعون | حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے اُن کو تسلی دی اور فرمایا خوف نہ کرو خدا کا وعدہ سچا ہے وہ تم کو نجات دے گا اور تم ہی کامیاب ہو گے، اور پھر درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہوئے، وحیِ الٰہی نے موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو پانی پر مارو تا کہ پانی پھٹ کر بیچ میں راستہ نکل آئے، چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) نے ایسا ہی کیا، جب انھوں نے قلزم پر اپنا عصا مارا تو پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا اور بیچ میں راستہ نکل آیا اور حضرتِ موسیٰؑ کے حکم سے تمام بنی اسرائیل اُس میں اُتر گئے، اور خشک زمین کی طرح اس سے پار ہو گئے فرعون نے یہ دیکھا تو اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا! یہ میری کرشمہ سازی ہے کہ بنی اسرائیل کو تم

جا پکڑو لہٰذا بڑھے چلو چنانچہ فرعون اور اس کا تمام لشکر بنی اسرائیل کے پیچھے اُسی راستے پر اُتر لئے لیکن اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارہ پر سلامتی کے ساتھ پہنچ گیا تو پانی بحکمِ الٰہی پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا اور فرعون اور اس کا تمام لشکر جو ابھی درمیان ہی میں تھا غرق ہو گیا۔

جب فرعون غرق ہونے لگا اور ملائکہ عذاب سامنے نظر آنے لگے تو پکار کر کہنے لگا۔

"میں اُسی ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہستی پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں" مگر یہ ایمان چونکہ حقیقی ایمان نہ تھا بلکہ گذشتہ فریب کاریوں کی طرح نجات حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ایک مضطربانہ بات تھی اس لئے خدا کی طرف سے یہ جواب ملا :۔

آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ — اب یہ کہہ رہا ہے حالانکہ اس سے پہلے جو اقرار کا وقت تھا اس میں انکار

وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (یونس ع) — اور خلاف ہی کرتا رہا اور درحقیقت تو مفسدوں میں سے تھا۔

یعنی خدا کو خوب معلوم ہے کہ تو "مسلمین" میں سے نہیں بلکہ "مفسدین" میں سے ہے۔

درحقیقت فرعون کی یہ پکار ایسی پکار تھی جو ایمان لانے اور یقین حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے بعد اضطراری اور بے اختیاری کی حالت میں نکلتی ہے، اور مشاہدۂ عذاب کے وقت اس کی یہ صدائے ایمان و یقین "حضرت موسیٰؑ کی اُس دعا کا نتیجہ تھی جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

فَلَا يُؤْمِنُوا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ — پس یہ اُس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک اپنی ہلاکت اور

الْاَلِيْمَ ۝ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ — عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، اللہ تعالیٰ نے کہا بلاشبہ تم

دَّعْوَتُكُمَا (یونس ع) — دونوں کی دعا قبول کرلی گئی۔

اس موقعہ پر فرعون کی پکار پر درگاہِ الٰہی کی جانب سے یہ بھی جواب دیا گیا :۔

اَلْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ — آج کے دن ہم تیرے جسم کو اُن لوگوں کے لئے جو تیرے پیچھے

لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ (الآیۃ)   آنے والے میں نجات دیں گے کہ وہ (عبرت) کا نشان بنے۔

پس اگر گذشتہ "مصری مقالہ" کا مضمون صحیح ہے کہ منفتاح (رعمسس ثانی) ہی فرعون موسیٰ تھا تب تو بے شبہ اس کی نعش آج تک محفوظ ہے اور سمندر میں تھوڑی دیر غرق رہنے کی وجہ سے اس کی ناک کو مچھلی نے کھا لیا ہے اور آج وہ مصریات (ایجپٹالوجی) کے مصری عجائب خانہ میں تماشاگاہِ خاص و عام ہے۔

اور بالفرض یہ وہ فرعون نہیں ہے تب بھی آیت کا مطلب اپنی جگہ صحیح ہے، اس لئے کہ توراۃ میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے غرق شدہ مصریوں کی نعشوں کو کنارے پر پڑے ہوئے دیکھا تھا:۔

"اور اسرائیلیوں نے مصریوں کو سمندر کے کنارے مرے ہوئے پڑے دیکھا" (خروج باب ۱۴، آیت ۳۱)

فلق بحر | قرآنِ عزیز نے بنی اسرائیل کی روانگی اور فرعون کے غرق اور بنی اسرائیل کی نجات کے واقعہ کو بہت مختصر بیان کیا ہے اور اس کے صرف ضروری اجزاء ہی کا تذکرہ کیا ہے البتہ اس سے متعلق عبرت و بصیرت اور موعظت کے معاملہ کو قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری ہے:۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝ (طٰہٰ ع ۴)	(اور پھر دیکھو) ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی تھی کہ (اب) میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لیجا پھر سمندر میں ان کے گذرنے کے لئے خشکی کی راہ نکال لے، پیچھا کرنے والوں سے نہ تو تعاقب کرنے والوں سے اندیشہ ہوگا، نہ اور کسی طرح کا خطرہ پھر (جب موسیٰ اپنی قوم کو لے کر نکل گیا، تو) فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ اس کا پیچھا کیا، پس پانی کا ریلا جیسا کچھ ان پر چھانے والا تھا) چھا گیا یعنی جو کچھ ان پر گذرنی تھی گذر گئی) اور فرعون نے اپنی قوم پر راہ (نجات) گم کردی انہیں سیدھی راہ نہیں دکھائی۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ
اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِى
الْمَدَاۗىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ
لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ۝ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَاۗىِٕظُوْنَ ۝
وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ۝ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ
جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝
كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝
فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ۝ فَلَمَّا تَرَاۗءَ الْجَمْعٰنِ
قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝
قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝
فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ
بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ
فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ
الْاٰخَرِيْنَ ۝ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ
اَجْمَعِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ
الرَّحِيْمُ ۝ (الشعراء ع ۴)

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ
بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا
غٰفِلِيْنَ ۝ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰؑ کو کہ رات کو لے نکل میرے بندوں
کو، البتہ تمہارا پیچھا کریں گے، پھر بھیجے فرعون نے شہروں میں
نقیب، یہ لوگ جو ہیں سو ایک جماعت ہے تھوڑی سی، اور
وہ مقرر ہم سے دل جلے ہوئے ہیں، اور ہم سارے اُن سے
خطرہ رکھتے ہیں، پھر نکال باہر کیا ہم نے ان کو باغوں
اور چشموں سے اور خزانوں اور مکانوں سے اسی طرح
اور ہاتھ لگا دیں ہم نے یہ چیزیں بنی اسرائیل کے
پھر پیچھے پڑے ان کے سورج نکلنے کے وقت
پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں کہنے لگے موسیٰؑ
کے لوگ ہم تو پکڑے گئے، کہا ہرگز نہیں میرے
ساتھ ہے میرا رب وہ مجھ کو راہ بتائے گا، پھر حکم بھیجا
ہم نے موسیٰؑ کو کہ مار اپنے عصا سے دریا کو، پھر دریا
پھٹ گیا تو ہو گئی ہر ایک پھانک جیسے بڑا پہاڑ، اور
پاس پہنچا دیا ہم نے اسی جگہ دوسروں کو، اور بچا دیا
ہم نے موسیٰؑ کو اور جو لوگ تھے اس کے ساتھ سب کو،
پھر ڈبا دیا ہم نے ان دوسروں کو، اس چیز میں ایک
نشانی ہے، اور نہیں تھے بہت لوگ اُن میں ماننے
والے، اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا۔

بالآخر ہم نے (ان کی بدعملیوں پر) انھیں سزا دی یعنی اس
جرم کی پاداش میں کہ ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور ان کی
طرف سے غافل رہے، انھیں سمندر میں غرق کر دیا، اور جس قوم کو

يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ	کمزور و حقیر خیال کرتے تھے اسی کو ملک کے تمام پورب کا اور اس کے
وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ۖ وَتَمَّتْ	مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے وارث
كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ	کردیا، اور اس طرح (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کا فرمان پسندیدہ
بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَدَمَّرْنَا	بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کہ (محنت و شدائد کے ساتھ) جمے
مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ	رہے تھے اور فرعون اور اس کا گروہ (اپنی طاقت و شوکت کیلئے)
وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ۝	جو کچھ بناتا رہا تھا اور جو کچھ (عمارتوں کی) بلندیاں اٹھاتی تھیں وہ
(الاعراف ع ۱۶)	سب درہم برہم کردیں!
وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ	اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا۔ یہ دیکھ کر فرعون
فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا	اور اس کے لشکر نے پیچھا کیا، مقصود یہ تھا کہ ظلم و شرارت کریں، یہاں تک کہ جب
وَعَدْوًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ	حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ فرعون سمندر میں غرق ہونے لگا تو اس وقت
قَالَ آمَنتُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا	پکار اٹھا: میں یقین کرتا ہوں کہ اس ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر
الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ	بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں، اور میں بھی اسی کے فرماں برداروں
وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ آلْآنَ	میں ہوں! (ہم نے کہا) "ہاں، اب تو ایمان لایا حالانکہ پہلے برابر نافرمانی
وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنتَ	کرتا رہا، اور تو دنیا کے مفسد انسانوں میں سے ایک (بڑا ہی) مفسد تھا
مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ فَالْيَوْمَ	پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے)
نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ	بچالیں گے، تاکہ ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں،
لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً ۚ وَإِنَّ كَثِيرًا	(قدرت حق کی) ایک نشانی ہو) اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری
مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ ۝	نشانیوں کی طرف سے یک قلم غافل رہتے ہیں۔
(یونس ع ۹)	
وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ	اور بڑائی کرنے لگے وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق
وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ۝ فَأَخَذْنَاهُ	اور سمجھے کہ وہ ہماری طرف پھر کر نہ آئیں گے پھر پکڑا

وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ فَانْظُرْ   ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پھر پھینک دیا ہم نے
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (قصص ع۴)   ان کو دریا میں سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام گنہ گاروں کا۔
وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ   اور جانچ چکے ہم اُن سے پہلے فرعون کی قوم کو اور آیا ان
رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ۝ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ   کے پاس رسول عزت والا کہ حوالہ کرو میرے بندے
لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ؕ   خدا کے تمہارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا معتبر اور یہ کہ سرکشی
اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَاِنِّيْ عُذْتُ   نہ کرو اللہ کے مقابل میں لایا ہوں تمہارے پاس سند
بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا   کھلی ہوئی، اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے
لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ۝ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ   رب کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو، اور اگر تم نہیں
مُّجْرِمُوْنَ ۝ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝   یقین کرتے مجھ پر تو مجھ سے پرے ہو جاؤ، پھر دعا کی اپنے رب سے
وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝   کہ یہ لوگ گنہگار ہیں پھر لے نکل رات میں میرے بندوں کو،
كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ   البتہ تمہارا پیچھا کریں گے اور چھوڑ جا دریا کو تھما ہوا، البتہ وہ
كَرِيْمٍ ۝ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ ۣ   لشکر ڈوبنے والے ہیں، بہت سے چھوڑ گئے باغ اور چشمے
وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ   اور کھیتیاں اور گھر عمدہ، اور آرام کا سامان جس میں باتیں بنایا
السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ   کرتے تھے، یونہی ہوا اور وہ سب ہاتھ لگا دیا ہم نے ایک
نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝   دوسری قوم کے پھر نہ رویا اُن پر آسمان اور زمین اور نہ ملی
مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝   ان کو ڈھیل اور ہم نے بچا نکالا بنی اسرائیل کو ذلت کی
(الدخان ع۲) مصیبت سے جو فرعون کی طرف سے تھی بیشک تھا چڑھ رہا حد سے بڑھ جانے والا

فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ   پھر چاہا بنی اسرائیل کو چین نہ دے اس زمین میں پھر
مَّعَهٗ جَمِيْعًا ۝ وَّقُلْنَا مِنْ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ   ڈبا دیا ہم نے اس کو اور اس کے ساتھ والوں کو سب کو
اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ   اور کہا ہم نے اس کے پیچھے آباد رہو تم زمین میں پھر جب
جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝ (بنی اسرائیل ع۱۲)   آئے گا وعدہ آخرت کا لے آئیں گے ہم تم کو سمیٹ کر۔

وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ۝ (الذاريات ع ۲)

اور نشانی ہے موسیٰ کے حال میں جب بھیجا ہم نے اس کو فرعون کے پاس دے کر کھلی سند، پھر اس نے منہ موڑ لیا اپنے زور پر اور بولا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ، پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اسکے لشکروں کو پھر پھینک دیا ان کو دریا میں اور اس پر لگا الزام۔

البتہ تورات نے بیان کردہ واقعات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تفصیلات بیان کی ہیں اور بنی اسرائیل کے کوچ اور پڑاؤ کے اکثر مقامات کے نام بھی بتائے ہیں جو دنیا کے لئے نامعلوم ہیں۔

تورات کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم پر جب خدا کی بھیجی ہوئی آفات کا سلسلہ جاری ہو گیا اور موسیٰ ؑ کے ارشاد کے مطابق یکے بعد دیگرے "نشانات" کا ظہور ہونے لگا تو اس نے حضرت موسیٰ ؑ کو بلا کر کہا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لیجا مگر اُنکے چوپایے اور پالتو جانور یہیں چھوڑنے ہوں گے حضرت موسیٰ ؑ نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ایک جانور بھی تو روکنے کا حق نہیں رکھتا، تب فرعون غضبناک ہو کر کہنے لگا کہ اب بنی اسرائیل نہ جا سکیں گے اور تو اب میرے سامنے کبھی نہ آنا ورنہ میرے ہاتھ سے مارا جائیگا، حضرت موسیٰ ؑ نے فرمایا کہ یہ تو نے ٹھیک کہا اب میں کبھی تیرے سامنے نہ آؤں گا، میرے خدا کا یہی فیصلہ ہے اور اس نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ تجھ پر اور تیری قوم پر ایسی سخت آفت آئے گی کہ تیرا اور کسی مصری کا پہلوٹھا زندہ نہیں رہے گا۔

موسیٰ (علیہ السلام) فرعون سے یہ گفتگو کر کے دربار سے باہر نکل آئے اور پھر بنی اسرائیل سے یہ فرمایا کہ خداوند خدا کا ارشاد ہے کہ فرعون کا دل سخت ہو گیا ہے وہ اب تم کو یہاں سے اُس وقت تک نہ جانے دے گا جب تک مزید نشان نہ دیکھ لے کہ جس سے تمام مصریوں میں کہرام مچ جائے مگر تم کو تیاری کر لینی چاہیئے کہ مصر سے نکلنے کا وقت آپہنچا اور خدائے تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کے ذریعہ بنی اسرائیل کو نکلنے سے پہلے قربانی اور عید فسح کا بھی حکم دیا اور اسکا

طریقہ اور شرائط بھی بتادیں، موسیٰؑ نے ان سے یہ بھی کہا کہ اپنی عورتوں سے کہو کہ وہ مصری عورتوں کے پاس جائیں اور اُن سے عید کے لئے سونے اور چاندی کے زیور اور قیمتی پارچہ جات مستعار مانگ لائیں اور مصری عورتوں نے آخر اُن کو زیورات دے دیئے پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک رات فرعون سے لے کر معمولی مصری کا پہلوٹھا مر گیا اور تمام گھرانوں میں کہرام مچ گیا۔

یہ دیکھ کر مصری فرعون کے پاس دوڑے آئے اور اس کو مجبور کیا کہ اسی وقت تمام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال دے تاکہ یہ نحوست یہاں سے دور ہو، ہم پر یہ سب آفتیں انہی کی بدولت آتی رہتی ہیں۔

تب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ اسی وقت تم سب یہاں سے نکل جاؤ اور اپنے جانوروں، مویشیوں، اور سب سامان کو بھی ساتھ لے جاؤ، جب بنی اسرائیل رعمسیس (جشن کے شہر) سے نکلے تو بچوں اور جانوروں کے علاوہ وہ سب چھ لاکھ تھے اور جب وہ نکلے تو مصریوں کے زیورات کو بھی واپس نہ کر سکے اور مصریوں نے بھی مطالبہ نہ کیا

جب بنی اسرائیل نے جنگل کی راہ لی تو اب فرعون اور اس کے سرداروں کو اپنے فیصلہ پر سخت افسوس ہوا، اور انھوں نے آپس میں کہا کہ ہم نے مفت میں ایسے اچھے چاکر اور غلام ہاتھ سے کھو دیئے اور فرعون نے حکم دیا کہ فوراً سرداروں، مصری نوجوانوں اور فوج کو تیاری کا حکم ہوا اور وہ کر و فر کے ساتھ رتھوں میں سوار ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور بنی اسرائیل کا تعاقب کیا

بنی اسرائیل رعمسیس سے سکات اور وہاں سے ایتام اور پھر کر مجدال اور بحر کے درمیان فی ہیخروت کے پاس بعل صفون کے سامنے خیمہ زن ہو چکے تھے. بنی اسرائیل کے اس پورے سفر میں خدا اُن کے ساتھ رہا اور وہ نورانی ستون کی تجلی کے ساتھ رات میں بھی اُن کی راہنمائی کرتا اور دن میں بھی آگے آگے چلتا، غرض صبح کی پو پھٹ رہی تھی کہ فرعون نے سمندر کے کنارے بنی اسرائیل کو آلیا انھوں نے پیچھا پھر کر دیکھا اور فرعون کو مع لشکر کے ساتھ اپنے قریب پایا تو بد دل اور خائف ہو کر حضرت موسیٰؑ سے جھگڑا کرنے لگے حضرت موسیٰ

نے ان کو بہت کچھ تسلی و تشفی دی اور بتایا کہ تمہارے دشمن ہلاک ہوں گے اور تم سلامتی و عافیت کے ساتھ نجات پاؤ گے، اور پھر دربارِ خداوندی میں مناجات کرنے لگے۔

اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے، بنی اسرائیل سے کہو کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر، اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے..... پھر موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔

.... اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا، اور ایک بھی اُن میں سے باقی نہ چھوڑا، پھر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی اُن کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیواروں کی طرح رہا۔

.... اور اسرائیلیوں نے وہ بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی دیکھی، اور وہ لوگ خداوند سے ڈرے اور خداوند پر اور اس کے بندے موسیٰؑ پر ایمان لائے۔[1]

تورات کی ان تفصیلات میں اگرچہ بہت زیادہ رطب و یابس اور دور از کار باتیں بھی ضمناً آ گئی ہیں، مگر وہ اور قرآنِ عزیز دونوں اس بارہ میں ہم آہنگ ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قہرمانیت کے مظالم سے موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان نشان (معجزہ) کے ذریعہ نجات دی، قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ یہ معجزہ اس طرح ظاہر ہوا کہ خدا کے حکم سے موسیٰ (علیہ السلام) نے قلزم پر لاٹھی ماری اور دریا کا پانی بیچ میں خشکی دے کر دونوں جانب پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔

فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ	پس (دریا) پھٹ گیا پھر ہر ایک جانب ایک بڑے پہاڑ کی
كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ (الشعراء)	مانند ہو گئی۔

[1] خروج باب ۱۴ آیت ۱۵-۳۱۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (بقرہ ع) اور جب ہم نے ٹکڑے کر دیا تمہارے لئے سمندر پس نجات دی ہم نے تم کو اور غرق کر دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم دیکھ رہے تھے'

اور توراۃ بھی اسی کی تائید کرتی ہے، چنانچہ اس میں مذکور ہے :-

"تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر..........

اور پانی اُن کے دائیں بائیں دیوار کی طرح رہا۔

البتہ توراۃ میں یہ اضافہ اور ہے کہ "رات بھر تند پُوربی ہوا چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا" سو اوّل تو توراۃ کی تحریف؛ در مختلف سنین کے مختلف تراجم کے پیشِ نظر تاریخی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے قرآن عزیز کے بیان ہی کو قابلِ اعتماد سمجھا جائے گا، کیوں کہ وہ باتفاق دوست و دشمن ہر قسم کی تحریف و تبدیل اور اضافہ و ترمیم سے محفوظ ہے۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ اس پر باطل کا کسی جانب سے گذر نہیں نہ سامنے سے اور نہ پیچھے سے وہ اتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والا خوبیوں والا ہے۔

علاوہ ازیں اس اضافہ کی تطبیق کی بہترین صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موسیٰؑ کے ہاتھ بڑھا کر عصا چلانے سے اوّل دریا کے دو حصے ہو گئے اور دونوں جانب پانی کھڑا ہو گیا اور پھر لاکھوں انسانوں نے جب اس کے درمیان سے گذرنا شروع کیا تو زمین کی نمی اور تری کو خشک کرنے کے لئے برابر پوربی تند ہوا چلتی رہی تاکہ بچہ سے بوڑھے تک اور انسان سے حیوان تک کسی کو بھی گذرنے میں زحمت و تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔

بدقسمتی سے مسلمانوں میں بعض ایسے افراد بھی ہیں جو "علم" کے نام سے مذہب کے ہر مسئلہ کو "مادیات" ہی تک محدود دیکھنا چاہتے ہیں اور اس لئے وہ خدا کے دیئے ہوئے ان نشانات (معجزات) کا بھی انکار کرتے ہیں جو انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کی

تائید اور دلیل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اُن کے انکار کے وہی معنی ہیں جو گذشتہ **صفحات پر** معجزہ کی بحث میں زیرِ بحث آچکے ہیں یعنی وہ خدا کے کسی فعل کو بھی کسی حالت میں اس محسوس اور مادی دنیا کے اسباب و علل سے مستثنیٰ مان لینے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ اُن کے الحاد و زندقہ کی بنیاد دراصل مغربی الحاد و زندقہ پر قائم ہے، اور اُن کا دل و دماغ اُس ہی سے مرعوب اور متاثر ہے جس کا لازمی نتیجہ میٹریلزم (MATERIALISM) پر اعتقاد و اعتماد کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

پس منجملہ دوسرے مقامات کے اُنھوں نے اُس مقام پر بھی یہ کوشش کی ہے کہ کسی طرح "غرقِ فرعون" کا یہ واقعہ روحانی معجزہ سے نکل کر مادی اسباب و علل کے تحت میں آجائے'

ہندوستان میں مسلمانوں کی دُنیوی ترقی کے لئے سرگرمِ عمل ہستی سید احمد خاں (سرسید) (مرحوم) بھی علومِ عربیہ اور علومِ دینیہ سے ناواقفیت کے باوجود مسطورۂ بالا عقیدہ کی ترویج میں پیش پیش ہیں، غالباً اس طرح وہ یورپ کی موجودہ زندگی کے ساتھ اسلام کو مطابق کرنا چاہتے تھے مگر مادیت کا یہ چولا چونکہ اس کے قد پر راست نہ آیا اس لئے اُنھوں نے چولے کی ترمیم کے بجائے اسلام کے نقشہ اور قد و قامت میں ترمیم شروع کر دی مگر اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

بے شبہ اسلام ایک ایسا روحانی مذہب ہے جو روحانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ دُنیوی زندگی میں بھی انسان کے عروج اور فلاح و بہبود کا کفیل ہے اور اس لئے ہر زمانے کے علوم و فنون کی ترقی اس کی آغوش میں پلتی اور اُس میں جذب ہوتی رہی ہے اور علم و حکمت ہمیشہ اُس کے سایۂ عاطفت میں نشو و نما پاتے رہے، لیکن "مادی علوم" کی حدود مادیات و مشاہدات اور محسوسات سے آگے کسی حال میں متجاوز نہیں ہو سکتیں اور آج کی سائنس اور کل کا فلسفہ دونوں اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہماری حدود محسوسات سے پرے نہیں ہیں' یعنی محسوسات و مادیات کی دیوار کے پیچھے کیا ہے؟ وہ اس سے لاعلمی تو ظاہر کرتے ہیں'

مگر اُن کا انکار نہیں کرتے۔

اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ گذشتہ اور موجودہ زمانہ میں جب کبھی علوم "نظریوں" اور "تھیوریز" سے آگے بڑھ کر محسوس اور مشاہدہ کی حد تک پہنچے ہیں تو ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ وہ اسلام کے اصول سے ٹکراتا ہو، یا اسلام میں اُس کا انکار پایا جاتا ہو تب ایسی صورت میں جب تک علمی نظریوں اور تھیوریوں میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی اور علمی تحقیقات ایک جگہ چھوڑتی اور دوسری جگہ بناتی رہتی ہیں تو اسلام کو ان کے مطابق کرنے کی سعی عبث ہے کیوں کہ مشاہدہ کی حد پر پہنچنے کے بعد بے شبہ ان کا فیصلہ قرآن کے فیصلہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

البتہ اسلام یا مذہب حق چند ایسے امور کا بھی اقرار کرتا ہے جو ان مادیات کی دنیا سے پرے کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً آخرت، حشر و نشر، جنت، جہنم، ملائکہ، وحی، نبوت اور معجزہ، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان میں سے کوئی امر بھی خلاف عقل یعنی عقل کی نگاہ میں ناممکن اور محال نہیں ہے، تاہم عقل کے لئے اس کی کنہ و حقیقت کا ادراک صرف اسی قدر ہو سکتا ہے جس قدر کہ مذہب نے اپنے علم یقین (وحی الٰہی) کے ذریعہ اس کو بتا دیا ہے اور ان باتوں کے سمجھنے کے لئے وحی کے سوائے عقل کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

بہرحال سید احمد خاں صاحب نے تفسیر احمدی میں اس مقام کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ غرق فرعون اور نجات بنی اسرائیل کا یہ واقعہ معجزہ نہ تھا بلکہ عام دُنیوی سلسلۂ اسباب و علل کے ماتحت بحر کے مد و جزر (جوار بھاٹا) سے تعلق رکھتا ہے، یعنی صورت حال یہ پیش آئی کہ جس وقت بنی اسرائیل نے قلزم کو عبور کیا تھا اس وقت اس کا پانی سمٹا ہوا تھا اور پیچھے کو ہٹ کر اس نے "جزر" اختیار کر رکھا تھا، فرعون نے جب بنی اسرائیل کو اس آسانی سے پار ہوتے دیکھا تو اس نے بھی اپنے لشکر کو داخل ہو جانے کا حکم دیدیا، مگر بنی اسرائیل

پار ہو چکے تھے اور فرعونی لشکر ابھی دریا کی خشکی پر چل ہی رہا تھا کہ اس کے "مدّ" اور آگے بڑھنے کا وقت آپہنچا اور فرعون اور اس کے لشکر کو اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ وہ آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے، اور سب غرق ہو گئے۔

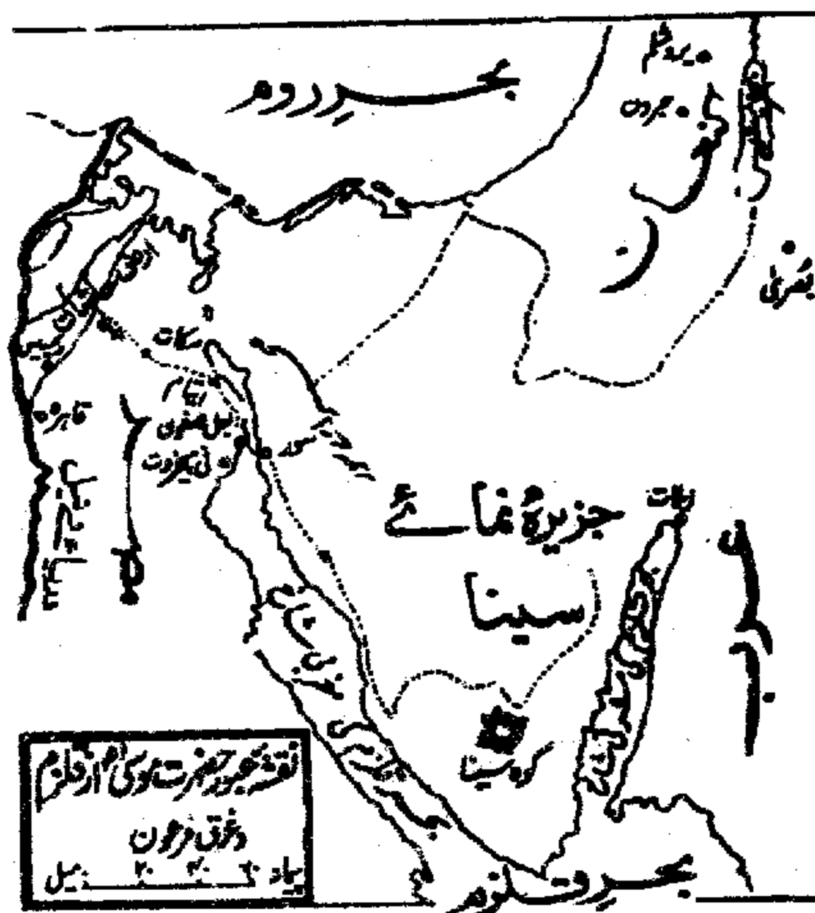
سید صاحب نے اپنے اس مزعومہ خیال کے مطابق بنی اسرائیل کے عبور کے متعلق ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنی اسرائیل نے قلزم کے شمالی دہانہ پر جاکر اس کو عبور کیا ہے۔

مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن عزیز کی تصریحات اس کا قطعی انکار کرتی ہیں، اور سید صاحب کی بات کسی طرح بنائے نہیں بنتی۔

اس بات کا فیصلہ تو قطعی ناممکن ہے کہ خاص وہ مقام متعین کیا جاسکے کہ جس سے بنی اسرائیل گذرے اور دریا کو عبور کر گئے کیونکہ اس سلسلے میں گذشتہ تاریخ کا پُرانا ذخیرہ تورات ہے مگر اس کے بیان کردہ مقامات موجودہ نسل کے لئے نامعلوم اسماء کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

البتہ قرآن اور تورات کی مشترک تصریحات و نصوص سے یہ قطعی متعین کیا جاسکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے "بحرِ قلزم" کے کسی کنارے اور دہانہ سے عبور کیا یا درمیانی کسی حصّہ سے؟

اس کے لئے ایک مرتبہ نقشہ میں اس حصّہ پر نظر ڈالئے جہاں بحرِ احمر (قلزم یا ریڈسی) (RED SEA) واقع ہے، دراصل یہ بحرِ عرب کی ایک شاخ ہے جس کے مشرق میں سرزمینِ عرب واقع ہے، اور مغرب میں مصر، شمال میں اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں، ایک شاخ (خلیجِ عقبہ) جزیرہ نمائے سینا کے مشرق میں اور دوسری (خلیجِ سویز) اس کے مغرب میں واقع ہے، یہ دوسری شاخ پہلی سے بڑی ہے اور شمال میں بڑی دُور تک چلی گئی ہے، بنی اسرائیل اسی کے درمیان سے گذرے ہیں۔ اس شاخ کے شمالی دہانہ کے سامنے ایک اور سمندر واقع ہے جس کا نام بحرِ روم ہے (MEDITERRANEAN SEA)



اور بحرِ روم اور بحرِ احمر کے اس شمالی دہانہ کے درمیان تھوڑا سا خشکی کا حصہ ہے، یہی وہ راستہ تھا جہاں سے مصر سے فلسطین اور کنعان جانے والے کو "بحرِ احمر" عبور کرنا نہیں پڑتا تھا، اور اس زمانہ میں یہ راہ قریب کی راہ سمجھی جاتی تھی اور بنی اسرائیل نے بحکمِ الٰہی یہ راہ اختیار نہیں کی تھی، اب اسی خشک زمین کو کھود کر بحرِ احمر (ریڈسی) کو بحرِ روم سے ملا دیا گیا ہے اور اس ٹکڑے کا نام نہر سویز ہے، اور "ریڈسی" کے شمالی دہانہ پر سویز کے نام سے ایک شہر آباد ہے، جو مصر کی بندرگاہ شمار ہوتا ہے۔

اب اس کے بعد قرآنِ عزیز کی سورۂ بقرہ اور سورۂ شعراء کی ان آیات پر پھر ایک مرتبہ غور کرنا چاہیے جو اس سلسلہ کی تصریحات پیش کرتی ہیں، ان آیات میں دو باتوں کا صاف صاف تذکرہ موجود ہے، ایک "فلق یا فرقِ بحر" یعنی دریا کا پھٹنا یا اس کو پھاڑ دینا، اور دوسرے دونوں جانب پانی کا پہاڑ کی طرح کھڑا ہو جانا اور درمیان میں راستہ پیدا ہو جانا "فَکَانَ کُلُّ

فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ

عربی لغت میں "فرق" کے معنی دو ٹکڑے کرکے جدا کردینے کے آتے ہیں خصوصاً "بحر" کی نسبت کے ساتھ چنانچہ کتب لغت میں ہے "فرق البحر ای فلقہ" سر کی مانگ کو بھی "فرق" اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سر کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرکے بیچ میں نکالی جاتی ہے، اور "فلق" کے متعلق اس طرح مذکور ہے "فلق الشی، شقہ والفلق، انشق، یعنی اس نے فلاں شے کو ٹکڑے کردیا اور وہ ٹکڑے ہوگئی" اسی لئے "فالق" اس درار کو کہتے ہیں جو پتھر کے درمیان ہوجاتی ہے، اسی طرح "طود" کے معنی بڑے پہاڑ کے ہیں "الطود۔ الجبل العظیم" پس ان لغوی تصریحات کے بعد ان ہر دو آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہوا کہ دریا کا پانی یقیناً دو ٹکڑے ہوگیا اور وہ دونوں جانب دو کھڑے ہوئے پہاڑ کی طرح بن گیا، اور درمیان میں راستہ پیدا ہوگیا، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل نے دریا کے ایسے حصہ سے عبور کیا ہو جو دہانہ اور کنارہ کے سامنے کا حصہ نہ ہو بلکہ پانی کا ایسا حصہ ہو جو درمیان سے پھٹ کر دو حصے بن سکتا ہو، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ قرآن عزیز صاف صاف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ بنی اسرائیل خشکی کی راہ سے قلزم کے دہانہ یا کنارے سے نہیں گذرے تھے بلکہ دریا کے کسی درمیانی حصہ کو عبور کرکے میدانِ سینا میں پہنچے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ "مدوجزر" (جوار بھاٹا) طولانی حصہ میں دہانہ کی جانب ہوا کرتا ہے، عرض میں اس طرح کبھی بھی نہیں ہوتا کہ پانی دونوں جانب سمٹ جائے اور بیچ میں خشکی کی راہ پیدا ہوجائے لہٰذا خدائے تعالیٰ کے اس عظیم الشان نشان "معجزہ" کا انکار کرتے ہوئے اس کو روزمرہ کے مادی اسباب کے نیچے لانے کی سعی کرنا قرآنی تصریحات کے بالکل خلاف اور اُس کی تحریف کے مرادف ہے۔

نیز توارات نے بنی اسرائیل کے اس عبور کے واقعہ میں بحرِ احمر کے جن مشرقی اور مغربی کنارہ کے مقامات کا ذکر کیا ہے اور اس عبور کے متعلق جو تصریحات بیان کی ہیں اُن سے

بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ عبور دہانہ پر سے نہیں تھا بلکہ شمال مغرب کے درمیانی حصہ سے ہوا تھا، جیسا کہ نقشہ سے واضح ہوتا ہے۔

بعض مغرب زدہ "ملحدوں" نے اس مقام پر جب کسی طرح انکارِ معجزہ کی بات بنتی نہ دیکھی تو توراۃ کے اس فقرہ کا سہارا لیا۔

اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اُسے خشک زمین بنا دیا، اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ خشک زمین دریا کے بیچ میں نکل آئی تھی تو بھی یہ معجزہ نہ تھا بلکہ رات بھر خشک ہوا کے چلنے سے دونوں جانب پانی بستہ برف کی طرح ہو گیا تھا اور بیچ میں خشک راستہ بن گیا تھا مگر جب فرعون کی باری آئی تو آفتاب کی تمازت نے بستہ برف کو پگھلا دیا اور پانی اصل حالت پر آ گیا اور مصری غرق ہو گئے۔

تو اس کے متعلق نجار مصری نے خوب کہا ہے کہ اگر بالفرض ان کی اس باطل تاویل کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی یہ "معجزہ" ہوا، اس لئے کہ سمندروں کے وجود سے لیکر آج تک کسی جگہ یہ ثابت نہیں ہے کہ اس طرح ہوا چل کر ان کے درمیان میں خشک راہ بنا دیتی ہو، علمِ تاریخ اور طبیعات دونوں اس قسم کے واقعہ سے یکسر خالی ہیں۔

پس عام مادی علل واسباب سے جدا، اگر ہوا کا یہ عمل صرف حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہی کے لئے مخصوص تھا اور مخصوص رہا تو پھر یہ "معجزہ" نہیں تو اور کیا ہے۔؟

بہرحال قرآنِ عزیز صراحت کرتا ہے کہ بحرِ قلزم میں غرقِ فرعون اور نجاتِ موسیٰؑ کا یہ واقعہ موسیٰ (علیہ السلام) کی تائید میں ایک عظیم الشان معجزہ تھا اور اگر کائنات کی کوئی شہادت بھی اس واقعہ کے اعجاز میں موجود نہ ہوتی تب بھی ہمارے لئے "وحیِ الٰہی" کا یہ فیصلہ ایک ناطق فیصلہ ہے اور مومن کا ایمان دُور از کار تاویلات سے جدا اصل حقیقت ہی کے ساتھ

وابستہ ہے، اور ہمارا یقین ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے لئے یہ ایسا عظیم "معجزہ" تھا جس نے تمام مادی قہرمانیت اور سامانِ استبدادیت کو ایک لمحہ میں شکست دے کر مظلوم قوم کو ظالم قوم کے پنجہ سے رستگاری دلائی۔[1] "واللّٰہ علےٰ کل شئ قدیر"

وَاَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَمَنْ مَّعَہٗٓ اَجْمَعِیْنَ ۚ	اور ہم نے موسیٰ اور اس کے تمام ساتھیوں کو نجات دی، پھر
ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ	دوسروں کو (یعنی ان کے دشمنوں کو) غرق کر دیا، بلاشبہ اس
وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ وَاِنَّ	واقعہ میں (خدا کا زبردست) نشان (معجزہ) ہے اور اکثر
رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ؒ	اُن کے ایمان نہیں لاتے اور اقرار نہیں کرتے اور بلاشبہ
(شعراء ع ۴)	تیرا رب ہی (سب پر) غالب رحمت والا ہے۔

واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد منسلکہ نقشہ کو سامنے رکھنے سے بیان کردہ حقائق بخوبی واضح ہو سکتے ہیں اور منکرینِ معجزہ نے اس واقعہ کے حقائق پر پردہ ڈالنے کے لئے جو باطل تاویلات کی ہیں اُن کی حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے۔

فرعون، قومِ فرعون اور عذاب قیامت

فرعون اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ حق و باطل کے معرکوں میں ایک عظیم الشان معرکہ ہے، اور ایک جانب غرور و نخوت، جبر و ظلم اور قہرمانیت و انانیت کی ذلت و رسوائی ہے تو دوسری جانب

---

[1] نجار کہتے ہیں کہ غرقِ فرعون اور عبورِ بنی اسرائیل کی جگہ آج متعین اور منضبط نہیں ہے کہ ٹھیک ٹھیک اُس جگہ کو بتایا جا سکے، البتہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ یہ جگہ وہ ہے جو آج "برکۂ فرعون" (فرعون کے پانی میں بیٹھ جانے کی جگہ) کے نام سے مشہور ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ بحرِ احمر کی بندرگاہ سویز سے بہت دور ہے، مثلاً اگر جہاز شام کے وقت سویز سے روانہ ہو تو آدھی رات کے بعد اس مقام پر پہنچے گا، لہٰذا یہ مقام وہ جگہ ہرگز نہیں ہے بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ اُس زمانہ میں "قلزم" کی خلیج جو خلیج سویز کے نام سے مشہور ہے بحرِ روم کے قریب تک پھیلی چلی گئی تھی اور اس سے بہت نزدیک تھی، لہٰذا بنی اسرائیل کے عبور کی جگہ وہ ہو سکتی ہے جو آج "عیونِ موسیٰ" کے نام سے مشہور ہے اور جو شمال مشرق میں واقع ہے، اس وقت میرے پاس محمد رفعت کا اطلس (اٹلس) موجود ہے، اس میں عبورِ بنی اسرائیل کے لئے جو خط کھینچ کر دکھلائے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ یہ عبور سویز اور بحیرۂ مرہ کے درمیان ہوا ہے، اور عیونِ موسیٰ بھی یہیں شمال مشرق میں واقع ہے۔ (قصص الانبیاء ۳۴۱/۳۴۲)

مظلومیت، خدا پرستی اور صبر و استقامت کی فتح و کامرانی کا عجیب و غریب مرقع، اس لئے خدائے تعالیٰ نے فرعون اور قوم فرعون کی ہلاکتِ دنیوی کے بعد عبرت و بصیرت کیلئے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے لئے آخرت اور سرمدی و ابدی زندگی میں کس قدر سخت عذاب اور خدا کی پھٹکار کے کیسے عبرتناک سامان مہیا ہیں تاکہ سلیم اور صالح طبائع اور نیک نہاد و نیک سرشت ہستیاں ان کا مطالعہ کریں اور ان اعمالِ زشت سے خود کو بھی بچائیں اور دوسروں کو بھی بچنے کی ترغیب دیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۙ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ۝ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝ (ھود ع ۹)

اور (یہ بھی ہو چکا ہے کہ) ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور واضح سند کے ساتھ بھیجا تھا، فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، مگر وہ فرعون کی بات پر چلے، اور فرعون کی بات راست بازی کی بات نہ تھی، قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا (جس طرح دنیا میں گمراہی کے لئے ہوا) اور اُنہیں دوزخ میں پہنچائے گا تو دیکھو) کیا ہی پہنچنے کی بُری جگہ ہے جہاں وہ پہنچ کر رہے! اور اس دنیا میں بھی لعنت اُن کے پیچھے لگی (کہ ان کا ذکر کبھی پسندیدگی کے ساتھ نہیں کیا جاتا) اور قیامت میں بھی (کہ عذابِ آخرت کے مستحق ہوئے) تو دیکھو کیا ہی بُرا صلہ ہے جو انکے حصہ میں آیا۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَا یُنْصَرُوْنَ ۝ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ ۝ (ع قصص)

اور کیا ہم نے اُن کو پیشوا کہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور قیامت کے دن اُن کو مدد نہ ملے گی، اور پیچھے رکھ دی ہم نے اُن پر اس دنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن اُن پر بُرائی ہے۔

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۚ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا ۚ وَیَوْمَ

اور اُلٹ پڑا فرعون والوں پر بُری طرح کا عذاب، وہ آگ ہے کہ دکھلا دیتے ہیں اُن کو صبح اور شام، اور جس دن

تَقُوْمُ السَّاعَةُ قف اَدْخِلُوْآ اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (الی آخرالآیہ) (مومن ع)

قائم ہوگی قیامت حکم ہوگا داخل کرو فرعون والوں کو سخت سے سخت عذاب میں۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۝ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ۝ (دخان ع)

بلاشبہ سیہنڈ کا درخت خوراک ہے گنہگار کی جیسے پگھلا ہوا تانبا کھولتا ہے پیٹوں میں، جیسے کھولتا پانی، پکڑو اس کو اور ڈھکیل کر لے جاؤ دوزخ میں، پھر ڈالو اس کے سر پر پانی کا عذاب، اس کو چکھ! تو ہی ہے بڑا عزت والا سردار، یہ وہی ہے جس کے متعلق تم دھوکے میں پڑے تھے۔

عبورِ قلزم کے بعد بنی اسرائیل کا پہلا مطالبہ

توراۃ میں ہے کہ جب بنی اسرائیل سلامتی کے ساتھ بحرِ قلزم کو پار کر گئے اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے فرعون اور اس کی فوج کو غرق ہوتے اور پھر اُن کی نعشوں کو ساحل پر تیرتے دیکھ لیا تو بتقاضائے فطرت بیحد مسرت اور خوشی کا اظہار کیا، اور عورتوں نے خصوصیت کے ساتھ دف پر خوشی کے گیت گائے اور شادمانی و خوش کامی کا ثبوت دیا، جب یہ سب کچھ ہوچکا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے قوم کو جمع کر کے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنی قوم سے کہو کہ "وہ میں ہوں جس نے تم کو اس زبردست فتنہ سے نجات دی سو میرا شکر ادا کرو اور میری ہی بندگی کرو۔"

حضرتِ موسیٰؑ نے اب اپنی قوم کو ساتھ لے کر بیابانِ شور سے ہوتے ہوئے سین یا سینا کی راہ لی، سینا کے بُت کدوں میں پرستارانِ صنم بتوں کی پوجا میں مشغول تھے، بنی اسرائیل نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگے موسیٰؑ! ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دے تاکہ ہم بھی اسی طرح ان کی پرستش کریں۔ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے قوم کی زبانی یہ مشرکانہ مطالبہ سُنا تو بہت زیادہ ناراض ہوئے اور بنی اسرائیل کو ڈانٹا، عار دلائی اور ملامت کی کہ بدبختو! خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پوجا پر مائل ہوا اور خدا کی اُن تمام نعمتوں کو فراموش کر بیٹھے جن کا مشاہدہ

اپنی آنکھوں سے کر چکے ہو۔

قومی پستی کا مظاہرہ دنیا کی تاریخ میں ہمارے سامنے ایک قوم کا نقشۂ حیات اس طرح نظر آتا ہے کہ وہ تقریباً ساڑھے چار سو برس سے مصر کے قاہر و جابر بادشاہوں اور مصری قوم کے ہاتھوں میں غلام اور مظلوم چلی آتی ہے اور غالب قوم کے سخت سے سخت مصائب و مظالم کا شکار بن رہی ہے کہ اچانک اُسی مردہ قوم میں سے بجلی کی کڑک اور آفتاب کی چمک کی طرح ایک برگزیدہ ہستی سامنے آتی ہے اور اس کی صدائے حق اور اعلانِ ہدایت سے تمام قلمرو باطل لرزہ براندام ہوجاتی، اور ایوانِ ظلم و کفر میں بھونچال آجاتا ہے، وہ دنیا کی ایک زبردست متمدن طاقت کے مقابلہ میں یہ اعلان کرتی ہے کہ میں خدائے واحد کا رسول اور ایلچی ہوں اور تجھ کو ہدایت کی پیروی اور مظلوم قوم کی آزادی کا پیغام سُنانے آیا ہوں فرعونی طاقت اپنے تمام مادی اسباب کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتی ہے، مگر ہر مرتبہ شکست کا مُنہ دیکھتی ہے اور آخری بازی میں حق کی کامیابی اور باطل کی ہلاکت کا ایسا حیرت زا نقشہ سامنے آتا ہے کہ مادی طاقت قلزم میں غرق ہوجاتی اور غلام و مظلوم قوم اور دنیوی اسباب و وسائل سے محروم قوم آزادی کے گیت گاتی نظر آتی ہے۔

یہ ہے وہ عجیب و غریب فطرت اور حیران کن طبیعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی قوم "بنی اسرائیل" جو ان تمام معرکہ ہائے حق و باطل کو آنکھوں سے دیکھنے اور حق کی کامیابی کیساتھ اپنی نجات پاجانے کے شکریہ میں آج موسیٰ (علیہ السلام) سے پہلا مطالبہ یہ کرتی ہے کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود (بت) بنادے جیسا کہ یہ پجاری بت خانہ میں بیٹھے پوج رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اگرچہ بنی اسرائیل نبیوں کی اولاد تھے اور ابھی تک ان میں وہ اثرات ایک حد تک باقی بھی تھے جو ان کو باپ دادا سے ورثہ میں ملے تھے، تاہم صدیوں سے مصری بت پرستوں میں بود و ماند کرنے اور اُن کے حاکمانہ اقتدار میں غلام رہنے کی وجہ سے اُن میں صنم پرستی کا جذبہ کافی سرایت کرچکا تھا، اور وہی جذبہ تھا جو آج پجاریوں کو دیکھ کر اُن میں

اُبھر آیا اور وہ موسیٰ (علیہ السلام) سے ایسا ناپاک مطالبہ کر بیٹھے۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝ (اعراف ع)	اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا پھر اُن کا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں کے سامنے دھونی رمائے بیٹھی تھی تو کہنے لگے موسیٰ! جیسے ان کے معبود بت ہیں ایسے ہی ہمارے لئے بھی بنا دے، موسیٰ نے کہا افسوس تم پر بلا شبہ تم جاہل قوم ہو، لاریب ان لوگوں کا طریقہ تو ہلاکت کا طریقہ ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں باطل ہے (اور یہ بھی) کہا کر باوجود اس کے کہ تم کو خدا نے تمام کائنات پر فضیلت دی ہے، پھر بھی میں تمہارے لئے خدائے واحد کے سوا اور معبود تلاش کروں؟

بنی اسرائیل کے دیگر مطالبات اور آیاتِ بینات کا ظہور

بنی اسرائیل نے بحرِ قلزم کو پار کر کے جس سرزمین پر قدم رکھا یہ عرب کی سرزمین تھی جو قلزم کے مشرق میں واقع ہے، یہ لق و دق بے آب و گیاہ میدان سے شروع ہوتی ہے جو تورات کی زبان میں بیابانِ شور، سین، وادیٔ سینا (تیہ) کے نام سے مشہور ہے اور طور تک اس کا دامن وسیع ہے، یہاں شدید گرمی پڑتی ہے۔ دُور دُور تک سبزہ اور پانی کا پتہ نہیں، اس لئے بنی اسرائیل گھبرا اُٹھے اور حضرتِ موسیٰ ؑ سے فریاد کرنے لگے کہ ہم پانی کہاں سے پئیں، ہم تو پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے، یہاں تو پینے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے، تب حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے درگاہِ الٰہی میں التجا کی اور وحیِ الٰہی نے ان کو حکم دیا کہ اپنا عصا زمین پر مارو، حضرتِ موسیٰ نے تعمیلِ ارشاد کی تو فوراً بارہ سوت اُبل پڑے اور بنی اسرائیل کے بارہ اسباط (قبائل) کیلئے جُدا جُدا چشمے جاری ہو گئے، بنی اسرائیل کو جب اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو اب کہنے لگے کہ پانی کا تو انتظام ہو گیا، لیکن زندگی کے لئے صرف یہی تو کافی نہیں ہے، ہم کو بھوک لگی ہے اب کھائیں کہاں سے؟ یہاں تو کوئی صورت نظر نہیں آتی؟ حضرتِ موسیٰ ؑ نے پھر رب العلمین

کی بارگاہ میں دعا کی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ موسیٰؑ! تمہاری دعا قبول ہوئی، پریشان نہ ہو، ہم غیب سے سب انتظام کئے دیتے ہیں، اور پھر ایسا ہوا کہ جب رات بیت گئی اور صبح ہوئی تو بنی اسرائیل نے دیکھا کہ زمین اور درختوں پر جگہ جگہ سپید اولے کے دانے کی طرح شبنم کی صورت میں آسمان سے کوئی چیز برس کر گری ہوئی ہے، کھایا تو نہایت شیریں حلوے کی مانند تھی، یہ "من" تھا اور دن میں تیز ہوا چلی اور تھوڑی دیر میں بٹیروں کے غول کے غول آکر زمین پر اُترے اور پھیل گئے، بنی اسرائیل نے بآسانی اُن کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بھون کر کھانے لگے، یہ "سلویٰ" تھا، اس طرح روزانہ بغیر زحمت و تکلیف کے اُن کو یہ دونوں نعمتیں مہیا ہو جاتیں، لیکن خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی معرفت بنی اسرائیل کو یہ تنبیہ کر دی تھی کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق "من و سلویٰ" کو کام میں لائیں، اور دوسرے دن کے لئے ذخیرہ نہ کریں ہم اُن کو روزانہ یہ نعمت عطا کرتے رہیں گے۔[1]

کھانے اور پینے کی ضروریات کی فراہمی سے جب اطمینان ہو گیا تو اب بنی اسرائیل نے تیسرا مطالبہ یہ کیا کہ گرمی کی شدت اور سایہ دار درختوں اور مکانوں کی راحت میسر نہ ہونے کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہیں، ایسا نہ ہو کہ یہ تپش اور تمازت ہماری زندگی کا خاتمہ ہی کر دے، حضرت موسیٰؑ نے ان کو تشفی دی اور بارگاہِ قدس میں عرض کیا کہ جب تو نے ان پر بڑے بڑے انعامات اور فضل و کرم کی بارش کی ہے تو اس سخت تکلیف سے بھی ان کو نجات عطا فرما، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا سُنی گئی اور آسمان پر بادلوں کے پرے کے پرے بنی اسرائیل پر سایہ فگن ہو گئے اور بنی اسرائیل جہاں بھی سفر کرتے ہوئے جاتے بادلوں کا یہ سائبان اُن کے سروں پر سایہ فگن رہتا۔

سُدی کی ایک روایت میں ان ہر سہ "آیات اللہ" کا تذکرہ یکجا اس طرح مذکور ہے" جب بنی اسرائیل "تیہ" کے میدان میں پہنچے تو کہنے لگے "موسیٰ! اس لق و دق میدان میں ہمارا کیا حشر ہو گا، کہاں سے کھائیں گے، کہاں سے پئیں گے۔ اور کہاں سے سایہ حاصل کریں گے؟"

[1] تفسیر ابن کثیر جلد: ص ۹۵-۹۶۔

تب اللہ تعالیٰ نے اُن کے کھانے کے لئے "من وسلویٰ" اتارا، پینے کے لئے "بارہ چشمے" جاری کردیئے، اور سایہ کے لئے بادل سایہ فگن ہوگئے۔[1]

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ (بقرہ ع۷)	اور پھر (وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تھا اور ہم نے حکم دیا تھا، اپنی لاٹھی سے پہاڑ کی چٹان پر ضرب لگاؤ (تم دیکھو گے کہ پانی تمہارے لئے موجود ہے، موسیٰ نے اس حکم کی تعمیل کی) چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ نکلے، اور تمام لوگوں نے اپنے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کرلی (اُس وقت تم سے کہا گیا تھا، اس بے آب وگیاہ بیابان میں تمہارے لئے زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہوگئی ہیں، پس کھاؤ پیو، خدا کی بخشائش سے فائدہ اٹھاؤ اور ایسا نہ کرو کہ ملک میں فتنہ وفساد پھیلاؤ (یعنی ضروریاتِ معیشت کے لئے لڑائی جھگڑا کرو، یا ہر طرف لوٹ مار مچاتے پھرو)
وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۖ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (بقرہ ع۶)	اور (پھر جب ایسا ہوا تھا کہ صحرائے سینا کی بے آب وگیاہ سرزمین میں دھوپ کی شدت اور غذا کے نہ ملنے سے تم ہلاک ہوجانے والے تھے) تو ہم نے تمہارے سروں پر ابر کا سایہ پھیلا دیا، اور من اور سلویٰ کی غذا فراہم کردی (تم سے کہا گیا) خدا نے تمہاری غذا کے لئے جو اچھی چیزیں مہیا کردی ہیں، انہیں بفراغت کھاؤ اور کسی طرح کی تنگی و قلت محسوس نہ کرو (لیکن اس پر بھی تم اپنی بدعملیوں سے باز نہ آئے، غور کرو) تم نے اپنی ناشکریوں سے ہمارا کیا بگاڑا؟ خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے!
وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَىْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۖ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى	اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ (ضرور) ایسا ہے جو لوگوں کو سچائی کی راہ چلاتا اور سچائی ہی کے ساتھ (ان کے معاملات میں) انصاف بھی کرتا ہے، اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۹۷۔

مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ أَنِ اضْرِب
بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا
عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ
مَّشْرَبَهُمْ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ
وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ
كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ
وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ
يَظْلِمُونَ ○ (اعراف ع ۲۰)

خاندانوں کے بارہ گروہوں میں منقسم کردیا، اور جب لوگوں نے
موسیٰؑ سے پینے کے لئے پانی مانگا تو ہم نے وحی کی کہ اپنی لاٹھی
(ایک خاص) چٹان پر مارو چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر
گروہ نے اپنی اپنی جگہ پانی کی معلوم کرلی اور ہم نے بنی اسرائیل
پر ابر کا سایہ کردیا تھا۔ اور (انکی غذا کیلئے) من اور سلویٰ اتارا
تھا، ہم نے کہا تھا "یہ پسندیدہ غذا کھاؤ جو ہم نے عطا کی ہے" (اور شر
و فساد میں نہ پڑو) انھوں نے (نافرمانی کرکے) ہمارا کچھ نہیں بگاڑا
خود اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ قَدْ أَنجَيْنَاكُم مِّنْ
عَدُوِّكُمْ وَوَاعَدْنَاكُمْ جَانِبَ الطُّورِ
الْأَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ
وَالسَّلْوَىٰ ۝ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا
رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ
غَضَبِي ۖ وَمَن يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي
فَقَدْ هَوَىٰ ۝ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَ
آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ (طٰہٰ ع)

اے بنی اسرائیل! میں نے تمہارے دشمن سے تمہیں نجات بخشی، تم
سے (برکتوں اور کامرانیوں کا) وعدہ کیا جو کوہ طور کے دہنی جانب ظہور
میں آیا تھا، تمہارے لئے (صحرائے سینا میں) من اور سلویٰ مہیا کردیا،
تمہیں کہا گیا "یہ پاک غذا مہیا کردی گئی ہے شوق سے کھاؤ (مگر اس بارہ
میں سرکشی نہ کرو) کروگے تو میرا غضب نازل ہوجائے گا اور جس پر میرا
غضب نازل ہوا تو بس وہ (ہلاکت میں گرا) اور میں نے کہا) جو کوئی
توبہ کرے، ایمان لائے، نیک عمل ہو تو میں یقیناً اس کے لئے
بڑا ہی بخشش والا ہوں۔

عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں لکھا ہے کہ پانی کے وہ چشمے جن کا ذکر بنی اسرائیل کے واقعات میں آیا ہے، بحر احمر کے مشرقی بیابان میں سوئز سے زیادہ دور نہیں ہیں اور اب بھی "عیونِ موسیٰؑ" (موسیٰ کے چشمے) کے نام سے مشہور ہیں، ان چشموں کا پانی اب بہت کچھ سوکھ گیا ہے اور بعض کے تو آثار بھی قریب معدوم ہوگئے ہیں اور کہیں کہیں ان چشموں پر اب کھجور کے باغات نظر آتے ہیں۔

قرآنِ عزیز کے ذکر کردہ واقعات سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عصا مار کر پانی کے حاصل کرنے کا واقعہ صرف ایک ہی مرتبہ پیش نہیں آیا بلکہ "تیہ کے میدان میں" مختلف مقامات پر متعدد مرتبہ پیش آیا ہے۔

بہر حال حضرتِ موسیٰؑ کے طفیل بنی اسرائیل پر خدائے تعالیٰ کے احسانات کی مسلسل بارش ہوتی رہی اور سیکڑوں برس کی غلامی سے اُن کے عزائم کی پستی، اخلاقی کمزوری اور ہمت و شجاعت کے فقدان نے اُن پر جو ایک مستقل مایوسی اور نا اُمیدی طاری کر دی تھی ان خدائی نشانات "نے بڑی حد تک اُن کی ڈھارس بندھائے رکھی، مگر عجیب الفطرت قوم پر اس کا بھی کافی اثر نہ ہوا اور انھوں نے اپنی "بوالعجبی" کا ایک نیا مظاہرہ پیش کر دیا۔ ایک دن سب جمع ہو کر کہنے لگے "موسیٰؑ! ہم روز روز ایک غذا کھاتے رہنے سے گھبرا گئے ہیں، ہم کو اس "من و سلویٰ" کی ضرورت نہیں ہے، اپنے خدا سے دعا کر کہ وہ ہمارے لئے زمین سے باقلا، کھیرا، ککڑی، مسور، لہسن، پیاز جیسی چیزیں اُگائے تاکہ ہم خوب کھائیں"۔

حضرتِ موسیٰؑ کو اُن کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا، اور فرمانے لگے تم بھی کس قدر احمق ہو کہ ایک عمدہ اور بہترین غذا کو چھوڑ کر معمولی اور گھٹیا قسم کی چیزوں کے طلبگار بنے ہو اور اس طرح خدا کی نعمتوں کی ناسپاسی اور اُس کے احسانات کی ناشکری کر کے کفرانِ نعمت کرتے ہو؟ پس اگر واقعی تم کو یہ نعمتیں نہیں بھاتیں اور جن چیزوں کا تم نام لے رہے ہو ان ہی کے لئے اصرار کرتے ہو تو درگاہِ الٰہی سے ان کو نشانات کی طرح طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے جاؤ کسی بستی اور شہر میں چلے جاؤ وہاں ہر جگہ تم کو یہ چیزیں وافر مل جائیں گی"۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ	اور جب تم نے کہا "موسیٰ! ہم ایک کھانے پر
وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا	صبر نہیں کر سکتے پس اپنے پروردگار سے ہمارے لئے
تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا	دعا کر کہ وہ زمین سے ہمارے لئے باقلا۔ ککڑی،

وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ (بقرہ ع)

لہسن، مسور اور پیاز جیسی چیزیں اگائے، موسیٰؑ نے کہا "کیا تم بہتر اور عمدہ چیز کے بدلے میں گھٹیا چیز کے خواہش مند ہو، کسی شہر میں جا قیام کرو، بلاشبہ وہاں یہ سب کچھ مل جائے گا جس کے تم طلب گار ہو۔

طور پر اعتکاف حضرت موسیٰؑ سے خدا کا وعدہ تھا کہ جب بنی اسرائیل مصری حکومت کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے تو تم کو "شریعت" دی جائے گی، اب وہ وقت آگیا کہ خدا کا وعدہ پورا ہو اس لئے حضرتِ موسیٰ وحیِ الٰہی کے اشارہ سے طور پر پہنچے اور وہاں عبادتِ الٰہی کیلئے اعتکاف کیا، اس اعتکاف کی مدت ایک مہینہ تھی مگر بعد میں دس دن اور بڑھا کر چلہ پورا کر دیا۔

دیلمی نے حضرتِ ابنِ عباس (رضی اللہ عنہما) سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کا ایک ماہ کا اعتکاف ختم ہو گیا تو انھوں نے خدائے تعالیٰ سے ہم کلامی کی تیاری شروع کی، چونکہ مسلسل ایک ماہ روزہ ہی میں بسر کئے تھے اس لئے منہ میں بُو محسوس کرتے تھے لہٰذا انھوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ رب العٰلمین سے اس حالت میں ہم کلام ہوں اور انھوں نے ایک خوشبودار بوٹی کو چبایا اور کھالیا، فوراً ہی وحیِ الٰہی نے ٹوکا، موسیٰ! تم نے ہمکلامی سے پہلے روزہ کیوں افطار کر لیا؟ حضرتِ موسیٰؑ نے اس کی وجہ بیان کر دی، تب حکم ہوا کہ موسیٰؑ! اِس مدت کو دس دن بڑھا کر چالیس دن کرو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے یہاں ایک روزہ دار کے منہ کی بُو بھی مشک کی خوشبو سے زیادہ محبوب ہے، اور اس طرح یہ "چلہ" پورا ہوا۔[1]

مگر قرآنِ کریم نے صرف اسی قدر ذکر کیا ہے کہ یہ مدت اول تیس دن تھی اور پھر بڑھا کر چالیس دن کر دی گئی، وجہ بیان نہیں کی۔[2]

---

[1] روح المعانی جلد ۱ ص ۳۸۔ لیکن دیلمی محققینِ اسماء الرجال کی نظر میں قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ (مؤلف)

[2] روحانی ریاضیات کے لئے صوفیائے کرام کی "چلہ کشی" غالباً اسی ماخذ سے اخذ کی گئی ہے، تجربہ بتاتا ہے کہ کسی کام پر استقامت حاصل کرنے کے لئے عموماً یہ مدت مفید ثابت ہوتی ہے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتیں بڑھا کر
وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ اُسے پورا (چلّہ) کر دیا، اس طرح پروردگار کے حضور آنے کی مقررہ
رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ۚ (اعراف ع) میعاد چالیس راتوں کی پوری میعاد ہو گئی۔

حضرت موسیٰ جب طور پر چلّہ کشی کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت ہارونؑ کو اپنا جانشیں بنا گئے کہ وہ بنی اسرائیل کو راہِ حق پر قائم رکھیں اور ہر معاملہ میں ان کی نگرانی کریں،

وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا! تو میرے
فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ پیچھے میری قوم میں میرا نائب رہنا اور اُن کی اصلاح
الْمُفْسِدِیْنَ ۝ (اعراف ع) کا خیال رکھنا اور مفسدوں کی راہ پر نہ چلنا۔

تجلی ذات ؟ جب "چلّہ" پورا ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو ہم کلامی کا شرف بخشا تو حضرت موسیٰؑ نے غایت کیف و انبساط میں عرض کیا "خدایا! جب تو نے مجھ کو لذت و کیفِ سماع سے نوازا ہے تو پھر لذتِ مشاہدہ و دیدار سے کیوں محروم رہوں ؟ اس سے بھی سرفراز فرما" وہاں سے جواب ملا "موسیٰ! تم مشاہدۂ ذات کی تاب نہ لا سکو گے، اچھا دیکھو ہم اپنی ذات کی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر کریں گے اگر یہ اس تجلی کو برداشت کر لے تو پھر تم یہ سوال کرنا" اس کے بعد طور پر حضرتِ حق کی تجلی نے ظہور کیا تو پہاڑ کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا، اور حضرت موسیٰ بھی اس نظارہ کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گئے اور گر پڑے۔

جب حضرت موسیٰؑ کو ہوش آیا تو انھوں نے خدائے برتر کی حمد و ثنا کی اور اپنے سوال سے رجوع کیا اور کہا کہ میں اقرار کرتا ہوں اور ایمان لاتا ہوں کہ تیرے جمال کی تجلی و عرفان و نمودِ حق میں کوئی کمی نہیں نقصان صرف میری اپنی ہستی کے عجز و بیچارگی کا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ اور جب موسیٰؑ آیا تاکہ ہمارے مقررہ وقت میں حاضری دے اور
رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ؕ اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا تو پکار اٹھا پروردگار
قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ مجھے اپنا جمال دکھا کہ تیری طرف نظر کر سکوں حکم ہوا تو مجھے نہیں

إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (اعراف ع)

دیکھ سکے گا، مگر ہاں، اس پہاڑ کی طرف دیکھ اگر یہ (تجلیِ حق کی تاب لے آیا اور) اپنی جگہ ٹکا رہا تو تو بھی مجھے دیکھ سکے گا" پھر جب اس کے پروردگار نے تجلی کی تو اس تجلی نے پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا جب موسیٰ ہوش میں آیا تو بولا "خدایا! تیرے لئے ہر طرح کی تقدیس ہو، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے یقین کرنے والوں میں ہوں۔

نزولِ تورات اس راز و نیاز کے بعد موسیٰ (علیہ السلام) کو تورات عطا کی گئی، اور حضرت حق نے اُن کو حکم کیا کہ اس پر مضبوطی سے قائم رہو اور اپنی قوم سے کہنا کہ وہ بھی ان احکام پر اس طرح عمل کریں کہ جو عملِ نیک جس قدر زیادہ قربِ الٰہی کا سبب بنے اس کو دوسرے اعمال پر ترجیح دیں، میں نے اس کتاب میں تمہارے دینی و دُنیوی فلاح کی تمام تفصیلات بیان کر دی ہیں، اور حلال و حرام، اور محاسن و معائب غرض تمام اوامر و نواہی کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور یہی میری شریعت ہے۔

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ○ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۚ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ○ (اعراف ع)

(اللہ تعالیٰ نے) کہا اے موسیٰ! بیشک میں نے لوگوں پر تجھ کو اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے برتری دی ہے اور چن لیا ہے، پس جو میں نے تجھ کو (تورات کو) دیا ہے اس کو لے اور شکرگذار بن" اور ہم نے اس کے لئے (تورات کی) تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور (احکام میں سے) ہر شے کی تفصیل لکھ دی ہے، پس اس کو قوت کے ساتھ پکڑ اور اپنی قوم کو حکم کر کہ وہ ان میں سے اچھی کو اختیار کریں، عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا۔

اس مقام پر دو باتیں قابلِ توجہ ہیں (۱) علماء اسلام کہتے ہیں کہ طور کے اس واقعہ میں

جن احکام کا نزول ہوا وہ تورات ہے اور علماءِ نصاریٰ کی موجودہ جماعت کہتی ہے کہ اس سے مراد وہ دس احکام ہیں جو مذہبِ موسوی میں "شریعت یا احکامِ عہد" کے نام سے موسوم ہیں، یعنی خدا کے سوا کسی کو نہ پوجو، زنا نہ کرو، چوری نہ کرو وغیرہ۔[1] اور بعض معاصر مفسرین نے بھی اس آیت کا مصداق "احکامِ عہد" ہی کو ٹھہرایا ہے، لیکن یہ دوسرا قول قرآنِ عزیز اور تورات دونوں کی شہادت سے غلط ہے، اور قولِ اول ہی صحیح اور درست ہے، اس لئے کہ قرآنِ عزیز نے سورۂ بقرہ میں حضرتِ موسیٰ (علیہ السّلام) کے چلّہ کا ذکر کرتے ہوئے جب نزولِ احکام کا تذکرہ کیا ہے تو اس کو کتاب اور فرقان کہا ہے اور یہ دونوں صفات قرآنِ عزیز میں تورات کے لئے بولی گئی ہیں نہ کہ "احکامِ عہد" کے لئے۔

وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوسٰى أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ	اور جب عہد کیا ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا
اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَأَنْتُمْ	پھر بنا لیا تم نے اس کے پیچھے گوسالہ، اور تم اس
ظٰلِمُونَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ	بارہ میں ظالم تھے، پھر ہم نے اس کے بعد تم کو معاف
ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَإِذْ آتَيْنَا	کر دیا تاکہ تم شکر گذار ہو اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب
مُوسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ	اور حق و باطل میں فرق کرنے والی (فرقان) چیز
تَهْتَدُونَ ۝ (بقرہ ع ۶)	عطا کی تاکہ تم راہ پاؤ۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ مِنْ بَعْدِ مَا	اور بیشک ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ
أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولٰى بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَ	کو کتاب دی جو لوگوں کے لئے بصیرتیں مہیا کرنے والی
هُدًى وَّرَحْمَةً لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ (قصص ع ۵)	اور ہدایت اور رحمت ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

اور اگرچہ توراۃ (موجودہ بائبل) کے سفرِ خروج، استثناء، اور کتابِ یسوع میں موسیٰ علیہ السّلام کے "چلّہ" کے بعد "احکامِ عہد" یا "شریعت" کا لفظ پایا جاتا ہے لیکن مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی نوراللہ مرقدہٗ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب اظہار الحق میں فارسی، عربی اور اردو قدیم تراجم کے حوالے سے یہ

[1] خروج باب ۳۴، آیت ۲۸۔

ثابت کیا ہے کہ تورات کے ان نسخوں میں ان ہر دو الفاظ کی جگہ "تورات" لکھا ہوا پایا جاتا ہے چنانچہ مولانا عبدالحق رحمہ اللہ نے بھی تفسیر حقانی میں اُردو فارسی بائبل مطبوعہ ۱۸۴۵ء و ۱۸۳۹ء سے حسب ذیل حوالے نقل کئے ہیں :۔

(۱) دراں سنگہا تمامی کلمات ایں تورات را بخط روشن بنویس۔ (استثنا، باب ۲۷، آیت ۲۸)

(۲) بنی اسرائیل نے بموجب حکم موسیٰ کے ایک مذبح بنایا اور اس کے پتھروں پر توریت کو کھود دیا۔ (یسوع۔ باب ۸۔ آیت ۱۵۔ (۱۸۴۵ء)

ان حوالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو طور پر جو الواح چالیس کے بعد دی گئیں وہ تورات کی تھیں "احکام عہد" کی الواح نہیں تھیں، اور انگریزی نسخہ کے ترجمہ میں لا (LAW) اور عربی و اُردو نسخوں میں "شریعت" کو بھی صحیح مان لیا جائے تو یہ لفظ بھی اپنے معنی کی وسعت میں تورات پر صادق آتا ہے، اور تورات، شریعت اور قانون سب کا مصداق ایک ہی چیز ہے اور قدیم عیسائی دنیا میں یہی معنی سمجھے جاتے رہے ہیں۔ اور "احکام عہد" اسی کا ایک جزء ہیں اور اس کو مستقل قرار دینا بہت بعد کی پیداوار ہے۔

(۲) مسطورۂ بالا آیات میں مذکور ہے :۔

سَاُورِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ۝ (اعراف) عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا۔

تو اس "دار" سے مراد کون سا مقام ہے؟ کہنے والوں نے قیاس اور تخمین سے مختلف جوابات دیئے ہیں (ا) اس "دار" سے عاد و ثمود کے کھنڈر مراد ہیں (ب) مصر مراد ہے کہ بنی اسرائیل دوبارہ اس میں داخل ہوں گے (ج) قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے شام کی مقدس سرزمین مراد ہے جہاں اُس زمانہ میں عمالقہ کے جابر بادشاہوں کی حکومت تھی اور جہاں بنی اسرائیل کو داخل ہونا تھا۔[1] نجار نے اسی کو ترجیح دی ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے، رہا یہ امر کہ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے بوڑھے ان بستیوں میں داخل نہیں ہو سکے۔ اس لئے کہ حضرت موسیٰؑ کا انتقال ارضِ مقدس میں داخل ہونے سے

[1] روح المعانی جلد ۵ ص ۵۳۔

پہلے ہی ہو گیا تھا اور اسی طرح بنی اسرائیل کے بوڑھوں پر بھی آنے والی تفصیل کے مطابق اس کا داخلہ حرام کر دیا گیا تھا، تو آیت کی یا تو یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل کے نوجوانوں کا داخلہ جن کی اکثریت تھی سب کا داخلہ ہے اور اس طرح کا استعمال شائع ذائع ہے اور یا یہ مراد ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا اور چند بنی اسرائیل کے بہادروں کو ارضِ مقدس میں اس لئے بھیجا تھا کہ وہ وہاں کے مفصل حالات معلوم کر کے آئیں کہ ہم کس طرح دشمن کو شکست دے کر پاک سرزمین میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اور انھوں نے آکر تمام حالات بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیان کئے تھے تو گویا ان معدودے چند افراد کا ارضِ مقدس میں داخل ہو کر اس کو دیکھ آنا اور پھر سب کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرنا، آیت میں اسی معاملہ کی جانب اشارہ ہے قتادہؒ کے قول کے مقابلہ میں پہلا قول اس لئے مرجوح ہے کہ اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل کبھی قومی اور جماعتی حیثیت سے مصر میں داخل نہیں ہوئے اور دوسرا قول اس لئے قابلِ اعتماد نہیں ہے کہ اگرچہ ثمود کے آثار وادیِ سینا کے قریب ضرور تھے مگر عاد کے آثار و کھنڈرات تو عرب کے مغربی حصہ میں واقع تھے جو وادیِ سینا سے مہینوں کی راہ تھی تو ایسی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بنی اسرائیل کو صرف ان محو شدہ آثار و کھنڈرات کو دکھانے کے لئے بھیجا جاتا اور اس کے لئے خدا کا وعدہ اس شان کے ساتھ بیان ہوتا! مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ اُس سے جہنم مراد ہے اور کافروں کی تہدید کیلئے کہا گیا ہے۔[1]

بہرحال حضرتِ موسیٰؑ کو تورات دی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ "ہمارا قانون یہ ہے کہ جب کوئی قوم ہدایت نہ پہنچنے اور اُس کی صداقت پر دلائل اور روشن حجت آجانے کے باوجود بھی سمجھ سے کام نہیں لیتی اور گمراہی اور باپ دادا کی بُری ریت رسم ہی پر قائم رہتی اور اس پر اصرار کرتی ہے تو پھر ہم بھی اس کو اس گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور ہمارے پیغامِ حق میں اُن کے لئے کوئی حصہ باقی نہیں رہتا اس لئے کہ انھوں نے قبولِ حق کی

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ سورۂ اعراف۔

استعداد اپنی متمردانہ سرکشی کی بدولت زائل کردی، قرآنِ عزیز نے اِسی حقیقت کو اس انداز میں بیان کیا ہے:-

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ
يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ
وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ
يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا
وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ
سَبِيْلًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ○
وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ
الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ○ (اعراف ع ۱۷)

جو لوگ ناحق خدا کی زمین میں سرکشی کرتے ہیں، ہم اپنی نشانیوں سے ان کی نگاہیں پھرا دیں گے، وہ دنیا بھر کی نشانیاں دیکھ لیں پھر بھی ایمان نہ لائیں اگر وہ دیکھیں ہدایت کی سیدھی راہ سامنے ہے تو کبھی اس پر نہ چلیں، اگر دیکھیں گمراہی کی ٹیڑھی راہ سامنے ہے تو فوراً چل پڑیں ان کی ایسی حالت اس لئے ہو جاتی ہے کہ ہماری نشانیاں جھٹلاتے ہیں اور اُن کی طرف سے غافل رہتے ہیں اور جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور آخرت کے پیش آنے سے منکر ہوئے تو ان کے سارے کام اکارت ہو گئے، وہ جو کچھ بدلہ پائیں گے وہ اُسکے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ان ہی کے کرتوتوں کا پھل ہوگا جو دنیا میں کرتے رہے۔

گوسالہ پرستی کا واقعہ اسی اثناء میں ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کو حیرت زا بھی کہہ سکتے ہیں اور افسوسناک بھی۔ اور جس سے بنی اسرائیل کی ذہنیت اور اخلاقی پستی بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ یعنی جبل طور یا حورب کے پہاڑ پر تو حضرت موسیٰ ؑ پروردگارِ عالم سے راز و نیاز میں مصروف اور بنی اسرائیل کے لئے آئینِ الٰہی (توراۃ) حاصل کرنے میں مشغول تھے۔ اور پیچھے وادیٔ سینا میں بنی اسرائیل نے سامری کی قیادت میں خود ہی اپنا معبود (گوسالہ) منتخب کر کے اسکی سمادھ لگالی اور پرستش شروع کر دی۔

جمہور مفسرین کی تفسیر کے مطابق واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جب طور پر توراۃ لینے کے لئے تشریف لے جانے لگے تو بنی اسرائیل سے یہ فرمایا کہ میرے

اعتکاف کی مدت ایک ماہ ہے، مدت پوری ہونے پر فوراً تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ہارونؑ تمہارے پاس موجود ہیں یہ تمہارے احوال کے نگراں رہیں گے، مگر طور پر جا کر وہ مدت تیس کی بجائے چالیس دن ہو گئی، اس تاخیر سے ایک شخص (سامری) نے فائدہ اٹھایا اُس لیے جب یہ دیکھا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی تاخیر سے مضطرب ہو رہے ہیں تو اُس نے کہا کہ اگر تم اپنے وہ تمام زیورات میرے پاس لے آؤ جو تم نے مصریوں سے مستعار لئے تھے اور پھر واپس نہ کر سکے تو میں تمہارے فائدہ کی ایک بات کر دوں۔

سامری گو ظاہر میں مسلمان تھا مگر اس کے دل میں کفر و شرک کی نجاست بھری ہوئی تھی، پس جب بنی اسرائیل نے تمام سونے کے زیورات لا کر اس کے حوالے کر دیئے تو اُس نے ان کو بھٹی میں ڈال کر گلا دیا اور اس سے گوسالہ (بچھڑا) کا جسم تیار کیا اور پھر اپنے پاس سے ایک مُشتِ خاک اس کے اندر ڈال دی، اس ترکیب سے گوسالہ میں آثارِ حیات پیدا ہو گئے اور وہ بچھڑے کی آواز "بھائیں بھائیں" بولنے لگا۔

اب سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ موسیٰؑ سے غلطی اور بھول ہو گئی کہ وہ خدا کی تلاش میں طور پر گیا، تمہارا معبود تو یہ موجود ہے۔

صفحاتِ گذشتہ میں یہ اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ صدیوں تک مصر کی غلامی نے بنی اسرائیل میں مشرکانہ رسوم و عقائد کو پھیلا دیا تھا اور وہ اس رنگ میں کافی حد تک رنگے جا چکے تھے، اور گوسالہ پرستی مصر کا قدیم عقیدہ تھا، اور ان کے مذہب میں اس کو بہت اہمیت حاصل تھی، اسی لئے ان کے ایک بڑے دیوتا (حورس) کا مُنہ گائے کی شکل کا تھا، اور وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کرۂ زمین گائے کے سر پر قائم ہے[1]

سامری نے جب بنی اسرائیل کو ترغیب دی کہ وہ اس کے بنائے ہوئے گوسالہ کو

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ تمام بُت پرست اقوام میں گائے کی تقدیس اور گوسالہ پرستی مشترک عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے ہندوستان، عراق، ایران، چین اور جاپان کے بُت پرستوں میں اس کی اہمیت یکساں نظر آتی ہے۔

اپنا معبود سمجھیں اور اس کی پوجا کریں تو انھوں نے بآسانی اس کو قبول کر لیا۔

حضرت ہارون نے یہ دیکھا تو بنی اسرائیل کو سمجھایا کہ ایسا نہ کرو یہ تو گمراہی کا راستہ ہے۔ مگر انھوں نے ہارون (علیہ السلام) کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ جب تک موسیٰ نہ آجائیں ہم اس سے باز آنے والے نہیں۔

یہاں جب یہ نوبت پہنچی تو اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا ہوا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اس واقعہ سے مطلع کر دیئے اس لئے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے پوچھا "موسیٰ! تم نے قوم کو چھوڑ کر یہاں آنے میں اس قدر جلدی کیوں کی؟" حضرت موسیٰ نے عرض کیا خدایا! اس لئے کہ تیرے پاس جلد حاضر ہو کر قوم کے لئے ہدایت حاصل کروں۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت ان کو بتایا کہ جس کی ہدایت کے لئے تم اس قدر مضطرب ہو وہ اس گمراہی میں مبتلا ہے، حضرت موسیٰ نے یہ سنا تو ان کو سخت رنج ہوا اور غصہ و ندامت کے ساتھ قوم کی طرف واپس ہوئے اور قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا "یہ تم نے کیا کیا؟ مجھ سے ایسی کونسی تاخیر ہو گئی تھی جو تم نے یہ آفت برپا کی؟ یہ فرماتے جاتے تھے اور غیظ و غضب میں کانپ رہے تھے حتیٰ کہ ہاتھ سے تورات کی الواح بھی گر گئیں۔

بنی اسرائیل نے کہا کہ ہمارا کوئی تصور نہیں، مصریوں کے زیورات کا جو بوجھ ہم ساتھ لئے پھر رہے تھے وہ سامری نے ہم سے مانگ کر یہ سوانگ بنا لیا اور ہم کو گمراہ کر دیا۔

شرک منصب نبوت کے لئے ایک ناقابل برداشت شے ہے اس لئے اور نیز اس لئے کہ حضرت موسیٰ بہت گرم مزاج تھے انھوں نے اپنے بھائی ہارون کی گردن پکڑ لی، اور داڑھی کی جانب ہاتھ بڑھایا تو حضرت ہارون نے فرمایا: "برادر! میری مطلق خطا نہیں ہے، میں نے ان کو ہر چند سمجھایا مگر انھوں نے کسی طرح نہیں مانا اور کہنے لگے کہ جب تک موسیٰ نہ آجائے ہم تیری بات سننے والے نہیں بلکہ انھوں نے مجھ کو کمزور پا کر میرے قتل کا ارادہ کر لیا تھا جب میں نے یہ حالت دیکھی تو خیال کیا کہ اب اگر ان سے لڑائی کی جائے اور

مومنینِ کاملین اور اُن کے درمیان جنگ برپا ہو تو کہیں مجھ پر یہ الزام نہ لگایا جائے کہ میرے پیچھے قوم میں تفرقہ ڈال دیا، اس لئے میں خاموشی کے ساتھ تیرا منتظر رہا۔ پیارے بھائی! تو میرے سر کے بال نہ نوچ اور نہ ڈاڑھی پر ہاتھ چلا اور اس طرح دشمنوں کو ہنسنے کا موقعہ نہ دے۔

ہارونؑ (علیہ السلام) کی یہ معقول دلیل سُن کر حضرت موسیٰؑ کا غصہ اُن کی جانب سے فرو ہو گیا، اور اب سامری کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا:۔

سامری! تو نے یہ کیا سوانگ بنایا ہے؟ سامری نے جواب دیا کہ میں نے ایسی بات دیکھی جو اِن اسرائیلیوں میں سے کسی نے نہیں دیکھی تھی یعنی غرقِ فرعون کے وقت جبرئیل علیہ السلام گھوڑے پر سوار اسرائیلیوں اور فرعونیوں کے درمیان حائل تھے، میں نے دیکھا کہ اُن کے گھوڑے کے سُم کی خاک میں اثرِ حیات پیدا ہو جاتا ہے، اور خشک زمین پر سبزہ اُگ آتا ہے تو میں نے جبرئیلؑ کے گھوڑے کے قدموں کی خاک سے ایک مٹھی بھرلی اور اس خاک کو اس بچھڑے میں ڈال دیا اور اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور یہ "بھاں بھاں" کرنے لگا۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: اچھا اب تیرے لئے دنیا میں یہ سزا تجویز کی گئی ہے کہ تو پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرے اور جب کوئی انسان تیرے قریب آئے تو اُس سے بھاگتے ہوئے یہ کہے کہ دیکھنا مجھ کو ہاتھ نہ لگانا، یہ تو دنیوی عذاب ہوا اور قیامت میں ایسے نافرمانوں اور گمراہوں کے لئے جو عذاب مقرر ہے وہ تیرے لئے وعدۂ الٰہی کی صورت میں پورا ہونے والا ہے۔

اے سامری! یہ بھی دیکھ کر تو نے جس گوسالہ کو معبود بنایا تھا اور اس کی سمادھ لگا کر بیٹھا تھا ہم ابھی اس کو آگ میں ڈال کر خاک کئے دیتے ہیں اور اس خاک کو دریا میں پھینکے دیتے ہیں کہ تجھ کو اور تیرے ان بے وقوف معتقدوں کو معلوم ہو جائے کہ تمہارے معبود کی

قدر و قیمت اور طاقت و قوت کا یہ حال ہے کہ وہ دوسروں پر عنایت و کرم تو کیا کرتا خود اپنی ذات کو ہلاکت و تباہی سے نہ بچا سکا۔

بدبختو! یہ معمولی بات بھی نہ سمجھ سکے کہ تمہارا معبود صرف وہی ایک خدا ہے جس کا نہ کوئی ساجھی ہے نہ شریک اور وہ ہر شے کا عالم و دانا ہے :-

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى	اور پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ موسیٰ سچائی کی روشن دلیلوں کے ساتھ تمہارے
بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ	پاس آیا، لیکن جب چالیس دن کے لئے تم سے الگ ہو گیا تو تم بچھڑے کے
الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ	پیچھے پڑ گئے اور ایسا کرتے ہوئے یقیناً تم (رشتہ ایمان میں ثابت قدم نہ تھے)
ظٰلِمُوْنَ ○ وَاِذْ اَخَذْنَا	ایمان سے منحرف ہو گئے تھے، اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (دین الٰہی پر قائم
مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ	رہنے کا) تم سے عہد لیا تھا، اور کوہ طور کی چوٹیاں تم پر بلند کر دی تھیں (تو تم نے
الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ	اس کے بعد کیا کیا؟ تمہیں حکم دیا گیا کہ) جو کتاب ہمیں دی گئی ہے، اس پر مضبوطی کے
بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا	ساتھ جم جاؤ اور اُس کے حکموں پر کاربند رہو تم نے (زبان سے) کہا، سنا اور دل
سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا	سے کہا نہیں مانتے، اور پھر ایسا ہوا کہ تمہارے کفر کی وجہ سے تمہارے دلوں میں
فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ	گوسالہ پرستی رچ گئی، اے پیغمبر! ان سے کہو (دعوتِ حق سے بے نیازی ظاہر
قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ	کرتے ہوئے) تم اپنے جس ایمان کا دعویٰ کرتے ہو، اگر وہ یہی ایمان ہے تو
اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ	افسوس اس ایمان پر! کیا ہی بُری راہ ہے جس پر تمہارا ایمان تمہیں
مُّؤْمِنِيْنَ ○ (بقرہ ع)	لے جا رہا ہے!
وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ	پھر ایسا ہوا کہ موسیٰ کی قوم نے اس کے (پہاڑ پر) چلے جانے کے بعد اپنے
مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ	زیور کی چیزوں سے (یعنی زیور کی چیزیں گلا کر) ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا
خُوَارٌ ۭ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ	جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی اور اُسے (پرستش کے لئے) اختیار
وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ	کر لیا (افسوس اُن کی عقلوں پر) کیا انہوں نے اتنی (موٹی سی) بات بھی
وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ○ وَلَمَّا سُقِطَ	نہ سمجھی کہ نہ تو وہ ان سے بات کرتا ہے، نہ کسی طرح کی رہنمائی کر سکتا ہے؟

فِیْٓ اَیْدِیْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ
ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا
رَبُّنَا وَیَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ
الْخٰسِرِیْنَ ۝ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓی
اِلٰی قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ
قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ
بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ
وَاَلْقَی الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ
اَخِیْهِ یَجُرُّهٗٓ اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ
اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ
وَكَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ
بِیَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ قَالَ رَبِّ
اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ
رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۠
اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ
سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ
وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ۝
وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ
ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ؗ

وہ اُسے لے بیٹھے اور وہ (اپنے اوپر) ظلم کرنے والے تھے پھر جب
ایسا ہوا کہ (افسوس و ندامت سے) ہاتھ ملنے لگے اور انھوں نے دیکھ لیا
کہ (راہِ حق سے) قطعاً بھٹک گئے ہیں تو کہنے لگے "اگر ہمارے پروردگار
نے ہم پر رحم نہیں کیا اور نہ بخشا تو ہمارے لئے تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے"
اور جب موسیٰؑ خشمناک اور افسوس کرتا ہوا اپنی قوم میں لوٹا تو اُس نے
کہا "افسوس تم پر! کس بُرے طریقہ پر تم نے میرے پیچھے میری جانشینی کی
تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں ذرا بھی صبر نہ کر سکے" اس نے
(جوش میں آکر) تختیاں پھینک دیں اور ہارونؑ کو بالوں سے پکڑ کر
اپنی طرف کھینچنے لگا، ہارونؑ نے کہا "اے میرے ماں جائے
بھائی! (میں کیا کروں) لوگوں نے مجھے بے حقیقت سمجھا اور قریب
تھا کہ قتل کر ڈالیں، پس میرے ساتھ ایسا نہ کر کہ دشمن ہنسیں،
اور نہ مجھے (ان) ظالموں کے ساتھ شمار کر، موسیٰؑ نے کہا "پروردگار!
میرا قصور بخش دے (کہ جوش میں آگیا) اور میرے بھائی کا بھی (کہ
گمراہوں کو سختی کے ساتھ نہ روک سکا) اور ہمیں اپنی رحمت کے
سایہ میں داخل کر! تجھ سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو۔
خدا نے فرمایا "جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی، ان کے
حصے میں ان کے پروردگار کا غضب آئے گا، اور دنیا کی
زندگی میں بھی ذلت و رسوائی پائیں گے، ہم افترا پردازوں کو
(ان کی بدعملی کا) اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ ہاں! جن لوگوں نے
برائیوں کے ارتکاب کے بعد (متنبہ ہو کر) توبہ کرلی، اور
ایمان لے آئے، تو بلاشبہ تمہارا پروردگار توبہ کے

إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ	بعد بخش دینے والا رحمت والا ہے!
رَّحِيْمٌ ۝ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى	اور جب موسیٰؑ کی خشمناکی فرو ہوئی، تو اس نے تختیاں اٹھالیں،
الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚ وَفِيْ	ان کی کتابت میں (یعنی اُن حکموں میں جو اُن پر لکھے ہوئے تھے
نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ	اُن لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو اپنے پروردگار
هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۝ (اعراف ع)	کا ڈر رکھتے ہیں۔
وَمَا اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝	اور (جب موسیٰؑ طور پر حاضر ہوا تو ہم نے پوچھا) "اے موسیٰؑ! کس
قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ	بات نے تجھے جلدی پر اُبھارا اور تو قوم کو پیچھے چھوڑ کر چلا آیا؟" موسیٰؑ
اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ قَالَ فَاِنَّا	نے عرض کیا "وہ مجھ سے دُور نہیں میرے نقشِ قدم پر ہیں۔ اور اے
قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ	پروردگار! میں نے تیرے حضور آنے میں جلدی کی کہ تو خوش ہو۔"
وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝ فَرَجَعَ	فرمایا، "مگر ہم نے تیرے پیچھے تیری قوم کی (استقامت کی) آزمائش کی
مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ	اور سامری نے اُسے گمراہ کر دیا۔" پس موسیٰؑ خشمناک اور افسوس کرتا ہوا
اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ	قوم کی طرف لوٹا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! یہ تم نے کیا کیا؟
رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ	کیا تمہارے پروردگار نے ایک بڑی بھلائی کا وعدہ نہیں
عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ	کیا تھا؟ پھر کیا ایسا ہوا کہ تم پر بڑی مدت گذر گئی (اور تم اُسے یاد
يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ	نہ رکھ سکے؟) یا یہ بات ہے کہ تم نے چاہا، تمہارے پروردگار کا غضب
فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ۝ قَالُوْا مَآ	تم پر نازل ہو، اس لئے تم نے مجھ سے ٹھہرائی ہوئی بات توڑ ڈالی؟"
اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا	انھوں نے کہا "ہم نے خود اپنی خواہش سے عہد شکنی نہیں کی، بلکہ
حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ	(ایک دوسرا ہی معاملہ پیش آیا) مصری (قوم کی زیب و زینت کی چیزوں
فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى	کا ہم پر بوجھ پڑا تھا (یعنی بھاری بھاری زیور زر کا جو مصر میں پہنے
السَّامِرِيُّ ۝ فَاَخْرَجَ لَهُمْ	جاتے تھے ہم اس بوجھ کے رکھنے کی خواہش مند نہ تھے) وہ ہم نے
عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا	پھینک دیا (بس ہمارا اتنا ہی قصور ہے) چنانچہ اس طرح (جیسا ہمارا…

هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۵
فَنَسِيَ ۵ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ
اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۵ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ
ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۵ وَلَقَدْ قَالَ
لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ
اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ
الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا
اَمْرِيْ ۵ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ
عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۵
قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ
رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۵ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۵
اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۵ قَالَ يَبْنَؤُمَّ
لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ
اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ
بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ
قَوْلِيْ ۵ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ۵
قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ
فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ
الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ
سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ۵ قَالَ فَاذْهَبْ
فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ

ہوگیا تو) سامری نے اُسے آگ میں ڈالا، اور ان کے لیے ایک
(سنہرا بچھڑا بنا کر) نکال لایا، محض ایک دھڑ جس سے گائے
کی سی آواز نکلتی تھی، لوگ یہ دیکھ کر بول اُٹھے، یہ ہے ہمارا
معبود اور موسیٰؑ کا بھی، مگر وہ بھول میں پڑ گیا (افسوس ان کی
سمجھ پر!) کیا اُنہیں یہ (موٹی سی) بات بھی دکھائی نہ دی کہ بچھڑا
(آواز تو نکالتا ہے مگر) ان کی بات کا جواب نہیں دے سکتا
اور نہ انہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان؟ اور ہارونؑ
نے اس سے پہلے انہیں صاف صاف جتا دیا تھا "بھائیو! یہ
اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمہاری (استقامت کی) آزمائش
ہو رہی ہے، تمہارا پروردگار تو خدائے رحمٰن ہے، دیکھو! میری
پیروی کرو اور میرے کہے سے باہر نہ ہو" مگر انھوں نے جواب دیا
تھا جب تک موسیٰؑ ہمارے پاس واپس نہ آجائے ہم اس کی
پرستش پر جمے ہی رہیں گے، بہرحال موسیٰؑ نے (اب ہارونؑ سے)
کہا "اے ہارونؑ! جب تو نے دیکھا یہ لوگ گمراہ ہوگئے ہیں تو کیا
بات ہوئی کہ انہیں روکا نہیں؟ کیا تو نے پسند کیا کہ میرے حکم سے
باہر ہو جائے؟" ہارونؑ بولا "اے میرے عزیز بھائی! میری ڈاڑھی
اور سر کے بال نہ نوچ (میں نے اگر سختی میں کمی کی، تو صرف اس
خیال سے کہ) میں ڈرا، کہیں تم یہ نہ کہو، تو نے بنی اسرائیل میں
تفرقہ ڈال دیا اور میرے حکم کی راہ نہ دیکھی" تب موسیٰؑ نے (سامری
سے) کہا "سامری! یہ تیرا کیا حال ہوا؟" کہا "میں نے وہ بات دیکھی
تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی تو میں نے فرشتے کے نقش قدم کی مٹی

لَا مِسَاسَ وَاِنَّ لَكَ	سے ایک مٹھی بھر لی پھر اس کو (ڈھلے ہوئے بچھڑے میں) ڈال دیا،
مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ وَانْظُرْ	میرے جی نے ایسی ہی بات مجھے سمجھائی" موسیٰؑ نے کہا" اگر ایسا
اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ	ہے تو پھر جا، زندگی میں تیرے لئے یہ ہونا ہے کہ کہے میں اچھوت
عَلَیْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ	ہوں، اور آخرت میں عذاب کا) ایک وعدہ ہے جو کبھی ٹلنے والا
لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا ۝	نہیں اور دیکھ تیرے (گڑھے ہوئے) معبود کا اب کیا حال ہوتا ہے
اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ	جس کی پوجا پر جم کر بیٹھ رہا تھا، ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے اور
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ	راکھ سمندر میں اڑا کر بہا دیں گے، معبود تو تمہارا بس اللہ ہی ہے
شَیْءٍ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ ۴، ۵)	اس کے سوا کوئی نہیں وہی ہے جو ہر چیز پر اپنے علم سے چھایا ہوا ہے"

آیاتِ مسطورۂ بالا میں حسبِ ذیل آیت کی تفسیر کے متعلق مفسرین کے درمیان کلام ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ یٰسَامِرِیُّ ۝ قَالَ	موسیٰؑ نے کہا" پس اے سامری! تیرا یہ کیا معاملہ ہے" سامری
بَصُرْتُ بِمَا لَمْ یَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ	نے کہا" میں نے اس چیز کو دیکھا جس چیز کو انھوں نے نہیں
قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا	دیکھا، پس میں نے "رسول" کے نشان سے ایک مٹھی بھر لی
وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِیْ نَفْسِیْ ۝ (طٰہٰ ع)	پھر اس کو ڈال دیا اور میرے جی نے یہی سمجھا دیا۔

دراصل اس آیت میں چند باتیں زیرِ بحث ہیں اور ان ہی کے فیصلہ پر کل واقعہ کی تفسیر کا مدار ہے (۱) سامری نے وہ کیا شے دیکھی جو دوسروں نے یعنی بنی اسرائیل نے نہیں دیکھی؟ (۲) "قَبَضْتُ قَبْضَةً" سے کیا مراد ہے؟ (۳) اَثَرِ الرَّسُوْلِ میں "رسول" سے مراد حضرت موسیٰؑ ہیں یا جبرئیل فرشتہ؟ (۴) نبذتھا سے کیا مراد ہے؟

واقعہ کی گذشتہ تفصیلات سے اگرچہ جمہور کی رائے معلوم ہو چکی ہے، تاہم مختصر طور پر اس کو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی کی زبانی پھر سن لیجئے:۔

"جس وقت بنی اسرائیل پھٹے دریا میں پیٹھے (گھسے) پیچھے فرعون ساتھ فوج کے پیٹھا (داخل ہوا) جبرئیل بیچ میں ہو گئے کہ ان کو ان تک نہ پہنچنے دیں، سامری نے پہچانا کہ یہ جبرئیل ہیں ان کے پاؤں

کے نیچے سے مٹھی بھرٹی اٹھالی وہی اب اس سونے کے بچھڑے میں ڈال دی، سونا تھا کافروں کا مال لیا ہوا فریب سے اس میں مٹی پڑی برکت کی حق و باطل مل کر ایک "کرشمہ" پیدا ہوا کہ رونق جاندار کی اور آواز اُس میں ہوگئی، ایسی چیزوں سے بچنا چاہئے اسی سے بُت پرستی بڑھتی ہے۔

اس تفسیر کے متعلق صاحب روح المعانی ارشاد فرماتے ہیں :۔

آیت کی یہ تفسیر وہ ہے جو صحابہ تابعین، تبع تابعین اور جلیل القدر مفسرین سے منقول ہے [1]

اس تفسیر کے خلاف دوسری تفسیر مشہور معتزلی ابو مسلم اصفہانی کی ہے: وہ کہتے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دیا کہ مجھ کو بنی اسرائیل کے خلاف یہ بات سوجھی کہ آپ حق پر نہیں ہیں اور ساتھ ہی میں نے آپ کا کچھ اتباع کر لیا تھا، اور پیروی اختیار کر لی تھی، مگر میرا دل اس پر نہ جما اور آخر کار میں نے اس اتباع اور پیروی کو بھی ترک کر دیا اور اسی طریق کار کو میرے نفس نے بہتر جانا، گویا ابو مسلم کے نزدیک آیت "فَبَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهٖ" کے معنیٰ یہ ہیں کہ سامری بنی اسرائیل کے عقیدے کے خلاف حضرت موسیٰؑ کو حق پر نہیں سمجھتا تھا، اور "فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ" میں "رسول" سے مراد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ہیں اور "اثر الرسول" سے مراد پیروی اور اتباع ہے، اور "قبضة" سے تھوڑی سی پیروی اور "فَنَبَذْتُهَا" سے ترکِ اتباع مُراد ہے، ابو مسلم نے اپنی اس تفسیر کے ثبوت میں لغتِ عرب سے کچھ استشہادات بھی پیش کئے ہیں اور جمہور کی تفصیل پر کچھ اشکالات بھی وارد کئے ہیں، جس کا جواب سیّد محمود آلوسیؒ نے اپنی تفسیر میں تفصیل کیساتھ دیا ہے۔

بایں ہمہ ابو مسلم کی اس تفسیر کو امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں قوی، راجح اور صحیح تسلیم کیا ہے، وہ فرماتے ہیں :۔

"یہ واضح رہے کہ ابو مسلم نے جو تفسیر بیان کی ہے اُس میں مفسرین کی مخالفت تو ضرور پائی جاتی ہے لیکن حسب ذیل چند وجوہ کے پیشِ نظر تحقیق سے قریب تر اُسی کی تفسیر ہے" [2]

[1] روح المعانی جلد ۱۶ ص ۲۲۹۔ [2] جلد ۶ ص ۲۰۔

چنانچہ علماءِ عصر میں سے مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ترجمان القرآن میں اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے:
زیرِ بحث آیت سے متعلق قرآنِ عزیز کے سیاق و سباق کے مطالعہ اور اس سلسلہ میں صحیح احادیثِ نبوی کی تفتیش و تحقیق کے بعد حق اور راجح بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی تصریح منقول نہیں ہے کہ جس کے بعد ایک جانب کو قطعیت حاصل ہو جائے اور دوسری جانب باطل قرار پائے اور غالباً اسی وجہ سے مشہور محدث و مفسر حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اس سلسلہ کی تمام روایات کو سامنے رکھنے کے بعد اگرچہ جمہور کی تائید کی ہے، اور ابومسلم کی تائید نہیں کی بلکہ اس کی تفسیر کو نقل بھی نہیں کیا تاہم جمہور کی تفسیر کو وہ حیثیت نہیں دی جو صاحب روح المعانی نے ذکر فرمائی ہے یعنی یہ کہ جمہور کی تفسیر نصوصِ حدیثی سے ثابت ہے اور اس لئے دوسرا احتمال بے شبہ الحاد و زندقہ ہے، چنانچہ انھوں نے آیت کی تفسیر کرنے کے بعد صرف یہ فرمایا:۔

ھٰذا ھو المشھور عند کثیر من المفسرین او اکثرھم۔ (جلد ۳ سورۂ طٰہٰ)	یہ وہ تفسیر ہے جو بہت سے مفسرین بلکہ اکثر مفسرین کی نسبت سے مشہور ہے۔

اور اسی طرح ان کے مشہور معاصر مفسر ابن حیان اندلسی نے البحر المحیط میں ابومسلم کی تفسیر کو اگرچہ قِیلَ[1] کہہ کر نقل کیا ہے مگر اس کے خلاف ایک جملہ بھی نہیں لکھا اور سکوت فرمایا۔
پس ان جلیل القدر مفسرین کے اس طرزِ تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ جمہور کی تفسیر ہی کو صحیح یا راجح سمجھتے ہیں، مگر دوسرے احتمال کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ نصوصِ قطعیہ کے خلاف ہے اور ایسا احتمال ہے جس کی پشت پر الحاد و زندقہ کی کارفرمائی ہے۔
البتہ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس آیت کا سیاق و سباق اور قبول و عدم قبولِ حق کے متعلق اس سلسلہ کی تمام آیاتِ قرآن کا اسلوبِ بیان دونوں ہی ابومسلم کی تفسیر کا قطعاً انکار کرتے اور اس کو تاویلِ محض ظاہر کرتے ہیں، اس لئے کہ آیتِ زیرِ بحث کے

---

[1] کوئی قول کمزور سمجھا جاتا ہے تو اس کو قیل کہہ کر بیان کیا جاتا ہے۔

جملہ "بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ" میں بصارت سے بصارتِ عینی کی جگہ بصیرتِ قلبی مراد لینا اور حضرتِ موسیٰؑ سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی "الرسول" کہہ کر اُن کو غائب کے قائم مقام بنانا اور "قَبَضْتُ قَبْضَةً" کے معنی مٹھی بھر لینا کی بجائے "تھوڑا سا اتباع کر لینا" بیان کرنا اور جملہ "نَبَذْتُهَا" سے ترکِ اتباع مراد لینا، یہ سب علیحدہ علیحدہ جملہ کے اعتبار سے اگرچہ محاوراتِ عرب میں قابلِ تسلیم ہیں لیکن پورے نظمِ کلام کے پیشِ نظر ابو مسلم کی تفسیر بجز تاویل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور سیاق و سباق شہادت دے رہے ہیں کہ اس جگہ وہی معنی راجح ہیں جو جمہور کا مختار ہیں۔

کیا یہاں یہ اصولی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اگر سامری کو صرف یہ بتانا تھا کہ میں دل سے آپ کا معتقد نہیں تھا، گر مصلحۃً کچھ دنوں کے لئے آپ کی پیروی کر رہا تھا اور اب اس کو بھی ترک کر دیا تو اس صاف اور سادہ بات کے لئے قرآنِ عزیز کو ایسے ذو معنی اور مبہم اظہارِ بیان کی کس لئے ضرورت پیش آئی کہ بقول مولانا آزاد مفسرین کو یہ موقع مل گیا کہ انھوں نے یہودیوں میں مشہور روایت کو ٹھیک ٹھیک آیتِ زیرِ بحث پر چسپاں کر دیا" پس جمہور کی تفسیر یہود کی روایت نہیں ہے بلکہ خود قرآن کا بولتا ہوا بیان ہے اور صاف اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے سوال پر سامری کا جواب ضرور کسی ایسے واقعہ سے تعلق رکھتا ہے جو حیرت زا بھی تھا اور کج فطرت انسانوں کی گمراہی کے لئے اس کو آلۂ کار بھی بنایا جا سکتا تھا۔

رہا یہ سوال کہ یہ عجیب و غریب معاملہ ایک باطل پرست کے ہاتھ سے کس طرح ظہور پذیر ہوا تو اس کے متعلق سب سے بہتر جواب شاہ عبد القادر (رحمہ اللہ) کی وہ تعبیر ہے جو موضح القرآن سے گذشتہ سطور میں نقل کی گئی، یعنی جب ایک باطل کو کسی دوسرے حق کے ساتھ ملایا جائے تو اس کے امتزاج سے ایک کرشمہ پیدا ہو جاتا ہے جو اس ترکیب کا خاصہ اور اس کا حقیقی مزاج کہلاتا ہے، مثلاً آپ گلاب کے عطر کو چرکین کے کچھ اجزاء کے ساتھ

مخلوط کیجئے تو گلاب کی نفیس اور لطیف خوشبو چرکین کی قابلِ نفرت بدبو کے ساتھ مل کر ایک ایسی کیفیت پیدا کر دے گی جس سے بے شبہ نفس چرکین کی بو سے بھی زیادہ دل و دماغ پر بُرا اثر پڑے گا اور یہ حالت ہو جائے گی کہ ایک سلیم المزاج انسان چرکین کے ایک ڈھیر پر کھڑا ہونا منظور کر سکتا ہے لیکن اس مخلوط بُو کو ایک لمحہ کے لئے بھی برد[illegible] نہیں کر سکتا، اسی لئے اسلام نے حق و باطل کے ایسے امتزاج کو حرام قرار دیا ہے کہ اس سے سخت گمراہی پھیلتی ہے'

بہرحال جمہور کی تفسیر ہی صحیح اور قرآنِ عزیز کے اسلوبِ بیان کے مطابق ہے۔

سامری کون تھا؟ | سامری کے اس انوکھے فریب نے ایک محقق کے لئے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ یہ شخص اسرائیلی تھا یا کون؟ اور یہ کہ سامری اس کا نام ہے یا لقب؟

نجار کہتے ہیں اس موقعہ پر جرائد میں عیسائیوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ سامریؔ سامرہؔ کی جانب منسوب ہے اور سامرہ شہر اس وقت تک آباد نہیں ہوا تھا، لہٰذا قرآن کے اس واقعہ میں سامری کے ذکر کے کیا معنی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "سامری" "سامرہ" شہر کی جانب منسوب نہیں ہے اور نہ منسوب ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ شہر موسیٰؑ کے زمانہ میں موجود نہ تھا۔ بلکہ بہت زمانہ کے بعد عالمِ وجود میں آیا ہے بلکہ یہ "شامر" کی جانب منسوب ہے اور یہ عبرانی لفظ ہے یہ جب عربی میں منتقل ہوا تو "ش" "س" کے ساتھ تبدیل ہو گیا خود عبرانی بولنے والی دو شاخیں سبطِ افرائیم اور سبطِ یہوذا میں سے افرائیمی "س" بولتے ہیں اور یہوذا "ش" چنانچہ یہ لفظ عبرانی میں "شومیر" بولا جاتا ہے اور شمر کے معنی حرس (حفاظت) کے ہیں لہٰذا شومیر یا شامر یا سامر کے معنی "حارس" (محافظ) کے ہیں اور اسی کی نسبت سے "سامری" بولا جاتا ہے۔

نجار نے عبرانی توراۃ سے (اس معنی کے استشہاد میں ایک حوالہ بھی دیا ہے کہ جب خدا نے قابیل سے پوچھا کہ تیرا بھائی ہابیل کہاں ہے؟ تو اس نے جواب دیا مجھے نہیں معلوم کہاں ہے:۔ ھسومیر احی انوخی[1] (کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں)[2]

---

[1] تکوین اصحاح ۴ آیت ۶۔ [2] قصص الانبیاء ص ۳۶۶۔

اور علامہ آزاد فرماتے ہیں:۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سامری کون تھا؟ یہ اس کا نام تھا یا قومیت کا لقب؟ قیاس کہتا ہے کہ یہاں سامری سے مقصود سمیری قوم کا فرد ہے، کیوں کہ جس قوم کو ہم نے سمیری کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے، عربی میں اس کا نام قدیم سے سامری آرہا ہے اور اب بھی عراق میں اُن کا بقایا اسی نام سے پکارا جاتا ہے، یہاں قرآن کا "سامری" کہہ کے اُسے پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں ہے، اس کی قومیت کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ شخص اسرائیلی نہ تھا، سامری تھا۔

حضرتِ مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس پہلے دجلہ و فرات کے دوآبے میں دو مختلف قومیں آباد ہو رہی تھیں اور ایک عظیم الشان تمدن کی بنیادیں اٹھا رہی تھیں، اُن میں سے ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی، عرب تھی، دوسری جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ شمال سے اُتری، سمیری تھی، اسی قوم کے نام سے تاریخِ قدیم کا شہر سامرہ اور اور آباد ہوا تھا جس کا محل اب تل العبید" میں دریافت ہوا ہے اور وہاں سے پانچ ہزار برس پیشتر کے بنے ہوئے زیور اور سنہری ظروف برآمد ہوئے ہیں۔

سمیری قوم کی اصل کیا تھی؟ اس بارہ میں اس وقت تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے لیکن نینوا میں اشوری پال (متوفی ۶۶۶ء قبل مسیح) کا جو کتب خانہ نکلا ہے اس میں تختیوں کا ایک مجموعہ لغت کی کتاب کا بھی ہے جس میں اکادی اور سمیری زبان کے ہم معنیٰ الفاظ جمع کئے گئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمیری زبان کے اصوات سامی حروف کے اصوات سے چنداں مختلف نہیں تھے، یہ بہت ممکن ہے کہ وہ بھی دراصل ان ہی قبائل کے مجموعہ سے کوئی بعیدی تعلق رکھتے ہوں جن کے لئے ہم نے تورات کی اصطلاح سامی اختیار کر لی ہے .... بہر حال سمیری قبائل کا اصلی وطن عراق تھا، مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے۔ مصر کے ان سے تعلقات کا سراغ ایک ہزار سال قبلِ مسیح تک، روشنی میں آچکا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے اسی قوم کا ایک فرد حضرتِ موسیٰ کا بھی

معتقد ہوگیا اور جب بنی اسرائیل نکلے، تو یہ بھی اُن کے ساتھ نکل آیا۔ اسی کو قرآن نے "السامری" کے لفظ سے یاد کیا ہے، گائے، بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی الخ [1]

ان ہر دو بیانات کے مطالعہ کے بعد یہ بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد کی تشریح نجار کی تشریح کے مقابلہ میں زیادہ قرین صواب اور راجح ہے اور نجار کی تشریح "تاویل بعید" کی حیثیت رکھتی ہے، سامر کے معنیٰ اگر نگہبان کے آتے ہیں تو اس کا نام بھی سامری کیوں ہوا۔ اس کا جواب اس تاویل میں نہیں ملتا اور عیسائیوں کے سوال کا جواب جس تاریخی تحقیق کے ساتھ آزاد صاحب کے مضمون میں ملتا ہے وہی صحیح ہے۔

الحاصل حضرت موسیٰؑ جب ان معاملات سے فارغ ہو گئے تو انھوں نے خدائے تعالیٰ کی جناب میں رجوع کیا کہ اب ان کے اس ارتداد اور بے دینی کی سزا تیرے نزدیک کیا ہے! وہاں سے جواب ملا کہ جن لوگوں نے یہ شرک کیا ان کو اپنی جان سے ہاتھ دھولینا پڑے گا۔ نسائی میں روایت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تمہاری توبہ کی صرف ایک صورت مقرر کی گئی ہے، وہ یہ کہ مجرموں کو اپنی جان کو اس طرح ختم کرانا چاہیے کہ جو شخص رشتہ میں جس سے زیادہ قریب ہے وہ اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے یعنی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو، آخر بنی اسرائیل کو اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ تورات میں ہے کہ اس طرح تین ہزار بنی اسرائیل قتل ہوئے اور بعض اسلامی روایات میں اس سے بھی زیادہ تعداد مذکور ہے، جب نوبت یہاں تک پہنچی تو حضرت موسیٰؑ درگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئے اور عرض کیا بار الٰہا! اب ان پر رحم فرما اور ان کی خطاؤں کو بخش دے، حضرت موسیٰؑ کی دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے قاتل و مقتول دونوں کو بخش دیا اور جو زندہ ہیں اور قصور وار ہیں ان کی بھی خطا معاف کر دی، تم انکو سمجھا دو کہ آئندہ شرک کے قریب بھی نہ جائیں۔

[1] ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۶۴ - ۴۶۵ -

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ	اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم! بلاشبہ تم نے گوسالہ
ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ	بنانے میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا ہے، پس اپنے خالق کی طرف
فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ	رجوع کرو اور اپنی جانوں کو قربان کرو، تمہارے پیدا کرنے والے کے
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ	نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے پھر وہ تم پر رجوع برحمت ہوگا
عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (بقرہ ع)	بلاشبہ وہ بڑا رجوع برحمت ہونے والا، رحم کرنے والا ہے۔

اس واقعہ کے متعلق قرآنِ عزیز اور تورات میں بہت سخت اختلاف ہے، تورات کا بیان ہے کہ گوسالہ ہارونؑ نے بنایا تھا:-

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰؑ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارونؑ کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اُٹھ ہمارے لئے دیوتا بنادے جو ہمارے آگے آگے چلے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰؑ کو جو ہم کو ملکِ مصر سے نکال کر لایا، کیا ہوگیا، ہارونؑ نے ان سے کہا تمہاری بیویوں اور لڑکوں لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں اُن کو اُتار کر میرے پاس لے آؤ، چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اُتار اُتار کر انکو ہارونؑ کے پاس لے آئے اور اس نے اُن کو اُن کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی، تب وہ کہنے لگے اے اسرائیل! یہی وہ تیرا دیوتا ہے جو تجھ کو ملکِ مصر سے نکال کر لایا، یہ دیکھ کر ہارونؑ نے اس کے آگے ایک قربانگاہ بنائی اور اس نے اعلان کردیا کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔ (خروج باب ۳۲-آیت ۹-۵)

تورات کی تحریف و مسخ کی شہادت اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ جو کتاب اسی بابِ خروج میں ہارون (علیہ السلام) کو خدا کا پیغمبر اور حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کا وزیر ظاہر کرتی ہو وہی تورات اس جگہ ہارون (علیہ السلام) کو عیاذاً باللہ نہ صرف مشرک اور بُت پرست ثابت کررہی ہے بلکہ شرک کا معلم اور بُت پرستی کا راہنما بتا رہی ہے۔

تورات کے مطالعہ سے بآسانی آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اہلِ کتاب کی بوالعجبیں

اور کتاب اللہ میں تحریفات کی داستانوں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت داستان یہ ہے کہ وہ خدا کے جن برگزیدہ انسانوں کو نبی اور پیغمبر کہتے جاتے ہیں ان ہی پر شرک و کفر اور بداخلاقیوں کی تہمت لگانے میں بھی نہیں جھجکتے، چنانچہ اس مقام پر بھی سامری کے مشرکانہ عمل کو حضرتِ ہارون علیہ السلام کے سر لگا دیا۔ قرآنِ عزیز اس خرافات کی پُرزور تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضرتِ ہارونؑ کا دامن اس قسم کی ناپاکی سے قطعاً پاک ہے، گوسالہ بنانا اور گوسالہ پرستی کی ترغیب دینا سامری کا کام تھا نہ کہ حضرتِ ہارونؑ جیسے برگزیدہ نبی کا، انھوں نے تو سختی کے ساتھ بنی اسرائیل کو اس ناپاک حرکت سے باز رکھنے کی سعی کی مگر وہ بدبخت کسی طرح نہ مانے۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ	اور بیشک ہارونؑ نے پہلے ہی ان (بنی اسرائیل) سے کہا اے قوم:
قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ	بلاشبہ تم فتنہ میں ڈال دیئے گئے (اس بچھڑے کے بنانے سے) اور
الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝	بیشک تمہارا پروردگار بڑا رحم والا ہے پس (سب مل کر) میری پیروی
قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى	کرو اور میرے حکم کو مانو تو انھوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا ہم اس کی
يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝ (طٰهٰ)	سمادھ ہرگز نہ چھوڑیں گے تا آنکہ موسیٰؑ لوٹ کر ہمارے پاس نہ آجائے۔

ستر سرداروں کا انتخاب جب بنی اسرائیل کا یہ جرم معاف کر دیا گیا تو اب حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے اُن سے فرمایا کہ میرے پاس جو یہ الواح (تختیاں) ہیں، یہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت اور دینی و دنیوی زندگی کی فلاح کے لئے مجھ کو عطا فرمائی ہے، یہ توراۃ ہے اب تمہارا فرض ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔

بنی اسرائیل بہرحال بنی اسرائیل تھے کہنے لگے: موسیٰ! ہم کیسے یقین کریں کہ یہ خدا کی کتاب ہے؟ صرف تیرے کہنے سے تو ہم نہیں مانیں گے، ہم تو جب اس پر ایمان لائیں گے کہ خدا کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، اور وہ ہم سے یہ کہے کہ یہ توراۃ میری کتاب ہے تم اس پر ایمان لاؤ۔

حضرتِ موسیٰؑ نے ان کو سمجھایا یہ بے وقوفی کا سوال ہے، ان آنکھوں سے خدا کو کس نے دیکھا ہے جو تم دیکھو گے؟ یہ نہیں ہو سکتا، مگر بنی اسرائیل کا اصرار بدستور قائم رہا حضرتِ موسیٰؑ نے جب یہ دیکھا تو کچھ سوچ کر ارشاد فرمایا کہ یہ تو ناممکن ہے کہ تم لاکھوں کی تعداد میں میری ساتھ حوریب (طور) پر اس کی تصدیق کے لئے جاؤ مناسب یہ ہے کہ تم میں سے چند سردار چن کر ساتھ لئے جاتا ہوں وہ اگر واپس آکر تصدیق کر دیں تو پھر تم بھی تسلیم کر لینا، اور چونکہ تم ابھی گوسالہ پرستی کر کے ایک بہت بڑا گناہ کر چکے ہو اس لئے اظہارِ ندامت اور خدا سے آئندہ نیکی کے عہد کے لئے بھی یہ موقع مناسب ہے۔ قوم اس پر راضی ہو گئی۔

حضرتِ موسیٰؑ نے تمام اسباط سے سترّ سرداروں کو چن کر ساتھ لیا اور طور پر جا پہنچے، طور پر ایک سپید بادل کی طرح "نور" نے حضرتِ موسیٰؑ کو گھیر لیا اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی شروع ہو گئی، حضرتِ موسیٰؑ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ تو بنی اسرائیل کے حالات کا دانا بینا ہے، میں ان کی ضد پر ستر آدمی انتخاب کر لایا ہوں، کیا اچھا ہو کہ وہ بھی اس "حجابِ نور" سے میری اور تیری ہمکلامی کو سُن لیں اور قوم کے پاس جا کر تصدیق کرنے کے قابل ہو جائیں؟ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰؑ کی دعاء منظور فرمالی اور ان کو حجابِ نور میں لے لیا گیا۔ اور انھوں نے حضرتِ موسیٰؑ اور اللہ رب العٰلمین کی ہمکلامی کو سُنا۔ پھر جب پردۂ نور ہٹ گیا، اور حضرتِ موسیٰؑ اور ان سرداروں کے درمیان مواجہہ ہوا تو سرداروں نے وہی اپنا پہلا اصرار قائم رکھا کہ جب تک بے حجاب خدا کو نہ دیکھ لیں ہم ایمان لانے والے نہیں۔ اس احمقانہ اصرار اور تمرد پر غیرتِ الٰہی نے ان کو یہ سزا دی کہ ایک ہیبت ناک چمک، کڑک، اور زلزلہ نے ان کو آلیا اور جلا کر خاک کر دیا۔ حضرتِ موسیٰؑ نے جب یہ دیکھا تو درگاہِ الٰہی میں عاجزی کے ساتھ دعاء مانگی۔ الٰہی! یہ بے وقوف اگر بے وقوفی کر بیٹھے تو کیا تو ہم سب کو ہلاک کر دے گا، اے خدا! اپنی رحمت سے تو ان کو معاف کر دے، حق تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰؑ کی دعاء کو سُنا اور ان سب کو دوبارہ حیاتِ تازہ بخشی اور پھر جب وہ زندگی کا لباس پہن رہے تھے تو

ایک دوسرے کی تازہ زندگی کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے :-

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ
رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ
اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ
اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ
اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ
تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ
وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ
خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ
الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا
هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ
بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ
كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ
وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا
يُؤْمِنُوْنَ ۚ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ
النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ؗ
يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ

اور اس غرض سے کہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے وقت میں حاضر ہوں
موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چنے، پھر جب لرزا دینے والی
ہولناکی نے انہیں آ لیا تو موسیٰ نے (ہماری جناب میں) عرض کیا
پروردگار! اگر تو چاہتا تو ان سب کو اب سے پہلے ہی ہلاک
کر ڈالتا، اور خود میری زندگی بھی ختم کر دیتا (مگر تو نے اپنے فضل و
رحمت سے ہمیں مہلت دی) پھر کیا ایک ایسی بات کے لئے جو ہم
میں سے چند بے وقوف آدمی کر بیٹھے ہیں تو ہم سب کو ہلاک کر دیگا؟
یہ اس کے سوا کیا ہے کہ تیری طرف سے ایک آزمائش ہے تو
جسے چاہے اس میں بھٹکا دے، جسے چاہے راہ دکھا دے،
خدایا! تو ہمارا والی ہے، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر، تجھ سے
بہتر بخشنے والا کوئی نہیں! اور (خدایا) اس دنیا کی زندگی میں بھی
ہمارے لئے اچھائی لکھ دے، اور آخرت کی زندگی میں بھی ہمارے
لئے اچھائی کر ہم تیری طرف لوٹ آئے! خدا نے فرمایا میرے
عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں، اور رحمت
کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، پس میں ان کے لئے
رحمت لکھ دوں گا جو برائیوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ ادا کرینگے
اور ان کے لئے، جو میری نشانیوں پر ایمان لائیں گے، جو
الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی امی ہوگا اور اس کے
ظہور کی خبر اپنے یہاں توراۃ اور انجیل میں لکھی پائیں گے،
وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں

اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ	حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائیگا، اس بوجھ سے نجات دلائیگا
عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ	جس کے تلے دبے ہوں گے اُن پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار
وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ	ہوں گے تو جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کے مخالفوں کیلئے روک ہوئے
اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ	(راہِ حق میں) اس کی مدد کی، اور اس روشنی کے پیچھے ہو لئے جو اس کے
(الاعراف ع ۱۹)	ساتھ بھیجی گئی ہے، سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں۔
وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی	اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم تجھ پر اُس وقت تک ہرگز ایمان
نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَةُ	نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے
وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ	نہ دیکھ لیں، پس آنکھوں دیکھتے تم کو بجلی کی کڑک نے آپکڑا، پھر
مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (بقرہ ع ۶)	ہم نے تم کو موت کے بعد زندہ کیا تاکہ تم شکر گذار رہو۔

حیات بعد الموت قرآنِ عزیز نے حیات بعد الممات کا عام قانون تو یہ بتایا ہے کہ اس دُنیوی موت کے بعد پھر عالمِ آخرت ہی کے لئے دوبارہ زندگی ملے گی لیکن قانونِ خاص یہ ہے کہ کبھی کبھی حکمت و مصلحت کے پیشِ نظر خدائے تعالیٰ اِس دنیا ہی میں مُردہ کو زندگی بخش دیا کرتا ہے اور انبیاء علیہم السّلام کی معجزانہ زندگی میں خود قرآنی شہادت کے مطابق اس حقیقت کا متعدد مرتبہ ظہور ہو چکا ہے۔

قرآنِ عزیز جب حیاتِ بعد الممات کا ذکر کرتا ہے تو اس کا قرینہ یہ ہے کہ وہ اس زندگی کو "بعث" سے تعبیر کرتا ہے جس کو اُردو میں جی اُٹھنا کہتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی اس آیت میں بھی قرآنِ عزیز نے بنی اسرائیل کے نمائندوں کی موت و ہلاکت اور اس کے بعد اُن کے بعث جی اُٹھنے کا ذکر کیا ہے اور لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ کہہ کر اس واقعہ کی اصلی حقیقت کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے کہ بے شبہ صورت یہ پیش آئی کہ اُنکے نامعقول اور گستاخانہ اصرار پر "رجفہ" کے عذاب نے ان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور پھر حضرتِ موسیٰؑ کی عاجزانہ دعاء پر خدا کی وسعتِ رحمت نے ترس کھایا اور ان سوختہ جان

انسانوں کو دوبارہ زندگی بخش دی تاکہ یہ شکر گذار ہوں اور آئندہ اس قسم کی بے جا ضد کو کام میں نہ لائیں اور خدا کے سچے فرمانبردار بن جائیں۔

اس تفصیل کے بعد یہ بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ جن معاصر مفسرین نے آیت کی تفسیر میں حیات بعد الممات سے بچنے کے لئے رکیک تاویلات کے ساتھ کی ہے وہ صحیح نہیں ہے اور انہوں نے بغیر کسی سند اور دلیل کے قرآنِ عزیز کے صاف اور صریح اسلوب بیان کو تفسیر بالرائے پر قربان کر دیا ہے۔

رحمتِ عام کا اعلان | سورۂ اعراف کی یہ آیت قَالَ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ مہماتِ قرآنی میں سے ہے، اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی جانب سے جو عذاب آتا ہے وہ خاص حالات کے ماتحت ہوتا ہے ورنہ عذاب خدائے تعالیٰ کی صفت نہیں ہے بلکہ "رحمت" اس کی ازلی و ابدی صفت ہے اس لئے اس کی صفتِ رحمت ہر شے کے لئے عام ہے اور کائنات میں ایک شے بھی ایسی نہیں ہے جو اُس کی صفتِ رحمت سے خالی ہو بلکہ یوں کہئے کہ جس کو تم "عذاب" کہہ رہے ہو وہ تمہارے اعمال و کردار کی نسبت سے "عذاب" ہے، ورنہ کارخانۂ ہستی کے پورے نقشہ کے لحاظ سے اگر تم غور کرو گے تو اس کو بھی رحمت ہی پاؤ گے، چنانچہ سورۂ انعام میں اسی لئے فرمایا:

"كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ" اللہ نے رحمت کو اپنی ذات پر مقرر کر لیا ہے۔

اور اسی رحمتِ عام کا مظہرِ اتم اور پرتوِ اکمل وہ ذاتِ گرامی ہے جس کا ذکرِ مبارک سورۂ اعراف کی اس آیت میں اس طرح کیا جا رہا ہے کہ اُس کی آمد سے قبل ہی کتبِ سابقہ میں اس کی آمد کی بشارت دے دی گئی تھی اور اس کی صفات اور اس کے اخلاق کا بھی تذکرہ کر دیا گیا تھا اور اسی لئے دوسری جگہ اس کو رحمۃ للعٰلمین کے لقب سے پکارا گیا۔[1]

---

[1] اس آیت کی مفصل تفسیر ذکرِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے موقعہ پر کی جائے گی۔ (مؤلف)

بنی اسرائیل اور جبلِ طور

بہر حال جب یہ ستر سردار دوبارہ زندگی پاکر قوم کی جانب واپس ہوئے تو انھوں نے قوم سے تمام قصہ کہہ سنایا اور بتایا کہ موسٰی (علیہ السلام) جو کچھ کہتے ہیں وہ حق ہے اور بے شبہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں۔

اب فطرتِ سلیم کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ سب خدائے تعالیٰ کا شکر بجا لاتے اور اس کے فضل و کرم کی فراوانی کے پیشِ نظر فرمانبرداری اور عبودیت کے ساتھ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے مگر ہوا یہ کہ انھوں نے اپنی کج روی کو باقی رکھا اور اپنے نمائندوں کی تصدیق کے باوجود تورات کو قبول کرنے میں معاندانہ پس و پیش شروع کر دی اور حضرت موسٰی (علیہ السلام) کے ارشادات پر کان نہ دھرا۔

جب حضرتِ موسٰی (علیہ السلام) نے یہ دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں رجوع کرتے ہوئے قوم کی بے راہ روی کا گلہ کیا۔ درگاہِ الٰہی سے حکم ہوا کہ ان نافرمانوں کے لئے میں تجھ کو ایک حجت (معجزہ) اور عطا کرتا ہوں اور وہ یہ کہ جس پہاڑ (طور) پر تو مجھ سے ہمکلام ہوتا رہا ہے اور جس پر تیری قوم کے منتخب سرداروں نے حق کا مشاہدہ کیا ہے اسی پہاڑ کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرے اور سائبان کی طرح بنی اسرائیل کے سروں پر چھا جائے اور زبانِ حال سے یہ اعلان کرے کہ موسٰی خدا کا سچا پیغمبر ہے اور تورات بے شبہ خدا کی سچی کتاب ہے اور اگر یہ دونوں حق و صداقت کا مظہر نہ ہوتے تو یہ عظیم الشان "نشان" تم نہ دیکھتے جس کا ظہور قدرتِ الٰہی کے سوا اور کسی طرح ناممکن ہے۔

چنانچہ جوں ہی خدائے تعالیٰ کا یہ تکوینی فیصلہ ہوا طور اُن کے سروں پر مثل سائبان نظر آنے لگا، اور زبانِ حال سے کہنے لگا کہ اے بنی اسرائیل! اگر تم میں عقل و ہوش باقی ہے اور حق و باطل کی تمیز موجود ہے تو گوشِ حق نیوش سے سنو کہ میں خدا کا نشان بن کر تم کو یقین دلاتا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ موسٰی (علیہ السلام) نے بارہا میری پیٹھ پر خدائے تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل کیا ہے اور تمہارے رشد و ہدایت کا

قانون (تورات) بھی اس کو میری پیٹھ ہی پر عطا ہوا ہے اور اے سرمستانِ بادہ غفلت و سرکشی! میری یہ ہیئت جو تمہارے لئے حیران کُن بن رہی ہے، اس امر کی شہادت ہے کہ جب انسان کے سینہ میں دل کی نرمی، سختی سے بدل جاتی ہے تو پھر وہ پتھر کا ٹکڑا بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت بن جاتا ہے اور رُشد و ہدایت اُس میں کسی جانب سے بھی سرایت نہیں کر پاتی، دیکھو! میں پتھر کے ٹکڑوں کا مجموعہ "پہاڑ" ہوں لیکن خدا کے حکم کے سامنے سرِتسلیم خم کئے کس طرح عبودیت کا مظاہرہ کر رہا ہوں مگر تم ہو کہ انانیت اور خودی کے گھمنڈ میں کسی حالت میں بھی "نہیں" کو "ہاں" سے بدل دینے کے لئے تیار نہیں، سچ ہے:۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (بقرہ ع) — پھر تمہارے دل سخت ہو گئے سو وہ ہو گئے جیسے پتھر یا اُن سے بھی سخت۔

بنی اسرائیل نے جب یہ "نشان" دیکھا تو اب اُسے وقتی خوف و دہشت کا ثمرہ سمجھئے یا علیٰ رؤسِ الاشہاد خدا کے عظیم الشان "نشان" کے مشاہدہ کا نتیجہ یقین کیجئے کہ بنی اسرائیل تورات کی جانب متوجہ ہوئے اور حضرتِ موسیٰؑ کے سامنے اُس کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا تب خدائے تعالیٰ کا فرمانِ ذی شان ہوا کہ اے بنی اسرائیل! ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ لو اور جو احکام اس (تورات) میں درج ہیں ان کی تعمیل کرو تاکہ تم پرہیزگار اور متقی بن سکو۔

مگر افسوس کہ بنی اسرائیل کا یہ عہد و میثاق ہنگامی ثابت ہوا اور زیادہ عرصہ تک وہ اس پر کاربند نہ رہ سکے اور حسبِ عادت پھر خلاف ورزی شروع کر دی، قرآنِ عزیز نے ان واقعات کو نہایت مختصر مگر صاف اور واضح نظمِ الفاظ کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۞ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ — اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سر پر طور کو اونچا کیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اُس کو قوت سے پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اُس کو یاد کرو تاکہ تم پرہیزگار بنو، پھر اس کے بعد تم نے (اس تورات سے)

بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۚ (بقرہ ۸) — پیٹھ پھیرلی، پس اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بلاشبہ تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوجاتے۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۚ (اعراف ۲۱) — اور جب ہم نے اُن کے (بنی اسرائیل کے) سروں پر پہاڑ بلند کردیا گویا کہ وہ سائبان ہے اور انھوں نے یقین کرلیا کہ وہ اُن پر گرنے والا ہے (تو ہم نے کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اس کو قوت سے لو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد کرو تاکہ تم پرہیزگار رہو۔

ان آیات میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل نے جب تورات کو قبول کرنے میں پس و پیش کیا بلکہ انکار کردیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے سروں پر طور کو بلند کردیا اور اس طرح آیۃ اللہ کا مظاہرہ کرکے اُن کو قبولِ تورات پر آمادہ کیا، پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ آیات کے ظاہر کو تاویلات میں گھسیٹا جائے جیسا کہ بعض معاصر مفسرین نے کیا ہے۔

کسی پہاڑ کا جڑ سے اُکھڑ کر فضا میں معلق ہوجانا نہ عقلاً محال ہے اور نہ قانونِ قدرت کے منافی، البتہ انوکھا اور حیرت زا واقعہ ضرور ہے اور اس لئے آیۃ اللہ کہلانے کا مستحق، مگر تاویل کرنے والے کہتے ہیں کہ "رفع" کے معنی صرف بلندی کے آتے ہیں نہ کہ سر پر بلند ہونے کے، اور اسی طرح "نتق" کے معنی جس طرح جڑ سے اُکھڑنے کے آتے ہیں اسی طرح زلزلہ میں آنے اور خوفناک حرکت کرنے کے بھی آتے ہیں، لہٰذا سورۂ اعراف کی آیت کے معنی یہ ہوئے،

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے اُن کے اوپر پہاڑ کو زلزلہ میں ڈالا تھا، گویا ایک سائبان ہو ہل رہا ہو اور وہ (دہشت کی شدت میں) سمجھے تھے کہ بس ان کے سروں پر آگرا۔ الخ [1]

مگر ان حضرات نے اس حقیقت کو بالکل فراموش کردیا کہ "رفع" اور "نتق" کے اگر متعدد معانی آتے ہیں تو عربیت کے قاعدہ سے اُس مقام پر جو قرینہ پایا جاتا ہو اسی کے مطابق معنے متعین ہوں گے خصوصاً جب کہ قرآنِ عزیز کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے تو بے شبہ کسی لفظ کے متعدد معانی میں سے صرف وہی معنی مراد ہوں گے جو دوسری آیت کے

[1] ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۲۱

ذریعہ متعین ہوتے ہیں۔

پس بقرہ کی آیت "رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ" میں "رفع" اور "فوق" کو جب اعراف کی آیت "نَتَقْنَا الْجَبَلَ" میں "نتق" کے ساتھ ملائیں گے تو قرآنِ عزیز کی ان آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہی بنے گا کہ طور کو اس کی جگہ سے اکھاڑ کر بنی اسرائیل کے سروں پر اس طرح کر دیا گیا گویا ایک سائبان ہے جو عنقریب اُن پر گرنے والا ہے۔ نیز "فوق" کا رفع کیساتھ لانا بھی اس تفسیر کی صحت کے لئے مؤثق شہادت ہے جو جمہور نے بیان فرمائی ہے اسکے برعکس معاصر مفسرین سے نقل کردہ معنی صاف بول رہے ہیں کہ وہ منطوقِ قرآنی کے خلاف کھینچ تان کر بنائے گئے ہیں۔

اس مقام پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ہر دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر توراۃ کے عمل کرانے میں جبر و اکراہ سے کام لیا گیا ہے، حالانکہ دین میں جبر و اکراہ درست نہیں ہے مگر قرآنِ عزیز کے سیاق و سباق کو پیشِ نظر رکھ کر واقعہ کی صورت جس طرح ہم نے نقل کی ہے یہ اعتراض اس شکل میں پیدا ہی نہیں ہوتا، البتہ اگر جمہور مفسرین اور جدید مفسرین کی تفسیر سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے تو اُس کا بہترین جواب مفتی عبدہ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دراصل یہ جبر و اکراہ کا معاملہ نہیں تھا بلکہ آیۃ اللہ کا یہ آخری مظاہرہ تھا جو اُن کی رُشد و ہدایت کی تقویت و تائید میں کیا گیا اور اس لئے یہ واقعہ عہد و میثاق کے بعد پیش آیا جیسا کہ سیاقِ کلام سے ظاہر ہے۔

کثرتِ معجزات یہاں یہ بات بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ گذشتہ اوراق میں یہ بخوبی روشن ہو چکا ہے کہ صدیوں غلامی کی زندگی بسر کرنے اور پست خدمات میں مشغول رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل کے ملکاتِ فاضلہ کو گھن لگ گیا تھا اور مصریوں میں رہ کر مظاہر پرستی اور اصنام پرستی نے اُن کے عقل و حواس کو اس درجہ معطل کر دیا تھا کہ وہ قدم قدم پر توحیدِ الٰہی اور احکامِ الٰہی میں کسی "کرشمہ" کے منتظر رہتے، اس کے بغیر اُن کے دل میں یقین و اذعان کے لئے کوئی جگہ

نہ بنتی تھی، پس ان کی ہدایت و رشد کے لئے دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، ایک یہ کہ اُن کو فقط افہام و تفہیم کے مختلف طریقوں ہی سے قبولِ حق پر آمادہ کیا جاتا اور انبیاءِ سابقین کی اُمتوں کی طرح صرف کسی خاص اور اہم موقعہ پر "آیۃ اللہ" (معجزہ) کا مظاہرہ پیش آتا اور دوسری صورت یہ تھی کہ اُن کی صدیوں کی تباہ شدہ اس حالت کی اصلاح کے لئے روحانی طاقت کا جلد جلد مظاہرہ کیا جائے، اور حق و صداقت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خدائے تعالیٰ کے "تکوینی نشانات معجزات" ان کی استعدادِ قبول و تسلیم کو بار بار تقویت پہنچائیں، پس اس قوم کی پست ذہنیت اور تباہ حالی کے پیشِ نظر مصلحتِ خداوندی نے اُن کی اصلاح و تربیت کے لئے یہی دوسری صورت اختیار فرمائی۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ — اللہ تعالیٰ عالم و دانا حکمت والا ہے۔

بہرحال اس واقعہ کا ذکر تورات میں بھی موجود ہے، اور اُس میں طور کے متعلق وہی کہا گیا ہے جو ہمارے جدید مفسرین نے آیت کی تاویل کی صورت میں بیان کیا ہے:۔

جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے، اور موسیٰؑ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور وہ پہاڑ سے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہِ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اُترا اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اُٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا...... چنانچہ موسیٰؑ نیچے اُتر کر لوگوں کے پاس گیا اور یہ باتیں اُن کو بتائیں [1]

ارضِ مقدس کا وعدہ اور بنی اسرائیل

سینا کے جس میدان میں اس وقت بنی اسرائیل موجود تھے یہ سرزمین فلسطین سے قریب تھا، اور اُن کے باپ دادا حضرتِ ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب (علیہم السلام) سے خدا کا وعدہ تھا کہ تمہاری اولاد کو پھر اس سرزمین کا مالک بنائیں گے اور وہ یہاں پھولے پھلے گی، لہٰذا حضرتِ موسیٰؑ کی معرفت خدا کا حکم ہوا کہ اپنی قوم

[1] خروج باب ۱۹ - آیات ۱۶-۱۵ -

سے کہو کہ ارضِ مقدس میں داخل ہوں اور وہاں کے جابر و ظالم حکمرانوں کو نکال کر عدل و انصاف کی زندگی بسر کریں، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ فتح تمہاری ہوگی اور تمہارے ظالم دشمن ناکام ہوں گے، حضرتِ موسیٰؑ نے اس سے پہلے کہ بنی اسرائیل کو ارضِ مقدس میں داخل ہونے کے لئے آمادہ کریں" بارہ آدمیوں کو تفتیشِ حال کے لئے بھیجا، وہ فلسطین کے قریبی شہر اریحا میں داخل ہوئے اور تمام حالات کو بغور دیکھا، جب واپس آئے تو حضرتِ موسیٰؑ کو بتایا کہ وہ بہت جسیم اور تن و توش کے زبردست ہیں اور بہت قوی ہیکل ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ جس طرح تم نے مجھ سے اُن کے متعلق کہا ہے قوم کے سامنے نہ کہنا۔ اس لئے کہ عرصۂ دراز کی غلامی نے اُن کے حوصلے پست کر دیئے ہیں، اور اُن میں شجاعت، خودداری، اور علوِ ہمت کی جگہ بزدلی، ذلت اور پستیِ ہمت نے لے لی ہے، مگر آخر یہ بھی اسی قوم کے افراد تھے، نہ مانے اور خاموشی کے ساتھ قوم کے سامنے دشمن کی طاقت کا خوب بڑھا چڑھا کر ذکر کیا، البتہ صرف دو شخص یوشع بن نون اور کالب بن یُفنہ نے حضرتِ موسیٰؑ کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور اُنھوں نے بنی اسرائیل سے ایسی کوئی بات نہ کہی کہ جس سے اُن کی ہمت شکست ہو۔

اب حضرتِ موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس بستی (اریحا) میں داخل ہو اور دشمن کا مقابلہ کر کے اس پر قابض ہو جاؤ خدا تمہارے ساتھ ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا	اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم! تم پر جو خدا کا
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ	احسان رہا ہے اس کو یاد کرو کہ اُس نے تم میں نبی اور پیغمبر
فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ	بنائے اور تم کو بادشاہ اور حکمراں بنایا اور وہ کچھ دیا جو جہانوں
مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝	میں کسی کو نہیں دیا۔ اے قوم! اس مقدس سرزمین میں
يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ	داخل ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کر دیا ہے
الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى	اور پشت پھیر کر نہ لوٹو (کہ نتیجہ یہ نکلے) کہ تم خسارہ اور

اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ○ (مائدہ ع)	نقصان اُٹھانے والے بن کر لوٹو۔

بنی اسرائیل نے یہ سُن کر جواب دیا کہ موسیٰؑ! وہاں تو بڑے ظالم لوگ بستے ہیں، ہم تو اُس وقت تک اس بستی میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں، افسوس بدبختوں نے یہ نہ سوچا کہ جب تک ہمّت و شجاعت کے ساتھ تم ان کو یہاں سے نہ نکالو گے تو یہ ظالم خود کیسے نکل جائیں گے۔

یوشع اور کالب نے جب یہ دیکھا تو قوم کو ہمت دلائی اور کہا شہر کے پھاٹک سے گذر جانا کچھ مشکل نہیں ہے، چلو اور اُن کا مقابلہ کرو ہم کو پورا یقین ہے کہ تم ہی غالب رہو گے،

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ	ان ڈرنے والوں میں سے دو ایسے آدمیوں نے جن پر خدا نے
اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ	اپنا فضل و انعام کیا یہ کہا "تم ان جابروں پر دروازہ کی جانب
الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ	سے داخل ہو جاؤ پس جس وقت تم داخل ہو جاؤ گے تم بلاشبہ
غٰلِبُوْنَ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ	غالب رہو گے اور (یہ بھی کہا) اللہ پر ہی بھروسہ رکھو اگر تم
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (مائدہ ع)	ایمان والے ہو۔

لیکن بنی اسرائیل پر اس بات کا بھی مطلق اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنے انکار پر قائم رہے اور جب حضرتِ موسیٰؑ نے زیادہ زور دیا تو اپنے انکار پر اصرار کرتے ہوئے کہنے لگے:۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا	انھوں نے کہا اے موسیٰ! ہم کبھی اس شہر میں اُس وقت تک داخل نہیں
مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ	ہوں گے جب تک وہ اس میں موجود ہیں، پس تو اور تیرا رب دونوں
فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ ع)	جاؤ اور اُن سے لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں (یعنی تماشہ دیکھیں گے)

حضرتِ موسیٰؑ نے جب یہ ذلیل اور بیہودہ جواب سُنا تو بہت افسردہ خاطر ہوئے اور انتہائی رنج و ملال کے ساتھ درگاہِ الٰہی میں عرض کیا "بارِ الٰہا! میں اپنے اور ہارونؑ کے سوا کسی پر قابو نہیں رکھتا سو ہم دونوں حاضر ہیں، اب تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان جدائی کردے یہ تو سخت نااہل ہیں" اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰؑ پر وحی نازل فرمائی "موسیٰؑ! تم غمگین نہ ہو

اِن کی نافرمانی کا تم پر کوئی بار نہیں، اب ہم نے ان کے لئے یہ سزا مقرر کر دی ہے کہ یہ چالیس سال اِسی میدان میں بھٹکتے پھریں گے، اور ان کو ارضِ مقدس میں جانا نصیب نہ ہوگا، ہم نے اُن پر ارضِ مقدس کو حرام کر دیا ہے:۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِكُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَاَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیۡهِمۡ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَةً یَتِیۡهُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَلَا تَاۡسَ عَلَی الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ (مائدہ ع)

(موسیٰؑ نے) کہا اے پروردگار! میں اپنے اور اپنے بھائی کے ماسوا کسی کا مالک نہیں ہوں، لہٰذا تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان تفریق کر دے (اللہ تعالیٰ) نے کہا بلاشبہ ان پر ارضِ مقدس کا داخلہ چالیس سال تک حرام کر دیا گیا اس مدت میں یہ اسی میدان میں بھٹکتے پھریں گے، پس تو نافرمان قوم پر غم نہ کھا اور افسوس نہ کر۔

وادیٔ سینا کو "تیہ" اس لئے کہتے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے بنی اسرائیل کے لئے کہا ہے: یَتِیۡهُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ (یہ اس زمین میں بھٹکتے پھریں گے) جب کوئی شخص راہ سے بھٹک جائے تو عربی میں کہتے ہیں "تَاهَ فُلَانٌ"

توراۃ میں اس واقعہ کی تفصیلات اگرچہ اس انداز میں مذکور نہیں ہیں تاہم "گنتی باب ۱۴" میں بنی اسرائیل کے ارضِ مقدس میں داخلہ سے انکار، اس پر حضرت موسیٰؑ کی ناراضی اور پھر چالیس سال تک اُن پر ارضِ مقدس کے داخلہ کا حرام ہو جانا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس مدت کے اندر اندر بنی اسرائیل کے وہ تمام افراد مر جائیں گے جنھوں نے خدا کے حکم کے خلاف ارضِ مقدس کے داخلہ سے انکار کیا ہے اور اُن کے بعد نئی نسل کو داخلہ کی اجازت ہوگی جو کالب اور یوشع کی سرکردگی میں دشمنوں کو پامال کر کے پاک زمین میں داخل ہوں گے نیز یہ کہ حضرت ہارونؑ اور حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کا بھی اس وقت انتقال ہو چکا ہوگا۔

"پھر خداوند نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو خطاب کر کے فرمایا: میں کب تک اس خبیث گروہ کے مقابل

جو میری شکایت کرتا ہے صبر کروں؟ بنی اسرائیل جو میرے برخلاف شکایتیں کرتے ہیں میں نے انکی شکایتیں سُنیں، اُن سے کہہ خداوند کہتا ہے: مجھے اپنی حیات کی قسم جیسا تم نے مجھے سنا کے کہا ہے میں تم سے ویسا ہی کروں گا، تمہاری لاشیں اوران سب کی جو تم میں شمار کیے گئے اُن کے کُل جمع کے مطابق بیس برس والے۔ سے لے کر اوپر والے تک جنھوں نے میری شکایتیں کیں اس بیابان میں گریں گی، تم بیشک اس زمین تک نہ پہنچو گے جس کی بابت میں نے قسم کھائی ہے کہ تمہیں وہاں بساؤں گا سوا یفنہ کے بیٹے کالب اور نون کے بیٹے یشوع اور تمہارے لڑکوں کو جن کے حق میں تم کہتے ہو کہ وہ لٹ جائیں گے، میں ان کو داخل کروں گا اس زمین کی قدر کو جسے تم نے ذلیل جانا وہ پہچانیں گے، پر تم جو ہو تمہاری لاشیں اس بیابان ہی میں گریں گی اور تمہارے لڑکے اس دشت میں چالیس برس تک بھٹکتے پھریں گے اور تمہاری برگشتگی کے اُٹھانے والے ہوں گے جب تک کہ تمہاری لاشیں اس دشت میں نیست و نابود نہ ہوں، اُن دنوں کے شمار کے مطابق جن میں تم اس زمین کی جاسوسی کرتے تھے جو چالیس دن ہیں دن پیچھے ایک سال ہوگا سو تم چالیس برس تک اپنے گناہ کو اٹھائے رہو گے، تب تم میری عہد شکنی کو جان لو گے [1]

اِس جگہ یہ شبہ پیدا نہ کرنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون (علیہما السلام) کو بھی اسی میدان میں رہنا پڑا اور وہ بھی ارضِ مقدس میں نہ داخل ہو سکے اس لئے کہ جب بنی اسرائیل کے اس پورے قافلہ پر ارضِ مقدس کو حرام کر دیا گیا تو اب ضروری تھا کہ اُن کے رُشد و ہدایت کے لئے خدا کا پیغمبر اُن میں موجود رہے تاکہ کچھ یہ بوڑھے بھی راہِ حق پر قائم رہیں اور نئی نسل میں وہ استعداد پیدا ہو جس کے ذریعہ وہ ارضِ مقدس میں داخل ہو کر خدا کے حکم کو پورا کریں۔

ذبحِ بقرہ کا واقعہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک قتل ہو گیا مگر قاتل کا پتہ نہ لگا، آخر شبہ نے تہمت کی شکل اختیار کر لی اور اختلافِ باہمی کی خوفناک صورت پیدا ہو گئی، حضرت موسیٰ

[1] گنتی باب ۱۴- آیات ۲۶ - ۳۴ -

کے سامنے جب یہ واقعہ پیش ہوا تو اُنھوں نے خدائے تعالیٰ کی جانب رجوع کیا اور عرض کیا کہ اس واقعہ نے قوم میں سخت اختلاف رونما کر دیا ہے تو خود علیم و حکیم ہے میری مدد فرما۔
اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰؑ سے فرمایا کہ ان سے کہو کہ پہلے ایک گائے ذبح کریں، اور اُس کے بعد گائے کے ایک حصہ کو مقتول کے جسم سے مَس کریں، پس اگر وہ ایسا کرینگے تو ہم اُس کو زندگی بخش دیں گے اور یہ معاملہ واضح ہو جائے گا۔
حضرتِ موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے جب ذبحِ بقرہ کے متعلق فرمایا تو اُنھوں نے اپنی کج بحثی اور حیلہ جوئی کی خصلت کے مطابق بحث شروع کر دی۔
موسیٰؑ! کیا تو ہم سے مذاق کرتا ہے "یعنی مقتول کے واقعہ سے ذبحِ بقرہ کا کیا تعلق؟" اچھا اگر واقعی یہ خدا کا حکم ہے تو وہ گائے کیسی ہو؟ اس کا رنگ کیسا ہو؟ اُس کی کچھ اور تفصیلی صفات معلوم ہونی چاہئیں، کیوں کہ ابھی تک اُس کے تعین کے متعلق ہم مشتبہ حالت میں ہیں۔
حضرتِ موسیٰؑ نے جب وحیِ الٰہی کی معرفت اُن کے تمام سوالات کے جواب دیدئے۔ اور حیلہ جوئی کا اُن کے لئے کوئی موقعہ باقی نہیں رہا تب وہ تعمیلِ حکم پر آمادہ ہوئے اور وحیِ الٰہی کے مطابق معاملہ کا سرانجام کیا، خدا کے حکم سے وہ مقتول زندہ ہو گیا اور اُس نے تمام واقعہ من وعن بیان کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب اس حیرت زا "خدائی نشان" نے حقیقت کو واشگاف کر دیا تو قاتل کو بھی اقرار کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہ رہا اور اس طرح نہ صرف قاتل ہی کا پتہ چل گیا بلکہ مختلف اسباط اور خاندانوں میں اختلاف پیدا ہو کر جو سخت خانہ جنگی اور خوں ریزی کی صورت رونما ہو چلی تھی اُس کا بھی خوش اسلوبی کے ساتھ خاتمہ ہو گیا۔
اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس تاریخی واقعہ کو یاد دلا کر دو باتوں کی جانب توجہ دلائی ہے، ایک منکرینِ معاد کو یہ بتایا ہے کہ جس قوم کے اسلاف میں یہ واقعہ ہو گذرا ہے وہ آج تک اس تاریخی واقعہ کی شاہد ہیں، لہٰذا جس طرح خدا نے اس وقت مردہ کو زندہ کر کے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا تھا تم سمجھ لو وہ قیامت کے دن بھی اسی طرح مُردے کو زندگی عطا

فرمائے گا: "وَكَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى"[1] دوسرے بنی اسرائیل کو یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (یعنی تمہارے اسلاف کو) اتنی کثرت کے ساتھ اپنے نشان (معجزات) دکھائے ہیں کہ اگر دوسری قوم کے سامنے یہ مظاہرے کئے جاتے تو وہ ہمیشہ کے لئے خدائے تعالیٰ کی فرماں بردار بن جاتی اور اس کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی نافرمانی کا خطرہ نہ گزرتا لیکن تم اور تمہارے اسلاف پر یا تو اثر ہی نہ ہوا اور اگر ہوا بھی تو ناپائیدار اور غیر مؤثر ثابت ہوا اور آج بھی اگر تم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور اُن کی مخالفت کر رہے ہو تو یہ تمہاری جبلت اور قدیم عصبیت و جہالت ہی کا اثر ہے۔

قرآنِ عزیز نے ہم کو اس واقعہ کے متعلق صرف اسی قدر بتایا ہے اور اس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں دی۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا "بلاشبہ تم کو خدا یہ حکم دیتا ہے کہ تم گائے ذبح کرو" وہ کہنے لگے "کیا تو ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے؟" موسیٰؑ نے کہا "میں اللہ سے پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں میں شمار ہوں" (یعنی یہ مذاق نہیں ہے) انھوں نے کہا "تو اپنے پروردگار سے یہ دریافت کر کہ اُس کی حقیقت کیا ہے؟" موسیٰؑ نے کہا: "اللہ تعالیٰ کہتا ہے" وہ ایسی گائے ہو کہ نہ تو بڑھیا ہو اور نہ بچھیا بلکہ درمیانی عمر کی جوان ہو، پس اب جو تم سے کہا گیا ہے اس کی تعمیل کرو" وہ کہنے لگے "اپنے خدا سے پوچھ کر اس کا رنگ کیسا ہو؟" موسیٰؑ نے کہا "اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ" وہ گہرے زرد رنگ کی ہو کہ دیکھنے والے کو خوش رنگ معلوم ہو" کہنے لگے "ہم پر (ابھی تک) گائے کی کیفیت مشتبہ ہے اگر خدا کو منظور ہے تو ہم کامیاب ہو جائیں گے۔"

[1] اور اسی طرح اللہ تعالیٰ مردہ کو زندہ کر دیا کرتا ہے۔

لَمُهْتَدُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (بقرہ ع ۸)

موسیٰ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے "وہ ایسی گائے ہو کہ نہ محنت کاری ہو کہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ کھیت کو سیراب کرتی ہو۔ وہ بے داغ ہو جس پر کسی قسم کا دھبہ نہ ہو" کہنے لگے "اب تو صحیح بات لایا" پس انھوں نے اُس کو حاصل کرکے ذبح کیا، اور قریب تھا کہ نہ کرتے اور یہ جب ہوا کہ تم نے ایک جان کو قتل کر دیا۔ پھر آپس میں اختلاف کرنے لگے، اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے اُس بات کو جس کو تم چھپاتے ہو، پس ہم نے کہا اس مقتول کو گائے کے بعض حصے کے ساتھ مس کرو (مارو) اللہ تعالیٰ اسی طرح مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے، اور تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کے فرماتے ہی "ذبح بقرہ" کی تعمیل کر دیتے تو اُن کے لئے گائے کے معاملہ میں کسی قسم کی مطلق قید و بند نہ ہوتی اور وہ کوئی سی گائے بھی ذبح کر دیتے تو تعمیل پوری ہو جاتی مگر اُنھوں نے بیہودہ سوالات کرکے اپنے اوپر پابندیاں لگوائیں، چنانچہ پیغمبرِ خدا کے ساتھ اس قسم کی بیہودہ باتوں اور کج بحثیوں کی قرآنِ عزیز نے سخت مذمت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کا آخر نتیجہ کفر اور ترکِ ایمان پر جا کر ختم ہوتا ہے، لہٰذا اُمتِ مسلمہ کو چاہئے کہ وہ اس قسم کی باتوں سے بچے۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۝ (بقرہ ع ۱۳)

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اُس قسم کے سوال کرو جس طرح پہلے زمانہ میں حضرت موسیٰ سے سوالات کئے گئے تھے اور جو شخص ایمان کے عوض کفر اختیار کرتا ہے وہ بلاشبہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

اِس موقعہ پر یہ سوال ضرور سامنے آجاتا ہے کہ آخر "ذبح بقرہ" اور مقتول کے زندہ کردینے کے درمیان کیا مناسبت ہے جو احیاءِ مقتول کے لئے یہ خاص صورت اختیار کی گئی سو خدا کی حکمتوں اور مصلحتوں تک پہنچنا تو انسانی مقدرت سے باہر ہے تاہم عقل وشعور کی جو روشنی اُس نے انسان کو بخشی ہے وہ اس طرف راہنمائی کرتی ہے کہ اگر بنی اسرائیل کی اس تاریخ پر نظر کی جائے جو گذشتہ صفحات میں سپردِ قلم ہو چکی ہے تو یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ مصر کے بود وماند نے اُن کے اندر بُت پرستی خصوصاً گائے کی عظمت وتقدیس اور گوسالہ پرستی کا جذبہ بہت زیادہ پیدا کر دیا تھا جو جگہ جگہ اُبھر آتا اور اُن پر اثر انداز ہونے لگتا تھا، چنانچہ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد جب حضرتِ موسیٰؑ نے اُن سے "تورات کی تعمیل" کے لیے فرمایا تو اُس وقت بھی انھوں نے کافی حیلہ جوئی سے کام لیا تھا اور اگر "رفعِ طور" کا نشان اُن پر ظاہر نہ ہوتا تو وہ حضرتِ موسیٰؑ کی تکذیب پر اُتر آتے تو کچھ تعجب نہ تھا، خدائے تعالیٰ نے اُس موقعہ پر ارشاد فرمایا ہے کہ اس تعنّت اور حیلہ سازی کی خصلت کا باعث وہی گوسالہ پرستی ہے، ابھی تک ان کے دلوں سے بُت پرستی اور گوسالہ کی تقدیس کا عقیدہ دور نہیں ہوا بلکہ اُن کی حالت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تقدیس اُن کے دلوں میں رچ گئی ہے:-

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (بقرہ ع)	اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سروں پر طور بلند کر دیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے اُس کو مضبوطی سے پکڑو اور اس پر کان دھرو۔ انھوں نے کہا ہم نے سنا (اور عمل سے بتایا کہ ہم نے نافرمانی کی) اور اصل بات یہ ہے کہ اُن کے دلوں میں کفر کی وجہ سے گوسالہ رچ گیا ہے (اے مخاطب) کہہ دے اگر تم اپنے قول کے مطابق مومن ہو تو تمہارے ایمان نے یہ فیصلہ ہی بُرا کیا ہے۔
وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ	اور بے شبہ موسیٰؑ تمہارے پاس واضح دلائل لے کر آیا۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ (بقرہ ع ۶)

پھر تم نے اس کے بعد گوسالہ بنا لیا اور تم خود اپنے لئے ظالم ہو۔

پس اس موقع پر خدا کی مصلحت نے یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کی اس گمراہی کو کسی ایسے عمل سے دور کرے جس کا مشاہدہ خود اُن کی آنکھیں کر رہی ہوں لہٰذا اُن کو مشاہدہ کرایا کہ جس کی تقدیس تمہارے دل میں اس قدر پیوستہ ہوگئی ہے کہ بار بار نمایاں ہوتی ہے، اُس (گائے) کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا اور وہ تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکی اور کہیں یہ خیال نہ کر بیٹھنا کہ یہ گائے کی تقدیس ہی کا اثر تھا کہ اُس کے پارۂ گوشت کے مَس کرنے سے مُردہ زندہ ہوگیا اس لئے کہ اگر موت و حیات کا یہ معاملہ گائے کی تقدیس سے متعلق تھا، تو جس پارۂ گوشت نے مُردہ کو زندہ کر دیا وہ خود زندگی حاصل کر کے کیوں دوبارہ جیتی جاگتی گائے نہ بن گیا؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ گائے جس کو تم نے ذبح کیا تھا اُسی طرح بے جان پڑی ہے اور اُس کے پارہائے جسم تمہارے درمیان زینتِ دسترخوان ہو چکے ہیں۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ موت و حیات کا یہ معاملہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور جس "گوسالہ" کی محبت تمہارے دلوں میں رچ گئی ہے وہ تم سے بھی ادنیٰ ایک جاندار ہے جو صرف تمہاری خدمت اور ضرورت کے لئے بنایا گیا ہے نہ کہ تمہارے لئے "دیوتا" اور "دیوی" —— خدائے تعالیٰ ہی کی ذات واحد ہے کہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے حیات بخشے، چنانچہ تم نے ایک ہی واقعہ میں دونوں حقیقتوں کا مشاہدہ کر لیا کہ اُس نے گائے کی زندگی کو فنا سے بدل دیا اور انسان کے مردہ جسم کو حیاتِ تازہ بخش دی۔ فَاعْتَبِرُوْا یَآ اُولِی الْاَبْصَارِ!

قرآنِ عزیز نے غالباً اسی حکمت کے پیشِ نظر "ذبحِ بقرہ" کے واقعہ کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے، پہلے حصہ میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے واقعہ کی تائید میں بقرہ کا یہ واقعہ بیان

کیا گیا کہ جب ایک خاص مقصد کے لئے بنی اسرائیل سے گائے ذبح کرنے کو کہا گیا تھا تو یہی گوسالہ پرستی کی محبت اُن کے آڑے آئی تھی اور مصریوں کے عقیدۂ تقدیس بقرہ (گائے کی تقدیس) کے اتباع میں اُنھوں نے بیسیوں حیلے اور بہانے تراشے اور یہ کوشش کی کہ کسی طرح ان کو گائے ذبح نہ کرنی پڑے، لیکن جب سوالات کی پیچیدگی میں آکر پھنس گئے تو مجبوراً تعمیل کرنی پڑی۔

قرآن نے جب اس واقعہ کو سنایا تو قدرتی طور پر سامعین کو شوق پیدا ہونا چاہیے تھا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ ذبحِ بقرہ کا وہ واقعہ کیوں اور کس طرح پیش آیا جس کے بارے میں بنی اسرائیل اس قدر حیلے تراش رہے تھے تو دوسرے حصہ میں قرآنِ عزیز نے اس پیدا شدہ فطری سوال کا جواب اس طرح دیا کہ اُس واقعہ کے نمایاں پہلو کو بیان کر دیا جس کا بنی اسرائیل کی اس ردوکد کے ساتھ حقیقی تعلق تھا، اس لئے اس حصۂ بیان کو دوبارہ لفظ 'اذ' سے شروع کیا،

قرآنِ عزیز کی اِن آیات کی یہ وہ تفسیر ہے جو قرآن کے جملوں کے اندر محدود ہو کر کی گئی ہے، اور جس میں ذبحِ بقرہ کے واقعہ سے متعلق آیات میں تقدیم و تاخیر کی بحثوں میں جانے کی مطلق ضرورت پیش نہیں آتی اور نہ واقعہ کو اچنبھا سمجھ کر باطل اور رکیک تاویلات کی پناہ لینے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

بلاشبہ یہ واقعہ خدائے تعالیٰ کے اُن مسلسل نشانوں میں سے ایک "نشان" تھا جو یہود کی سخت اور تند جبلت اور متمردانہ خصلت کے مقابلہ میں تائیدِ حق کے لئے حکمتِ الٰہی کے پیشِ نظر ظہور میں آیا اور جو نشان ہونے کے علاوہ اپنے اندر متعدد اہم مصالح رکھتا تھا؛ اور اس حقیقتِ ثابتہ کے لئے خود قرآنِ عزیز کا سیاق و سباق تائید کرتا ہے، چنانچہ اس واقعہ کے متصل ہی ارشاد ہے "وَكَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ" اور اسی طرح اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کرے گا" اور اسی کے سیاق میں ارشاد فرمایا "وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ" "تاکہ دکھائے تم کو اپنی قدرت کے نشان"

گویا ذبحِ بقرہ کا واقعہ نقل کرنے سے قبل بنی اسرائیل کو بار بار خدائی نشان مشاہدہ کرانے کا ذکر اور پھر قصہ کے متصل ہی آخرت میں "احیاءِ موتیٰ" کا اس واقعہ سے استشہاد اور پھر اس واقعہ کو بھی آیات اللہ میں سے ایک آیت (نشان) بتانا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ کسی تاویل اور دُور از کار باتوں کی پناہ لئے بغیر ان آیات کی صاف اور سادہ تفسیر وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کی گئی۔

لہٰذا ان آیات کی وہ تفاسیر جو جدید معاصرین نے بیان کی ہیں اور جن میں تمام آیاتِ متعلقہ کو کبھی دو جُدا واقعات کہہ کر اور کبھی ایک واقعہ تسلیم کر کے مختلف رکیک اور لچر تاویلات سے کام لیا گیا ہے "ناقابلِ تسلیم ہیں اور قرآنِ عزیز کے منطوق کے خلاف۔

مثلاً کہا جاتا ہے کہ ذبحِ بقرہ کا یہ طریقہ دراصل خود بنی اسرائیل کی قدیم رسوم میں سے تھا جس کا ذکر اب تک تورات میں موجود ہے یعنی جب کسی جگہ ایسا مقتول پایا جاتا کہ اس کے قاتل کا پتہ نہ ملتا تو باہمی جنگ وجدال سے بچانے کے لئے یہ طریقہ مروج تھا کہ وہ ایک ایسی گائے کو حاصل کرتے جو نہ کاشت کے کام میں آئی ہو اور نہ سیرابی کی خدمت کر چکی ہو اور اس کو ایسی وادی میں لے جاتے جہاں کاشت کبھی نہ ہوئی ہو اور پانی کا نالہ بہہ رہا ہو، اور جس پر قاتل ہونے کا شبہ ہوتا تو اس کے محلہ، خاندان یا بستی کے لوگوں کو جمع کیا جاتا اور پھر کاہن آگے بڑھتا اور بہتے ہوئے پانی پر گائے کو کھڑا کر کے اس کی گردن مارتا اور جب اس کا خون پانی میں مل جاتا تو فوراً مشتبہ گروہ کے لوگ اٹھ کر اس خون آلود پانی سے ہاتھ دھوتے جاتے اور پکار پکار کر یہ کہتے جاتے "کہ نہ ہمارے ہاتھوں نے اس کو قتل کیا ہے اور نہ ہمیں قاتل کا پتہ معلوم ہے" تو پھر ان پر کوئی شبہ باقی نہ رہتا اور خانہ جنگی نہ ہونے پاتی، اور اگر مشتبہ گروہ کا ایک سردار بھی ہاتھ دھونے اور اس رسم میں شریک ہونے سے انکار کر دیتا تو پھر مقتول کا خون بہا اُس خاندان یا محلہ پر ڈال دیا جاتا تھا جس کا وہ سردار ہے۔[1]

اس تفسیر میں قرآنِ عزیز کے سیاق وسباق کے لحاظ سے جو نقائص ہیں وہ معمولی فہم وعقل

[1] استثناء باب ۲۱- آیات ۹-۲-

سے بھی معلوم ہو سکتے ہیں لیکن ان کے علاوہ سب سے زیادہ قابلِ اعتراض یہ امر ہے کہ اگر بنی اسرائیل میں یہ دستور قدیم سے رائج تھا تو جب حضرتِ موسٰی (علیہ السلام) نے اُسی رسم کے مطابق خدائے تعالیٰ کا فیصلہ سنایا تو بنی اسرائیل نے اس کو اجنبی نگاہ سے کیوں دیکھا اور یہ کیوں کہا "أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا" اے موسٰیؑ! کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے کہ گائے ذبح کرنیکو کہتا ہے، اور اگر از رہِ تعنّت اُن کا سوال تھا تو حضرتِ موسٰی (علیہ السلام) یہی جواب دیتے کہ اس میں حیرت و تعجب کا کون سا موقعہ ہے جبکہ تم خود جانتے ہو کہ قضیہ کے فیصلہ کا یہ پُرانا طریقہ ہے'

اس سلسلہ میں گائے حاصل کرنے سے متعلق کتبِ تفاسیر میں عجیب و غریب قصّے مذکور ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام قصص اسرائیلیات سے منقول ہیں، یعنی یہ وہ قصّے ہیں جو یہود کی نقل و روایت سے شہرت پا گئے اور تفسیروں میں بھی درج کر دیئے گئے ہیں مگر محققین نے ان کو چھان کر تفسیرِ قرآن سے بالکل جدا کر دیا ہے، چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ جیسے جلیل القدر مفسر نے ان قصص کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے:-

اور یہ سلسلۂ بیانات جو عبیدہ، ابو العالیہ اور سُدّی اور دوسروں سے مروی ہے ان سب کے آپس میں اختلاف ہے، اور صاف بات یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی کتابوں سے ماخوذ ہیں اور اگرچہ اُن کا نقل کرنا درجۂ جواز میں آسکتا ہے مگر ہم نہ اُن کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب اور اسی بنا پر ان روایات پر قطعاً کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا، مگر وہ روایات جو ہمارے نزدیک (قرآن و حدیث کی روشنی میں) حق ہوں۔ واللہ اعلم۔

اور خاص اس واقعہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:-

گائے کا وہ کون سا حصہ تھا جو مردہ جسم پر مَس کیا گیا سو وہ کوئی بھی حصہ ہو واقعہ میں جس قدر مذکور ہے معجزہ ہونے کے لئے وہ بھی کافی ہے اور اگر اس حصہ کا تعین بھی ہمارے دینی یا دنیوی حالات کے اعتبار سے ضروری ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور واضح فرما دیتے۔ مگر اس نے اس کو مبہم ہی رکھا ہے اگرچہ اصل حقیقت کے لحاظ سے وہ بہرحال متعین ہے اور نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم

سے بھی اس کے تعین کے متعلق کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے بھی یہی مناسب ہے کہ ہم بھی اس کو اُسی طرح مبہم رہنے دیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو مبہم رکھا ہے۔[۱]

علاوہ ازیں مسلم کی حدیث میں صرف اسی قدر مذکور ہے "کہ اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے ردّ وکد نہ کرتے تو گائے کے معاملہ میں ان پر پابندیاں عائد نہ ہوتیں" پس اگر اس معاملہ سے متعلق اور تفاصیل بھی ہوتیں تو نبی معصوم (صلی اللہ علیہ وسلم) اُنکا بھی ذکر ضرور فرماتے۔

غرض یہ واقعہ حق تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک "عظیم نشان" ہے، البتہ قرآنِ عزیز نے جو تفصیل بیان کی ہے صرف اسی قدر قابلِ تسلیم ہے، باقی سب قصص وحکایات ہیں۔ اور لاطائل داستانیں۔

حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات سے متعلق ان مباحث کا خطاب اُن ہی مفسّرین کے ساتھ ہے جو اصولاً معجزاتِ انبیاء کے تو قائل ہیں مگر ان مقامات میں تاویل کی گنجائش سمجھ کر ایسی تاویلات کرتے ہیں جن کی بدولت یہ واقعات "معجزہ" کی حد سے باہر ہو جائیں، باقی جو ملاحدہ اسلام کے مسلہ عقیدہ "معجزہ" کے ہی قائل نہیں ہیں اور اس لئے قرآنِ عزیز کے ایسے تمام واقعات کو باطل تاویلات کی نذر کر دینا ہی ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے لئے سب سے پہلے نفسِ معجزہ کے امکان پر گفتگو ہونا چاہیے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ ان عظیم الشان "آیات اللہ" کے مشاہدہ اور اُن پر خدائے تعالیٰ کے بے غایت فضل وکرم کے باوجود ان بدبختوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور یہ اُسی طرح کج روی اور زیغ پر قائم رہے، قبولِ حق کے لئے ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے، بلکہ پیہم تمرد وسرکشی نے اُن کی نیک استعداد کو فنا کر کے پتھر سے بھی زیادہ سخت بنا دیا، اس لئے کہ پتھر میں سختی ہوتے ہوئے بھی اُس سے مخلوقِ خدا کو بہت سے فائدے ہیں،

[۱] البدایہ والنہایہ جلد اول صفحہ ۱۱۲۔

مگران کی زندگی کا تو بجز خسارہ اور نقصان کے اور کچھ حاصل نہیں رہا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ	اس (مشاہدہ) کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے پس یہ معلوم ہوتا
فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ	ہے کہ گویا (دل نہیں) پتھر ہیں یا (یوں سمجھو) کہ پتھر سے بھی زیادہ
مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ	سخت (یہ بات واضح ہے) کہ بعض پتھروں سے پانی نکل کر نہریں
وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ	بہتی ہیں اور بعض چیخ کر پھٹتے ہیں تو ان سے سوت جاری
مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ	ہو جاتے ہیں اور بعض خدا کے خوف سے (بھونچال
مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ	وغیرہ حالتوں میں) نیچے لڑھک آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (بقرہ ع ۹)	تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے قلوب کی سختی اور قبولِ حق میں بے اثری کا یہ عالم ہے کہ اگر محاورہ اور بول چال کے مطابق یوں کہہ دیا جائے کہ اُن کا دل پتھر کا ٹکڑا بن گیا ہے تب بھی اُن کی شدت و صلابت کی صحیح تصویر سامنے نہیں آسکتی، اس لئے کہ پتھر اگرچہ سخت ہے مگر ناکارہ نہیں ہے، کیا تم نے پہاڑوں کا مشاہدہ نہیں کیا اور نہیں دیکھا کہ ان ہی سخت پتھروں سے ندیاں اور دریا بہہ رہے ہیں اور کہیں اُن ہی سے شیریں اور خنک پانی کے سوت جاری ہیں اور اگر بھونچال آجائے یا خدا کی مشیت کا کوئی اور فیصلہ ہو جائے تو پہاڑوں کی یہی دیو پیکر چٹانیں روئی کے گالوں کی طرح ٹوٹ کر اور اڑ کر سرنگوں ہو جاتی اور خدائے تعالیٰ کے خوف و خشیت کا زبانِ حال سے اقرار کرتی نظر آتی ہیں مگر ان بنی اسرائیل پر نہ آیات اللہ کا اثر ہوتا ہے نہ پیغمبر کی شیریں اور دل نشیں پند و نصائح کا اور نہ نافرمانی کرتے وقت خدا کا خوف اُن کے دلوں پر طاری ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ اور قارون | بنی اسرائیل میں ایک بہت بڑا متمول شخص تھا، قرآنِ عزیز نے اس کا نام قارون بتایا ہے، اس کے خزانے زر و جواہر سے پُر تھے، اور قوی ہیکل مزدوروں کی جماعت بمشکل اس کے خزانوں کی کنجیاں اُٹھا سکتی تھی اِس تموّل اور سرمایہ داری نے اس کو بے حد

مغرور بنا دیا تھا اور وہ دولت کے نشہ میں اس قدر چُور تھا کہ اپنے عزیزوں، قرابت داروں اور قوم کے افراد کو حقیر اور ذلیل سمجھتا اور ان سے حقارت کے ساتھ پیش آتا تھا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حضرتِ موسٰی (علیہ السلام) کا چچازاد بھائی تھا اور اس کا نسب اس طرح نقل فرماتے ہیں:۔

قارون بن یصہر بن قاہت اور حضرتِ موسٰی (علیہ السلام) کا نسب یہ ہے: موسٰی بن عمران بن قاہت۔ حضرتِ عبد اللہ بن عباسؓ سے بھی یہی منقول ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ قارون قیامِ مصر کے زمانہ میں فرعون کا درباری ملازم رہا تھا اور دولت کا یہ بے انتہا انبار اُس نے وہیں جمع کیا تھا، اور سامری منافق تھا اور حضرتِ موسٰیؑ کے دین میں اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔[1]

حضرتِ موسٰی (علیہ السلام) اور اُن کی قوم نے ایک مرتبہ اُس کو نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بے شمار دولت و ثروت بخشی ہے اور عزت و حشمت عطا فرمائی ہے لہٰذا اُس کا شکر ادا کر اور مالی حقوق "زکوٰۃ و صدقات" دے کر غربا، فقرا، اور مساکین کی مدد کر، خدا کو بھول جانا اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنا اخلاق و شرافت دونوں لحاظ سے سخت ناشکری اور سرکشی ہے، اس کی دی ہوئی عزت کا صلہ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ تو کمزوروں اور ضعیفوں کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے اور نخوت و پندار میں غریبوں اور عزیزوں کے ساتھ نفرت سے پیش آئے۔

قارون کے جذبۂ انانیت کو حضرتِ موسٰی (علیہ السلام) کی یہ نصیحت پسند نہ آئی اور اُس نے مغرورانہ انداز میں کہا: موسٰیؑ! میری یہ دولت و ثروت تیرے خدا کی عطا کردہ نہیں ہے، یہ تو میرے عقلی تجربوں اور علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے: "اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ" میں تیری نصیحت مان کر اپنی دولت کو اس طرح برباد نہیں کر سکتا۔

مگر حضرتِ موسٰی (علیہ السلام) برابر اپنے فرضِ تبلیغ کو انجام دیتے اور قارون کو راہِ ہدایت

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۳۰۹۔

دکھاتے رہے، قارون نے جب یہ دیکھا کہ موسیٰؑ کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتے تو اُن کو زچ کرنے اور اپنی دولت وحشمت کے مظاہرہ سے مرعوب کرنے کے، لئے ایک دن بڑے کروفر کے ساتھ نکلا۔

حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) بنی اسرائیل کے مجمع میں پیغام الٰہی سُنا رہے تھے کہ قارون ایک بڑی جماعت اور خاص شان وشوکت اور خزانوں کی نمائش کے ساتھ سامنے سے گذرا، اشارہ یہ تھا کہ اگر حضرتِ موسیٰؑ کی تبلیغ کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو میں بھی ایک کثیر جتھہ رکھتا ہوں اور زر وجواہر کا بھی مالک ہوں لہٰذا ان دونوں ہتھیاروں کے ذریعہ موسیٰؑ کو شکست دے کر رہوں گا۔

بنی اسرائیل نے جب قارون کی اس دُنیوی ثروت وعظمت کو دیکھا تو اُن میں سے کچھ آدمیوں کے دلوں میں انسانی کمزوری نے یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ بے چین ہو کر یہ دعا کرنے لگے: "اے کاش یہ دولت وثروت اور عظمت وشوکت ہم کو بھی نصیب ہوتی" مگر بنی اسرائیل کے اربابِ بصیرت نے فوراً مداخلت کی اور اُن سے کہنے لگے "خبردار! اس دُنیوی زیب وزینت پر نہ جانا اور اس کے لالچ میں گرفتار نہ ہو بیٹھنا، تم عنقریب دیکھو گے کہ اس دولت وثروت کا انجام بد کیسا ہونے والا ہے"؟

آخر کار جب قارون نے کبر ونخوت کے خوب خوب مظاہرے کر لئے اور حضرتِ موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے مسلمانوں کی تحقیر وتذلیل میں کافی سے زیادہ زور صرف کر لیا تو اب غیرتِ حق حرکت میں آئی اور پاداشِ عمل کے فطری قانون نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور قارون اور اس کی دولت پر خدا کا یہ اٹل فیصلہ ناطق کر دیا "فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ" "ہم نے قارون اور اُس کے سرمایہ کدہ کو زمین کے اندر دھنسا دیا" اور بنی اسرائیل کی آنکھوں دیکھتے نہ غرور باقی رہا اور نہ سامانِ غرور سب کو زمین نے نگل کر عبرت کا سامان مہیا کر دیا، قرآن عزیز نے متعدد مقامات پر اس واقعہ کو مفصل اور مجمل بیان کیا ہے:۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ (مومن ع)

اور بے شبہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں اور ظاہر و زبردست حجت (تورات) دے کر فرعون، ہامان اور قارون کے پاس بھیجا تھا پس ان سب نے یہ کہا کہ یہ تو جادوگر ہے بڑا جھوٹا۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ۚ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (عنکبوت ع)

اور بے شبہ اُن کے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر آیا، پھر انھوں نے زمین میں کبر و غرور اختیار کیا، اور وہ ہم سے جیت جانے والے نہیں تھے، پھر سب کو پکڑا ہم نے اپنے اپنے گناہ پر، پھر کسی پر ہم نے ہوا سے پتھراؤ کیا، اور کسی کو چیخ نے آدبایا، اور کسی کو زمین میں دھنسا دیا، اور کسی کو ہم نے غرق کر دیا، اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود آپ اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔

قارون اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے واقعہ سے متعلق صحیح حالات صرف اسی قدر ہیں، باقی روایات "اسرائیلیات" سے ماخوذ ہیں، اس لئے ناقابلِ اعتماد ہیں، اسی لئے حافظ ابن کثیرؒ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:۔

وقد ذکر ھھنا اسرائیلیات اضربنا عنھا صفحا۔ (ابن کثیر سورۂ القصص)

اور اس مقام پر بہت سی اسرائیلیات بیان کی گئی ہیں، ہم نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ" میں علم سے مراد "علمِ کیمیا" ہے اور وہ قارون کی دولت کو اُس کی کیمیا دانی کا رہینِ منت بتاتے ہیں، محققین نے اس کی تردید فرمائی ہے، اور یہ واضح کیا ہے کہ اُس کا مقصد "علم" سے اپنی عقل و دانش کے ذریعہ حصولِ مال ہے اور کیمیا کی باتیں سب دُور از کار ہیں۔

علماءِ تفسیر اس میں متردد ہیں کہ قارون کا واقعہ کب پیش آیا، مصر میں قبل غرقِ فرعون، یا

تیہ میں بعد غرقِ فرعون، حافظ ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ اگر قبلِ غرق کا ہے تو آیت میں "دار" اپنے حقیقی معنی میں ہے اور اگر میدانِ تیہ کا واقعہ ہے تو "دار" سے خیمہ و خرگاہ مراد ہے، ہمارے نزدیک یہ واقعہ میدانِ تیہ کا ہے اس لئے کہ قرآنِ عزیز نے اس کو غرقِ فرعون سے متعلق واقعات کے بعد بیان کیا ہے :۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ
عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ
لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ
لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ
الْفَرِحِينَ ۝ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ
الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ
الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ
إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ
اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝ قَالَ إِنَّمَا
أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي أَوَلَمْ يَعْلَمْ
أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ
مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا
وَلَا يُسْأَلُ عَن ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ ۝
فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ قَالَ الَّذِينَ
يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ
مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝
وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ

بیشک قارون، موسیٰ کی قوم ہی میں سے تھا، پس اُس نے اُن پر سرکشی کی اور ہم نے اُس کو اس قدر خزانے دیئے تھے، کہ اس کی کُنجیوں کے بوجھ سے طاقتور آدمی تھک جاتے تھے جب اُس کی قوم نے کہا تو شیخی نہ مار اللہ شیخی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور جو کچھ تجھ کو خدا نے دیا ہے اُس میں آخرت کو تلاش کر، اس کو نہ بھول کہ دنیا میں اُس نے تجھ کو کیا کچھ دے رکھا ہے، اور جس طرح خدا نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے تو بھی اسی طرح بھلائی کر، اور فساد کے درپے نہ ہو۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ قارون کہنے لگا یہ مال تو مجھ کو میرے ایک ہنر سے ملا ہے جو مجھ کو آتا ہے کیا وہ اس سے بے خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس سے پہلے اس سے کہیں زیادہ مال دار اور طاقتور قوموں کو ہلاک کر دیا۔ اور نہ سوال کیا جائے مجرموں سے اُن کے گناہوں کے بارہ میں (یعنی اُن کی عقلیں ماری گئی ہیں تب ہی تو گناہ میں مبتلا ہیں پھر سوال سے کیا فائدہ) پھر نکلا ایک دن قوم کے سامنے بن سنور کر خدم وحشم کے ساتھ تو جو لوگ دنیا کے طالب تھے انھوں نے اس کو دیکھ کر کہا "اے کاش ہمیں بھی یہ سب کچھ ہوتا جو قارون

خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ	کو دیا گیا ہے بلاشبہ یہ بڑے نصیب والا ہے، اور جن لوگوں کو اللہ
اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ	نے بصیرت و علم عطا کیا تھا انھوں نے کہا تمہیں ہلاکی ہو جو اللہ پر ایمان
الْاَرْضَ ۣ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ	لایا اور نیک عمل کئے اس کے لئے اللہ کا ثواب اس دولت سے بہتر
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۤ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ	ہے اور اس کو نہیں پاتے مگر صبر کرنیوالے، پھر ہم نے قارون اور اسکے
وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ	محل کو زمین میں دھنسا دیا، پس اس کے لئے کوئی جماعت مددگار ثابت
بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ	نہیں ہوئی جو خدا کے عذاب سے اس کو بچائے اور وہ بے یار و مددگار ہی
الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ	رہ گیا اور جنھوں نے کل اس کی شان و شوکت دیکھ کر اس جیسا ہو جانے کی
لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ	تمنا کی تھی وہ یہ دیکھ کر آج یہ کہنے لگے ارے خرابی یہ تو اللہ تعالیٰ کھول دیتا ہے
وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ تِلْكَ	روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور تنگ کر دیتا ہے، اگر احسان نہ
الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا	کرتا اللہ ہم پر تو ہم کو بھی دھنسا دیتا ارے خرابی یہ تو چھٹکارا نہیں پاتے منکر
يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ	یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لئے بنایا ہے جو (خدا کی) زمین میں شیخی نہیں
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (قصص ع ۹)	مارتے اور نہ فساد کے خواہش مند ہوتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقیوں کیلئے ہے

توراۃ نے بھی اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے[1] مگر اس کے بیان اور قرآنِ عزیز کی تصریحات کو پڑھنے کے بعد ایک انصاف پسند انسان کو یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآنِ عزیز جب کسی تاریخی واقعہ کو نقل کرتا ہے تو اُس کے صرف اُن ہی اجزاء کو بیان کرتا ہے جو غرض اور مقصد "نصیحت و عبرت" کے لئے ضروری ہوں اور زائد از حاجت تفصیلات کو نظر انداز کر جاتا ہے لیکن توراۃ میں اکثر بے ضرورت تفاصیل بیان ہوتی ہیں اور بعض جگہ تو بے محل طوالت بلکہ تضادِ بیان تک پایا جاتا ہے جن کو ہم حسب موقعہ بیان کرتے جاتے ہیں چنانچہ اس مقام پر بھی بعض غیر ضروری حصوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایذاء بنی اسرائیل

گذشتہ واقعات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو قول اور عمل دونوں طریقوں سے سخت

[1] توراۃ گنتی باب ۱۶ - آیات ۳۳ - ۲۰

اذیتیں پہنچائیں حتیٰ کہ بہتان طرازی اور تہمت تراشی سے بھی باز نہیں رہے۔

بت پرستی کی فرمائش، گوسالہ پرستی میں انہماک، قبولِ تورات سے انکار، ارضِ مقدس میں داخلہ سے انکار، من و سلویٰ پر ناسپاسی، غرض ہر ادائے فرض میں ضد اور ہٹ اور ہر ایک معاملہ میں حضرتِ موسیٰؑ کے ساتھ جاہلانہ ردّ و کد کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ان کی زندگی کا جز نظر آتا ہے اور حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) ضبط و صبر کے ساتھ ایک اولوا العزم رسول کی طرح اُن کو برداشت کرتے اور رشد و ہدایت کے پیغام میں منہمک نظر آتے ہیں۔

قرآنِ عزیز کی تصریحات کے علاوہ تاریخی حیثیت سے اگر بنی اسرائیل کی ان خصوصیات کا مطالعہ مقصود ہو تو تورات کے حسبِ ذیل ابواب قابلِ مراجعت ہیں:-

خروج باب ۱۲ آیات ۱۲-۱۱ باب ۱۶ آیات ۳-۲ گنتی باب ۱۴- آیات ۳-۱- باب ۱۶ آیات ۱۴ ۱۳- باب ۷ آیات ۱۳- ۱۲- استثنا ر باب ۹ آیات ۲۴ - ۲۳-

لیکن قرآنِ عزیز نے ان واقعات کے علاوہ جن کا ذکر صفحاتِ گذشتہ میں تفصیل سے آچکا ہے سورۂ احزاب اور سورۂ صف میں حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ بنی اسرائیل کی ایذا رسانی پر مذمت کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے:-

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَكُونُوا۟ كَٱلَّذِينَ ءَاذَوْا۟ مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ ٱللَّهُ مِمَّا قَالُوا۟ ۚ وَكَانَ عِندَ ٱللَّهِ وَجِيهًا (احزاب ع)	اے ایمان والو! تم ان بنی اسرائیل کی طرح نہ ہو جنھوں نے موسیٰؑ کو ایذا پہنچائی، پھر اللہ نے اس کو اس بات سے بری کر دیا جو وہ اُس کے متعلق کہتے تھے اور موسیٰؑ اللہ کے نزدیک صاحبِ وجاہت ہے۔
وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦ يَٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُونَنِى وَقَد تَّعْلَمُونَ أَنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ ۖ فَلَمَّا زَاغُوٓا۟ أَزَاغَ ٱللَّهُ قُلُوبَهُمْ ۚ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْفَٰسِقِينَ ۝ (صف ع)	اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم! تو کس لئے مجھ کو ایذا پہنچاتی ہے جبکہ تجھ کو یہ معلوم ہے کہ میں تمہاری جانب خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، پھر جب وہ کجی پر اڑ بیٹھے تو اللہ نے بھی اُن کے دلوں پر کجی کو مسلط کر دیا۔ اور اللہ نافرمان قوم کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔

اس لئے علماءِ تفسیر نے ان ہر دو مقام پر بحث کی ہے کہ یہاں جس ایذا کا تذکرہ کیا گیا ہے کیا اُس سے وہی حالات مُراد ہیں جو بنی اسرائیل کی سرکشی اور تعنت کے سلسلہ میں بیان ہو چکے ہیں اور جن کا پورا سلسلہ یقیناً حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کی اذیت کا باعث تھا، یا اُن کے علاوہ کسی اور خاص واقعہ کی جانب اشارہ ہے، چنانچہ بعض مفسرین نے تو یہ فرمایا کہ اس سے وہی ایذا مراد ہے جو حضرتِ موسیٰ کو بنی اسرائیل کے تعنت اور ضد کی وجہ سے پہنچتی رہی تھی اور بعض مفسرین نے ان ہر دو آیات کا مصداق گذشتہ واقعات سے جدا واقعہ کو بتایا ہے، اور وہ فرماتے ہیں، کہ بعض صحیح احادیث میں حضرتِ موسیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان ایسے واقعات کا تذکرہ پایا جاتا ہے جن کا تفصیلی ذکر قرآنِ عزیز میں موجود نہیں ہے، لہٰذا اُن کے واقعات میں سے کوئی ایک مخصوص واقعہ یا وہ سب واقعات ان آیات کے مصداق ہیں اور وہی اُن کے لئے شانِ نزول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اِن واقعات میں سے ایک واقعہ بخاری اور مسلم میں مذکور ہے اور وہ یہ کہ حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرتِ موسیٰ پر شرم و حیا کا بہت غلبہ تھا حتیٰ کہ وہ اپنے برہنہ بدن کے کسی حصہ پر بھی نگاہ نہیں پڑنے دیتے تھے، اس کے برعکس بنی اسرائیل مجمع عام میں برہنہ ہو کر غسل کرنے کے عادی تھے اس لئے وہ حضرتِ موسیٰ کو تنگ کرتے اور اُن کی مذاق اُڑاتے تھے کبھی کہتے کہ ان کے خاص حصہ جسم پر برص کے داغ ہیں، کبھی کہتے کہ ان کو اُدرة (فوطوں کا متورم ہو کر بڑھ جانا) کا مرض ہے، یا کوئی اور اسی قسم کا خراب مرض ہے تب ہی تو چُھپ کر علیحدہ نہاتے ہیں، حضرتِ موسیٰ سنتے اور خاموش رہتے، آخر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہوئی کہ اُن کو اِس تہمت سے پاک اور بری کرے، چنانچہ ایک روز وہ علیحدہ آڑ میں نہانے کی تیاری کر رہے تھے کپڑے اُتار کر پتھر پر رکھ دیئے، پتھر خدا کے حکم سے اپنی جگہ سے سرکا اور جہاں مجمع میں بنی اسرائیل برہنہ نہا رہے تھے، وہاں چل کر پہنچ گیا، حضرتِ موسیٰ گھبراہٹ اور غصہ میں اُس کے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے

ثوبی حجر، ثوبی حجر (اے پتھر! میرے کپڑے، اے پتھر! میرے کپڑے) پتھر جب مجمع کے سامنے ٹھہر گیا تو سب نے دیکھ لیا کہ موسیٰ علیہ السلام بیان کردہ ہر قسم کے عیب سے پاک و صاف ہیں، حضرت موسیٰؑ پر اس اچانک واقعہ کا ایسا اثر پڑا کہ غصہ میں جھنجھلا کر پتھر پر لاٹھی کے چند وار کر دیے جس سے اس پر نشان پڑ گئے۔[1]

بخاری اور مسلم نے اس کو متعدد طریقوں سے روایت کیا ہے، اُن میں سے ایک طریقہ میں اس واقعہ کو سورۂ احزاب کی اس آیت کا شانِ نزول قرار دیا ہے جس میں بنی اسرائیل کی ایذاء اور خدائے تعالیٰ کی جانب سے موسیٰ (علیہ السلام) کی براءت کا ذکر ہے۔

اور اسی آیت کے شانِ نزول میں ابن ابی حاتم نے حضرتِ علی رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت نقل کی ہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ ہارون (علیہما السلام) پہاڑ (طور) پر گئے مگر حضرتِ ہارونؑ کا وہیں انتقال ہو گیا اور حضرتِ موسیٰ تنہا واپس ہوئے۔ بنی اسرائیل نے یہ دیکھا تو حضرت موسیٰؑ پر تہمت رکھی کہ اس نے ہارونؑ کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ کو اس تہمت سے بہت دکھ پہنچا تب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ہارونؑ کی نعش کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کریں، فرشتوں نے فضاء میں حضرتِ ہارونؑ کی نعش بنی اسرائیل کے مجمع میں پیش کی، اور انھوں نے یہ دیکھ کر اطمینان حاصل کیا کہ واقعی ہارون (علیہ السلام) پر قتل کا کوئی نشان نہیں ہے۔

تیسری روایت حضرتِ عبداللہ بن عباسؓ اور سدّی سے کتبِ تفاسیر میں منقول ہے کہ جب قارون کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی نصیحت بہت ناگوار گذرنے لگی تو ایک دن اُس نے ایک پیشہ ور عورت کو چھ روپے دے کر اس پر آمادہ کر لیا کہ جس وقت حضرتِ موسیٰؑ پند و نصیحت میں مصروف ہوں اُس وقت تو اُن پر الزام لگانا کہ یہ شخص مجھ سے تعلق رکھتا ہے، چنانچہ دوسرے دن جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام وعظ فرما رہے تھے تو اس عورت نے حضرتِ موسیٰؑ پر الزام لگایا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام یہ سُن کر سجدہ میں گر پڑے اور پھر سر اُٹھا کر

[1] بخاری باب الغسل و مسلم باب الفضائل۔

عورت کی جانب مخاطب ہوئے کہ تو نے جو کچھ ابھی کہا تھا کیا خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتی ہے کہ یہ سچ ہے؟ یہ سُن کر عورت پر رعشہ طاری ہو گیا اور اُس نے کہا بخدا سچ بات یہ ہے کہ قارون نے مجھ کو روپیہ دے کر اس الزام پر آمادہ کیا تھا ورنہ تو آپ اس سے بَری اور پاک ہیں، تب حضرت موسیٰؑ نے قارون کے لئے بددعا کی اور وہ خدا کے حکم سے معہ ساز و سامان زمین میں دھنسا دیا گیا۔

محاکمہ | اس بحث میں صحیح مسلک یہ ہے کہ جب قرآنِ عزیز نے حضرتِ موسیٰؑ سے متعلق ایذاء کے واقعہ کو مجمل بیان کیا ہے اور اس کی کوئی تعیین نہیں کی تو ہمارے لئے بھی یہی منشا ہے کہ اس کی تفصیل اور تعیین کئے بغیر نفسِ واقعہ پر ایمان لائیں اور کسی خاص واقعہ سے متعلق نہ کریں اور جس حکمت و مصلحت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کو مجمل رکھنا مناسب سمجھا، ہم بھی اسی پر اکتفا کریں۔ اور اگر تفصیل اور تعیین کی جانب توجہ دینا ضروری ہے تو پھر تسلیم کرنا چاہیے کہ ان ہر دو آیات کا مصداق وہ تمام واقعات ہیں جو حضرتِ موسیٰؑ کی ایذاء رسانی سے متعلق قرآنِ عزیز اور صحیح احادیث میں منقول ہیں، اور اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ زیرِ بحث ایذاء کا معاملہ اس نوعیت کا ہے کہ جس سے حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کی وجاہت پر اثر پڑتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰؑ کی جانب سے اس کا دفاع کر کے ان کے قولی ہفوات سے اُن کو بری اور پاک ثابت کر دیا۔ تو ان ہر دو آیات کے مصداق کی تعیین میں وہ تینوں روایات قابلِ ترجیح ہیں جو کتبِ احادیث سے نقل کی جا چکی ہیں، اور وہ سب ان آیات کا مصداق ہیں، رہا یہ امر کہ شانِ نزول کے لئے کسی ایک واقعہ کا مخصوص ہونا ضروری ہے تو بقولِ حضرتِ شاہ ولی اللہ (رحمہ اللہ) یہ درست نہیں ہے بلکہ شانِ نزول کی اصل حقیقت یہ ہے کہ زمانۂ نبوت میں پیش آنے والے وہ تمام واقعات جو کسی آیت کا مصداق بن سکتے ہوں اس آیت کے لئے یکساں طور پر شانِ نزول کہے جا سکتے ہیں۔

اس مقام کی تفسیر میں نجار نے قصص الانبیاء میں ایک طویل بحث کی ہے اور ان کے

درمیان اور مصر کی مجلسِ علماء کے درمیان جو بحث و تمحیص ہوئی ہے اس کو بھی نقل کیا ہے مگر ہم چونکہ دونوں خیالات کے پوری طرح ہم نوا نہیں ہیں اور مفسرینِ قدیم میں ابن کثیر اور ابن حیان کے رجحانات کے مؤید ہیں اس لئے اس بحث کو نظر انداز کرتے ہیں۔

حضرتِ ہارونؑ کی وفات

گذشتہ واقعات میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے ارضِ مقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰؑ کے ذریعہ اُن کو یہ اطلاع کر دی تھی کہ چالیس سال تک اب تم کو اسی سرزمین میں بھٹکنا پڑیگا اور سرزمینِ مقدس میں ان افراد میں سے کوئی بھی داخل نہ ہو سکے گا، جنھوں نے داخل ہونے سے اس وقت انکار کر دیا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اُن کو یہ بھی بتایا کہ موسیٰؑ اور ہارونؑ بھی تمہارے پاس ہی رہیں گے کیوں کہ اُن کی اور آنے والی نسل کی رشد و ہدایت کے لئے اُن دونوں کا یہاں موجود رہنا ضروری ہے، چنانچہ جب بنی اسرائیل تیہ کے میدان میں گھومتے اور پھرتے پھراتے پہاڑ کی اس چوٹی کے قریب پہنچے جو ہور کے نام سے مشہور تھی تو حضرتِ ہارونؑ کو پیغامِ اجل آپہنچا، وہ اور حضرتِ موسیٰؑ خدا کے حکم سے "ہور" پر چڑھ گئے اور وہیں کچھ روز عبادتِ الٰہی میں مصروف رہے اور جب حضرتِ ہارونؑ کا وہاں انتقال ہو گیا تب حضرتِ موسیٰؑ اُن کی تجہیز و تکفین کے بعد نیچے اُترے اور بنی اسرائیل کو ہارون علیہ السلام کی وفات سے مطلع کیا۔

توراۃ میں اس واقعہ کو اس طرح ادا کیا ہے :-

"اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت قادس سے روانہ ہو کر کوہِ ہور پہنچی اور خداوند نے کوہِ ہور پر ادوم کی سرحد سے ملا ہوا تھا، موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہا، ہارونؑ اپنے لوگوں میں جا ملے گا کیونکہ وہ اس ملک میں جو میں نے بنی اسرائیل کو دیا ہے جانے نہیں پائے گا اس لئے کہ مریبہ کے چشمہ پر تم نے میرے کلام کے خلاف عمل کیا لہٰذا تو ہارونؑ اور اس کے بیٹے الیعزر کو اپنے ساتھ لیکر کوہِ ہور کے اوپر آجا اور ہارونؑ کے لباس کو اُتار کر اس کے بیٹے الیعزر کو پہنا دینا، کیوں کہ

ہارون وہیں وفات پاکر اپنے لوگوں میں جا ملے گا۔ اور موسیٰ نے خداوند کے حکم کے مطابق عمل کیا اور وہ ساری جماعت کی آنکھوں کے سامنے کوہ ہور پر چڑھ گئے اور موسیٰ نے ہارون کے لباس کو اُتار اس کے بیٹے الیعزر کو پہنایا اور ہارون نے وہیں پہاڑ کی چوٹی پر رحلت کی تب موسیٰ اور الیعزر پہاڑ پر سے اُتر آئے۔ جب جماعت نے دیکھا کہ ہارون نے وفات پائی تو اسرائیل کے سارے گھرانے کے لوگ ہارون پر تیس دن تک ماتم کرتے رہے۔[1]

حضرت موسیٰ اور خضر

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے واقعات زندگی میں ایک اہم واقعہ اس ملاقات کا ہے جو اُن کے اور ایک صاحب باطن کے درمیان ہوئی اور حضرت موسیٰ نے اُن سے عالم تکوینیات کے بعض رموز و اسرار معلوم کئے۔ اس ملاقات کا ذکر تفصیل کے ساتھ سورۂ کہف میں کیا گیا ہے، اور بخاری میں اس واقعہ سے متعلق بعض مزید تفصیلات مذکور ہیں۔ بخاری میں سعید بن جبیرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ نوف بکالی کہتا ہے کہ موسیٰ صاحب خضر، موسیٰ صاحب بنی اسرائیل نہیں ہیں، یہ ایک دوسرے موسیٰؑ ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا ''دشمن خدا جھوٹ کہتا ہے، مجھ سے اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) نے حدیث بیان کی ہے کہ انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔ ارشاد فرماتے تھے کہ ایک روز حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو خطاب فرما رہے تھے کہ کسی شخص نے دریافت کیا، اس زمانہ میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔ مجھے خدا نے سب سے زیادہ علم عطا فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کو اُن کی یہ بات پسند نہ آئی اور اُن پر عتاب ہوا کہ تمہارا منصب تو یہ تھا کہ اس کو علم الٰہی کے سپرد کرتے اور کہتے "واللہ اعلم" اور پھر وحی نازل فرمائی کہ جہاں دو سمندر ملتے ہیں (مجمع البحرین) وہاں ہمارا ایک بندہ ہے جو بعض امور میں تجھ سے بھی زیادہ عالم و دانا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا "پروردگار! تیرے اُس بندے تک رسائی کا کیا طریقہ ہے؟"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مچھلی کو اپنے توشہ دان میں رکھ لو، پس جس مقام پر وہ مچھلی گم ہو جائے اُسی

[1] گنتی باب ۲۰، آیات ۲۲۔۲۹۔

جگہ وہ شخص ملے گا، حضرتِ موسیٰؑ نے مچھلی کو توشہ دان میں رکھا اور اپنے خلیفہ یوشعؑ بن نون کو ساتھ لے کر مردِ صالحؑ کی تلاش میں روانہ ہوگئے، جب چلتے چلتے ایک مقام پر پہنچے تو دونوں ایک پتھر پر سر رکھ کر سو گئے، مچھلی میں زندگی پیدا ہوئی اور وہ زنبیل سے نکل کر سمندر میں چلی گئی، مچھلی پانی کے جس حصہ پر بہتی ہوئی گئی اور جہاں تک گئی وہاں پانی برف کی طرح جم کر ایک چھوٹی سی پگڈنڈی کی طرح ہوگیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر میں ایک لکیر یا خط کھنچا ہوا ہے یہ واقعہ یوشعؑ نے دیکھ لیا تھا کیوں کہ وہ حضرتِ موسیٰؑ سے پہلے بیدار ہوگئے تھے مگر جب حضرتِ موسیٰؑ بیدار ہوئے تو اُن سے ذکر کرنا بھول گئے اور پھر دونوں نے اپنا سفر شروع کر دیا اور اُس دن اور رات میں آگے ہی بڑھتے گئے، جب دوسرا دن ہوا تو حضرتِ موسیٰؑ نے فرمایا کہ اب تکان زیادہ محسوس ہونے لگا وہ مچھلی لاؤ تاکہ بھوک رفع کریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرتِ موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کوئی تکان نہیں ہوا تھا، مگر منزل سے آگے غلطی سے نکل گئے تو اب تکان بھی محسوس ہونے لگا، یوشعؑ نے کہا، آپ کو معلوم رہے کہ جب ہم (صخرہ) پتھر کی چٹان پر تھے تو وہیں مچھلی کا یہ تعجب خیز واقعہ پیش آیا کہ اُس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ مکتل (زنبیل) میں سے نکل کر سمندر میں چلی گئی اور اس کی رفتار پر سمندر میں راستہ بنتا چلا گیا، میں آپ سے یہ واقعہ کہنا بالکل بھول گیا، یہ بھی شیطان کا ایک چرکا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سمندر کا وہ خط مچھلی کے لئے "سرب" (راستہ) تھا، اور موسیٰؑ و یوشعؑ کے لئے "عجب" (تعجب خیز بات)

حضرتِ موسیٰؑ نے فرمایا کہ جس مقام کی ہم کو تلاش ہے وہ وہی مقام تھا اور یہ کہہ کر دونوں پھر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہوئے اُسی راہ پر لوٹے اور اُس "صخرہ" (پتھر کی چٹان) تک جا پہنچے۔

وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اُس جگہ عمدہ لباس پہنے ہوئے ایک شخص بیٹھا ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ

نے اُس کو سلام کیا، اس شخص نے کہا کہ تمہاری اس سرزمین میں "سلام" کہاں؟ (یعنی اس سرزمین میں تو مسلمان نہیں رہتے) یہ خضرؑ تھے، حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ میرا نام موسیٰؑ ہے۔
خضرؑ نے کہا: موسیٰ بنی اسرائیل؟ حضرت موسیٰؑ نے کہا: ہاں! میں تم سے وہ علم حاصل کرنے آیا ہوں جو خدا نے تم ہی کو بخشا ہے، خضرؑ نے کہا "تم میرے ساتھ رہ کر اُن معاملات پر صبر نہ کر سکو گے، موسیٰؑ! خدائے تعالیٰ نے مجھ کو تکوینی رموز و اسرار کا وہ علم عطا کیا ہے جو تم کو نہیں دیا گیا اور اس نے تم کو (تشریعی علوم کا) وہ علم عطا فرمایا ہے جو مجھ کو عطا نہیں ہوا" حضرت موسیٰؑ نے کہا "انشاء اللہ" آپ مجھ کو صابر و ضابط پائیں گے اور میں آپ کے ارشاد کی قطعی خلاف ورزی نہیں کروں گا" حضرت خضرؑ نے کہا "تو پھر شرط یہ ہے کہ جب آپ میرے ساتھ رہیں تو کسی معاملہ کے متعلق جس کو آپ کی نگاہیں دیکھ رہی ہوں مجھ سے کوئی سوال نہ کریں، میں خود آپ کو اُن کی حقیقت بتادوں گا" حضرت موسیٰؑ نے منظور کر لیا، اور دونوں ایک جانب کو روانہ ہو گئے، جب سمندر کے کنارے پہنچے تو سامنے سے ایک کشتی نظر آئی حضرت خضرؑ نے ملاحوں سے کرایہ پوچھا، وہ خضرؑ کو پہچانتے تھے لہٰذا انھوں نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا اور اصرار کر کے دونوں کو کشتی پر سوار کر لیا اور کشتی روانہ ہو گئی، ابھی چلتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ حضرت خضر (علیہ السلام) نے کشتی کے سامنے والے حصہ کا ایک تختہ اُکھاڑ کر کشتی میں سوراخ کر دیا، حضرت موسیٰؑ سے ضبط نہ ہو سکا، خضرؑ سے کہنے لگے کشتی والوں نے تو یہ احسان کیا کہ آپ کو اور مجھ کو مفت سوار کر لیا اور آپ نے اس کا یہ بدلہ دیا کہ کشتی میں سوراخ کر دیا کہ سب کشتی والے کشتی سمیت ڈوب جائیں یہ تو بہت نازیبا بات ہوئی؟
حضرت خضرؑ نے کہا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میری باتوں پر صبر نہ کر سکیں گے؟ آخر وہی ہوا، حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ مجھے وہ بات بالکل فراموش ہو گئی، اس لئے آپ بھول چوک پر مواخذہ نہ کریں اور میرے معاملہ میں سخت گیری سے کام نہ لیں" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ پہلا سوال واقعی موسیٰؑ کی بھول کی وجہ سے تھا" اسی اثناء میں ایک چڑیا کشتی کے

کنارے آکر بیٹھی اور پانی میں چونچ ڈال کر ایک قطرہ پانی پی لیا۔ حضرتِ خضرؑ نے کہا کہ بلا شائبہ تشبیہہ علمِ الٰہی کے مقابلہ میں میرا اور تمہارا علم ایسا ہی بے حقیقت ہے جیسا کہ سمندر کے سامنے یہ قطرہ۔

کشتی کنارے لگی اور دونوں اُتر کر ایک جانب روانہ ہو گئے، سمندر کے کنارے کنارے جا رہے تھے کہ ایک میدان میں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ حضرتِ خضرؑ آگے بڑھے اور اُن میں سے ایک بچہ کو قتل کر دیا۔ حضرتِ موسیٰؑ کو پھر یارائے صبر نہ رہا۔ فرمانے لگے "ناحق ایک معصوم جان کو آپ نے مار ڈالا، یہ تو بہت ہی بُرا کیا! حضرتِ خضرؑ نے کہا: میں تو شروع ہی میں کہہ چکا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر و ضبط سے کام نہ لے سکیں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "چونکہ یہ بات پہلی بات سے بھی زیادہ سخت تھی اس لئے حضرتِ موسیٰؑ صبر و ضبط نہ کرنے میں معذور تھے"، حضرتِ موسیٰؑ نے فرمایا "خیر اس مرتبہ اور نظر انداز کر دیجئے، اس کے بعد بھی اگر مجھ سے صبر نہ ہو سکا تو پھر عذر کا کوئی موقع نہیں رہے گا، اور اس کے بعد آپ مجھ سے علیحدہ ہو جائیے گا، غرض پھر دونوں روانہ ہو گئے، اور چلتے چلتے ایک ایسی بستی میں پہنچے جہاں کے باشندے خوش عیش اور مہمان داری کے ہر طرح قابل تھے، مگر دونوں کی مسافرانہ درخواست پر بھی ان کو مہمان بنانے سے انکار کر دیا تھا، ابھی بستی ہی میں سے گذر رہے تھے کہ خضرؑ ایک ایسے مکان کی جانب بڑھے جس کی دیوار کچھ جھکی ہوئی تھی اور اُس کے گر جانے کا اندیشہ تھا، حضرتِ خضرؑ نے اُس کو ہاتھ کا سہارا دیا اور دیوار کو سیدھا کر دیا۔ حضرتِ موسیٰؑ نے پھر خضرؑ کو ٹوکا اور فرمانے لگے کہ ہم اس بستی میں مسافرانہ وارد ہوئے، مگر اس کے بسنے والوں نے نہ مہمان داری کی اور نہ ٹکنے کو جگہ دی، آپ نے یہ کیا کیا کہ اُس کے ایک باشندے کی دیوار کو بغیر اُجرت درست کر دیا، اگر کرنا ہی تھا تو بھوک پیاس کو دُور کرنے کے لئے کچھ اُجرت ہی طے کر لیتے" حضرتِ خضرؑ نے فرمایا "اب میری اور تمہاری جُدائی کا وقت آگیا "هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ" اور پھر انھوں نے حضرتِ موسیٰؑ کو ان تینوں معاملات

کے حقائق کو سمجھایا اور بتایا کہ یہ سب منجانب اللہ وہ باتیں تھیں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارا جی تو یہ چاہتا تھا کہ موسیٰؑ تھوڑا صبر اور کرتے اور ہم کو اللہ تعالیٰ کے اسرار اور تکوینی علوم کی مزید معلومات ہو سکتیں۔

جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کی مفارقت ہونے لگی تو خضرؑ نے اُن واقعات کی جو حقیقت بیان کی قرآنِ عزیز نے سورۂ کہف میں اِس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اس طرح ظاہر کیا ہے:-

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ	"بس اب مجھ میں اور تم میں جدائی کا وقت آگیا، ہاں جن باتوں پر
سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ	تم سے صبر نہ ہو سکا، اُن کی حقیقت تمہیں بتلائے دیتا ہوں۔
عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ	سب سے پہلے کشتی کا معاملہ لو، وہ چند مسکینوں کی تھی جو سمندر میں
لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِى الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ	محنت مزدوری کرتے ہیں، وہ جس طرف بڑھ رہے تھے، وہاں
اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ	ایک بادشاہ ہے (ظالم) جس کسی کی (اچھی) کشتی پاتا ہے زبردستی
يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝ وَاَمَّا	لے لیتا ہے، میں نے چاہا اس کی کشتی میں عیب نکال دوں تاکہ وہ
الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ	مجھ کر اس کو چھوڑ دے) رہا لڑکے کا معاملہ، تو اس کے ماں باپ
اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ	مومن ہیں۔ میں یہ دیکھ کر ڈرا کہ یہ اُنہیں سرکشی اور کفر کر کے
فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا	اذیت پہونچائے گا، بس میں نے چاہا کہ اُن کا پروردگار
مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ۝ وَاَمَّا الْجِدَارُ	اس لڑکے سے بہتر اُنہیں لڑکا دے گا، دینداری میں بھی اور
فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِى الْمَدِيْنَةِ	محبت میں بھی' اور وہ جو دیوار درست کر دی گئی تو وہ شہر کے دو یتیم
وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا	لڑکوں کی ہے جس کے نیچے اُن کا خزانہ گڑا ہوا ہے' اُن کا باپ
صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ	ایک نیک آدمی تھا، پس تمہارے پروردگار نے چاہا دونوں لڑکے
اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ	اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ محفوظ پاکر نکال لیں، یہ اُن
رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ	لڑکوں کے حال پر پروردگار کی ایک مہربانی تھی جو اس طرح ظہور

أَمْرِي ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِع عَلَيْهِ صَبْرًا (کہف ع ۱۰) میں آیا، اور یاد رکھو میں نے جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا اللہ کے حکم سے کیا) یہ حقیقت اُن باتوں کی ان پر تم صبر نہ کر سکے۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کے شروع میں خضرؑ کے اس علم کے متعلق کہا ہے "وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا" (اور ہم نے اُس کو اپنے پاس سے علم عطا کیا) اور قصہ کے آخر میں خضرؑ کا یہ قول نقل کیا "وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي" (میں نے اس سلسلۂ واقعات کو اپنی جانب سے نہیں کیا) قرآن دونوں جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خضرؑ کو بعض اشیاء کے حقائق کا وہ علم عطا فرمایا تھا جو تکوینی رموز و اسرار اور باطنی حقائق سے متعلق ہے، اور یہ ایک ایسا مظاہرہ تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق پر یہ واضح کر دیا کہ اگر عالمِ ہست و بود کے تمام حقائق سے اسی طرح پردہ اٹھا دیا جائے جس طرح بعض حقائق کو خضرؑ کے لئے بے نقاب کر دیا گیا تھا تو اس عالم کے تمام احکام ہی بدل جائیں اور عمل کی آزمائشوں کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گر دنیا اعمال کی آزمائش گاہ ہے اس لئے "تکوینی حقائق" پر پردہ پڑا رہنا ضروری ہے، تاکہ حق و باطل کی پہچان کے لئے جو ترازو "قدرتِ الٰہی" نے مقرر کر دیا ہے وہ برابر اپنا کام انجام دیتا رہے۔

سورۂ کہف کی ان آیات کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) چونکہ اولوالعزم پیغمبر اور جلیل المرتبت رسول تھے اور تشریعی علوم و احکام کی تبلیغ اُن کا منصب تھا اس لئے وہ ان تکوینی اسرار کے مظاہرے کو برداشت نہ کر سکے اور باوجود وعدۂ صبر کے تشریعی منکرات کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور حضرت خضرؑ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مخاطب بناتے رہے اور آخر کار جُدائی کی نوبت آگئی۔

بخاری کی مسطورۂ بالا حدیث میں سورۂ کہف کے ذکر کردہ واقعات سے چند باتیں زیادہ ہیں جو اصل کی تمہید یا مزید تشریح کے طور پر بیان ہوئی ہیں اور اس حدیث ہی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس "عبدِ صالح" کو خضرؑ کہتے ہیں۔

اس مقام پر چند باتیں قابلِ بحث ہیں (۱) خضر نام ہے یا لقب (۲) خضر فقط عبدِ صالح

(ولی) ہیں یا نبی یا رسول؟ (۳) اِن کو حیاتِ ابدی حاصل ہے، یا وفات پا چکے؟

مفسرین کے یہاں ان تینوں سوالات کے جوابات میں بہت سے اقوال منقول ہیں، چنانچہ پہلے سوال کے جواب میں بعض کہتے ہیں کہ خضر نام ہے اور اکثر کا قول ہے کہ یہ لقب ہے، اور پھر نام کے متعلق بھی مختلف اقوال ہیں مثلاً (۱) بلیا بن ملکان (۲) ایلیا بن ملکان۔ (۳) خضرون، معمر، الیاس، الیسع وغیرہ۔

دوسرے سوال کے جواب میں بعض کا قول ہے کہ وہ فقط "عبدِ صالح" تھے اور بعض کہتے ہیں کہ "رسول" تھے، مگر جمہور کا قول یہ ہے کہ نہ وہ رسول تھے اور نہ فقط عبدِ صالح بلکہ "نبی" تھے۔

اور تیسرے سوال کے جواب میں بعض علماء کا خیال ہے کہ اُن کو حیاتِ ابدی حاصل ہے اور وہ اب تک زندہ ہیں اور اس سلسلہ میں کچھ حکایات و روایات بھی بیان کرتے ہیں۔ اور جلیل القدر محققین فرماتے ہیں کہ اُن کے لئے حیاتِ ابدی کا ثبوت نہ قرآن سے ثابت ہے، اور نہ احادیث سے لہٰذا وہ بھی انسانی دنیا کی طرح اپنی طبعی موت سے وفات پا چکے۔

قولِ فیصل | ان ہر سہ مسائل میں قولِ فیصل یہ ہے کہ پہلی بات کے متعلق قرآن عزیز میں کوئی تذکرہ نہیں ہے نہ حضرتِ خضرؑ کا نام مذکور ہے اور نہ لقب بلکہ "عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا" کہہ کر ان کا واقعہ نقل کیا ہے، البتہ بخاری و مسلم کی صحیح احادیث میں خضر کہہ کر اُن کا ذکر کیا گیا ہے، پس اگر تاریخی روایات سے ہم اُن کے نام اور لقب کا پتہ لگا سکتے تو بآسانی یہ کہہ سکتے کہ فلاں نام ہے اور فلاں لقب، مگر اس بارہ میں تاریخی اقوال اس درجہ مضطرب ہیں کہ اُن سے کسی نتیجہ پر پہنچنا ناممکن ہے، لہٰذا ہمارے سامنے اُن کی شخصیت کا تعارف صرف اسی قدر رہ جاتا ہے کہ ان کو خضر کہا جاتا ہے اور یہ کہ وہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معاصر ہیں، اس سے زیادہ اُن کے نام یا لقب یا نسب کی تمام بحثیں بے دلیل محض تخمینی اقوال کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اور دوسری بات کے متعلق راجح قول یہ ہے کہ وہ "نبی" تھے اس لئے کہ قرآنِ عزیز نے جس انداز میں اُن کے شرف کا ذکر کیا ہے وہ مقامِ نبوت ہی پر صادق آتا ہے اور مقامِ ولایت

اُس سے بہت فروتر ہے، مثلاً جب خضرؑ نے لڑکے کے قتل کی وجہ بیان کی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي "یہ میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا، تیرے رب کی رحمت کی بدولت ہوا" اور ظاہر ہے کہ کسی ولی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ الہام کے ذریعہ کسی شخص کو قتل کر ڈالے اس لئے کہ "الہام" میں مغالطہ کا امکان ہے اور اولیاء اللہ کے بہت سے مکاشفات میں اسی لئے کثرت سے تضاد پایا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر وہ شرعی حجت تسلیم نہیں کیا گیا۔

لہٰذا امورِ تکوینیہ میں سے ایک ایسا تکوینی امر جو ظاہر سطح میں نہایت قبیح اور بہت بڑا جرم ہے صرف وحیِ الٰہی کے ذریعہ ہی انجام پا سکتا تھا، اس آیت کے علاوہ حضرتِ موسیٰؑ اور حضرتِ خضرؑ کے درمیان گفتگو کے واقعہ کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ وہ نبی تھے تب ہی تو حضرتِ موسیٰؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر حضرتِ خضرؑ کی معیت اور ان کے علمِ تکوینی کے مشاہدہ کے لئے اصرار کرتے' اور تب ہی حضرتِ خضرؑ جرأت کے ساتھ اپنے علم اور حضرتِ موسیٰؑ کے درمیان موازنہ کرتے نظر آتے ہیں۔

تاہم مجموعۂ کمالاتِ نبوت و رسالت کے اعتبار سے حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کا مقام حضرتِ خضرؑ کے مقام سے بہت بلند ہے کیوں کہ وہ خدا کے نبی بھی ہیں اور جلیل القدر رسول بھی، صاحبِ شریعت بھی ہیں اور صاحبِ کتاب بھی، اور رسولوں میں بھی اولوا العزم رسول ہیں پس حضرتِ خضرؑ کا وہ جزئی علم جو علمِ تکوین کے اسرار سے تعلق رکھتا تھا، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے جامع علمِ تشریعی پر فائق نہیں ہو سکتا۔

اور تیسری بات کے متعلق صحیح رائے علماءِ محققین ہی کی ہے جو اس امر کے قائل ہیں کہ حضرتِ خضرؑ کو حیاتِ اَبدی حاصل نہیں ہے اور وہ اپنی طبعی عمر کے بعد وفات پا چکے، اس لئے کہ قرآنِ عزیز میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو بھی حیاتِ اَبدی عطا نہیں فرمائی، اور اس کے لئے اس دنیا میں "موت" ایک امرِ حق ہے، چنانچہ ارشاد ہے:-

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ط (انبیاء ع ۳) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھ سے پہلے بھی کسی بشر کو حیاتِ اَبدی عطا نہیں کی،

نیز قرآنِ عزیز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم نے ہر ایک نبی سے یہ عہد و میثاق لیا ہے کہ جب محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو گی تو تم میں سے جو بھی اُس وقت موجود ہو اُس کا فرض ہو گا، کہ وہ اُس رسول پر ایمان بھی لائے اور اُس کی مدد بھی کرے، چنانچہ تمام انبیاء ورسل نے اُس کا اقرار کیا اور اُن کے اور خدا کے درمیان شہادت و میثاق محکم و مضبوط ہوا۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (آلِ عمران ع ۹) اور جب اللہ نے نبیوں سے میثاق و عہد لیا کہ میں نے جو کچھ تم کو کتابیں اور علم دیا ہے پھر آوے تمہارے پاس رسول (محمدؐ) کہ سچا بتائے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اُس کی مدد کرو گے، فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ بولے ہم نے اقرار کیا، فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

پس اگر حضرتِ خضرؑ زندہ ہوتے تو اُن کا فرض تھا کہ وہ علی الاعلان حاضرِ خدمت ہو کر آپ پر ایمان لاتے اور تمام غزوات میں آپؐ کی اعانت و امداد کرتے، مگر کسی صحیح روایت سے اِن باتوں میں سے کسی ایک بات کا بھی ثبوت نہیں ملتا، حالانکہ غزوۂ بدر و حنین وغیرہ میں جبرئیلِ امین اور ملائکہ کی اعانت و امداد تک کی تصریحات موجود ہیں۔

قرآنِ عزیز کی اِن آیات کے علاوہ صحیحین (بخاری و مسلم) کی حسب ذیل روایت بھی اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ خضرؑ اب تک زندہ ہیں۔

حضرتِ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ اس رات کو تم نے دیکھا؟ یہ واضح رہے کہ آج جو شخص بھی بقیدِ حیات ہے

ایک صدی گذرنے پر اُن میں سے ایک بھی زمین پر زندہ باقی نہیں رہے گا۔[1]

اس صحیح حدیث کی پیش گوئی کے مطابق بھی حضرتِ خضرؑ کی حیاتِ اَبدی کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکلتی، اور نہ اُن کا استثناء کسی روایت سے ثابت ہوتا ہے، حالانکہ یہ روایت صحیحین کے علاوہ مختلف طریقوں سے دوسری کتبِ حدیث میں بھی منقول ہے۔

اسی لئے مشہور محدث حافظ ابنِ قیمؒ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے ایک بھی صحیح روایت ایسی منقول نہیں ہے جس سے حضرتِ خضرؑ کے زندہ ہونے کا ثبوت ملتا ہو، بلکہ اس کے برعکس آیاتِ قرآنی اور صحیح روایات اُنکی موت کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، ابن کثیرؒ، ابن جوزیؒ، امام بخاریؒ، قاضی ابو یعلیٰ حنبلیؒ، ابو طاہر بن الغباری، علی بن موسیٰ الرضا، ابو الفضل مرسی، ابو طاہر بن العبادی، ابو الفضل بن ناصر، قاضی ابو بکر بن العربی، ابو بکر محمد بن الحسن جیسے جلیل القدر محدثین و مفسرین اُن کی موت ہی کے قائل ہیں۔

لہٰذا حیاتِ خضرؑ کے متعلق جن علماء نے اجماع نقل کیا ہے وہ قطعاً بے سند ہے بلکہ مشہور مفسر ابن حیان اندلسی نے دعوائے اجماع کے خلاف یہ دعویٰ کیا ہے کہ جمہور کا مسلک یہی ہے کہ خضرؑ زندہ نہیں ہیں۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے کرائی جن کا نام خضرؑ تھا اُن کو بعض اسرارِ کونیہ کا وہ علم عطا ہوا تھا جو حضرتِ موسیٰؑ کو نہیں دیا گیا، حضرتِ موسیٰؑ کی شان حضرتِ خضرؑ سے کہیں زیادہ ہے، حضرتِ خضرؑ کا تذکرہ جس انداز سے قرآنِ عزیز نے کیا ہے اُس سے یہی راجح نظر آتا ہے کہ وہ نبی تھے، تاہم بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ کو قرآنِ عزیز نے جس طرح مجمل رکھا ہے ہم صرف اُسی پر یقین رکھیں اور اس سے آگے اپنی تحقیق کو دخل نہ دیں حضرتِ عباسؓ کا یہی قول ہے اور چونکہ اُن کی حیاتِ ابدی کے لئے کوئی شرعی اور تاریخی دلیل موجود نہیں ہے اسلئے

[1] بخاری و مسلم، کتاب الفضائل۔

بے شبہ وہ بھی اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ کر واصل الی اللہ ہوئے۔

حضرتِ خضرؑ کے واقعہ سے متعلق اور بھی بہت سی عجیب وغریب روایات تفسیر وتاریخ کی کتابوں میں منقول ہیں، محققین کی نگاہ میں وہ سب موضوع اور بے اصل ہیں، اور اسرائیلیات سے ماخوذ اس لئے ناقابلِ اعتماد ہیں۔[1]

"مجمع البحرین" دو دریاؤں کے سنگم کو کہتے ہیں یہاں کون سے دو دریا اور ان کا سنگم مراد ہے؟ اس کے متعلق مفسرین اور اربابِ سیرت سے مختلف اقوال منقول ہیں مگر ان میں سے کوئی قول بھی "قولِ فیصل" کی حیثیت نہیں رکھتا، البتہ جن حضرات نے اِس سے بحرِ روم اور بحرِ قلزم اور اُن دونوں کا سنگم مراد لیا ہے وہ قرینِ قیاس ہے اور یہ ممکن ہے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اُس وقت اُن دونوں میں ایسا خطِ اتصال موجود ہو جس پر حضرتِ موسیٰؑ اور حضرتِ خضرؑ کے درمیان یہ واقعہ پیش آیا ہے، اس لئے کہ خروجِ مصر اور میدانِ تیہ کے قیام کے دوران میں بظاہر انہی ہر دو سمندروں سے یہ واقعہ متعلق ہو سکتا ہے، اور حضرتِ استاذ علامہ سید محمد انور شاہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ یہ مقام وہ ہے جو آج کل عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔[2]

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی وفات

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ان تمام صبر آزما حالات میں جن کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے، بنی اسرائیل کی رشد وہدایت میں مصروف اور ایک اولوالعزم پیغمبر کی طرح ہر قسم کی ایذا رسانی ومخالفت کے باوجود صبر کے ساتھ اُن کی اصلاح میں مشغول ومنہمک تھے کہ داعیِ اجل کو لبیک کہنے کا وقت آپہنچا۔

بخاری ومسلم میں حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کی وفات کا واقعہ اس طرح مذکور ہے:-

حضرتِ ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جب حضرتِ موسیٰؑ کی وفات کا وقت

---

[1] اس علمی بحث کے لئے البدایہ والنہایہ جلد ۱- البحر المحیط جلد ۶- روح المعانی جلد ۱۵ عینی شرح بخاری جلد ۷- فتح الباری جلد ۶- اور اصابہ جلد اول قابلِ مراجعت ہیں۔ [2] فیض الباری جلد ۱۔

قریب آیا تو موت کا فرشتہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "اَجِب رَبَّکَ" اپنے پروردگار کی جانب سے پیغامِ اجل کو قبول فرمایئے، حضرت موسیٰؑ نے اس کے طمانچہ رسید کر دیا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی، تب اُس نے دربارِ الٰہی میں جا کر شکایت کی کہ تیرا بندہ موت نہیں چاہتا اور یہ کہ اس نے میرے طمانچہ رسید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُس کی آنکھ پھر درست ہوگئی، اور اُس کو حکم ملا کر موسیٰؑ کے پاس دوبارہ جاؤ اور کہو کہ اللہ کا یہ ارشاد ہے کہ کسی بیل کی کمر پر تم اپنا ہاتھ رکھ دو جس قدر بال تمہاری مُٹھی میں آجائیں گے ہم ہر ایک بال کے عوض تمہاری عمر میں ایک سال کا اضافہ کر دیں گے، فرشتہ نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرت موسیٰؑ کو خدائے تعالیٰ کا پیغام سُنایا، حضرت موسیٰؑ نے دریافت کیا کہ بارِ الٰہا! اس کے بعد کیا انجام ہوگا؟ حضرتِ حق سے جواب ملا کہ آخر کار پھر "موت" ہے، تب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اگر طویل سے طویل زندگی کا آخری نتیجہ موت ہی ہے تو پھر وہ شے آج ہی کیوں نہ آجائے، اور دعا کی کہ الٰہ العٰلمین اس آخری وقت میں ارضِ مقدس سے قریب کر دے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں اس جگہ ہوتا تو تم کو حضرت موسیٰؑ کی قبر کا نشان دکھاتا کہ وہ سرخ ٹیلہ (کثیبِ احمر) کے قریب اس جگہ دفن ہیں۔

ضیاءِ مقدسی کہتے ہیں کہ اَریحا میں سُرخ ٹیلہ کے قریب ایک قبر ہے جس کو حضرتِ موسیٰؑ کی قبر بتایا جاتا ہے، دوسرے تاریخی اقوال کے مقابلہ میں یہ قول صحیح ہے، اس لئے کہ میدانِ تیہ کے سب سے قریب وادی مقدس کا علاقہ اریحا کی بستی ہے اور اسی جگہ وہ کثیبِ احمر (سرخ ٹیلہ) واقع ہے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے[1]

بخاری و مسلم کی اس روایت میں فرشتہ کے ساتھ حضرتِ موسیٰؑ کا جو معاملہ منقول ہے ابن قتیبہ کے نزدیک وہ مادی حقیقت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ تخئیلی و تمثیلی ہے[2]

ہمارے نزدیک اس واقعہ میں انسانی موت و حیات کے مسئلہ کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ جس سے اس سلسلہ کی تمام ضروری اور اہم کڑیاں نمایاں ہو سکیں یعنی یہ ظاہر ہو جائے

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۳ - [2] ایضاً۔

کہ انسان اگر نبوت و رسالت جیسے عظیم الشان منصب پر بھی فائز ہو تب بھی بربناءِ بشریت وہ "موت" کو غیر مرغوب شے سمجھتا ہے مگر جب خدا اس پر موت کی حقیقت کو منکشف کر دیتا ہے تو اس کے مقرب بندوں کے لئے وہ سب سے زیادہ محبوب شے بن جاتی ہے، نیز یہ واضح ہو جائے کہ موت کسی کے نزدیک محبوب شے ہو یا نامرغوب مگر وہ انجام کار ایک نہ ملنے والا حکم ہے جس سے کسی حالت میں بھی مفر نہیں، اس لئے تمنا یہ نہ ہونی چاہئے کہ زندگی میں اضافہ ہو بلکہ یہ آرزو رہنی چاہئے کہ زندگی کا جو لمحہ بھی میسر آئے وہ پاکی اور بلندیِ اخلاق کے ساتھ پورا ہو تاکہ خدائے تعالیٰ کی آغوشِ رحمت پا سکے اور "موت" حقیقی اور ابدی زندگی بن جائے۔

تو اب حدیث کے الفاظ کی تعبیر اس طرح کرنی چاہئے کہ حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں جب موت کا فرشتہ حاضر ہوا تو بشری شکل وصورت میں تھا، حضرتِ موسیٰؑ اُس کو اس حالت میں اسی طرح نہ پہچان سکے جس طرح حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اور حضرتِ لوط علیہ السلام عذاب کے فرشتوں کو ابتداءً نہ پہچان سکے، حضرتِ موسیٰؑ کو یہ ناگوار گذرا کہ ایک اجنبی شخص بغیر اجازت کیوں اُن کے خلوت کدہ میں گھس آیا اور اس کو موت کا پیغام دینے کا کیا حق ہے اور طیش میں آکر مُنہ پر طمانچہ مار دیا، فرشتہ بشکلِ انسان تھا لہٰذا بشری اثرات نے کام کیا اور آنکھ مجروح ہو گئی، مگر جس طرح عذاب کے فرشتوں نے آہستہ آہستہ حضرتِ ابراہیمؑ اور حضرتِ لوطؑ کو اپنی اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا، موت کے فرشتہ نے حضرتِ موسیٰؑ کو آگاہ نہ کیا اور فوراً غائب ہو گیا اور درگاہِ الٰہی میں جا پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو پھر ملکوتی ہیئت پر واپس کر دیا، اور اس طرح وہ اُس عیب سے بری ہو گیا جو بشری شکل و صورت میں آنکھ مجروح ہو جانے سے پیدا ہو گیا تھا۔

فرشتۂ موت نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے خیالات سے آشنا ہوئے بغیر خود ہی یہ سمجھ لیا کہ حضرتِ موسیٰؑ موت کے نام سے خفا ہو گئے اور وہ موت نہیں چاہتے اور دربارِ الٰہی

میں جاکر یہ شکایت کردی کہ تیرا بندہ موت نہیں چاہتا۔ خدائے تعالیٰ نے فرشتہ کی غلط فہمی اور حضرتِ موسیٰؑ کی جلالتِ شان دونوں کے اظہار کے لئے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ دوبارہ جاؤ اور حضرتِ موسیٰؑ کو جاکر ہمارا پیغام سناؤ، اُدھر فرشتہ پیغام حاصل کررہا تھا اور اِدھر حضرتِ موسیٰؑ نے اجنبی شخص کے غائب ہوجانے پر فوراً یہ محسوس کرلیا کہ درحقیقت یہ معاملہ انسانی معاملات سے جُدا دوسرے عالم کا ہے، چنانچہ جب فرشتۂ اجل نے دوبارہ حاضر ہوکر حضرتِ موسیٰؑ کو پیغامِ الٰہی سنایا تو اُن کا لہجہ اور طرزِ گفتگو بالکل دوسرا ہوگیا اور انجام کار وہ رفیقِ اعلیٰ سے جاملے اور قربتِ موت کی جو چند گھڑیاں تھیں وہ موت سے قبل اس طرح سامانِ عبرت و موعظت بنیں۔

صحیحین کی حدیث کے مفہوم و مطلب سے متعلق یہ ایسی تعبیر ہے کہ جس سے وہ تمام سوالات و اشکالات حل ہوجاتے ہیں جو اس سلسلہ میں علماء کے درمیان زیرِ بحث آئے ہیں۔

تورات اور کتبِ تاریخ میں ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السّلام کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوئی اور حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام کی وفات اور حضرتِ موسیٰؑ کی ولادت کے درمیان تقریباً ڈھائی سو سال کا عرصہ ہے۔[1]

تورات میں حضرتِ موسیٰ (علیہ السّلام) کی وفات کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے، اُن میں سے ایک جگہ مذکور ہے:۔

اور موسیٰ موآب کے میدانوں میں سے بنو کے پہاڑوں پر پسگہ کی چوٹی پر جو یریحو کے مقابل ہے چڑھ گیا اور خداوند نے ساری زمین جلعاد سے لے کے دان تک اس کو دکھلائی اور نفتالی کا سارا ملک پچھلے سمندر تک اور جنوب کا ملک اور وادی اریحو (اریحا) جو خرمانوں کا شہر ہے اس کی وادی کا میدان صُغر تک اُس کو دکھایا اور خداوند نے اس سے کہا یہی وہ ملک ہے جس کی بابت میں نے ابراہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کھاکر کہا تھا کہ اسے میں تمہاری نسل کو دوں گا سو میں نے ایسا کیا کہ تو اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، پھر تو اس پار

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱۔

وہاں جانے نہ پائے گا، پس خداوند کے بندے موسیٰؑ نے خداوند کے کہے کے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی اور اُس میں اُسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغفور کے مقابل دفن کیا، پھر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں، اور موسیٰؑ اپنی وفات کے وقت ایک سو بیس برس کا تھا، اور نہ تو اس کی آنکھ دھندلانے پائی اور نہ اُس کی طبعی قوت کم ہوئی۔[1]

بنی اسرائیل کا قومی مزاج اور خدا کی جانب سے تذکیرِ نعمت

حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) اور بنی اسرائیل کے تفصیلی واقعات کا مطالعہ کرنے سے جو بات سب سے پہلے نگاہ کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے اندر ایک عجیب طرح کا تلوّن پایا جاتا ہے، اور سرکشی، احسان فراموشی، فساد انگیزی اور بغض وحسد اُن کے قومی مزاج کا مایۂ خمیر معلوم ہوتا ہے، غالباً اُن کے قومی مزاج کا یہ فساد صدیوں کی غلامی کا نتیجہ تھا۔ کیوں کہ تمام عیوب میں غلامی ہی ایک ایسا عیب ہے جو اخلاق کی پستی، دناءت اور بغض وعناد جیسے ناپاک رذائل انسان کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی قوم کو راہِ راست پر لانے یا صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کے لئے انبیاء ورسل کو سخت سے سخت نامساعد حالات اور دشوار گذار مراحل پیش آئیں گے چنانچہ پیش آتے رہے اور چونکہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) پہلے پیغمبر ہیں کہ جن کی پیغمبرانہ مساعی کے ذریعہ بنی اسرائیل نے غلامی سے نجات پائی اور آزادیٔ حیات سے بہرہ مند ہونے کا موقع میسر آیا تو سب سے زیادہ اُنہی کو بنی اسرائیل کے فاسد قومی مزاج سے دوچار ہونا اور اس کی اصلاح کے لئے سخت سے سخت مصائب کو برداشت کرنا پڑا۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی ایسی قوم کی اصلاح اور رشد وہدایت کے لئے نزولِ قانون (توراۃ) کے علاوہ بڑی کثرت سے آیات اللہ (معجزات ونشانات) کا مظاہرہ کیا گیا، تاکہ اس طرح اُن کے تلوّن اور آشفتہ مزاجی میں اعتدال پیدا ہو کر قبولِ حق اور

[1] استثناء، باب ۳۴ آیات ۷۔۱۔

استقامتِ حق کی استعداد و صلاحیت پیدا ہو سکے۔

یہی وہ آیات اللہ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ عزیز کے اندر سورۂ بقرہ، اعراف اور ابراہیم میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور بتایا ہے کہ معاصر قوموں میں ہمارے فضل و کرم اور عطا و احسان کا مرکز یہی قوم (بنی اسرائیل) رہی ہے مگر افسوس کہ ان تمام انعام و اکرام اور عفو و رحمت کی فراوانی کے باوجود ان کی سرکشی اور بغاوت اور تلون رہ رہ کر ابھرتا، اور دب دب کر نمایاں ہوتا رہا اور آخر کار انھوں نے خدا کی ابدی لعنت و غضب کو سرمایۂ نازش بنا کر ہمیشہ کے لئے دنیا و آخرت کی عزت سے محرومی کا داغ لگا لیا۔

چنانچہ آیات "یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ الآیۃ" (بقرہ) "وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ" الآیہ (بقرہ) "وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ" الآیہ (بقرہ) "وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ" الآیہ (بقرہ) "وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ" الآیہ (بقرہ) "وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ" الآیہ (اعراف) "وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہِ اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ الآیہ" (ابراہیم) میں ان ہی واقعات کا تذکرہ ہے اور نگاہِ عبرت بیں کے لئے سامانِ صد ہزار عبرت و موعظت ہے۔

البتہ بنی اسرائیل کی قومی زندگی کا جو نقشہ قرآنِ عزیز نے پیش کیا ہے اور جس کی زبردست تائید خود تورات سے بھی ہوتی ہے اُس کو سامنے رکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ایسی قوم کو کس لئے ان نعمتوں اور فضیلتوں کے لئے منتخب کر لیا تھا اور عالم الغیب والشہادہ نے کیوں نہ شروع ہی سے ایسی ضدی قوم کو نظر انداز کر دیا، اور کیوں نہ ان فضائل و انعامات کا رُخ کسی دوسری قوم کی جانب مبذول فرمایا، سو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ اُس زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں اور علم الاجتماع (Sociology) اور علم الاقوام والامم (ANTHROPOLOGY) کے اصول پر مطالعہ فرمائیں تو آپ دیکھیں گے کہ جب سے تاریخِ انسانی کا کائنات میں وجود ہوا ہے اکثر ت

سے یہ بات صاف اور واضح ہے کہ اقوامِ عالم کے تمدن و معاشرت اور ان کی سیاست و مذہب پر سامی (Semetic) اقوام کا تسلط اور غلبہ نظر آتا ہے چنانچہ تاریخی حقائق کی تہ تک پہنچنے کے بعد دنیا کی کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی جو سامی اقوام کے ان اثرات سے متاثر نہ ہوئی ہو۔[1] تو جس دور کی حالت قرآنِ عزیز بیان کر رہا ہے اُس دور میں اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے دور و نزدیک جو سامی اقوام آباد تھیں تاریخ نے ان کو عمالیقی، قبطی، کنعانی، عراقی، سمیری وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے جن کا تمدن شام، فلسطین شرقِ اردن مصر اور عراق میں چمک رہا تھا، مگر ان تمام اقوام میں شرک و کفر، بغاوت و سرکشی اور ظلم و طغیان کا جو ہیبتناک مظاہرہ بپا تھا اس کے سامنے بنی اسرائیل بسا غنیمت نظر آتے تھے اور ان کی استعداد و صلاحیت معاصر اقوام کے مقابلہ میں قدرے قابلِ اطمینان تھی، قبطی قوم کا حال فرعونِ مصر اور مصریوں کے وقائع میں ابھی آپ مطالعہ کر چکے ہیں اور کنعانی اور عمالیقی قوم کے حالات عنقریب نظر سے گذریں گے اور سمیری قوم کا اندازہ اس کے ایک سردار "سامری" کے حالات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

یہ تھے وہ کوائف و حالات جن کی بناء پر رشد و ہدایت کے لئے بنی اسرائیل کو منتخب کیا گیا اور تاریخ اس کا ثبوت بہم پہونچاتی ہے کہ اس قوم کی عام بدبختی کے باوجود اسی کی ایک قلیل جماعت کے ذریعہ خدا کی رشد و ہدایت کا پیغام عرصۂ دراز تک کائناتِ انسانی تک پہونچتا رہا اور ہزاروں برس کے بعد اسرائیلیوں سے یہ نعمت سلب کر کے بنی اسمٰعیل کے حوالہ کی گئی۔

غرض بنی اسرائیل کا یہ انتخاب ان کے تقدس و طہارت کے پیشِ نظر نہ تھا بلکہ ان کو ان سے بھی زیادہ فساد و سرکشی پھیلانے والی طاقتوں کی سرکوبی کا ذریعہ بنانا تھا لہٰذا ان کو احکامِ الٰہی کا مطیع بنانے اور اُن کو راہِ راست پر لانے کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا اور اس طرح ان کی نوجوان نسل سے خدا نے اپنی یہ خدمت لی۔

[1] یہ بھی مسئلہ کافی تفصیل کا محتاج ہے، اس جگہ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

توراۃ نے بھی ایک جگہ اِس حقیقت کو ان بہترین الفاظ کے ساتھ آشکارا کیا ہے:۔

"سُن۔ لے اے اسرائیل! آج تجھے یردن پار اس لئے جانا ہے کہ تو ایسی قوموں پر جو تجھ سے بڑی اور زور آور ہیں اور ایسے بڑے شہروں پر جن کی فصیلیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں قبضہ کرے، وہاں عناقیم کی اولاد ہیں جو بڑے بڑے اور قد آور لوگ ہیں، تجھے اُن کا حال معلوم ہے اور تو نے ان کی بابت یہ کہتے سنا ہے کہ بنی عناق کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ پس آج کے دن جان لے کہ خداوند تیرا خدا تیرے آگے آگے بھسم کرنے والی آگ کی طرح پار جا رہا ہے اور ان کو فنا کر دے گا اور وہ ان کو تیرے آگے پست کرے گا ایسا کہ تو ان کو نکال کر جلد ہلاک کر دے گا جیسا خداوند نے تجھ سے کہا ہے۔ اور جب خداوند تیرا خدا ان کو تیرے آگے سے نکال چکے تو تو اپنے دل میں یہ نہ کہنا کہ میری "صداقت" کے سبب سے خداوند مجھے اس ملک پر قبضہ کرنے کو یہاں لایا کیوں کہ فی الواقع ان کی "شرارت" کے سبب سے خداوند ان قوموں کو تیرے آگے سے نکالتا ہے، تو اپنی صداقت یا اپنے دل کی راستی کے سبب سے اُس ملک پر قبضہ کرنے کو نہیں جا رہا ہے بلکہ خداوند تیرا خدا ان قوموں کی شرارت کے باعث ان کو تیرے آگے سے خارج کرتا ہے تاکہ یوں وہ اس وعدہ کو جس کی قسم اس نے تیرے باپ دادا ابراہام اور اضحاق اور یعقوب سے کھائی پورا کرے، غرض تو سمجھ لے کہ خداوند تیرا خدا تیری صداقت کے سبب سے یہ اچھا ملک تجھے قبضہ کرنے کے لئے نہیں دے رہا ہے، کیوں کہ تو ایک گردن کش قوم ہے، اس بات کو یاد رکھ اور کبھی نہ بھول کہ تو نے خداوند اپنے خدا کو بیابان میں کس کس طرح غصہ دلایا بلکہ جب سے تم ملک مصر سے نکلے ہو تب سے اس جگہ پہنچنے تک تم برابر خداوند سے "بغاوت" ہی کرتے رہے ہو[1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ثنا و منقبت قرآن میں	قرآن عزیز اور احادیث نبویؐ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مناقب و فضائل اور بنی اسرائیل کے واقعات کے سلسلہ میں

[1] استثنار باب ۹۔ آیات ۱۔ ۷۔

اُن کی جلالت و عظمت کا جس طرح اظہار کیا گیا ہے اس سے یہ نمایاں ہوتا ہے کہ ختم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور مجدد انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰؑ اولوالعزم رسول اور پیغمبر ہیں اور انبیاء و رسل میں عظیم المرتبت اور بڑی قدر و منزلت کے مالک!

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بچپن کی زندگی سے وفات تک کے حالات ایسے عجیب و غریب طریقے سے گذرے ہیں کہ اُن کے مطالعہ سے بے ساختہ حضرت موسیٰؑ کی جلالت قدر کا اقرار و اعتراف کرنا اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فرعون، قوم فرعون اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں جو تکالیف حضرت موسیٰؑ نے اٹھائیں اور اُن کی اصلاح حال کے لئے جس قسم کی ایذائیں اور مصیبتیں برداشت کیں، اُن کی نظیر (باستثناء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم و حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور) کسی نبی و رسول کی زندگی مبارک میں نہیں ملتی۔

قرآن عزیز نے جگہ جگہ حضرت موسیٰؑ کے واقعات سے اسی لئے استشہاد کیا ہے کہ اُمتوں اور قوموں کی سہل انگاری، حق سے اغماض بلکہ تمرد و سرکشی، مخالفت و عناد، پیغمبر کی توہین و ایذا رسانی، اور پیغمبر کا صبر و ضبط اور گمراہ اُمت و قوم کی اصلاح اور اُن کے رشد و ہدایت کے لئے پیہم سعی اور جد و جہد کا اس قدر کثیر مواد موعظت و بصیرت کے لئے کہیں نہیں پایا جاتا، جس قدر حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے واقعات میں فراہم ہے۔

پس اگرچہ قرآن عزیز کی اُن تمام آیات سے حضرت موسیٰؑ کی جلالت قدر اور اولوالعزم پیغمبر ہونے کا اظہار ہوتا ہے "جو اُن کے واقعات کو بیان کرتی ہیں" مگر حسب ذیل آیات میں خصوصیت کے ساتھ اُن کی ثناء و منقبت کا اعلان کیا گیا ہے اور اُن کے ضمن میں حضرت ہارونؑ کا بھی، چنانچہ سورہ مریم میں ارشاد ہے:۔

ے استثناء باب ۹ - آیات ۱ - ۷

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝ (ع)	اور یاد کر قرآن میں موسیٰؑ کو بے شبہ وہ تھے مخلص اور تھے رسول، نبی، اور ہم نے ان کو طورِ ایمن کی جانب سے پکارا اور ان کو قریب کرکے ان سے سرگوشیاں کیں اور ہم نے اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارونؑ کو نبی بنایا۔

اور سورۂ اعراف میں ہے:۔

قَالَ يٰمُوْسٰىٓ اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ڮ (ع)	(اللہ تعالیٰ نے) کہا: اے موسیٰؑ! بے شبہ میں نے تم کو لوگوں پر بزرگی عطا کی اور تم کو چن لیا اپنی رسالت دے کر اور ہم کلامی کا شرف بخش کر۔

بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھ کو موسیٰؑ پر فضیلت نہ دو اس لئے کہ قیامت کے دن لوگوں پر دہشت سے غشی طاری ہو جائے گی تو سب سے پہلا شخص جس کو ہوش آئے گا میں ہوں گا، تو میں یہ دیکھوں گا کہ موسیٰؑ عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں اب میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کو مجھ سے پہلے افاقہ ہو گیا یا وہ طور پر بیہوش کئے جانے کے صلہ میں آج کی مدہوشی سے بری کر دیئے گئے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد "کہ مجھ کو موسیٰؑ پر فضیلت نہ دو" از رہِ تواضع اور انکسار ہے ورنہ تو دوسری جگہ آپؐ کا خود یہ ارشاد مبارک ہے "انا سیّدُ ولدِ آدم ولا فخر" بغیر فخر و مباہات کے کہتا ہوں کہ میں تمام اولادِ آدمؑ کا سردار ہوں" اور آپؐ کا خاتم النبیین ہونا خود اس کی روشن دلیل ہے، رہا قیامت کا یہ واقعہ سو یہ ایک جزئی فضیلت ہے اور منبعِ فضل و کمال کے جمیع کمالات کی برتری و تفوق پر اس سے اثر نہیں پڑتا، بہرحال اس روایت کی روح حضرت موسیٰؑ کی جلالتِ قدر اور عظمت کا اظہار ہے اور بس۔

اور سورۂ نساء میں ہے:۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيْمًا ۝ (ع)

اور کچھ رسول ہیں کہ جن کا ذکر ہم نے تم سے پہلے کردیا ہے اور کچھ رسول ہیں جن کا ذکر ہم نے تم کو نہیں سُنایا اور اسی طرح اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام ہوتا ہے،

اور سورۂ صافات میں ہے:۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوسٰى وَهَارُونَ ۝ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ۝ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰى مُوسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (ع)

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ پر احسان کیا اور اُن دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑی مصیبت سے نجات دی اور ہم نے اُن کی مدد کی کہ وہ (فرعون اور قوم فرعون) پر غالب رہے اور ہم نے ان دونوں کو روشن کتاب دی اور دونوں کو راہِ مستقیم کی ہدایت بخشی اور باقی رکھا ان کے متعلق پچھلے لوگوں میں کہ سلام ہو موسیٰؑ اور ہارونؑ پر، بے شک ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نکوکاروں کو، بیشک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں۔

اور سورۂ احزاب میں ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۝ (ع)

اے ایمان والو! تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہونا جنھوں نے موسیٰؑ کو ایذا پہونچائی، پس اللہ نے ان کو اس بات سے بَری کردیا جس کو ان کی زبانیں کہہ رہی تھیں اور موسیٰؑ اللہ کے نزدیک وجیہہ ہیں۔

نیز بخاری و مسلم میں اسریٰ اور معراج کی روایات میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو مکالمات منقول ہیں اُن سے ان کی عظمت و شان کا

نمایاں اظہار ہوتا ہے۔

بخاری ومسلم میں ایک اور روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ تقسیم فرمایا تو ایک شخص (منافق) کہنے لگا کہ اس تقسیم میں خدا کی خوشنودی کا لحاظ نہیں رکھا گیا، کسی مسلمان نے اس مقولہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نقل کر دیا تو آپ کا چہرۂ مبارک غضب وغصہ کی وجہ سے سُرخ ہو گیا اور ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ پر رحم فرمائے کہ اُن کو تو اس سے بھی کہیں زیادہ اذیت پہنچائی گئی ہے اور اُنھوں نے ان تمام اذیتوں کے مقابلہ میں صبر وضبط ہی سے کام لیا۔ یعنی منافق کے اس ایذا رساں قول کے مقابلہ میں میں بھی اولوا العزم رسولوں کی طرح صبر وضبط ہی سے کام لیتا ہوں۔

غرض یہ اور اسی قسم کے بے شمار فضائل ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے اولوا العزم رسول ہونے پر دلالت کرتے اور ہمارے لئے ذخیرۂ رشد وہدایت مہیا کرتے ہیں۔

ایک لطیف تاریخی نکتہ | یہود (بنی اسرائیل) کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت سے نا آشنا نہیں۔ ہے کہ عرصۂ دراز قبل از مسیحؑ (یہود) حجاز میں آکر بس گئے تھے، اور تیما، وادیِ قریٰ، فدک، خیبر اور مدینہ (یثرب) میں انھوں نے مکانوں، مذہبی عبادتگاہوں، جائدادوں، مذہبی درس گاہوں اور فوجی چھاؤنیوں اور قلعوں کے ذریعہ اپنا مستقل تمدن قائم کر لیا تھا اور بقولِ عرب مؤرخین بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور بنی حارث بڑے بڑے یہود قبائل نے اِن مقامات کو اپنا مستقل موطن بنا لیا تھا اور وہ یہیں رہ پڑے تھے۔

اِس حقیقت کے پیشِ نظر دو اہم تاریخی سوال پیدا ہوتے ہیں جو حل طلب ہیں۔

ایک یہ کہ وہ کون سا ناگزیر واقعہ پیش آیا کہ جس کی وجہ سے یہود کو وہ سرزمین چھوڑنی پڑی جس کو فلسطین کہتے ہیں اور جس کے متعلق یہود کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ "ارضِ مقدس" ہے

اور وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں؟ (۲) دوسرے یہ کہ اگر کسی ناگزیر حالت میں ان کو اپنی یہ محبوب سرزمین چھوڑنی ہی پڑی تھی تو پھر وہ کون سا سبب تھا جس نے ان کو مجبور کیا کہ وہ قریب کے سرسبز و شاداب اور پُرکیف علاقوں کو چھوڑ کر ایسے علاقہ میں آکر آباد ہوئے جہاں گھاس پات اور زندگی کے لئے سامانِ خورد و نوش بھی وسعت کے ساتھ مہیا نہیں تھے، حالانکہ مصر اُن کی سرزمین سے قریب تھا، عراق ان کا قدیم دارالہجرۃ اور نزدیک تھا اور شام اُن کے شمال میں متصل ہی آباد تھا اور یہ سب مقامات بے حد سرسبز و شاداب اور متمدن ساز و سامان کا مرکز تھے۔

پہلے سوال کا جواب تو تاریخ یہ دیتی ہے کہ فلسطین کی محبوب، مقدس، اور پیاری سرزمین سے یہود کو ۷۰ء قبل عیسوی طیطس رومی (Titus) کے زمانہ میں جبراً نکلنا پڑا، اس بادشاہ نے فلسطین پر فوج کشی کر کے بلادِ فلسطین کو تہ و بالا کر ڈالا۔ بیت المقدس کو برباد کر دیا، اس "ہیکل" کو جس پر یہود کو ناز تھا اور جس کی مضبوطی اور پُرشوکت تعمیر کی وہ مثالیں دیا کرتے تھے اور جس کے سا[مان اور مکلل و مذہب] ظروف پر وہ فخر کیا کرتے تھے" ظالم نے اس کو کھود کر پھینک دیا تھا اور اس کے تمام بیش قیمت ساز و سامان کو لوٹ لیا تھا،

اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ "یہود" توراۃ میں پڑھ چکے، اور اپنے پیغمبروں کی زبانی سُن چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ ایک زمانہ میں اپنے اس "عہد" کو بنی اسرائیل کے بھائیوں "بنی اسمٰعیل" میں پھر تازہ کرے گا، اور اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ یثرب (مدینہ) میں آئے گا اور یہ اُس کا دارالہجرۃ بنے گا، اور اس کی دعوتِ الٰہی کا مرکز قرار پائے گا، اور یہ کہ "بت پرستوں" کے مقابلہ میں اس کی مجاہدانہ زندگی کامیاب ہوگی، اور ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ و موسیٰؑ کے اعلانِ حق کو دوبارہ اُسی کے ہاتھوں سربلندی نصیب ہوگی اس لئے جب وہ اس "بت پرست بادشاہ" کے ہاتھوں عاجز و درماندہ

ہوئے تو انھوں نے اپنی سربلندی کی آخری پناہ "حجاز" کی اس سرزمین "یثرب" (مدینہ) ہی کو سمجھا اور اس راہ پر اپنا موطن بنالیا جو اُس نبی کے ظہور کے شہر اور فلسطین کے درمیان تھی اور اس طرح وہ نبیِ منتظر کے انتظار اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کی واپسی کیلئے زندگی بسر کرنے لگے۔

چنانچہ "یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں" صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ اس نبی کا ظہور سلع پہاڑ کے قریب ہوگا، اور یہ ظاہر ہے کہ "مدینہ" کی آبادی ایسی جگہ واقع ہے، جس کے مشرق میں جبلِ احد ہے اور مغرب میں جبلِ سلع اور درمیان میں "وادیِ مدینہ" ہے۔

اے سمندر پر گذرنے والو اور اُس میں بسنے والو! اے جزیرہ اور ان کے باشندو! خداوند کے لئے نیا گیت گاؤ، زمین پر سرتاسر اُسی کی ستائش کرو، بیابان اور اس کی بستیاں قیدار کے آباد گاؤں اپنی آواز بلند کریں، سلع کے بسنے والے گیت گائیں، پہاڑوں کی چوٹیوں سے للکاریں، وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں، اور جزیروں میں اُس کی ثناخوانی کریں، خداوند بہادروں کی مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی مانند اپنی غیرت دکھائے گا، وہ نعرہ مارے گا، ہاں وہ للکارے گا، وہ اپنے دشمنوں پر غالب آئے گا۔ میں بہت مدت سے چُپ رہا۔ میں خاموش ہو رہا اور ضبط کرتا رہا..... جو کھودی ہوئی مورتوں پر بھروسہ کرتے اور ڈھالے ہوئے بتوں سے کہتے ہیں، تم ہمارے معبود ہو وہ پیچھے ہٹیں گے اور وہ بہت شرمندہ ہوں گے۔[1]

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ موسٰی علیہ السلام کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی نبی اور پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے "بت پرستوں" سے جہاد کیا ہو اور انجام کار اُن کو نامرادی کا مُنہ دیکھنا پڑا ہو، پھر یہ بنی قیدار کون ہیں؟ سلع کس جگہ واقع ہے؟ جزیروں اور پہاڑوں کا بار بار تذکرہ کیوں ہے؟ اور بنی اسرائیل کے گیت کے علاوہ "نیا گیت" کونسا ہے؟ یہ تمام باتیں پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ ایسی "شریعت" اور ایسے "نبی" کی بشارت کا ذکر ہے

[1] یسعیاہ باب ۴۲ - آیات ۱۰ - ۱۷ - ماخوذ از قصص الانبیاء و ملخصًا۔

جو جزیرہ عرب میں حجاز کے خطہ سے تعلق رکھتا ہے، تو کیا پھر بھی وہ بات نہیں ہے جس کو قرآنِ عزیز نے زندہ تاریخی شہادت کے طور پر یہود کو مخاطب کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا ہے:۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (بقرہ ع ۱۱)	اور جب کہ ان کے پاس اللہ کی جانب سے کتاب (قرآن) آئی جو اس کتاب (توراۃ) کی تصدیق کرتی ہے جو اُن کے پاس ہے اور یہ (یہود) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے کافروں کے مقابلہ میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے پھر جب اُن کے پاس جانی پہچانی بات (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپہنچی تو اُس کا انکار کرنے لگے، سو اللہ کی لعنت ہو انکار کرنے والوں پر!

یعنی جب ان اہلِ کتاب (یہود) کی یثرب کے بُت پرستوں سے جنگ ہوا کرتی تھی، اور اہلِ کتاب کو شکست ہو جاتی تو وہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ خدا نبیِ منتظر کو جلد بھیج کہ ہم اس کے ساتھ مل کر بت پرستی کا قلع قمع کریں اور تیرے وعدہ کے مطابق حق کو کامیابی حاصل ہو لیکن جب وہ پیغمبرِ برحق تشریف لے آئے اور مبعوث ہو گئے تو وہ اس حسد میں اس کا انکار کرنے لگے کہ یہ اسمٰعیلی کیوں ہے، اسرائیلی کیوں نہیں؟

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعض علماءِ یہود اس وسوسہ میں گرفتار تھے کہ اگرچہ اس پیغمبر کی بعثت اور ظہور کا مقام کوہ سلع کے قریب بتایا گیا ہے مگر اس کا ظہور بنی اسرائیل ہی میں سے ہونا چاہیئے، اور اسی لئے وہ یہاں آکر بس گئے تھے کہ خدا کا وہ وعدہ ہم ہی میں سے پورا ہو، لیکن انھوں نے یہ فراموش کر دیا تھا کہ اسی توراۃ میں اُس نبیِ منتظر کے لئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ میں اُن کے لئے اُن ہی کے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا[1] اور یہ نہیں کہا کہ ان ہی (بنی اسرائیل) میں سے برپا کروں گا، لیکن اُن کے جمہور علماء اور

[1] استثناء باب ۱۸ - آیت ۱۸-

ان کے پیرو عوام اس حقیقت سے آشنا نہ تھے کہ یہ نعمت اب ان کے بھائیوں بنی اسمٰعیل میں منتقل ہو کر ہم کو مستفیض کرنے والی ہے، اسی جانب قرآن نے اشارہ کیا ہے:۔

یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ	یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اسی طرح (سچا نبی) جانتے ہیں جس طرح
اَبْنَآءَهُمْ (بقرہ ع)	اپنے بیٹوں کے بیٹا ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔

الحاصل، یہ وجہ تھی کہ صدیوں پہلے بنی اسرائیل جب جبراً وقہراً فلسطین کی سرزمین سے نکالے گئے تو انھوں نے مصر، شام اور عراق کے سرسبز و شاداب اور متمدن ممالک کو چھوڑ کر حجاز کی سرزمین کو ترجیح دی اور یثرب (مدینہ) اور اطراف یثرب میں آکر بس گئے اور اُسی کو اپنا وطن و مسکن بنا لیا، مگر افسوس کہ اُس کے ظہور پر حسد و بغض نے ان کو دولت ایمان سے محروم رکھا،

جدید تاریخی حقائق کے پیشِ نظر اس مقام پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ سوال و جواب کی مسطورۂ بالا پوری بحث اس لئے بیکار ہے کہ سرزمینِ حجاز (مدینہ) میں جو یہود آباد تھے وہ عربی نژاد تھے، یہودی النسل نہیں تھے اس لئے کہ یہودِ بنی اسرائیل کے خصوصی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی جا کر بسے ہوں اپنے اسرائیلی ناموں کو نہیں چھوڑتے بخلاف یہودِ حجاز کے کہ ان کے اجداد کے نام قریظہ، نضیر، قینقاع عربی نام ہیں اور اسرائیلی ناموں سے بالکل ممتاز ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس جدید نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ سرزمینِ حجاز میں آباد یہود صرف عرب نژاد ہی تھے اور ان میں یہودی النسل قبائل قطعاً موجود نہ تھے تو یہ قطعاً غلط اور واقعاتِ تاریخی کے خلاف ہے اس لئے کہ ان قبائل میں بعض وہ قبائل بھی ہیں، جن کا ارضِ فلسطین سے ہجرت کر کے حجاز میں آباد ہو جانا تاریخ کے اوراق میں آج تک محفوظ ہے اور اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ قبائلِ عرب کے ساتھ ساتھ یہودی النسل قبائل بھی یہاں آباد تھے اور اُن ہی کی بدولت قبائلِ عرب میں یہودیت کا بیج بویا گیا تھا تو

مسطورۂ بالا سوال پھر پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا جواب تاریخی حیثیت سے وہی دیا جا سکتا ہے جو گذشتہ سطور میں دیا جا چکا ہے۔

بصیرتیں اور عبرتیں حضرت موسیٰ، بنی اسرائیل، فرعون اور قوم فرعون کی یہ طویل تاریخی داستان ایک قصہ اور حکایت نہیں ہے بلکہ حق و باطل کے معرکے، ظلم و عدل کی جنگ، آزادی و غلامی کی کشمکش، مجبور و پست کی سربلندی، اور جابر و سربلند کی پستی و ہلاکت، حق کی کامرانی اور باطل کی ذلت و رسوائی، صبر و ابتلا اور شکر و احسان کے مظاہر غرض ناسپاسی و ناشکری کے بدنتائج کی ایسی پُرعظمت اور نتائج سے لبریز حقائق کی ایسی پُرمغز داستان ہے جس کی آغوش میں بے شمار عبرتیں اور اَن گنت بصیرتیں پنہاں ہیں اور ہر صاحبِ ذوق کو اس کے مبلغ علم اور دقتِ نظر کے مطابق دعوتِ نظر و فکر دیتی ہیں، ان میں سے مشتے نمونہ از خروارے "یہ چند بصائر خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور اور لائقِ فکر ہیں۔

(۱) اگر انسان کو کوئی مصیبت اور ابتلاء پیش آجائے تو از بس ضروری ہے کہ صبر و رضا کے ساتھ اُس کو انگیز کرے، اگر ایسا کرے گا تو بلاشبہ اس کو خیرِ عظیم حاصل ہوگی اور وہ یقیناً فائز المرام اور کامیاب ہوگا، حضرتِ موسیٰ اور فرعون کی پوری داستان اس کی زندہ شہادت ہے۔

(۲) جو شخص اپنے معاملات میں خدا پر بھروسہ اور اعتماد رکھتا اور اُسی کو خلوصِ دل کیساتھ اپنا پُشتیبان سمجھتا ہے تو خدائے تعالیٰ ضرور اس کی مشکلات کو آسان کر دیتا اور اُسکے مصائب کو نجات اور کامرانی کے ساتھ بدل دیتا ہے، حضرتِ موسیٰ کا قبطی کو قتل کر دینا، مصریوں کا حضرتِ موسیٰ کے قتل کے لئے آپس میں مشورہ کرنا، پھر دشمنوں ہی میں سے ایک ہمدرد شخص کا حضرتِ موسیٰ کو مصریوں کی سازش پر مطلع کرنا، اور اس طرح انکا مدین جانا، وحی الٰہی سے مشرف ہونا، اور رسالت کے جلیل القدر منصب سے سرفراز ہونا اسکی

روشن شہادتیں ہیں۔

(۳) جس کا معاملہ حق کے ساتھ عشق تک پہنچ جاتا ہے اس کے لئے باطل کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہیچ اور بے وجود ہو کر رہ جاتی ہے، غور کیجیے! حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان مادی طاقت کے پیشِ نظر کیا نسبت ہے، ایک بیچارہ و مجبور اور دوسرا باصد ہزار قہرمانی کبر و غرور سے معمور، مگر جب فرعون نے بر سرِ دربار حضرت موسیٰ کو کہا اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا (اے موسیٰ! بالیقین میں تجھے جادو مارا سمجھتا ہوں) تو حضرت موسیٰ نے بھی بے دھڑک جواب دیا "لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا" (تو بلاشبہ جانتا ہے کہ ان (آیات) کو آسمانوں اور زمینوں کے پروردگار نے صرف بصیرتیں بنا کر نازل کیا ہے، اور اے فرعون! میں تجھ کو بلاشبہ ہلاک شدہ سمجھتا ہوں) یعنی خدائے تعالیٰ کے ان کھلے نشانوں کے باوجود نافرمانی کا انجام ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

(۴) اگر کوئی خدا کا بندہ حق کی نصرت و حمایت کے لئے سرفروشانہ کھڑا ہو جاتا ہے تو خدا دشمنوں اور باطل پرستوں ہی میں سے اُس کے معین و مددگار پیدا کر دیتا ہے۔

تمہارے سامنے حضرتِ موسیٰ ہی کی مثال موجود ہے کہ جب فرعون اور اُس کے سرداروں نے اُن کے قتل کا فیصلہ کر لیا تو اُن ہی میں سے ایک مردِ حق پیدا ہو گیا جس نے حضرتِ موسیٰ کی جانب سے پوری مدافعت کی، اسی طرح قبطی کے قتل کے بعد جب اُن کے قتل کا فیصلہ کیا گیا تو ایک باخدا قبطی نے حضرتِ موسیٰ کو اس کی اطلاع کی اور اُن کو مصر سے نکل جانے کا نیک مشورہ دیا، جو آئندہ چل کر حضرت موسیٰ کی عظیم الشان کامرانیوں کا باعث بنا۔

(۵) اگر ایک بار بھی کوئی لذتِ ایمانی سے لطف اندوز ہو جائے اور صدق دلی کے ساتھ اُس کو قبول کر لے تو یہ نشہ اس کو ایسا مست بنا دیتا ہے کہ اس کے ہر ریشۂ جان

سے وہی صدائے حق نکلنے لگتی ہے، کیا یہ اعجاز نہیں ہے کہ جو ساحر "چند منٹ" پہلے فرعون کی زبردست طاقت سے مرعوب اور اس کے حکم کی تعمیل کو حرزِ جان بنائے ہوئے تھے، اور جو اپنے کرشموں کی کامیابی پر انعام و اکرام کا معاملہ طے کر رہے تھے وہی چند منٹ کے بعد جب حضرت موسیٰؑ کے دستِ مبارک پر دولتِ ایمان کے نشہ سے سرشار ہو گئے تو فرعون کی سخت سے سخت دھمکیوں اور جابرانہ عذاب و عقاب کو ایک کھیل سے زیادہ نہ سمجھتے ہوئے بے باکانہ انداز میں یہ کہتے نظر آتے ہیں" قَالُوا لَن نُّؤْثِرَكَ عَلَىٰ مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا" (انھوں نے کہا ہم کبھی یہ نہیں کر سکتے کہ جو روشن دلیلیں ہمارے سامنے آگئی ہیں اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس سے منہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں، تو جو فیصلہ کر چکا ہے اس کو کر گذر، تو زیادہ سے زیادہ جو کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے)

(۶) صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے خواہ اس پھل کے حاصل ہونے میں کتنی ہی تلخیاں برداشت کرنی پڑیں، مگر جب بھی وہ پھل لگے گا میٹھا ہی ہوگا، بنی اسرائیل مصر میں کتنے عرصہ تک بیچارگی، غلامی، اور پریشان حالی میں بسر کرتے اور نرینہ اولاد کے قتل اور لڑکیوں کی باندیاں بننے کی ذلت و رسوائی کو برداشت کرتے رہے مگر آخر وہ وقت آ ہی گیا جبکہ ان کو صبر کا میٹھا پھل حاصل ہوا اور فرعون کی تباہی اور ان کی باعزت رستگاری نے ان کے لئے ہر قسم کی کامرانیوں کی راہیں کھول دیں" وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا" (اور بنی اسرائیل پر تیرے رب کا کلمۂ نیک پورا ہو کر رہا بسبب اس بات کے کہ انھوں نے صبر سے کام لیا)

(۷) غلامی اور محکومانہ زندگی کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمت و عزم کی روح پست ہو کر رہ جاتی ہے اور انسان اس ناپاک زندگی کے ذلت آمیز امن و سکون کو نعمت سمجھنے اور حقیر راحتوں کو سب سے بڑی عظمت تصور کرنے لگتا ہے، اور جد و جہد کی

زندگی سے پریشان و حیران نظر آتا ہے، اس کی زندہ شہادت بھی ان بنی اسرائیل کی زندگی کا وہ نقشہ ہے جس میں حضرت موسیٰؑ کے آیات و بیّنات دکھانے، عزم و ہمت کی تلقین کرنے اور خدا کے وعدۂ کامرانی کو باور کرانے کے باوجود اُن میں زندگی اور پامردی کے آثار نظر نہیں آتے اور وہ قدم قدم پر شکووں اور حیرانیوں کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔

ارضِ مقدس میں داخلہ اور وعدۂ نصرت کے باوجود بُت پرست دشمنوں کے مقابلہ سے انکار کے وقت جو یہ تاریخی جملے اُنھوں نے کہے وہ اس حقیقت کے لئے شاہدِ عدل ہیں، "فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ" (اے موسیٰ! تو اور تیرا رب دونوں جا کر اُن سے لڑو، بلاشبہ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں یعنی تماشہ دیکھتے ہیں)

(۸) وراثتِ زمین یا وراثتِ ملک اسی قوم کا حصہ ہے جو بے سروسامانی سے بے خوف ہو کر اور عزم و ہمت کا ثبوت دے کر ہر قسم کی مشکلات اور موانع کا مقابلہ کرتی اور "صبر" اور خدا کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے میدانِ جدوجہد میں ثابت قدم رہتی ہے۔

(۹) باطل کی طاقت کتنی ہی زبردست اور پُر از شوکت و صولت کیوں نہ ہو انجام کار اس کو نامرادی کا منہ دیکھنا پڑے گا اور آخری انجام میں کامرانی و کامیابی کا سہرا اُن ہی کے لئے ہے جو نکوکار اور باہمت ہیں "وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ"

(۱۰) یہ عادۃ اللہ ہے کہ جابر و ظالم قومیں جن قوموں کو ذلیل اور حقیر سمجھتی ہیں ایک دن آتا ہے کہ وہی ضعیف اور کمزور قومیں خدا کی زمین کی وارث بنتی اور حکومت و اقتدار کی مالک ہو جاتی ہیں اور ظالم قوموں کا اقتدار خاک میں مل جاتا ہے، حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی مکمل داستان اس کے لئے روشن ثبوت ہے۔ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (قصص) (اور ہم چاہتے تھے

کہ جو لوگ ملک میں کمزور کردیئے گئے ہیں اُن پر احسان کریں اور اُن کو پیشوا بنائیں اور انہیں ملک کا وارث کریں اور ملک میں ان کو طاقت وقدرت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر کو وہ چیز دکھا دیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔)

(۱۱) طاقت وحکومت اور دولت وثروت میں سرشار جماعتوں کا ہمیشہ سے یہ شعار رہا ہے کہ سب سے پہلے وہی دعوتِ حق کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوتی ہیں مگر قوموں کی تاریخ یہ بھی بتلاتی ہے کہ ہمیشہ حق کے مقابلہ میں اُن کو شکست ہوتی رہی ہے اور انجام کار اُن کو ناکامی ونامرادی کا منہ دیکھنا پڑا ہے، اس کے لئے نہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تنہا شاہد ہے بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ حق اور مخالف طاقتوں کی مخالفت کا انجام تاریخی شہادت بن کر حقیقت میں انسانوں کے لئے درسِ عبرت دیتا رہا ہے۔

(۱۲) جو ہستی یا جماعت دیدہ دانستہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی سرکشی کرے اور خدا کی دی ہوئی نشانیوں کی منکر ونافرمان بنے تو اس کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ اُن سے قبولِ حق کی استعداد فنا کر دیتا ہے کیوں کہ یہ اُن کی پیہم سرکشی کا قدرتی ثمرہ ہے "سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ" (عنقریب میں اپنی نشانیوں سے ان کی نگاہیں پھیر دوں گا جو ناحق خدا کی زمین میں سرکشی کرتے ہیں) اس آیت کا اور اس قسم کی دوسری آیات کا یہی مطلب ہے جو سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا، یہ مطلب نہیں ہے کہ خدائے تعالیٰ کسی کو بے عقلی اور گمراہی پر مجبور کرتا ہے۔

(۱۳) یہ بہت بڑی گمراہی ہے کہ انسان کو جب حق کی بدولت کامرانی وکامیابی حاصل ہو جائے تو خدا کے شکر وسپاس اور عبودیت ونیاز کی جگہ مخالفینِ حق کی طرح غفلت وسرکشی میں مبتلا ہو جائے افسوس کہ بنی اسرائیل کی داستان کا وہ حصہ جو فرعون سے نجات پاکر قلزم عبور کرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے "اِسی گمراہی سے معمور ہے۔

(۱۴) دین کے بارہ میں ایک بہت بڑی گمراہی یہ ہے کہ "انسان" صداقت وسچائی

کے ساتھ اُس پر عمل پیرا نہ ہو اور خواہش نفس کو امام بنا کر احکام الٰہی میں مرضی کے مطابق حیلہ سازیاں تراشے اور خود فریبی میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ بیٹھے کہ من مانی بھی ہو گئی اور دین کا اتباع بھی ہو گیا۔ بُرائی کو بُرائی سمجھ کر اس میں مبتلا ہونا اس درجہ شنیع نہیں ہے جتنا کہ برائی کو بھلائی کا رنگ دے کر اور منہیات میں حیلہ سازی کر کے اس کا جواز پیدا کرنا مذموم و مکروہ ہے، حق تعالیٰ کی جانب سے اکثر و بیشتر قوموں پر عذاب اسی قابلِ نفرت عمل کی وجہ سے ہوتا رہا ہے، یہود نے بھی "سبت کے متعلق" یہی طریقہ اختیار کیا تھا اور عذابِ الٰہی کے مستحق ٹھہرے تھے، سبت کے دن بنی اسرائیل کو شکار کی ممانعت تھی اور پورا دن عبادت کے لئے مخصوص تھا، انھوں نے کچھ عرصہ تو اس حکم پر صبر کیا لیکن زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے، اور حیلہ یہ اختیار کیا کہ سبت سے پہلی رات میں دریا کے کنارہ گڑھے کھود کر پانی کا بہاؤ اس طرف کر دیتے اور صبح ہوتے مچھلیاں خود بخود اُن گڑھوں میں آجاتیں اور بنی اسرائیل شام کو اُن کو قبضہ میں کر لیتے، اور جب خدا کے نیک بندے اس حیلہ پر اعتراض کرتے تو بڑے فخر سے کہتے کہ ہم نے سبت کے احترام کو کب شکست کیا ہے جو تم معترض ہوتے ہو، مگر خدا کے عذاب نے جب اُن کو آلیا تب اُن کو معلوم ہوا کہ دین میں حیلہ سازی کس قدر خوفناک جرم ہے۔

(۱۵) کوئی حق کو قبول کرے یا نہ کرے حق کے داعی کا فرض ہے کہ وہ موعظتِ حق سے باز نہ رہے، چنانچہ سبت کی بے حرمتی پر اُن ہی میں سے بعض اہلِ حق نے ان کو سمجھایا تو بعض نے یہ بھی کہا کہ یہ ماننے والے نہیں ہیں ان کا سمجھانا بیکار ہے مگر پختہ کار داعیانِ حق نے جواب دیا: "مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ" (قیامت میں خدا کے سامنے ہم معذرت تو کر سکیں گے کہ ہم حق تبلیغ برابر ادا کرتے رہے، اور ہم کو غیب کا کیا علم، کیا عجب ہے کہ یہ پرہیزگار بن جائیں؟)

(۱۶) کسی قوم پر جابر و ظالم حکمراں کا مسلط ہونا اُس حکمراں کی عند اللہ مقبولیت و سرفرازی کی دلیل نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا ایک عذاب ہے جو محکوم قوم کی بد عملیوں کے پاداشِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مگر محکوم قوم کی ذہنیت پر جابر طاقت کا اس قدر غلبہ چھا جاتا ہے کہ وہ اس کی

قہرمانیت کو ظالم حکمراں پر خدا کی رحمت اور اس کے اعمال کا انعام سمجھنے لگتی ہے، چنانچہ فرعون اور بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ جس میں حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دلانے کے لئے اُن کو ابھارا اور انھوں نے قدم قدم پر حضرت موسیٰ سے اپنی شکایتوں اور مصر میں غلامانہ خوش حال زندگی بسر کرنے کی دوبارہ تمناؤں کا اظہار کیا ہے، اس کے لئے شاہدِ عدل ہے، قرآنِ عزیز نے اس حقیقت کو اس معجزانہ انداز میں بیان کیا ہے:-

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۭ (الاعراف ع ۲۱)

اور جب ایسا ہوا کہ تیرے پروردگار نے اعلان کر دیا تھا (اگر بنی اسرائیل بدعملی اور سرکشی سے باز نہ آئے تو) وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کریگا جو انھیں ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا رکھیں گے۔

(۱۸) جب فرعون اور اُس کی قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو حضرت موسیٰ نے خدائے تعالیٰ سے دعا کی، خدایا! اب ان بدکرداروں کو اُن کی سرکشی اور بدعملی کی سزا دے کہ یہ کسی طرح راہِ راست پر نہیں آتے، مگر جب بھی حضرت موسیٰ کی دعا کی استجابت کا وقت آتا اور خدا کے عذاب کی علامتیں شروع ہوتیں تب فوراً فرعون اور اس کی قوم حضرت موسیٰ سے کہتی: اگر اس مرتبہ یہ عذاب ہم پر سے دفع ہو گیا تو ہم ضرور تیری بات مان لیں گے اور جب وہ دفع ہو جاتا تو پھر بدستور تمرد اور سرکشی کرنے لگتے، اس طرح ایک عرصہ تک اُن کو مہلت ملتی رہی اور جب کسی طرح کج روی سے باز نہ آئے تو آخرکار عذابِ الٰہی نے اچانک اُن کو آلیا اور ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا، اسی طرح سبت کی بے حرمتی کرنے والوں کو مہلت ملتی رہی۔ مگر جب وہ کسی طرح باز نہ آئے تو خدا کے عذاب نے ان کا خاتمہ کر دیا۔

یہ اور امم ماضیہ کے اسی قسم کے دوسرے واقعات اس امر کی دلیل ہیں کہ جب کوئی قوم یا کوئی جماعت بدکرداری اور سرکشی میں مبتلا ہوتی ہے تو خدا کا قانون یہ ہے کہ اُن کو فوراً ہی گرفت میں نہیں لیا جاتا بلکہ بتدریج مہلت ملتی رہتی ہے کہ اب باز آجائے اب سمجھ جائے۔ اور اصلاحِ حال کر لے لیکن جب وہ آمادۂ اصلاح نہیں ہوتی اور ان کی سرکشی اور بدعملی ایک

خاص حد تک پہنچ جاتی ہے تو پھر خدا کی گرفت کا سخت پنجہ اُن کو پکڑ لیتا ہے اور وہ بے یار و مددگار فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔

(۱۹) کسی ہستی کے لئے بھی "وہ نبی یا رسول ہی کیوں نہ ہو" یہ مناسب نہیں کہ وہ یہ دعوٰی کرے کہ مجھ سے بڑا عالم کائنات میں کوئی نہیں بلکہ اُس کو خدا کے علم کے سپرد کر دینا بہتر ہے کیونکہ فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اس کا ارشادِ عالی ہے، حضرتِ موسیٰؑ نے جلیل القدر رسول و پیغمبر اور جامع صفات و کمالاتِ نبوت ہونے کے بعد جب یہ فرمایا کہ میں سب سے بڑا عالم ہوں تو خدا نے ان کو تنبیہ کی اور خضرؑ سے ملاقات کرا کے یہ بتایا کہ اِن صفاتِ کمال کے باوجود علمِ الٰہی کے اسرار اس قدر بے غایت و بے نہایت ہیں کہ اُن میں سے چند امر کو اُس نے ایک بزرگ ہستی پر ظاہر کر دیا تو موسیٰؑ ان تکوینی اسرار کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

(۲۰) پیروانِ ملتِ اسلامیہ کے لئے "غلامی" بہت بڑی لعنت اور خدا کا بہت بڑا غضب ہے اور اُس پر قانع ہو جانا گویا عذابِ الٰہی اور لعنتِ خداوندی پر قناعت کر لینے کے مرادف ہے یہی وجہ ہے کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے فرعون کو دعوتِ حق دیتے ہوئے پہلا مطالبہ یہ کیا کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر دے تاکہ وہ میرے ساتھ ہو کر آزادانہ توحیدِ الٰہی کے پرستار رہ سکیں اور اُن کی مذہبی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی جابرانہ اور کافرانہ اقتدار حائل نہ رہ سکے:۔

وَقَالَ مُوسَىٰ يَافِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ حَقِيقٌ عَلَىٰ أَن لَّا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ (اعراف ع ۱۳)	اور موسیٰؑ نے کہا! اے فرعون! میں جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ایلچی ہوں، میرے لئے کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ پر حق اور سچ کے علاوہ کچھ اور کہوں بلاشبہ میں تمہارے لئے تمہارے پروردگار کے پاس سے دلیل اور اشارہ لایا ہوں، پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔
فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ	پھر وہ دونوں فرعون کے پاس آئے پس دونوں نے کہا: ہم بلاشبہ

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ (شعراء) جہانوں کے پروردگار کے پیغمبر اور ایلچی ہیں یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور غلامی سے ان کو چھٹکارا دے۔

سورۂ شعراء کی یہ آیت تو اس مسئلہ کی اہمیت کو اس درجہ رفیع ظاہر کر رہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر اور اولوا العزم پیغمبر کی بعثت کی غرض وغایت ہی یہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام کے مشہور خانوادہ بنی اسرائیل کو فرعون کے جابرانہ اور کافرانہ اقتدار کی غلامی سے آزاد کرائیں اور نجات دلائیں۔

نیز سورۂ اعراف کی آیات کو اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی یہی حقیقت نمایاں ہے، اس لئے کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) فرعون کے دربار میں اوّل اپنی رسالت کا اعلان کرتے ہیں اور پھر خدا کی جانب سے رشد و ہدایت کی دعوت دیتے اور آیاتِ بینات کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے اپنی بعثت کا مآل اور نتیجہ یہی بیان فرماتے ہیں، "فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ" (پس بنی اسرائیل کو (اپنی غلامی سے نجات دے کر) میرے ساتھ کر دے،

پھر یہ بات بھی توجہ کے لائق ہے کہ دعویٰ نبوت و رسالت کے بعد اگرچہ عرصۂ دراز تک موسیٰ علیہ السلام کا قیام مصر میں رہا تاہم بنی اسرائیل پر اُس وقت تک قانونِ ہدایت (توراۃ) نہیں اترا جب تک اُن کو فرعون کی غلامی سے نجات نہیں مل گئی اور وہ ظالمانہ اقتدار کے پنجۂ استبداد سے نجات پاکر ارضِ مقدس واپس نہیں آگئے۔ ❖

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ

۱۰ر مارچ ۱۹۶۵ء

